تاریخ افغانستان

زمانہ قبل از اسلام سے دور حاضر تک

مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ

زمانہ قبل از اسلام سے 2011ء تک

تاریخ افغانستان

جلدِ اوّل

تالیف

مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ

استاذ تاریخ اسلام جامعۃ الرشید کراچی

بلاک A-1، گلستانِ جوہر، یونیورسٹی روڈ، کراچی

0321-3135009 | 0321-2000870

www.almanhalpublisher.com

almanhalpublisher@gmail.com

تاریخ افغانستان
جلد اول

تالیف
مولانا محمد اسماعیل ریحان مدظلہ
استاذ تاریخ اسلام جامعۃ الرشید کراچی

دوکان نمبر 3-2، الور مینشن، بنوری ٹاؤن، گرومندر، کراچی
021-34914596, 0324-2855000
idaratunnoor@gmail.com

پاکستان بھر میں ملنے کے پتے

لاہور	
مکتبہ رحمانیہ	0343-9697395 042-37224228
مکتبہ سید احمد شہیدؒ	042-37228272 042-37228196
اعجاز احمد	0332-4959155
المیزان	042-37122981
مکتبہ العلم	042-37211788
الفلاح پبلشرز	0333-4101085
راولپنڈی	
اسلامی کتاب گھر	0514-830451
الخلیل پبلشنگ	0332-5459409
ملتان	
مکتبہ حقانیہ	0300-4541093
مکتبہ امدادیہ	0300-6380664
مکتبہ امداد العلوم	0302-9635918
فیصل آباد	
اسلامی کتاب گھر	0323-2000921
اسلام آباد	
مکتبہ فریدیہ	0343-5846073
حیدرآباد	
محمد احسن	0321-8728384
مکتبہ اصلاح تبلیغ	0320-3015228
کوئٹہ	
کتب خانہ رشیدیہ	0333-7825484

جوڑ علاوہ سالارزی بونیر	
مکتبہ ہاشمیہ	0312-5588992 0341-9333804
کوہاٹ	
مکتبہ حسین بن علی	0334-8299029
پشاور	
دار الاخلاص	0300-5831992 091-2567539
بیت العلم	0300-9348654
مکتبہ عمر فاروق	0311-8845717 091-2580103
مکتبہ فاروق اعظم	0345-9597693
مکتبہ عثمانیہ	0300-5990822
چمن	
دار العلم	0315-4105987
مکتبہ عزیزیہ	0315-7788573
ڈیرہ اسماعیل خان	
برکی کتب خانہ	0346-7851984 0336-9755780
مکتبہ حقانیہ	0346-5435446
درہ پینرو	
مکتبہ حلیمیہ	0305-9571570
سرائے نورنگ	
مکتبہ ختم نبوۃ کتاب گھر	0302-5565112
بنوں	
مکتبۃ الاسلام	0334-5345720
مکتبہ عرفان	0333-9749663
مکتبہ شیخ الہند	0336-9243535

میران شاہ	
مکتبہ رحمانیہ	
مردان	
مکتبہ الاحرار	0321-9872067
مکتبہ امام محمد	0311-9383776
کرک	
مکتبہ حقانیہ	0313-9836011
اکوڑہ	
مکتبہ سید احمد شہید	0332-9984701
سوات	
مکتبہ صدیقیہ	0334-9332627
مکتبہ عزیزیہ	0344-8178216
مانسہرہ	
ادارہ محمود دینی کتب خانہ	0311-8790712
ہنگو	
مکتبہ دیوبند	0332-4345384
سواڑی بازار	
مکتبہ حسن	0335-9520022
مکتبہ حبیبیہ	0333-9691389
مکتبہ صدیقیہ	0333-9705047
نوشہرہ	
القاسم اکیڈمی	0346-4010613
ادارۃ العلم	0321-9746859
دیربالا	
ادارہ محمودیہ	0300-5571532
مکتبہ صدیقیہ	0331-8174101
صوابی	
اسلامی کتب خانہ	0303-8004066
مدنی کتب خانہ	0302-5687765
شبقدر	
مکتبہ بیت العلم	0345-0947410
مری	
مکتبہ محمدیہ	0321-7484917
مکتبہ عزیزیہ	0310-2197703
ٹانک	
مکتبہ حمادیہ	0304-0988857

فہرستِ جلدِ اوّل

پانچواں باب

چھٹا باب

دسواں باب

گیارھواں باب

بارھواں باب

تیرھواں باب

چودھواں باب

پندرھواں باب

سولھواں باب

سترھواں باب

اٹھارھواں باب

انیسواں باب

بیسواں باب

اکیسواں باب

پیش لفظ

تاریخ کی کتب قوم کی امانت ہوتی ہیں اور انہی پر قوموں کے تشخص کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ دورِ حاضر میں مستشرقین کی ایک پوری کھیپ ہماری تاریخ مسخ کرنے میں مصروف ہے۔ اس بات کا خطرہ ہے کہ اگر ہم نے اپنے ماضی بعید کے ساتھ ساتھ قریبی ادوار کی تاریخ کو پوری احتیاط، دیانت داری اور صداقت کے ساتھ محفوظ نہ کیا تو اگلی نسلوں کے ہاتھوں میں تاریخ کے نام پر صرف وہی زہر آلود مواد ہوگا جو مستشرقین پیش کر رہے ہیں۔ افغانستان کی تاریخ خصوصاً ایسے فکری حملوں کا ہدف ہے۔ اہل مغرب آج میڈیا کے ذریعے وہاں کے غیور مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں، کل کو اسی مواد سے وہ افغانستان کی ایسی تاریخ مرتب کریں گے جس میں ہمارے لیے جابجا گمراہ کن پھندے بچھے ہوں گے۔

ان خطرات سے دفاع کے لیے 2004ء میں ہفت روزہ ضربِ مومن میں ''تاریخِ افغانستان'' پر مضامین کا آغاز کیا گیا۔ ابتدا میں میرا ہدف صرف قریبی دو عشروں کی تاریخ مرتب کرنا تھا۔ اس میں بھی سوویت یونین کے خلاف جہاد اور طالبان کے اِسلامی دور کو خصوصی اہمیت دینا میرا محور تھا۔ مگر جب کام شروع کیا تو معلوم ہوا کہ افغانستان کا ہر دور اپنے سابقہ دور سے اس طرح بندھا ہوا ہے کہ اس سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔ ویسے تو ہر قوم اپنے ماضی کی اسیر ہوتی ہے مگر اپنی اِسلامی تاریخ اور روایات سے جس قدر مضبوط رشتہ افغانوں میں دیکھا جاتا ہے، دنیا کی کوئی اور قوم اسکی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ اس لیے میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ کیوں نہ افغانستان کے پورے اِسلامی عہد کا از سر نو جائزہ لیا جائے اور قارئین کو اس سیر میں اپنا ہم سفر بنا لیا جائے۔

بایں ہمہ جب یہ سلسلہ شروع ہوا تھا تو یہ توقع نہ تھی کہ اسے عوام وخواص میں اس قدر مقبولیت حاصل ہوگی۔ راقم کو قارئین کی جانب سے ملنے والے بکثرت خطوط سے یہ اندازہ ہوا کہ الحمدللہ ہماری قوم خاص کر نوجوان طبقے میں اپنی تاریخ جاننے اور اس سے سبق حاصل کرنے کا زبردست ولولہ موجود ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک بات اکثر خطوط اور پیغامات میں مشترک ہوتی تھی اور وہ یہ کہ اس سلسلے کو کتابی شکل

میں ضرور لایا جائے۔

قارئین کی یہ دلچسپی اور طلب مجھے آمادہ کرتی رہی کہ میں ''تاریخِ افغانستان'' کو بہتر سے بہتر انداز میں زیادہ سے زیادہ معلومات سے پُر کر کے پیش کرتا رہوں۔ اس کے لیے مجھے جس قدر عرق ریزی سے کام لینا پڑا وہ میرے تاریخی تحقیقی سفر کا ایک دلچسپ اور مفید ترین تجربہ تھا۔ چونکہ اس کے ساتھ ساتھ ''بچوں کا اِسلام'' کی تیاری اور کلیۃ الشریعہ جامعۃ الرشید کی تدریسی مصروفیات بھی گھیرے ہوئے تھیں لہٰذا اس کام کے لیے عموماً مجھے صرف جمعے کا دن مل سکتا تھا اور میری کوشش ہوتی تھی کہ اس دن مکمل طور پر تاریخِ اَفغانستان کے لیے یکسو رہوں۔ چنانچہ جمعے کی صبح یہ کام شروع ہوتا تو کبھی اذانِ جمعہ اور کبھی نمازِ عصر تک جا کر ایک قسط کے بقدر مواد سپردِ قرطاس ہو پاتا تھا۔

مطالعہ کتب کے علاوہ اس سلسلے میں وہ تمام مراحل پیش آتے رہے جو ریسرچ میں ہمت وحوصلے کا امتحان لیتے ہیں، مثلاً کتب خانوں کی خاک چھاننا، نادر و نایاب نسخے تلاش کرنا اور قریبی دور کی تاریخ کے لیے افراد سے رابطے کرنا۔ مگر چونکہ یہاں کھلا وقت نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک ہفتے کے اندر اندر ایک خاص مقدار میں مواد تیار کر کے دینا ضروری تھا (جبکہ تحقیق کے کام کو ایسی قیودات سے آزاد ہونا چاہیے) اس لیے اس مواد کی ترتیب میں ''اکملیت'' کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

بہرکیف یہ تاریخ اِسلام کے ایک اہم باب کا تخصیصی جائزہ ہے جسے قارئین کی فہم و استعداد کو پیش نظر رکھتے ہوئے دلچسپ اور سبق آموز انداز میں پیش کیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس تاریخی جائزے میں حوالہ جات کا اہتمام نہیں کیا گیا جیسا کہ اخباری مضامین کا انداز ہوتا ہے۔ تاہم اب جبکہ قارئین کے بے حد اصرار پر اس سلسلے کو کتابی شکل دی جا رہی ہے، ہر باب کے آخر میں متعلقہ حوالہ جاتی کتب کی فہرست بھی شامل کر دی گئی ہے۔ امید ہے کہ قارئین اس کوشش کو نافع پائیں گے۔ اہل علم سے، خصوصاً اَفغانستان کی تاریخ پر نگاہ رکھنے والے حضرات سے توقع رکھتا ہوں کہ اگر وہ تاریخی حوالے سے کہیں کوئی لغزش محسوس کریں تو اس بارے میں حوالے کے ساتھ مطلع کریں تاکہ آیندہ ایڈیشن کی اشاعت سے قبل اس کی تحقیق کر لی جائے۔ راقم کو یہ بھی احساس ہے کہ اس تاریخ کو انگریزی، فارسی، عربی اور پشتو زبانوں میں ترجمہ کر کے اسے عام کیا جانا اشد ضروری ہے۔ اللہ نے چاہا تو جلد ہی اِس رُخ پر کام شروع کیا جائے گا۔

والسلام

محمد اسماعیل ریحان (کراچی)

rehanbhai@gmail.com

اِنتساب

اُن

شہداء

کے نام جن کے پاکیزہ لہو سے

گلشنِ اِسلام

کی آبیاری ہوئی

پہلا باب

اَفغانستان ...... ماقبل اَز اِسلام

اُناسٌ اِذَا لَاقَوْا عِدًى فَكَاَنَّمَا
سِلَاحُ الَّذِی لَاقَوْا غُبَارُ السَّلَاهِبِ

''یہ ایسے لوگ ہیں کہ جب دشمن سے ٹکراتے ہیں تو حریف کا اسلحہ ان کی نگاہوں میں گھوڑوں کا گردوغبار معلوم ہوتا ہے۔''

وسطِ ایشیا، برصغیر اور چین کے سنگم پر واقع اَفغانستان شیر دل مسلمانوں کا دیس ہے، صدیوں سے یہ سرزمین اُمتِ مسلمہ کو ایسے صاحبِ ایمان، بلند ہمت، نڈر اور اولوالعزم رجال کار مہیا کرتی آ رہی ہے جنہیں بجا طور پر مذکورہ عربی شعر کا مصداق کہا جا سکتا ہے۔ ہر دور میں اَفغانستان نے اُمتِ مرحومہ کی حفاظت و بقا کی جدوجہد میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کے ہر مرحلے میں اَفغانستان کے مجاہد لشکرِ اسلام کی پہلی صف میں سرگرمِ عمل رہے ہیں۔

اَفغانستان، شیر دل مسلمانوں کا مسکن: اَفغانستان کے باشندوں کی حمیتِ ایمانی اور دینی جوش و جذبے کا تذکرہ کرتے ہوئے عالمِ عرب کے نامور مؤرخ امیر شکیب ارسلان بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں:

''میرے رب کی قسم! اگر ساری دنیا میں اِسلام کی نبض ڈوب جائے، کہیں بھی اس میں زندگی کی رمق باقی نہ رہے تب بھی کوہِ ہمالیہ اور کوہِ ہندوکش کے درمیان بسنے والوں میں اِسلام زندہ رہے گا اور ان کا عزم جوان رہے گا۔''

قرونِ اولیٰ کی ایک نامور ہستی حضرت قتیبہ رحمہ اللہ کے بقول یہ ملک اللہ کی کمان ہے جس سے وہ اپنے دشمنوں پر تیر برساتا ہے۔

فاتحین کی شاہراہ، طبعی خواص: اَفغانستان کو ایشیا کا دل، وسط ایشیا کا دروازہ اور فاتحین کی شاہراہ بھی کہا جاتا ہے۔ ہزاروں سال سے یہاں قبائلی سیاست رائج چلی آ رہی ہے۔ اِسلام سے قبل یہاں قبائلی

سرداری ہر قید و بند سے آزاد تھی، اشاعتِ اسلام کے بعد اس پر اسلامی تہذیب وتمدن کی ایسی گہری چھاپ لگی جسے آج تک دھندلایا نہیں جاسکا۔

یہ برف پوش چوٹیوں، دلفریب وادیوں، میٹھے چشموں اور حسین سبزہ زاروں کا ملک ہے۔ اس کے مشرق میں کوہِ سیاہ اور کوہِ سلیمان اَفغان سرحد کو پاکستان سے جدا کرتے ہیں، انہی پہاڑوں میں درّہ خیبر، درّہ گومل، درّہ ٹوچی اور درّہ بولان واقع ہیں جنہیں عبور کر کے بڑے بڑے فاتحین برصغیر پہنچتے رہے ہیں۔ کابل کے شمال میں واقع کوہ ہندوکش ملک کا سب سے بلند پہاڑی سلسلہ ہے جو شمال مشرق میں پامیر سے شروع ہو کر جنوب مغرب کی طرف پھیلتا چلا گیا ہے۔ اس کوہستانی سلسلے کی بلندی بعض مقامات پر بیس ہزار فٹ تک جا پہنچتی ہے۔ پامیر کے کہسار اسے چین سے جدا کرتے ہیں۔ وسطی اَفغانستان کی سرزمین سطحِ سمندر سے چھ ہزار فٹ بلند ہے۔

ملک میں دریا بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ بھی زیادہ بڑے نہیں۔ دریائے کابل، کابل شہر کے درمیان سے گزرتا ہے اور جلال آباد کے نزدیک دریائے کنڑ سے مل کر پاکستان کی حدود میں اٹک کے نزدیک دریائے سندھ میں جا گرتا ہے۔ دریائے ہلمند اور دریائے ہری رود ہرات کے گرد و نواح کو سیراب کرتے ہیں اور سیستان کے صحرا میں ختم ہو جاتے ہیں۔ دریائے آمو ملک کی شمالی سرحد ہے جو روس اور اَفغانستان کو الگ کرتا ہے۔ یہ پامیر کی برف پوش چوٹیوں سے نکل کر وسطِ ایشیا کے بحیرہ ارال میں جا گرتا ہے۔

یہ ملک معدنی دولت سے مالا مال ہے، ہیرے، موتی، کوئلہ، گیس، تانبہ، سلفر، ابرق، جست، سرمہ، لوہا، سنگِ مرمر اور نمک جیسی قیمتی معدنیات کے بے شمار ذخائر اس کی خاک میں پوشیدہ ہیں۔ سرد آب و ہوا کے اس ملک کے مشرقی اور وسطی صوبوں میں موسم سرما برف کی چادر اوڑھ کر آتا ہے۔ کابل، غزنی اور بامیان میں بڑی شدت کی سردی پڑتی اور اکثر برف باری بھی ہوتی ہے۔ جبکہ قندھار، سیستان، فراہ، گرم سیر سمیت تمام جنوبی مغربی اضلاع اور دریائے آمو سے متصلہ علاقوں مزار شریف، بلخ وغیرہ میں گرمی کا موسم شدید گرم ہوتا ہے۔ جلال آباد اور خوست کی گرمی بھی مشہور ہے۔

<u>اَفغانستان کے باشندے:</u> باحمیت اور خوددار مسلمانوں کا یہ دیس 6 لاکھ 47 ہزار 500 مربع کلومیٹر رقبے پر مشتمل ہے جس میں 2 کروڑ 60 لاکھ سے زائد افراد بستے ہیں، اکثریت حنفی المسلک مسلمانوں کی ہے۔

نسلی اور لسانی لحاظ سے یہ لوگ مختلف قبائل ہیں۔ پختون مشرقی، وسطی اور جنوبی اَفغانستان میں آباد ہیں۔ قندھار اور جلال آباد ان کے بڑے شہر ہیں۔ تاجک کابل شہر، کابل کے شمالی اضلاع اور ہرات میں زیادہ آباد ہیں۔ ازبکوں کا سب سے بڑا شہر مزار شریف ہے۔ ان کے علاوہ ہزارہ جات جو وسطی

افغانستان میں آباد ہیں، ایک الگ قوم ہیں۔ انہیں عموماً ان تاتاریوں کی اولاد مانا جاتا ہے جو چنگیز خان کے ساتھ آئے تھے۔ یہ مذہباً شیعہ اور زبان کے لحاظ سے فارسی ہیں۔ ایران کی سرحدوں کے ساتھ بلوچ قبائل بھی بستے ہیں۔ جلال آباد کے شمال میں واقع صوبہ نورستان کے لوگ زبان اور نسل کے لحاظ سے ایک الگ قوم ہیں۔ یہ ڈیڑھ صدی پہلے تک غیر مسلم تھے اور ان کا علاقہ کافرستان کہلاتا تھا مگر امیر عبدالرحمن کے زمانے میں انہوں نے اسلام قبول کرلیا جس کے بعد علاقے کا نام نورستان رکھ دیا گیا۔ ورلڈ فیکٹ بک لائبریری اوف کانگریس کی رپورٹ 2004ء کے مطابق افغانستان میں پختون 42 فیصد، تاجک 27 فیصد، ازبک 10 فیصد، ہزارہ جات 9 فیصد، ترکمان 3 فیصد اور بلوچ 2 فیصد ہیں۔ باقی چند فیصد نورستانی، بروہی اور پامیری ہیں۔ ملک میں غیر مسلم آبادی نہ ہونے کے برابر ہے تاہم کابل اور دوسرے بڑے شہروں میں کچھ ہندو اور سکھ خاندان مدت سے آباد ہیں۔ ہندو زیادہ تر تجارت پیشہ ہیں۔

لوگوں کے پیشے اور مشاغل: افغانستان کے دیہی علاقوں میں لوگوں کا عام پیشہ گلہ بانی اور کاشت کاری ہے۔ مکئی، جو اور گندم کے علاوہ آج کل افیون کی کاشت بھی عام ہے۔ اکثر زمینیں بارانی ہیں، نہری زمین بہت کم ہے۔ بعض علاقوں میں لوگ پہاڑی ندیوں اور چشموں سے چھوٹی چھوٹی نالیاں کاٹ کر اپنے کھیتوں تک لاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایران اور بلوچستان کی طرح یہاں کاریز کے ذریعے بھی آب پاشی کی جاتی ہے۔ کاریز سے مراد ایسا زمین دوز نالا ہے جسے کھود کر کسی پہاڑی چشمے کا پانی دور دراز کے کھیتوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ اس نالے کی تہہ زمین کی سطح سے آٹھ نو فٹ نیچے ہوتی ہے اور اس میں ڈھلوان کا تناسب اس مہارت سے رکھا جاتا ہے کہ جب پانی مطلوبہ کھیت تک پہنچے تو سطح زمین پر نکل آئے۔ عموماً ہر ایک میل کے فاصلے پر کاریز کی سطح پر سوراخ ہوتا ہے جس سے لوگ ڈول بھر کر پانی نکال سکتے ہیں۔ افغانستان کے پھل مثلاً انگور، آڑو، ناشپاتی، انار، شہتوت، سیب، خربوزہ اور تربوز کے باغ بہت مشہور ہیں۔ خشک میوہ بھی بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ اخروٹ، بادام، کشمش اور پستہ یہاں کی بڑی برآمدی پیداوار اور افغانوں کی آمدن کا بڑا ذریعہ ہیں۔ قالین بافی یہاں کی اہم صنعت ہے۔ افغانستان کے قالین اور غالیچے اور دوسرے ملکوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں۔ بھیڑ بکریوں کی کھالیں فروخت کرنا بھی افغانوں کا اہم ذریعہ آمدن ہے۔ قراقولی بھی برآمد کی جاتی ہے۔ بزکشی یعنی ذبح شدہ بکری کو گھوڑوں پر سوار ہو کر ایک دوسرے سے جھپٹنا افغانوں کا قدیم کھیل ہے۔

افغانوں کی عادات واطوار: ظفر حسن ایبک جو امیر حبیب اللہ خان کے دور میں افغان فوج میں ملازم رہے تھے افغانوں کی عادات واطوار کے بارے میں اپنا مشاہدہ اور تجربہ یوں تحریر کرتے ہیں:

''افغان لوگ جفاکش اور محنتی، جانباز اور جنگجو ہیں۔ گھوڑے کی سواری کا شوق رکھتے ہیں۔ گھوڑی پر سوار ہونے کو معیوب سمجھتے ہیں۔ جنگ میں حملے کے وقت جانفشانی سے کام لیتے ہیں۔ بہت ڈٹ کر اپنے مورچے کی حفاظت کرتے ہیں لیکن اگر اس میں ان کو شکست ہو جائے تو بہت جلد بددل ہو جاتے ہیں۔ لوگ آزاد منش ہیں اور اپنی افغانیت پر ناز کرتے ہیں۔''

نیز وہ لکھتے ہیں:

''ان کے قبیلوں میں خاص کر ان قبیلوں میں جو مشرقی سرحد کے نزدیک رہتے ہیں، باہمی جھگڑے اور لڑائیاں ختم نہیں ہوتیں۔ ایک ہی قبیلے کے افراد میں بھی باہمی عداوتیں چلتی جاتی ہیں اور ایک قتل کا بدلہ لینے کے لیے سالہا سال انتظار کرتے ہیں اور موقع دیکھتے رہتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی خانہ جنگی ختم ہی نہیں ہوتی۔ افغانوں کی مہمان نوازی مشہور ہے۔ شام کو اگر کوئی مسافر گھر میں آجائے تو عام طور پر اس کی خاطر تواضع خوب کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ان کا کوئی دشمن بھی ان سے پناہ لینے کے لیے گھر آجائے تو وہ پرانے خونی خاندانی جھگڑے بھول جاتے ہیں۔ افغانوں کی یہ خصلت ان کے اس قانونِ برادری کا نتیجہ ہے جس کو وہ ''پختون والی'' کہتے ہیں اور جس کو ہر چھوٹا بڑا افغان مانتا ہے۔ اگر چہ یہ قانون کسی کتاب میں نہیں لکھا ہے۔''

(آپ بیتی، حصہ اوّل: صفحہ:53،54)

افغانوں کا نسب: افغانوں کے آبا و اجداد کون تھے؟ افغانوں کا لقب کس قوم سے جا کر ملتا ہے؟ اس سلسلے میں مختلف آراء ہیں اور کسی کو حتمی نہیں کہا جا سکتا۔ افغانوں کے ہاں مشہور روایات بتاتی ہیں کہ ان کا جدِ امجد قیس (یا قیص) نامی ایک شخص تھا۔ قیس کے تین بیٹے تھے۔ سار بانڑیں، بتان اور غور غشت۔ سار بانڑیں کی اولاد سے سدوزئی، اچکزئی، بارکزئی اور شنواری قبیلے نکلے۔ بتان کی اولاد سے غلزائی، لودھی اور سوری قبائل بنے۔ غور غشت کی اولاد سے مندو خیل، کاکڑ، صافی اور موسیٰ خیل پیدا ہوئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قیس کے بیٹے غور غشت کا ایک لڑکا برہان تھا جس سے ''کرلانڑیں'' نامی شخص پیدا ہوا۔ آفریدی، محسود، خٹک، وزیر، اورکزئی، مہمند اور دیگر سرحدی قبائل اسی کی اولاد ہیں۔

افغانوں کے بارے میں دوسرا مشہور نظریہ یہ ہے کہ یہ آریاؤں کی اولاد ہیں جو وسطِ ایشیا سے نقل مکانی کر کے افغانستان آئے تھے اور پھر ہندوستان چلے گئے تھے۔ مگر ان میں سے بہت سے یہیں رہ گئے اور نئی قوم بن گئے۔

افغانوں کی تین نمایاں خصوصیات: افغانستان کی تاریخ اور یہاں کے باشندوں کی نفسیات کا مطالعہ

کیا جائے تو تین خصوصیات بہت واضح نظر آتی ہیں: ❶ ایمان، ❷ آزادی وخودداری، ❸ جہاد۔

ایمان اس بہادر قوم کی رگ وریشے میں رچا بسا ہے، جذبہ آزادی ان کی گھٹی میں پڑا ہے اور یہی دو عوامل ہر دور میں انہیں ہر غاصب اور ظالم طاقت کے خلاف جہاد پر آمادہ کرتے رہے ہیں۔ افغانستان کے اِسلامی عہد کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں بخوبی نظر آئے گا کہ صدیوں سے حق وباطل کے یادگار معرکے افغانستان کے میدانوں میں لڑے جاتے رہے ہیں۔ مگر اس سے پہلے کہ ہم افغانستان کی اِسلامی تاریخ کا عہد بہ عہد جائزہ لینا شروع کریں، مناسب ہوگا کہ قارئین کے سامنے افغانستان کی عمومی تاریخ کا مختصر سا تذکرہ ہو جائے۔

اِسلام سے قبل تاریخِ افغانستان پر ایک نظر: افغانستان کی تاریخ ہزاروں سال پر محیط ہے۔ ماہرین آثارِ قدیمہ کا خیال ہے کہ یہاں سے برآمد ہونے والے انسانی تمدن کے آثار چار تا آٹھ ہزار سال قدیم ہو سکتے ہیں۔ قندھار کے آثار قدیمہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ولادت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تین چار ہزار سال قبل یہاں زراعت پیشہ قبائل آباد تھے۔ بامیان کے نزدیک چہل ستون اور مزار شریف کے قریب ''آک کپرک'' کے آثار قدیمہ بھی تقریباً اتنے ہی پرانے معلوم ہوتے ہیں۔ ہندوکش کے پہاڑی راستوں سے ملنے والے آثار بتاتے ہیں کہ اس ملک کا قدیم عراق سے تجارتی تعلق رہا تھا۔ یہ راستے عراق کے علاوہ دیگر ممالک سے تجارت کے لیے بھی استعمال ہوتے تھے۔ یہ آثار ظاہر کرتے ہیں کہ افغانستان زمانہ قدیم ہی سے اہم تجارتی شاہراہ کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے۔ یہاں ہڑپہ تہذیب کے آثار بھی نظر آتے ہیں جو تین تا دو ہزار قبل مسیح کے ہیں۔ اس سے اگلے دور میں جو دو تا ڈیڑھ ہزار سال ق م کا ہے، وسط ایشیا کے آریاؤں نے افغانستان میں قدم رکھا اور ایک عرصے تک یہاں آباد رہے۔ اس دور میں اس ملک کو ''آریانہ'' کہا جانے لگا۔

اس دور میں یہ ملک درجنوں قبائل اور نسلوں میں منقسم تھا۔ سیاسی حد بندیاں اس کے علاوہ تھیں جس کی بنا پر یہ پورا علاقہ شدید انتشار کا شکار تھا مگر بیرونی حملہ آور کے مقابلے میں یہ سب یک جان تھے۔ جزیرہ نمائے عرب کی طرح یہاں کے آزاد منش قبائل پر بھی کوئی بادشاہ اپنی حکومت مسلط کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ سامراجی مزاج کے حامل آریاؤں نے اس کی بجائے ہندوستان میں سکونت اختیار کرنے کو ترجیح دی۔

آریاؤں نے جب گنگا جمنا کی وادیوں کا رخ کیا تو یہاں آتش پرستوں نے اثر ورسوخ حاصل کر لیا۔ 600 ق م میں یہاں آگ کی پرستش عروج پر تھی، مجوسیوں کا پیشوا ''زرتشت'' اسی سرزمین میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے پیرو ''زرتشتی'' کہلاتے تھے اور یہاں ان کی خاصی تعداد تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے کوئی 600 سال پہلے ایران کے بادشاہ ''کورش خسرو'' (سائرس اعظم) نے اس علاقے کو اپنی عملداری میں شامل کرلیا، مگر غیور اَفغانوں نے ایران کی بالادستی کو تسلیم نہیں کیا اور اپنی آزادی وخودمختاری کے لئے سربکف رہے۔ 331 ق م میں یہاں ایرانی بادشاہ ''دارا'' کی حکومت تھی۔

سکندر کا حملہ: 330 قبل مسیح میں یونان کا شہرہ آفاق حکمران سکندر (الیگزنڈر) یورپی ممالک پر فتوحات کے جھنڈے گاڑنے کے بعد، مغربی ایشیائی ممالک کو کچلتا ہوا اَفغانستان کی طرف بڑھا۔ ایرانی بادشاہ ''دارا'' کی شوکت اس کے سامنے ڈھیر ہوگئی۔ اَفغان قبائل خطرہ سر پر دیکھ کر چونکے اور ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا۔

اس دور میں اَفغانستان کے جنوبی اضلاع ''آریانہ'' اور ''ارکوسیہ'' کہلاتے تھے اور شمالی حصہ ''باختریہ'' کے نام سے مشہور تھا۔ ان سب اضلاع کے قبائل سکندر کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، چار سال تک خونریز جنگیں ہوتی رہیں، مشرقی اَفغانستان کے ایک شدید معرکے میں سکندر خود بھی زخمی ہوا، مسلسل جنگوں اور وطن سے دوری کے باعث یونانی فوج خستہ حال ہوگئی تھی، اس کے باوجود آخرکار 327 ق م میں سکندر اَفغانستان پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگیا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اَفغان قبائل میں مرکزیت اور قیادت کا فقدان تھا۔

چار سالہ جنگ میں یونانی حملہ آوروں کو بھی غیر متوقع نقصانات کا سامنا کرنا پڑا تھا جس کے باعث یورپی اقوام کے دلوں پر اہلِ اَفغانستان کی جرأت کی دھاک اسی زمانے سے بیٹھ گئی تھی جو آج تک چلی آ رہی ہے۔ خود سکندر اَفغانوں کی جرأت سے بڑا متاثر تھا کیونکہ انہوں نے یونانی سیلاب صفت افواج کو جو بڑے بڑے ملکوں کو آناً فاناً فتح کرتی آئی تھیں چار سال تک برصغیر کی جانب بڑھنے سے روکے رکھا تھا۔

برصغیر کی دفاعی لائن: اس سے یہ تاریخی حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ بیرونی حملہ آوروں کے مقابلے میں اَفغانستان نے ہمیشہ برصغیر کی دفاعی لائن کا کردار ادا کیا ہے۔ سکندر اعظم کے بعد تاتاریوں اور سوویت یونین کی یلغار میں دنیا نے اسی حقیقت کا پھر مشاہدہ کیا۔ اور اس وقت امریکی یورش کے مقابلے میں اَفغانوں کی قوت مزاحمت نے عالمی طاقتوں کو حیران کررکھا ہے۔

ان دنوں برصغیر میں پنجاب پر راجہ پورس کی حکومت تھی، اس سے یہ تاریخی غلطی سرزد ہوئی کہ اس نے سالہا سال اس جنگ کا تماشا دیکھا مگر پڑوسیوں کی مدد کے لئے ہاتھ نہ بڑھایا، نتیجہ یہ نکلا کہ اَفغانستان کا دفاعی خط ٹوٹتے ہی یورپی لشکر برصغیر میں داخل ہوگیا۔

دریائے جہلم کے کنارے گھمسان کی جنگ کے بعد پورس کو شکست ہوئی اور یونانی تہذیب کے آثار ٹیکسلا تک پھیل گئے۔ 323 ق م میں سکندر فوت ہوگیا، اس کے بعد اس خطے پر یونانیوں کی گرفت کمزور پڑگئی، انہی دنوں ہندوستان میں ایک انقلاب آیا۔ نندہ خاندان کی کمزور حکومت کو موریہ خاندان کے

پُرجوش راجاؤں نے ختم کر دیا اور ساتھ ہی یونانیوں سے ان کی کشمکش شروع ہو گئی۔ ان دنوں پنجاب سے عراق تک کے علاقے سکندر کے نائب یونانی جرنیل سلیوکس کے قبضے میں تھے، اس کی حکومت ''سلیوکسی'' کہلاتی تھی جس کا پایہ تخت عراق کا شہر ''بابل'' تھا۔

306 ق م میں ہندو راجا چندر گپت موریا نے 500 ہاتھیوں پر مشتمل لشکر کے ساتھ سلیوکس کے مقبوضات پر حملہ کیا اور سکندر اعظم کے نائبین کو شکست دے کر دریائے سندھ کے پار دھکیل دیا۔ سلیوکس نے موریہ سے صلح کر کے صرف اَفغانستان و عراق پر قناعت کر لی۔

بدھ مت کا فروغ: 261 ق میں یکا یک حالات نے پلٹا کھایا۔ موریہ خاندان کے مشہور حکمران اشوکا نے بدھ مذہب قبول کر لیا۔ اس نے نہ صرف پورے برصغیر بلکہ مشرقی اور وسطی اَفغانستان تک اپنی حدودِ سلطنت وسیع کر لیں۔ اس کے دور میں اَفغانستان کا سرکاری مذہب بدھ مت قرار پایا۔ اشوکا نے بدھ مت کی اشاعت میں نہایت سرگرمی دکھائی۔

بدھ حکمرانوں نے اَفغانستان کے بڑے رقبے پر قبضہ کر لیا تھا مگر وہ یونانیوں کا زور مکمل طور پر توڑنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ 250 ق م میں یونانیوں نے اَفغانستان کے شمال میں اپنی آزاد مملکت قائم کر لی جو''باختر'' کے نام سے طویل مدت تک چلتی رہی۔ اس دوران پارتھی اقوام نے یونانیوں سے اقتدار کی کشمکش جاری رکھی۔ دوسری اور تیسری صدی قبل مسیح میں اَفغانستان اور اسکے گردونواح میں ایک بڑے رقبے پر پارتھیوں کا غلبہ رہا۔

135 ق م میں چینی ترکستان (وسطی چین) سے یوچی قبائل نمودار ہوئے۔ انہوں نے سنکیانگ سے لے کر پشاور، سوات اور پنجاب تک قبضہ جما لیا۔ 128 ق م میں انہوں نے یونانیوں کی ''باختریہ'' مملکت کو شکست دے دی اور شمالی اَفغانستان پر بھی قابض ہو گئے۔ ان کے بعد چین کے ایک اور قبیلے ''چیونی'' نے اس خطے پر طویل عرصے تک حکومت کی۔ 40 عیسوی میں یوچی قبائل کے ایک سردار کادفس اوّل نے پشاور میں کوشان خاندان کی بنیاد رکھی اور ''گندھارا حکومت'' قائم کی۔ 85 عیسوی میں کادفس اول کے جانشین نے اس سلطنت کو بنارس تک پھیلا دیا اور سندھ، راجپوتانہ اور کاٹھیاواڑ سے پارتھیوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ 125 عیسوی سے 152 عیسوی تک یہاں کوشان خاندان کے ایک نامور بادشاہ کنشک اعظم کا اقتدار رہا۔ اس نے پشاور اور کابل کے درمیان اپنا پایہ تخت بنایا۔ اشوکا کی طرح یہ بھی بدھ مت کا پرجوش حامی تھا چنانچہ بدھ مذہب ایک بار پھر جنوبی ایشیا اور اَفغانستان پر چھا گیا اور گندھارا تہذیب کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔ اسی حکمران نے ہندوؤں کی دیکھا دیکھی گوتم بدھ کی مورتی پوجنے کی

روایتِ بد کا آغاز کیا۔اس نے بامیان میں گوتم بدھ کے 120اور 175 فٹ بلند مجسمے ترشوائے جنہیں بدھ مت کے پیروکاروں کے نزدیک سب سے بڑے بتوں کی حیثیت حاصل ہوئی۔اس دور میں شاہراہ ریشم غیر معمولی طور پر مصروف رہی،اس شاہراہ کا خاصا حصہ افغانستان سے گزرتا تھا۔چین، یورپ اور جنوبی ایشیائی ریاستیں سب اپنی تجارت کے لیے اس شاہراہ کے محتاج تھے،اس لیے افغانستان کی تجارتی اہمیت مسلم تھی۔

کنشک کے بعد گندھارا سلطنت کو زوال آ گیا۔241ء میں فارس کے ساسانی خاندان نے کوشان خاندان کے زیرِ نگین افغانستان کے کئی صوبوں پر قبضہ کرلیا۔پھر وسطِ ایشیا سے ''سفید ہنوں'' نے یلغار کی اور نہ صرف کابل اور غزنی پر قبضہ کر کے گندھارا سلطنت کو تہ وبالا کر دیا بلکہ مغربی ہند اور ایران پر قابض پارتھیوں کو بھی بے دخل کر دیا۔370ء سے 530ء کا درمیانی عرصہ اس سرزمین میں ہنوں کے عروج کا تھا۔

چھٹی صدی عیسوی میں ایران کے نامور بادشاہ نوشیروان نے اس علاقے کو زیرِ نگیں کیا،مگر یہ حکومت یہاں زیادہ عرصہ قائم نہ رہی اور چین کے شاہی خاندان نے جلد ہی ایرانیوں کو اپنی حدود میں لوٹ جانے پر مجبور کر دیا۔

<u>تاریک دور:</u> ساتویں صدی عیسوی کا آغاز ہو چکا تھا، اہلِ افغانستان اس دور میں نہایت انتشار اور ابتری کی زندگی گزار رہے تھے، جرأت و بہادری کی ممتاز صفات کے باوجود لامرکزیت نے انہیں غیر اقوام کے ہاتھوں یرغمال بنا دیا تھا، یکے بعد دیگرے مختلف بادشاہتیں انہیں پامال کرتی جا رہی تھیں۔نسلی،لسانی اور قبائلی انتشار کے علاوہ مذہبی اور نظریاتی اختلافات بھی عروج پر تھے جو بیرونی اقوام کے زیرِ اثر پنپ رہے تھے۔مغربی افغانستان کے اضلاع فراہ، نیمروز اور ہرات پر ایران کے ساسانی بادشاہوں کا قبضہ تھا جو زرتشت کے پیروکار تھے۔چنانچہ یہاں کے باشندے بھی سیاست و مذہب اور زبان میں شاہِ ایران کے مقلد تھے جو مجوسی تھا۔

مشرقی اور وسطی افغانستان بدھ مت اور ہندو مت سے بری طرح متاثر تھا، کابل سے قندھار تک بت پرستی کا رواج تھا۔چینی تہذیب وثقافت کے ملے جلے آثار بھی ملک میں ہر جگہ واضح نظر آتے تھے۔غرض کہ اس تاریک دور میں افغان قوم اپنی شناخت مکمل طور پر کھو بیٹھی تھی اور عالمی اقتدار کے کھلاڑی پولو کی گیند کی طرح اس سے کھیل رہے تھے۔

مآخذ و مراجع

- ...... الکامل فی التاریخ ج 1۔ ابن اثیر الجزری
- ...... المختصر فی اخبار البشر ج 1۔ ابو الفداء
- ...... Encyclopedia of Islam.V.1
- ...... اردو دائرہ معارف اسلامیہ۔ناشر: دانش گاہ، پنجاب یونی ورسٹی
- ...... اسلامی انسائیکلو پیڈیا۔ سید قاسم محمود
- ...... اردو ڈائجسٹ جون، جولائی 2003ء۔ مضمون قاضی ذو الفقار احمد
- ...... دریائے کابل سے دریائے یرموک تک۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمہ اللہ
- ...... سیرِ افغانستان۔ علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ
- ...... قدیم تاریخ ہند۔ وی اے سمتھ، ترجمہ: پروفیسر جمیل الرحمن
- ...... آپ بیتی۔ ظفر حسن ایبک

دوسرا باب

اِسلام کی روشنی، افغانستان میں

یہ وہ زمانہ تھا جب افغانوں کو اپنی نجات کے لئے کسی ایسے رہنما کی ضرورت تھی جو انہیں انسانوں کی غلامی سے نکال کر دینِ فطرت کی طرف لے جائے اور اقوام عالم کے ہاتھوں میں کھلونا بننے کی بجائے انہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کا قرینہ سکھائے۔ ایران میں نوشیروان کی موت کے بعد انہیں اپنے نجات دہندہ کے لئے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ سرزمینِ عرب میں حضور رحمتِ عالم ﷺ کی بعثت ہو چکی تھی، معرکہ بدر میں اِسلام فتح یاب ہو چکا تھا، دنیا والے مدینہ منورہ میں پہلی اِسلامی حکومت کے قیام کی خبریں سُن کر حیرت زدہ تھے۔ کچھ ہی دنوں بعد فارس کے بدطینت ساسانی حکمران خسرو پرویز کو حضور اکرم ﷺ کا مکتوب مبارک پہنچا۔ خسرو پرویز نے نامہ مبارک چاک کر ڈالا اور یمن کے ایرانی گورنر کو حضور اکرم ﷺ کو گرفتار کر کے ایران بھجوانے کا حکم دیا۔ پیغمبر آخر الزماں ﷺ نے پرویز کی اس جسارت پر اس کی ہلاکت اور اس کی سلطنت کے عنقریب پارہ پارہ ہونے کی پیش گوئی فرمائی جو حرف بحرف پوری ہوئی۔ پرویز کو اس کے بیٹے شیرویہ نے قتل کر دیا اور اس کے ساتھ ہی ایران کی ساسانی سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ نظامِ حکومت ایسا ابتر ہوا کہ اس کا سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ چند برسوں میں ساسانی خاندان میں کوئی ایسا مرد نہ بچا جو سلطنت سنبھال سکتا ہو۔ ایرانیوں نے علامتی طور پر ایک عورت کو تخت پر بٹھالیا۔

<u>خراسان:</u> افغانستان کے اکثر اضلاع ان دنوں صوبہ خراسان کی حدود میں شامل تھے۔ خراسان سلطنتِ ایران کا وسیع رقبے پر پھیلا ہوا صوبہ تھا، یاقوت حموی کے بیان کے مطابق ”خراسان کی حدود عراق کے قصبہ جوین سے شروع ہوتی ہیں اور اس کی آخری حدود ہندوستان کی جانب تخار، غزنی اور سیستان (جس میں نیمروز، فراہ اور جنوبی افغانستان کے اضلاع شامل ہیں) تک جا پہنچتی ہیں۔ نیشاپور، ہرات، مرو، بلخ، طالقان اور سرخس جیسے بڑے بڑے شہر اس میں شامل ہیں۔“

علامہ بلاذری کے قول کے مطابق افغانستان کے دیگر کئی شہر مثلاً: جوزجان، بغلان، بامیان، کابل اور

دریائے آمو کے پار واقع ترمذ اور بخارا بھی خراسان کا حصہ ہیں۔ موجودہ خراسان جو مشرقی ایران کا ایک صوبہ ہے، درحقیقت اصل خراسان کا ایک چھوٹا سا جز ہے۔

افغانستان کے خودمختار حاکم: ساسانی خاندان میں انتشار کے ساتھ ہی افغانستان کے قبائلی سرداروں کی خودمختاری بھی بڑھنے لگی۔ جنوبی افغانستان کے صوبے سیستان میں ''رتبیل''، ہرات میں ''برازان''، کابل میں ''ترند شاہ'' جوزجان میں ''خداۃ'' اور بلوچستان میں قشمیران شاہ نے خودمختار حکومتیں قائم کرلیں اور ہر ایک نے خود کو ''شاہ'' کے لقب سے آراستہ کرلیا۔

یہ چھٹی صدی عیسوی کا تیسرا عشرہ تھا: جزیرۃ العرب میں حضور رحمت دو عالم ﷺ دنیا کو کفر و شرک اور ظلم و ستم کی تاریکی سے نکالنے کے لئے قیامت تک جاری رہنے والے سلسلۂ جہاد کا آغاز فرما چکے تھے اور اس عظیم مقصد کے لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسے جانثاروں کی جماعت تیار ہو چکی تھی، انہیں قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج پیروں میں روندنے کی بشارت بھی زبانِ نبوی سے مل چکی تھی۔

آپ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں اِسلامی لشکر جزیرۃ العرب سے مرتدین اور باغیوں کا صفایا کرتے ہوئے شام اور ایران کی سلطنتوں کے ایوان دہلانے لگا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک طرف حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ جیسے بطلِ جلیل دمشق اور القدس پر فتوحات کے پرچم لہرا رہے تھے، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ صحرائے سینا سے گزر کر مصر کے قلب تک جا پہنچے تھے اور دوسری طرف حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ قادسیہ کے میدان میں ساسانیوں کے آخری تاجدار یزدگرد کا غرور خاک میں ملا چکے تھے۔ ایران کا پایۂ تخت مدائن فتح ہو گیا تھا اور ہزیمت خوردہ بادشاہ اپنے ماتحت قبائل سے مدد کی امید پر خراسان کی طرف فرار ہو چکا تھا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ اِسلامی لشکر کو سرزمینِ افغانستان کی طرف بڑھنے کی ضرورت پیش آئی۔

افغانستان میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پہلی پیش قدمی: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں شمالی افغانستان کے فاتح عظیم مسلم جرنیل حضرت احنف بن قیس رحمہ اللہ (متوفی 67ھ) تھے جو بڑے تجربہ کار، جنگجو اور مدبر انسان تھے۔ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کا زمانہ پایا تھا مگر زیارت کا شرف حاصل نہ کرسکے تھے۔ ان کی مہمات کا آغاز تب ہوا جب امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو یزدگرد کے تعاقب میں خراسان کی سرحد عبور کرنے کا حکم دیا۔ خراسان کی حدود میں پہلا شہر ''طبسین'' تھا جسے خراسان کا دروازہ کہا جاتا تھا، احنف بن قیس رحمہ اللہ اس طرف روانہ ہوئے اور 22ھ (643ء) میں اسے

بآسانی فتح کرلیا۔اس کے بعد وہ ہرات کی جانب بڑھے اور معمولی جنگ کے بعد یہاں قبضہ کرلیا۔

یزدگرد نے اپنے معاون قبائل کے ساتھ بلخ میں ڈیرے ڈال دیئے اور ساتھ ہی اپنے پڑوس کی قدیم چینی بادشاہت کی طرف کمک کے لئے ہرکارے دوڑا دیئے۔ اِسلامی فوجوں نے یزدگرد کو زیادہ موقع نہ دیا اور بلخ پہنچ کر ایک زوردار معرکے کا آغاز کردیا۔ یزدگرد کو شکست ہوئی اور وہ دریائے آمو پار کرکے اپنے حلیف چینی حکمران کے پاس فرار ہوگیا۔احنف بن قیس رحمہ اللہ نے بلخ سے لے کر تخار تک تمام علاقے پر قبضہ کرلیا اور ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کو تخار کا انتظام سونپ دیا۔ان فتوحات کی اطلاع حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ہوئی، فرمایا: ''کاش! ہمارے اور اہلِ خراسان کے درمیان آگ کا سمندر ہوتا۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بے ساختہ پوچھا: ''امیر المؤمنین یہ کیوں؟'' فرمایا:

''اس ملک کے لوگ تین بار جھاڑے جائیں گے اور تیسری بار ان کو جڑ سے کاٹ دیا جائے گا، میں چاہتا ہوں کہ ایسا مسلمانوں کے ساتھ نہ ہو، بلکہ جو پیش آنا ہو، وہیں کے باشندوں کے ساتھ پیش آئے۔'' (الکامل فی التاریخ: 1 / 464)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے علم میں ایسی احادیث ہوں گی جن میں خراسان (اَفغانستان) میں مستقبل کی شدید جنگیں وقوع پذیر ہونے اور غیر معمولی حوادث ٹوٹنے کا ذکر ہوگا۔ واللہ اعلم۔ تاریخ ثابت کرتی ہے کہ واقعی یہ سرزمین بڑی بڑی آزمائشوں اور جنگوں کا نشانہ رہی۔ چنگیز خان کے حملے میں تو واقعتاً یہاں آبادی کو جڑ سے اکھاڑ دیا گیا۔سوویت یونین کی یلغار میں بھی اسی قسم کا قتلِ عام ہوا اور یہ سلسلہ اب امریکی یورش کی شکل میں ایک بار پھر جاری ہے۔

عہدِ فاروقی میں فتوحاتِ اَفغانستان کی حدود: شمالی اَفغانستان میں تخار تک کے علاقوں کی فتح احنف بن قیس رحمہ اللہ کا کارنامہ ہے، اس کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے انہیں آگے بڑھنے اور دریائے آمو عبور کرنے سے روک دیا تاکہ مفتوحہ علاقوں کی تعمیر وترقی اور وہاں تبلیغِ اسلام کی طرف توجہ دی جائے۔ چنانچہ تخار شمالی اَفغانستان کے مفتوحہ علاقوں کی آخری سرحد قرار پایا۔جنوبی اَفغانستان، عاصم بن عمرو نے فتح کیا تھا جس کے باعث انہیں ''فاتح سیستان'' کہا جاتا ہے، نیمروز کا موجودہ صدر مقام زرنج جو اس وقت جنوبی اَفغانستان کا مرکز سمجھا جاتا تھا، انہی کے ہاتھوں فتح ہوا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں پیش قدمی یہاں پر روک دی گئی تھی، اس طرح سیستان اَفغانستان کے جنوب کا آخری مفتوحہ صوبہ بن گیا۔

فتح اَفغانستان میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایران اور اَفغانستان کے باشندوں کے مزاج اور ان علاقوں کے طبعی وجغرافیائی فرق کو خوب سمجھتے تھے۔انہیں معلوم

تھا کہ جس رفتار سے اسلامی فوجوں نے ایران کی وسیع وعریض سلطنت کی حدود میں پیش قدمی کی ہے اسے افغانستان میں برقرار رکھنا ممکن نہیں۔ اس لیے وہ افغانستان پر مسلسل فوج کشی غیر ضروری بلکہ نقصان دہ سمجھتے تھے چنانچہ اسی لیے انہوں نے حضرت احنف بن قیس رضی اللہ عنہ کو مزید پیش قدمی سے روک دیا تھا۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی یہ رائے نہایت دور اندیشی اور بالغ نظری پر مبنی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ایران کی عیش پسند قوم کی بنسبت اہلِ افغانستان حد درجہ جفاکش اور جنگجو ہیں، وہ دشوار گزار پہاڑوں اور گھاٹیوں میں طویل مدت تک لڑنے کا فن جانتے ہیں، حریف کی بڑی سے بڑی فوج کو الجھا کر اس کا ناطقہ بند کر سکتے ہیں، ان کی کوئی ایک مرکزی حکومت یا بادشاہت نہیں ہے کہ جس کے ختم ہوتے ہی پوری قوم سرنگوں ہو جائے گی بلکہ یہاں ہر وادی میں ایک نئے سردار اور ہر پہاڑ پر ایک نئے حریف کا سامنا ہوگا۔

علاوہ ازیں افغان سرداروں کی سیماب صفتی اور تیز مزاجی بھی مسلّم تھی۔ طاقتور حریف سے وقتی طور پر دب کر صلح کرنا اور موقع ملتے ہی بغاوت کر دینا ان کا قدیم وطیرہ تھا، جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ فاروقی فراست کے مطابق ان تمام خطرات کا تدارک اسی صورت میں ہو سکتا تھا جبکہ افغان قوم اسلام کو دل و جان سے قبول کر کے اسلامی لشکر کا حصہ بن جائے۔ جب تک یہ کیفیت پیدا نہ ہو، علاقوں پر علاقے فتح کرتے چلے جانا خلاف مصلحت تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اہلِ افغانستان کی دلیری، جرأت، ہمت اور سادگی سے بھی بخوبی واقف تھے اور انہیں یقین تھا کہ اسلام کی خوبیاں دیکھنے کے بعد یہ لوگ اسلام کے بہترین سپاہی ثابت ہوں گے۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ افغانوں کے اس استحصال سے بھی آگاہ تھے جو صدیوں سے ظالمانہ حکومتوں کی ماتحتی میں جاری رہا تھا، مقامی سرداروں کا ظلم وستم بھی ان سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ افغان عوام عدل، مساوات اور اخوت پر مبنی نظام کے متلاشی ہیں۔ اسلام کی تعلیمات سامنے آتے ہی وہ از خود اسلام کی جھولی میں آ گریں گے اور سخت ترین مزاحمت کا یہ قلعہ اسلام کا قلعہ بن جائے گا۔

یہ وہ نظریہ تھا جس کی بنا پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں اسلامی لشکر نے افغانستان میں پھونک پھونک کر قدم رکھے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی یہی طرزِ عمل اپنایا گیا۔ کوشش یہی رہی کہ قبائل کے سردار اسلام قبول کر لیں یا جزیہ دینے پر آمادہ ہو جائیں، جنگ کی نوبت نہ آئے۔ یہ پالیسی کامیاب رہی، اگرچہ جہاں جنگ ناگزیر تھی وہاں معرکہ آزمائی بھی ہوئی، بعض جگہ خونریز جنگیں بھی ہوئیں مگر اکثر قبائل نے اسلامی جرنیلوں کے حسنِ سلوک، اعلیٰ کردار اور اخلاق سے متاثر ہو کر جزیہ دینے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ چونکہ مسلمانوں نے انہیں کسریٰ کے مظالم سے نجات دلائی تھی اس لئے وہ بہرحال

مسلمانوں کو اپنا نجات دھندہ سمجھتے تھے۔

افغانستان میں تبلیغِ اسلام: خلفائے راشدین کے سنہرے زمانے میں ایران اور ایشیائی روم کی عظیم سلطنتیں صرف 12 سال کے اندر اندر اِسلامی عملداری میں شامل ہوگئی تھیں مگر اَفغانستان جس کا رقبہ نسبتاً بہت کم تھا، لگ بھگ 20 سال میں فتح ہوا۔ اس کی وجہ سے وہی محتاط پالیسی تھی جس کی بنیاد حضرت عمر رضی اللہ عنہ رکھ گئے تھے۔ یہ دور اَفغانستان میں عوامی فلاح و بہبود اور اِسلامی ذہن سازی کا دور تھا۔ اِسلام کے مجاہدوں نے ان کے سامنے عدل و انصاف کا بے مثال نمونہ پیش کیا، ان کے ہاں آقا اور غلام کا فرق نہیں تھا، قانون کی نظر میں سب برابر تھے۔ افسر اور سپاہی ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے اور ایک ہی صف میں نماز پڑھتے تھے۔

ان اولوالعزم مسلمانوں نے یہاں مساجد بنائیں، کنویں کھدوائے، شہروں کی حفاظت کے لئے فصیلیں تعمیر کیں، خشک علاقوں میں کاریزیں کھدوائیں، چنانچہ بنجر علاقوں میں فصلیں لہلہانے لگیں، صدیوں سے بھاری ٹیکس ادا کرنے والے مفلوک الحال کسانوں کو پہلی بار جابرانہ ٹیکسوں سے نجات ملی اور وہ اپنی محنت کا پھل پانے لگے۔

اس نئی معاشرت سے متاثر ہو کر اَفغان قبائل رفتہ رفتہ بدھ مت اور زرتشت کے مشرکانہ فرسودہ نظریات سے متنفر ہونے لگے اور دن بہ دن اِسلام کے قریب آتے چلے گئے۔

عہدِ عثمانی میں احنف بن قیس کی فتوحات: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے ساتویں برس یہ دیکھ کر کہ وسطی اَفغانستان جہاں غزنی اور کابل جیسے بڑے اور مرکزی شہر ہیں اب تک اِسلام کی روشنی سے محروم ہے، اَفغانستان میں مزید پیش قدمی کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ اس لئے بھی ناگزیر تھا کہ انہی دنوں شمالی اور جنوبی اَفغانستان کے مفتوحہ صوبوں میں ایران کے آخری معزول بادشاہ یزدگرد کی سازشوں کے باعث متعدد مقامات پر بغاوت پھوٹ پڑی تھی، چونکہ احنف بن قیس شمالی اَفغانستان کے چپے چپے سے واقف تھے اس لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نائب عبداللہ بن عامر نے شمال کی مہم ان کے سپرد کی۔

یہ 31ھ (651ء) کا واقعہ ہے۔ احنف شمالی اَفغانستان پہنچے تو معلوم ہوا کہ تخار کے مقام پر طالقان، جوزجان اور فاریاب کے باغیوں کی مشترکہ فوج ان سے مقابلہ کے لئے تیار ہے۔ احنف بن قیس نے ایک دستہ خواجہ غار سے 40 کلومیٹر مشرق میں واقع قصبے رستاق کی طرف روانہ کرکے اس پر قبضہ کیا اور اس کے بعد جنوب کی طرف اصل محاذِ جنگ پر پہنچ گئے، لشکروں کا آمنا سامنا ہوا تو باغیوں کے سردار نے نیزہ تھام کر احنف پر زوردار وار کیا، یہ وار بچا گئے اور حملہ آور سردار کے ہاتھ کو گرفت میں لے کر ایسا جھٹکا دیا کہ نیزہ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ احنف بن قیس یہی نیزہ تھام کر دشمن پر ٹوٹ پڑے، معرکہ کارزار گرم

ہوا، حریف نے ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر ایک خونریز جنگ کے بعد اسے پسپا ہونا پڑا۔

اس شکست کے بعد طالقان اور فاریاب کے باشندوں نے بغیر لڑے اپنے شہر حوالے کر دیئے جبکہ جوزجان جہاں شکست خوردہ دشمنوں کی خاصی تعداد جمع ہو چکی تھی بزور شمشیر فتح کیا گیا۔ ہرات اور بلخ کے باشندوں نے اسلامی فوجوں سے لڑائی مول نہ لی بلکہ ان کا استقبال کیا۔ بلخ کے عمائدین نے مسلمانوں کو بیش بہا تحائف پیش کر کے اپنی خیر خواہی کا ثبوت دیا۔ اس موقع پر بلخ اور اس کے گردونواح کے حاکم ''بازان'' نے احنف بن قیس سے درخواست کی کہ اس کا خاندان اس علاقے کا پشت در پشت حاکم چلا آ رہا ہے لہٰذا انہیں باجگزار نہ بنایا جائے، ہاں اہل بلخ خراج کے طور پر انہیں 60 ہزار درہم دیا کریں گے۔ احنف بن قیس نے اسے قبول کرتے ہوئے تحریر لکھ دی: ''تمہاری درخواست قبول کی جاتی ہے، ہاں مسلمانوں کو کمک پہنچانا تم پر لازم ہوگا، اگر اسلام قبول کر لو گے تو عزت اور مال حاصل کرو گے اور میرے اور تمام مسلمانوں کے برابر شمار ہو گے۔ محرم 32ھ۔''

اس معاہدے پر احنف بن قیس کی مہر اور پانچ مسلمان افسران کے دستخط بھی تھے۔

عبدالرحمن بن سمرۃ رضی اللہ عنہ کے کارنامے: جنوبی افغانستان میں باغیوں کے استیصال اور مزید فتوحات کے لئے عبدالرحمن بن سمرہ کو بھیجا گیا۔ یہ نامور اسلامی جرنیل جب جنوبی افغانستان کے مرکز ''زرنج'' پہنچے تو باغیوں کی ہمت جواب دے گئی اس طرح زرنج اور گردونواح کے علاقے لڑائی کے بغیر فتح ہو گئے۔ اب عبدالرحمن بن سمرہ کے سامنے افغانستان کے وہ بڑے شہر تھے جو فلک بوس پہاڑوں کے حصار میں آباد اور اب تک اسلامی فوجوں کی قدم بوسی سے محروم تھے۔ آگے بڑھنے سے پہلے وہ عقب کو مضبوط کرنے کے لئے پہلے جنوب کی طرف بڑھتے چلے گئے اور بلوچستان کا کچھ علاقہ فتح کر لیا۔

ہر طرف سے مطمئن ہو کر وہ افغانستان کے مرکزی شہروں کی طرف بڑھے۔ ان کے سامنے پہلا بڑا شہر قندھار تھا (اسے قدیم عرب مؤرخین نے داور، دوار اور رُخج یا الرخاج کے نام سے یاد کیا ہے) یہاں ایک پہاڑ پر ایک بہت بڑا بُت خانہ تھا جس میں ''زوز'' نامی ایک بُت نصب تھا، یہ بُت مکمل طور پر سونے کا بنا ہوا تھا، اس کی آنکھ کی جگہ بیش قیمت یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ ''زوز'' بُت کی نسبت سے اس پہاڑ کو ''کوہ زوز'' کہا جاتا تھا۔ یہ بُت خانہ جنوبی افغانستان میں ہندومت اور بدھ مت کی یادگار تھا۔ نہ صرف افغانستان بلکہ سندھ اور ہندوستان تک کے بُت پرست اس زریں مجسمے کی عبادت کے لئے یہاں آتے تھے۔ اس بت کدے کی اہمیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے قندھار اس زمانے میں بُت پرستوں کا بہت بڑا مرکز شمار ہوتا تھا۔ ایک رائے کے مطابق ''قندھار'' کا لفظ ''گندھارا'' سے نکلا ہے،

گندھارا آرٹ یا گندھارا تہذیب وہ قدیم مشرکانہ ثقافت ہے جو بدھ مت کی ترویج کے نتیجے میں ہندوستان، اَفغانستان اور چین میں پھیلی تھی۔

عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ قندھار پہنچے تو شہر کے باشندے کوہ زوز کی طرف نکل گئے اور بُت کدے کی مضبوط فصیل میں پناہ لے لی۔ عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے بُت کدے کا محاصرہ کر لیا، مجبور ہو کر اہلِ شہر نے صلح کی درخواست کی جو قبول کر لی گئی۔

عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ بُت کدے میں داخل ہوئے، یاقوت جڑی آنکھوں والا سونے کا بے حس و حرکت مجسمہ ان کے سامنے تھا، انہوں نے بُت کے ہاتھ توڑ ڈالے اور اس کی آنکھوں کے حلقوں میں جڑے ہوئے یاقوت نوچ لئے...... اپنے معبود کی بے بسی دیکھ کر مقامی لوگ یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے۔ حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے دونوں یاقوت اپنے ساتھ کھڑے حیران و پریشان مقامی سردار کے حوالے کرتے ہوئے کہا: ''یہ سونا اور یاقوت تم ہی رکھ لو، میں صرف تمہیں یہ دکھانا چاہتا تھا کہ یہ بُت نہ نفع دے سکتا ہے نہ نقصان۔''

یہ پہلا موقع تھا کہ قندھار کے بُت کدے میں ایمان کی کرن چمکی اور صدیوں سے باطل نظریات کی پگڈنڈیوں پر اندھا دھند دوڑنے والے آشفتہ سروں کو سیدھی اور روشن راہ نظر آئی۔

کابل کا محاصرہ: قندھار کے بعد اِسلامی لشکر پہلی بار زابل اور ارزگان کے پہاڑی علاقوں میں داخل ہوا۔ خدشہ تھا کہ ان پُر پیچ پہاڑی علاقوں میں خوفناک معرکے ہوں گے مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ غزنی بھی دیکھتے ہی دیکھتے فتح ہو گیا اور اِسلامی لشکر نے کابل کا رخ کیا، اگرچہ شہر نہایت محفوظ تھا مگر کابل اور وسطی و جنوبی اَفغانستان کے حکمران نے جس کا لقب رتبیل تھا، دب کر صلح کر لی۔ اس طرح عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے کسی دشواری کے بغیر کابل کو اِسلامی سلطنت میں شامل کر لیا۔ یہ دور خلافتِ راشدہ میں اَفغانستان کی آخری مہم تھی۔

کابل کی فتح کے بعد گویا پورا اَفغانستان سرنگوں ہو چکا تھا اور اس علاقے میں اِسلام کی اشاعت میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی تھی حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں بڑے فقہاء و صوفیاء بھی تھے جن میں حضرت حسن بصری رحمہ اللہ بھی شامل تھے۔ یہ حضرات اس علاقے میں اِسلام کی اشاعت اور علوم دینیہ کی ترویج میں منہمک ہو گئے، یہ کاوشیں بار آور ثابت ہوئیں اور کچھ ہی عرصہ میں اَفغان قبائل کی اچھی خاصی تعداد مسلمان ہو گئی۔ تاہم یہاں اشاعتِ اِسلام کا کام تدریجاً ہوا اور یہاں اس کی تکمیل کے لئے کم از کم ایک نسل کو بھرپور محنت کرنا پڑی۔

بہر حال خلافت راشدہ کے اختتام تک افغانستان امن وسکون کا گہوارہ بن چکا تھا اور یہاں کے عوام جو کسریٰ اور دیگر بادشاہوں کے جور وستم سے جاں بہ لب تھے مطمئن اور خوش وخرم زندگی بسر کرنے لگے تھے۔
ساسانی خاندان کا آخری تاجدار یزدگرد روپوشی کے ایام میں کسی کسان کے ہاتھوں گمنامی کی موت مارا جا چکا تھا اور صدیوں پرانی یہ جابرانہ حکومت ایک افسانہ بن کر رہ گئی تھی۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں: امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں بعض شورش پسندوں نے افغانستان میں فتنہ انگیزی کی جس سے علاقے کی صورتحال بگڑ گئی، کئی شہروں میں بغاوت ہوگئی۔ بہر کیف اسلامی خلافت کے مشرقی صوبوں کے حاکم عبداللہ بن عامر نے بلاتاخیر اس کا تدارک کیا۔ ان کے حکم پر قیس بن ہیثم نے بلخ پر چڑھائی کی۔ بلخ کے باشندوں میں اب تک آتش پرستی کے جراثیم باقی تھے۔ قیس نے ان کا آتش کدہ منہدم کر دیا۔
ایک اور جرنیل عبداللہ بن حازم نے ہرات اور بادغیس کی صورت حال کو سنبھالا۔ یہ 41ھ (661ء) کا واقعہ ہے۔

عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ ایک بار پھر میدان میں: وسطی اور جنوبی افغانستان میں بغاوت پھیل گئی تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے نائب عبداللہ بن عامر نے فاتح کابل عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کو ایک بار پھر اس سرزمین کی طرف بھیجا۔ عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ طوفان کی طرح افغانستان میں داخل ہوئے، عہدِ عثمانی میں انہوں نے کسی غیر معمولی تگ ودو کے بغیر یہ علاقے زیرنگیں کر لئے تھے مگر اس بار انہیں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، مگر وہ مزاحمت کی ہر دیوار کو گراتے چلے گئے۔ انہوں نے کابل کا سختی سے محاصرہ کر لیا۔ دن گزرتے گئے، پہاڑوں اور سنگین فصیلوں کی پناہ میں یہ شہر کسی طرح فتح ہونے میں نہیں آتا تھا، محاصرہ کئی ماہ جاری رہا۔ اسی محاصرہ میں عمرو بن عبیداللہ، حسن بصری، عبدالصمد بن حبیب رحمہم اللہ جیسی نامور شخصیات بھی موجود تھیں۔ محاصرے کے دوران حسن بصری رحمہ اللہ کا درسِ حدیث بھی جاری رہا۔ عبدالصمد بن حبیب رحمہ اللہ نے اس محاصرے میں ان سے ''صلوٰۃ الخوف'' کی وہ حدیث سماعت کی جو ابوداؤد شریف کی کتاب الطہارۃ میں اس حوالے سے موجود ہے کہ یہ کابل کے محاذ پر سنائی گئی۔
کوئی چارہ نہ پا کر آخرکار عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے منجنیقوں کے استعمال کا فیصلہ کیا۔ منجنیقوں کے لئے بھاری بھرکم پتھر شہر کی دیواروں پر پھینکے جانے لگے، ایک جانب کی دیوار ضرب مسلسل نہ سہہ سکی اور اس میں شگاف پڑ گیا۔ رات کے وقت کابلیوں نے شگاف پُر کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا مگر مجاہدین نیزوں کے وار کر کے انہیں شگاف سے پیچھے دھکیلتے رہے۔ صبح ہوتے ہی کابلی باشندے جان

ہتھیلی پر رکھ کر باہر نکل آئے۔ گھمسان کا رن پڑا، کابل کی فصیلوں تلے ایک زوردار معرکے کے بعد لشکر اِسلام فتحیاب ہوا اور شہر پر بزور شمشیر قبضہ کرلیا گیا۔ اُفغانستان کی تاریخ میں کابل کو بزور قوت حاصل کرنے کے کارنامے گنے چُنے ہی ہیں، اس لحاظ سے یہ ایک تاریخی فتح تھی۔

یہ لڑائی اس لحاظ سے بھی یادگار تھی کہ اس میں مسلمانوں نے اس سرزمین میں پہلی بار منجنیقوں کو کامیابی سے استعمال کیا اور ان کے ذریعے شہر کی فصیل کے پرخچے اڑا دیئے۔

عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے یہاں سے فارغ ہوتے ہی جنوبی اُفغانستان کا رخ کیا اور قندھار اور زابل کو یکے بعد دیگرے تین خونریز لڑائیوں کے بعد فتح کرلیا۔ ان فتوحات کے بعد باغیوں کا زور بالکل ٹوٹ گیا۔

47ھ (667ء) میں غور کے لوگوں نے سرکشی کی مگر حکم بن عمرو غفاری نے ان پر قابو پالیا۔ 50ھ (670ء) میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ربیع بن زیاد کی قیادت میں 50 ہزار سپاہی شمالی اُفغانستان میں متعین کردیئے جس سے یہاں مستقل امن قائم ہوگیا۔ درمیان میں چند بار شورش پسندوں نے فتنہ انگیزی کی کوششیں کیں مگر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے باہمت اصحاب نے انہیں پنپنے نہ دیا اور یہاں عمومی طور پر خلافتِ راشدہ کے دور کی طرح امن وآشتی کا ماحول رہا۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں اُفغانستان کی فتوحات کی تکمیل ہوئی۔

<u>رتبیل کی بغاوت:</u> امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے چند برس بعد ایک بار پھر یہاں شورش پسندوں نے سر اٹھایا۔ یہ وہ دور تھا کہ عبدالملک بن مروان اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مابین معرکہ کارزار گرم تھا۔ ان باہمی اختلافات کی بنا پر مرکزی حکومت کمزور پڑ گئی تھی اور شورش پسند عناصر کو اُفغانستان سمیت متعدد صوبوں کے عوام میں غلط فہمیاں پھیلانے کا موقع مل رہا تھا، چنانچہ کابل، سیستان اور شمالی اُفغانستان کے کئی اُفغان سرداروں نے علم بغاوت بلند کردیا۔

ان دنوں خراسان کے والی امیہ بن عبداللہ تھے۔ ''رتبیل'' جو کابل اور سیستان (جنوبی اُفغانستان) کا مشہور قبائلی سردار تھا ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے قبل 47ھ (667ء) میں ربیع حارثی، 51ھ (671ء) میں عباد اور 62ھ (681ء) میں یزید اور ابوعبیدہ نامی عرب افسران یکے بعد دیگرے رتبیل کے خلاف معرکہ آراء ہوئے تھے مگر رتبیل کا زور کسی سے نہ ٹوٹ سکا تھا۔ اس بار امیہ بن عبداللہ نے اپنے بیٹے عبداللہ کو اس کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ یہ 74ھ (693ء) کا واقعہ ہے۔ رتبیل پہاڑی دڑوں اور چوٹیوں کا شناور تھا، اس نے عبداللہ کی راہ میں کوئی مزاحمت نہ کی، جب اِسلامی لشکر بلند پہاڑوں کی تنگ وتاریک گھاٹیوں میں گھس آیا تو رتبیل نے ناکہ بندی کرکے اسے محاصرے میں لے

لیا۔ عبداللہ کو اب اپنی غلطی کا احساس ہوا، اس نے مجبور ہو کر رتبیل سے اس وعدہ پر صلح کر لی کہ آیندہ اِسلامی لشکر اس علاقے میں قدم نہیں رکھے گا۔

78ھ (697ء) میں ایک اور مسلم جرنیل عبیداللہ بن ابی بکرہ رتبیل کا فتنہ فرو کرنے کے لئے جنوبی اَفغانستان پہنچے۔ انہوں نے رتبیل کے علاقے میں دور تک پیش قدمی کر کے سیستان کے خاصے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا اور رتبیل کے کئی قلعے پیوندِ زمین کر دیئے۔ ان کامیابیوں نے انہیں اتنا بے فکر کر دیا کہ وہ عقب کا خیال کئے بغیر آگے بڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ کابل کے گردونواح میں پہنچ گئے جو باغی اَفغان قبائل کا مضبوط ترین مرکز تھا۔ وہ کابل سے 56 میل کے فاصلے پر تھے کہ انہیں اطلاع ملی کہ رتبیل نے واپسی کے راستوں کی ناکہ بندی کر کے انہیں محاصرے میں لے لیا ہے۔

مجبور ہو کر عبداللہ بن ابی بکرہ نے رتبیل سے صلح کی بات شروع کی، رتبیل نے سات لاکھ درہم ادا کرنے کا مطالبہ کیا، جسے اِسلامی فوج نے قبول کر لیا مگر لشکرِ اِسلام کے ایک اور جرأت مند افسر شریح بن ھانی نے مصالحت سے انکار کر دیا اور کہا: ''اگر ہم نے یہ شرط قبول کر لی تو اس ملک میں اِسلام ہمیشہ کے لئے کمزور ہو جائے گا، موت کا ایک دن طے ہے، اس سے بچ کر تم کہاں بھاگ سکتے ہو؟'' مجاہدین کی ایک جماعت نے شریح بن ھانی کی آواز پر لبیک کہا اور رتبیل کے جنگجوؤں سے بھڑ گئے، معرکہ کارزار گرم ہوا جس میں اِسلامی فوج کے سپاہی بڑی تعداد میں شہید ہو گئے، باقی ماندہ افراد بڑی مشکل سے محاصرہ توڑ کر نکلنے میں کامیاب ہوئے۔

عبدالرحمن ابن اشعث اور حجاج بن یوسف: یہ دور شمال اور جنوب میں اِسلامی فتوحات کے پھیلاؤ کا تھا مگر اَفغانستان میں اِسلامی دائرۂ عمل داری آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اس صورت حال کو برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا، عراق کے گورنر حجاج بن یوسف نے اس پر شدید بے چینی ظاہر کی اور 80ھ (699ء) میں عبدالرحمن بن اشعث کو ایک عظیم لشکر کے ساتھ اَفغانستان روانہ کیا۔ اس لشکر میں بڑے بڑے نامور علماء کرام، قراء، محدثین اور فقہاء کرام بھی شامل تھے۔ عبدالرحمن بن اشعث ایک کہنہ مشق سپاہی تھے۔ انہوں نے سابقہ مہمات کی ناکامی کی وجوہ کو سامنے رکھتے ہوئے بڑی محتاط پیش قدمی کی، ہر منزل پر وہ واپسی کے راستوں اور عقب کی حفاظت کا سخت انتظام کر کے آگے بڑھتے۔ رتبیل کھلے میدان میں ان سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، وہ اب تک ناکہ بندی اور محاصرے کی چال چل کر کامیاب ہوتا آ رہا تھا مگر اس بار اس کی یہ چال بھی ناکام ہو گئی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رتبیل پسپا ہوتا چلا گیا۔

ایک طویل مدت تک یہ مہم جاری رہی اور جنوبی اَفغانستان کا بڑا حصہ فتح ہو گیا۔ ابھی یہ مہم مکمل نہیں ہوئی تھی

مگر چونکہ عبدالرحمن بن اشعث سابقہ مہمات کے پیشِ نظر تیز گامی کو نقصان دہ سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے فوج کو کچھ عرصہ آرام کا حکم دیا۔ افغانستان میں افواج کی پیش قدمی رکنے کی اطلاع نے حجاج بن یوسف کو غضبناک کر دیا اس نے عبدالرحمن بن اشعث کو آگے بڑھنے کے کئی احکام نامے مسلسل روانہ کئے مگر عبدالرحمن ابن اشعث نے ہر بار معذرت کی جس پر حجاج نے اسے قیادت سے سبکدوشی کا حکم نامہ بھیج دیا۔ عبدالرحمن بن اشعث نے اس حکم پر عملدرآمد سے انکار کر دیا اور رتبیل سے صلح کا معاہدہ کر کے حجاج کے خلاف شمشیر سونت لی۔ حجاج کے مظالم سے مسلمان پہلے ہی نالاں تھے، اس لئے ایک بہت بڑا طبقہ جن میں ابراہیم نخعی، امام شعبی اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ جیسے جبالِ عالم شامل تھے عبدالرحمن بن اشعث کے ساتھ ہو گیا۔

82ھ (701ء) میں عبدالرحمن ابن اشعث اور حجاج بن یوسف کی فوجوں کے مابین کئی معرکے ہوئے۔ افغانستان، ایران اور عراق کے مختلف شہروں میں یہ کشاکشی جاری رہی۔ باغی افغان سردار رتبیل بھی مسلمانوں کی اس خانہ جنگی کو ہوا دینے میں پوری طرح شریک تھا۔ اس نے کئی مواقع پر عبدالرحمن ابن اشعث کی مدد کی مگر انجام کار ابن اشعث کو تمام محاذوں پر شکست ہوئی اور اس نے رتبیل کے پاس پناہ لی۔ رتبیل نے کچھ عرصے پناہ کی لاج رکھی مگر بالآخر حجاج کے انتقام سے ڈر کر انہیں قتل کرا دیا۔

<u>قتیبہ بن مسلم کی فتوحات:</u> افغانستان میں جاری شورشوں اور بغاوت کو بڑی حد تک فرو کرنے کا سہرا نامور اُموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے سر ہے۔ اس دور میں اسلامی تاریخ کے نامور اولوالعزم کمانڈر قتیبہ بن مسلم باہلی کو افغانستان کا حاکم مقرر کیا گیا۔ انہوں نے افغانستان پہنچ کر اپنی تمام تر توجہ علاقائی امن و سلامتی اور شورشوں کو فرو کرنے پر مرکوز کر دی۔ انہوں نے موقع محل کی مناسبت سے کہیں نرمی و مذاکرات کا راستہ اپنایا اور کہیں قوت بازو سے کام لیا۔

89ھ (707ء) میں وہ بادغیس کے باغی حکمران نیزک کی سرکوبی کے لئے نکلے، نیزک شروع شروع میں ایک عرصے تک مسلمانوں کا معاون رہا تھا مگر ترکستان میں قتیبہ بن مسلم کی مسلسل فتوحات نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا اور وہ مسلمانوں کی قوت سے خطرہ محسوس کرنے لگا تھا لہٰذا اس نے بلخ، فاریاب، طالقان اور جوزجان سمیت شمالی افغانستان کے تمام شہروں کے سرداروں کو ملا کر بغاوت کا پرچم بلند کر دیا۔ علاوہ ازیں اس نے کابل کے حکمران کو بھی مسلمانوں کے خلاف اکسا کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ تخار کا قبائلی حاکم جبغو یہ بھی نیزک سے مرعوب و متاثر تھا، اس کے کہنے پر اس نے تخار میں بغاوت کر دی اور مقامی مسلمان حاکم کو وہاں سے بے دخل کر دیا، قتیبہ بن مسلم کو یہ خبر اس وقت ملی جب کہ ان کا لشکر تیار نہ تھا۔

بہر حال انہوں نے اپنے بھائی عبدالرحمن بن مسلم کو 12 ہزار سپاہی دے کر ''بروقان'' میں ٹھہرنے

اور موسم سرما گزرتے ہی تخار کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد انہوں نے خود نیشا پور سے بھاری کمک منگوا کر طالقان پر حملہ کر دیا اور یہاں کے باغیوں کو کسی رعایت کے بغیر تہہ تیغ کر دیا۔

نیزک کا تعاقب: موسم سرما گزرنے پر 91ھ (710ء) میں انہوں نے فاریاب، جوزجان اور بلخ کو یکے بعد دیگرے کسی خونریزی کے بغیر دوبارہ فتح کر لیا۔ نیزک اپنے جتھے کے ساتھ اسی علاقے میں مورچہ بندی کر رہا تھا۔ قتیبہ اپنے بھائی عبدالرحمن کے ساتھ اس کے تعاقب میں آگے بڑھتے گئے۔

نیزک ''خلم'' کی انتہائی دشوار گزار گھاٹی سے (جو مزار شریف سے 50 کلومیٹر مشرق میں ہے) سے گزر کر بغلان پہنچ گیا اور گھاٹی پر پہرہ بٹھا دیا۔ ''خلم'' گھاٹی کے منہ پر ایک قلعہ تھا جس کا محل وقوع ایسا تھا کہ یہاں چند آدمیوں کی مدد سے بڑی سے بڑی فوج کی پیش قدمی روکی جا سکتی تھی۔ قتیبہ کئی دن نشیب میں پڑاؤ ڈالے آگے بڑھنے کی تدبیریں سوچتے رہے، خوش قسمتی سے ایک مقامی آدمی مسلمانوں سے آملا، اس نے قتیبہ کو قلعے کے عقب تک پہنچنے کا ایک خفیہ راستہ بتا دیا۔ مسلمان اس راستے سے گزر کر قلعہ پر متعین باغیوں پر ٹوٹ پڑے اور راستہ صاف کر دیا۔ قتیبہ نے براہِ راست نیزک کے تعاقب میں بغلان کی طرف بڑھنے کی بجائے سمنگان کا رخ کیا اور وہاں سے نیزک کے پیچھے روانہ ہوئے۔ نیزک اس دوران بغلان سے فرار ہو کر وادیٔ فرغانہ پہنچ گیا تھا اور ''کرز'' نامی ایک ناقابل تسخیر گھاٹی میں روپوش تھا۔ تخار کا حاکم جبغویہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ قتیبہ نے ''کرز'' گھاٹی کا محاصرہ کر لیا، اس گھاٹی کو گھوڑے اور خچر بھی عبور نہیں کر سکتے تھے، اس لئے قتیبہ نے دو ماہ تک محاصرہ جاری رکھا۔ آخر کار محصورین بھوک، پیاس، سردی اور خارش کی بیماری سے تنگ آ گئے، قتیبہ نے انہیں بات چیت کے ذریعے باہر بلوایا، جبغویہ کی جاں بخشی کر دی گئی مگر نیزک نے دو سال سے اِسلامی لشکر کو تنگ کر رکھا تھا، اس کا جرم ناقابل معافی تھا لہٰذا اس کا سر قلم کر کے خلیفہ کے پاس دمشق بھجوا دیا گیا۔

عمر ثانی رحمہ اللہ کا سنہرا دور: اَفغانستان میں اشاعتِ اِسلام کا کامیاب ترین دور 99ھ (717ء) میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی خلافت کے آغاز کے ساتھ شروع ہوا، ان سے قبل ولید بن عبدالملک اور سلیمان بن عبدالملک کے دور میں اَفغانستان کے باغی سرداروں کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ دوسری طرف سندھ کے راجا کا تاج و تخت بھی خلافتِ اِسلامیہ کے سامنے مٹی میں مل چکا تھا اور افریقہ کے تاریک جنگلات میں بھی اِسلامی فوجیں برابر پیش قدمی کر رہی تھیں، شمال میں ان کا دھاوا یورپ پر بھی جاری تھا، سلیمان بن عبدالملک نے اپنے بھائی مسلمہ کو قسطنطنیہ فتح کر کے یورپ میں داخل ہونے کی مہم سونپ رکھی تھی اور یہ لشکر سخت ترین برف باری کے باوجود قسطنطنیہ کے سامنے خیمے گاڑے ہوئے تھا، مگر ان کامیابیوں اور کارناموں

کے باوجود اِسلامی ریاست کے لئے ایک نیا خطرہ سر ابھار رہا تھا اور وہ یہ تھا کہ سرحدوں کی وسعت کے مطابق رعایا کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت پر توجہ نہیں دی جا رہی تھی، گویا اس طرح بیرونی خطرات سے تو بے فکری تھی مگر اندرونی عدمِ استحکام کا خطرہ بڑھ رہا تھا اور یہ صورتحال حکومت میں شامل اعلیٰ عہدیداروں کے ایک گروہ کی بے جا سختی، اقرباپروری، بددیانتی اور آرام پسندی کے باعث پیدا ہو رہی تھی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے مسندِ خلافت سنبھالتے ہی ان خرابیوں کا تدارک کیا۔ اقرباء پروری کی جڑ اس طرح کاٹ ڈالی کہ ان کی زندگی اس کی روشن مثال بن گئی۔ عمّالِ حکومت کو ناجائز سختیوں سے روکا، ظلم و خیانت کے مرتکب عہدیداروں کو معزول کر دیا۔ عوام اور حکام کے مابین فاصلے ختم کر دیئے، عدل و انصاف کو عام کیا، مجرموں کو سزائیں دیں، حق داروں کو ان کا حق دلایا، غصب شدہ اموال اور جائیدادیں ان کے اصل مالکان کو واپس کیں، بیت المال میں جمع شدہ دولت کے انبار عوام کی فلاح و بہبود میں بے دریغ خرچ کر ڈالے۔ درحقیقت ان کا دورِ حکومت خلافتِ راشدہ کا ہو بہو نمونہ تھا۔ ان کے اصلاحی اقدامات کے باعث ملک میں عدمِ اطمینان کی فضا یکسر ختم ہو گئی اور اِسلامی ریاست داخلی استحکام کی راہ پر چل پڑی۔ اَفغانستان سمیت تمام صوبوں سے شورشوں کا نام و نشان تک مٹ گیا۔

عمرِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے نقشِ قدم پر: حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اَفغانستان جیسے حساس علاقوں میں بالکل وہی تدبیر اپنائی جسے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مدِنظر رکھا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز جانتے تھے کہ محبت، محبت کو جنم دیتی ہے، اس لئے انہوں نے عوام کو شریعت کی روشنی میں تمام حقوق دیئے، ان کی شخصی آزادی کی حفاظت کرنے اور ان کو اعتماد میں لینے پر مبنی حکمتِ عملی اپنائی۔ خصوصاً اَفغانستان کے باشندوں کی طبیعت و مزاج کا خیال رکھتے ہوئے انہوں نے یہاں پوری احتیاط اور فراست کے ساتھ اس حکمتِ عملی سے کام لیا اور اپنے گورنروں کو بھی اس کی تاکید کی۔ ان کے خطوط اور فرامین سے یہ بات بخوبی جھلکتی ہے۔ شورش زدہ علاقوں کے گورنر ایک عرصے تک مقامی عوام سے رواداری برتتے برتتے کبھی کبھار ان کی اصلاح سے مایوس ہو جاتے تو تنگ آ کر امیر المؤمنین سے سختی کی اجازت طلب کرتے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ ہر بار انہیں حسنِ اخلاق اور عدل و انصاف کی تاکید فرماتے اور انہیں سخت گیری کی قطعاً اجازت نہ دیتے۔ ایک بار والیٔ اَفغانستان جراح بن عبداللہ بن حکمی کا خط پہنچا جس میں لکھا تھا:

''اہلِ اَفغانستان کا رویہ بہت خراب ہے، انہیں تلوار اور کوڑے کے علاوہ کوئی چیز راہ راست پر نہیں لاسکتی، امیر المؤمنین مناسب سمجھیں تو مجھے اس کی اجازت دیں۔''

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ نے خط پڑھ کر یہ جواب لکھوایا: ''تمہارا یہ خیال کہ ان لوگوں کو کوڑے اور تلوار کے سوا کوئی چیز راہ راست پر نہیں لا سکتی سراسر غلط ہے۔ ان کو عدل و انصاف اور حق کی نگہداشت راہ راست پر لا سکتی ہے۔ بس حق کو جہاں تک ہو سکے عام کرو۔'' (تاریخ الخلفاء)

جراح بن عبداللہ نے اس حکم پر عملدرآمد کرتے ہوئے اپنے طرزِ عمل کو درست کر لیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے انہیں ذمیوں کو نرمی سے دعوت اِسلام دینے اور اِسلام قبول کرنے والوں کو شرعی قانون کے مطابق جزیہ معاف کر دینے کی بھی تاکید کی تھی، اس کا اثر یہ ہوا کہ خراسان میں ذمی جوق در جوق اِسلام قبول کرنے لگے، صرف جراح بن عبداللہ کے ہاتھ پر چار ہزار افراد نے اِسلام قبول کیا۔

اَفغانستان میں رفاہی کام اور علومِ اِسلامیہ کی بہار: اَفغانستان اس سے قبل نہایت پسماندہ چلا آ رہا تھا، آمد و رفت کے بنیادی ذرائع بھی کمیاب تھے، راستوں پر سرائے خانے نہ تھے، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ نے یہاں کے حاکم کو صوبے کی تمام سڑکوں اور راستوں پر جگہ جگہ سرائے خانے تعمیر کرنے کا حکم دیا، اس سے علاقے کے عوام اور مسافروں نے سکون کا سانس لیا۔ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ خود بہت بڑے محدث اور فقیہ تھے، علوم دینیہ کی حفاظت اور اشاعت پر انہوں نے خاص توجہ دی۔ انہوں نے مدینہ منورہ کے حاکم قاضی ابوبکر بن حزم سمیت تمام صوبوں کے والیوں کو لکھوا بھیجا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث چھان بین کر ذخیرہ کر لی جائیں، کہیں علماء کے اٹھ جانے سے یہ علم ضائع نہ ہو جائے۔

اس فرمان کے مطابق مدینہ منورہ، مکہ معظمہ، خراسان اور شام و مصر کے تمام محدثین سے احادیث ذخیرہ کر لی گئی، ان کے مجموعے ترتیب دیئے گئے اور ان کی نقول اِسلامی صوبوں میں پھیلا دی گئیں۔ ان کوششوں کی بدولت تمام اِسلامی صوبوں کی طرح اَفغانستان میں بھی اِسلامی علوم کا خوب چرچا ہوا، تہذیب و تمدن پر اِسلامی اثرات کی گہری چھاپ لگی اور ملتِ اَفغانستان نے صحیح معنوں میں اِسلام کو پہچانا۔ اہلِ اَفغانستان طبعی طور پر نہایت دلیر، عالی حوصلہ اور ذہین تھے، اِسلامی علوم نے ان کی ذہانت و فطانت پر صیقل کا کام کیا۔ اِسلامی تعلیمات نے انہیں اپنا گرویدہ بنا لیا اور وہ گروہ در گروہ علم کے خزانوں کی طرف لپکے۔

عرب سے روشن ہونے والی اِسلامی علوم کی مشعل نے اہلِ اَفغانستان کو اخلاق، معاشرت، تمدن، ثقافت اور علوم و فنون کے وہ رہنما اصول دیے جن سے وہ حقیقی معنوں میں مہذب اور متمدن بنے۔ انہوں نے اِسلامی علوم و حکمت کے انمول موتیوں کی دل سے قدردانی کی۔ جہاں کوئی عالمِ دین حلقۂ درس لگاتے وہاں طالبانِ علوم کے ٹھٹ لگ جاتے۔ بے شمار نوجوان علوم اِسلامیہ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے کوفہ، بصرہ، حجاز اور شام جیسے دور دراز علاقوں میں پھیل گئے اور اپنا دامن علم و فضل کے جواہر سے بھر کر

لوٹے۔ انہوں نے بھی اپنے اپنے مقام پر حلقۂ درس جاری کیے اور یوں یہ علاقے علماء سے آباد ہوگئے۔ علم کے خوگرانہی نومسلم اَفغانوں میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا خاندان بھی تھا جس نے کابل سے ہجرت کر کے نسا، ترمذ اور پھر عراق کو اپنا وطن بنایا۔ (الطبقات السنیہ فی تراجم الحنفیہ: 1/24)

ایک صدی کے اندر اندر اَفغانستان میں کوئی شہر اور کوئی بستی ایسی نہ تھی جہاں مساجد اور مدارس نہ ہوں۔ تمام مساجد نمازیوں سے پُر اور تمام مدارس طالب علموں سے بھرے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ بڑے مدارس میں طلبہ کی تعداد ڈیڑھ دو ہزار سے کم نہیں ہوتی تھی۔ شمالی اَفغانستان میں ضحاک بن مزاحم رحمہ اللہ تفسیر اور فقہ کی تعلیم دیتے تھے، ان کی درس گاہ کے طلبہ تین ہزار سے کم نہ تھے۔ اَفغانستان میں یہ دور علومِ عالیہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ اور اسماء رجال کی ترویج کا تھا، اس کے علاوہ ادب، شعر و منطق اور کلام کے ماہرین بھی یہاں اپنی محنتوں سے علم کی ترویج میں حصہ لے رہے تھے۔

شمالی اَفغانستان میں اِسلام: مشرقی اور وسطی اَفغانستان کی بنسبت شمالی اَفغانستان کے باشندوں نے قدرے تاخیر سے اِسلام قبول کیا۔ دوسری صدی ہجری کے اوائل میں یہاں کے بہت سے سردار اور ان کے قبائل اِسلامی حکومت کے باج گزار ہونے کے باوجود غیر مسلم تھے، ان کی طبیعت میں سرکشی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ قبولِ اِسلام کی سعادت کے حصول میں بلخ کے باشندوں نے پہل کی۔ ان کے کچھ عمائدین اِسلام کے دائرے میں داخل ہوئے، بلخ میں پہلی مسجد تعمیر ہوئی، اس کے بعد یہاں مساجد و مکاتب کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ جلد ہی بلخ نہ صرف علوم و فنون بلکہ سلوک و معرفت کا بھی ایک ممتاز مرکز بن گیا۔ عالمِ اِسلام کے بہت سے نامور علماء و مشائخ نے یہاں جنم لیا۔

ہشام بن عبدالملک کا دور: عمر بن عبدالعزیز کے جانشین خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے بھی اَفغانستان پر بھرپور توجہ دی۔ بغاوتوں کے خطرات کے سدباب کے لئے یہاں بڑی چھاؤنیاں تعمیر کی گئیں۔ اس دور میں صرف شمالی اَفغانستان میں تعینات سپاہیوں کی تعداد 54 ہزار سے کم نہ تھی۔ ان میں کوفہ کے 7 ہزار، بصرہ کے 9 ہزار، قبیلہ بکر کے 7 ہزار، عبدالقیس کے 4 ہزار، ازد کے 10 ہزار اور آزاد کردہ عجمی غلاموں میں سے 7 ہزار افراد تھے۔ اس طرح اَفغانستان پر حکومت کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ تعلیم اور دعوت و تبلیغ کا کام بھی بدستور جاری رہا۔

اَفغانستان کی سیاسی تقسیم: ان دنوں اُموی حکومت کی پالیسی کے مطابق اَفغانستان کو ولایت خراسان کے تحت تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ (اس میں موجودہ اَفغانستان کے علاوہ بھی کئی وسیع علاقے شامل تھے)

1. شمالی اَفغانستان ...... اس کا مرکز ''مرو'' (جو موجودہ ترکمانستان میں ''میری'' کے نام سے مشہور

ہے) کو قرار دیا گیا۔ (خلافتِ راشدہ کے دور میں شمالی اَفغانستان کا مرکز ''نیشاپور'' تھا) بلخ، ہرات، فاریاب، جوزجان اور تخار اس کے اہم شہر تھے۔

2. مغربی اَفغانستان......اس کا مرکز ''زرنج'' تھا۔ صوبہ سیستان کی سرحدوں تک کے علاقے اس میں شامل تھے۔

3. جنوب مشرقی اَفغانستان......اس میں بلوچستان سے دریائے سندھ کے ساحل تک تمام علاقہ شامل تھا، ایک عرصہ تک اس کا کوئی مرکز نہ تھا۔ بعد میں تمیم بن زید کے دور میں سندھ کے شہر منصورہ کو اس کا صدر مقام قرار دیا گیا۔

سلوک و احسان کی روشنی اَفغانستان میں: اَفغانستان کی سیاست، عوامی زندگی، معاشرت اور اخلاقی اقدار پر حکومتی اقدامات جس طرح اثر انداز ہو رہے تھے وہ اپنی جگہ، مگر یہاں ایک اور جماعت کا ذکر ضروری ہے جس کے اولوالعزم کارکن قریباً نصف صدی سے اس ملک کے پہاڑوں، وادیوں اور گھاٹیوں کا سینہ چیرتے ہوئے دور دراز کی بستیوں اور دیہاتوں تک میں کام کر رہے تھے۔ یہ وہ گم نام مبلّغین اور داعی تھے جنہیں عرف عام میں ''صوفیاء'' کہا جاتا ہے۔ جس جوش وجذبے سے مجاہدین محاذوں پر مسلح دشمنوں سے نبرد آزما رہے، اسی ولولے سے دعوت کے میدان میں گم نام مبلغین سرگرم رہے۔ ان کی زندگیاں نومسلموں کی تعلیم وتربیت، تزکیہ باطن اور اصلاحِ نفس کے لئے وقف ہو گئیں۔ ان مبلغین اور داعیوں نے اس قدر خاموشی سے کام کیا کہ تاریخ میں چند ایک کے سوا کسی کے حالات محفوظ نہیں مگر نصف صدی کے بعد اَفغانستان میں عشقِ خداوندی سے سرشار بلند مرتبہ مشائخ کی جابجا آراستہ محفلیں اس بات کی گواہی دے رہی تھیں کہ پچھلی نسلوں کے گم نام داعی معرفتِ الٰہیہ کا ذوق وشوق پیدا کرنے کے لئے یہاں کتنے بڑے پیمانے پر کام کر گئے تھے۔ اَفغانستان میں سلسلہ احسان وسلوک کی بنیاد رکھنے والی پہلی عظیم المرتبت ہستی خواجہ حسن بصری رحمہ اللہ تھے، وہ اپنے دور کے نہایت بلند مرتبہ محدث، مفسر، فقیہ اور داعی تھے، دعوت و ارشاد ان کا خاص میدان تھا، اصلاح باطن اور تزکیۂ نفس کو ایک مستقل کام سمجھ کر اس کے لئے مراکز قائم کرنا آپ کا تجدیدی کارنامہ تھا۔ آپ کے خلیفہ شیخ عبدالواحد بن زید رحمہ اللہ اور ان کے تابعین نے اس سلسلے کو مزید آگے بڑھایا۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اَفغانستان کی فتح میں حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ شریک رہے تھے اس لئے اس خطے پر ان کی خاص توجہ تھی۔ ان کے متوسلین کی محنت کے باعث اَفغانستان کی خاک سے ایسے جلیل القدر اولیاء تیار ہوئے جن پر اسلام کی تاریخ آج بھی فخر کرتی ہے۔

ذیل میں ہم بطور نمونہ اس دور کے چند ایک ممتاز بزرگوں کا مختصر سا تعارف پیش کرتے ہیں۔

ابراھیم بن ادھم رحمہ اللہ: ابراھیم بن ادھم رحمہ اللہ کا نام معرفت وسلوک کی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کا تعلق شمالی افغانستان کے مرکزی شہر بلخ سے تھا، بلخ کے حاکم نے انہیں اپنا منہ بولا بیٹا بنا رکھا تھا اس لئے اس کے بعد ابراھیم بن ادھم رحمہ اللہ نے بلخ کی حکومت سنبھالی مگر کچھ ہی عرصے بعد دنیا سے دل اُچاٹ ہو گیا اور حق تعالیٰ کی محبت نے دل کی کایا ایسی پلٹی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر درویشی کی زندگی اپنا لی۔ یہ وہ دور تھا کہ افغانستان میں اِسلام کی روشنی تیزی سے پھیل رہی تھی اور گم نام داعی اور صوفیائے کرام اس سلسلے میں غیر معمولی کردار ادا کر رہے تھے۔ بلخ سے نکلنے کے بعد آپ کی اکثر زندگی بے وطنی اور سیاحت میں گزری۔ مکہ معظّمہ، مدینہ منورہ، نیشاپور، کوفہ، بغداد اور دنیائے اِسلام کے دیگر روحانی و علمی مراکز میں گھوم پھر کر بزرگانِ دین سے فیض حاصل کیا۔

حضرت اویس قرنی، حضرت عمران بن موسیٰ، حضرت باقر، شیخ منصور سلمی اور حضرت فضیل بن عیاض رحمہم اللہ جیسے اکابرین صوفیاء کی نسبتیں حاصل کر کے آپ مرجعِ خلائق بن گئے تھے، لوگ جوق در جوق آپ کی مجالس میں آکر تزکیۂ نفس، اصلاحِ باطن اور تعلق مع اللہ کے اصول سیکھتے۔ آپ کی وفات 162ھ میں ہوئی۔

ابراھیم بن طھمان رحمہ اللہ: ہرات سے تعلق رکھنے والے یہ عظیم محدث تبع تابعین میں سے تھے، عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ جیسے جلیل القدر عالم ان کے شاگرد تھے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے بھی ان سے روایت لی ہے۔ اپنے دور میں یہ افغانستان کے سب سے بڑے محدث کی حیثیت سے مشہور تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ان کا اتنا احترام کرتے تھے کہ اگر ٹیک لگا کر بیٹھے ہوتے تو ان کا نام سنتے ہی سیدھے بیٹھ جاتے اور فرماتے: ''یہ مناسب نہیں کہ نیک لوگوں کا ذکر ہو اور میں ٹیک لگا کر بیٹھوں۔'' آپ کی وفات 163ھ میں ہوئی۔

حضرت شقیق بلخی رحمہ اللہ: حضرت شقیق بلخی رحمہ اللہ کا تعلق بلخ سے تھا، تاجر پیشہ تھے مگر بعد میں علوم دینیہ کی طرف راغب ہوئے اور ان میں زبردست ملکہ حاصل کیا۔ ایک عرصہ تک کوفہ میں حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی مجلس میں حاضر ہوتے رہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ کے سب سے ممتاز شاگرد قاضی امام ابو یوسف رحمہ اللہ ان کے ہم درس تھے۔ علومِ شریعت میں کمال حاصل کرنے کے بعد اصلاحِ باطن کی طرف متوجہ ہوئے اور زمانے کے نامور اولیاء کرام سے فیض حاصل کر کے سلوک و معرفت کے نہایت بلند پایہ مقام پر فائز ہوئے۔ جہاد کا زبردست جذبہ رکھتے تھے، بارہا معرکوں میں شریک ہوئے اور بالآخر 175ھ میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ افغانستان کے عوام کے دلوں کو فتح کرنے والے یہی صوفیاء کرام تھے جن کے

اخلاص، مجاہدے، سوزِ دل اور آہِ سحر گاہی نے پہاڑوں کی طرح سخت طبیعت رکھنے والی اس قوم کے دل موم کر دیئے اور کچھ ہی عرصے میں یہاں ہر طرف ایمان کی بادِ بہاری چلنے لگی اور روحانی فضا کی خوشبو سے سانس مہکنے لگے۔ افغانستان کے عوام و خواص میں آج بھی صوفیاء کرام سے محبت اور ان کی تعلیمات سے گہری وابستگی پائی جاتی ہے۔

<u>اُموی خلافت کا خاتمہ:</u> ہشام بن عبدالملک کے بعد اموی خلافت کو کوئی مدبر، باصلاحیت اور مضبوط کردار کا حکمران میسر نہیں آیا، چنانچہ دن بہ دن مرکز کی گرفت صوبوں پر کمزور پڑتی گئی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر عباسی تحریک نے زور پکڑ لیا۔ عباسیوں کی زیرِ زمین سرگرمیاں، ان کی خفیہ اور پھر اعلانیہ دعوت، امویوں کے بالمقابل خلافت کا دعویٰ، مسلح تیاری اور حکومت سے جھڑپیں...... یہ سب تفصیلات تاریخ کا ایک طویل حصہ ہیں جو ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ مختصر یہ کہ حکمرانی کے دعوے دار، ان دو گروہوں کی محاذ آرائی آخرکار اموی خلافت کے خاتمے اور عباسی خلافت کے قیام پر انجام پذیر ہوئی۔ خلافتِ عباسیہ کے دور میں اُفغانستان میں جو اہم واقعات، حوادث اور انقلاب وقوع پذیر ہوئے ان کا مختصر ذکر ہم آئندہ کریں گے۔

تیسرا باب

عباسی دور کا اَفغانستان

عباسی خلافت کے قیام میں ابو مسلم خراسانی نامی ایک عجمی سیاست دان نے سب سے بھرپور کردار ادا کیا تھا، اس نے عجم کو عربوں کی حکومت سے نجات اور حکومت میں ان کی شمولیت کا سبز باغ دکھا کر اُمویوں کے خلاف برانگیختہ کیا تھا۔ عجمی عوام جن میں اَفغانستان کے باشندے بھی شامل تھے، عمومی طور پر عباسی تحریک کے حامی تھے، انہیں عباسیوں سے غیر معمولی مراعات کی توقع تھی اور عباسی حکومت کے ابتدائی زمانے میں ان کی پذیرائی بھی ہوئی، خلیفہ منصور عباسی نے ان کی بڑی حد تک دلجوئی کی مگر جلد ہی باہمی اعتماد کی یہ فضا مکدر ہوگئی۔ خصوصاً جب منصور نے ابو مسلم خراسانی کے سازشی مزاج اور اس کی حد سے بڑھی ہوئی پُرکاری سے خوفزدہ ہو کر اسے قتل کیا تو اَفغانستان کے عوام میں ایک بار پھر بے چینی پھیلنے لگی، جلد ہی مختلف شہروں میں مسلح بغاوتیں شروع ہوگئیں اور پورے صوبہ خراسان میں بدامنی کا راج ہوگیا۔ ان بغاوتوں کی بنیاد ''لسانیت'' تھی، ابو مسلم کے قتل ہوتے ہی شر پسند عناصر نے اہلِ اَفغانستان کے سامنے عربی اور عجمی کا سوال ایک بار پھر پوری شدت سے اٹھایا اور یہ باور کرایا کہ خلیفہ منصور نے ابو مسلم خراسانی کو محض عجمی ہونے کی بناء پر قتل کیا ہے۔ اس اشتعال انگیز فضا میں اَفغانستان کے شمال مغربی شہر ہرات کا ایک مجوسی سندباد بغاوت کا علم لے کر کھڑا ہوگیا، ہرات اور ایران کے مجوسی قبائل کی بڑی تعداد لسانی عصبیت کے نام پر اس کے ساتھ ہوگئی۔ سندباد نے رفتہ رفتہ نفرت کی اس آگ کا رخ اِسلام کی جانب کر دیا اور اعلان کیا کہ ہم کعبۃ اللہ کو ڈھائیں گے اور مسلمان عورتوں کو باندیاں بنائیں گے۔

سندباد نے 137ھ (754ء) میں خراسان کے بڑے حصے پر تسلط حاصل کر لیا اور آگے پیش قدمی کی تیاریاں کرنے لگا، مگر منصور نے اسے زیادہ موقع نہ دیا، عباسی جرنیل جمہور بن مرار عجلی دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ اس کے مقابلے پر آیا ہمدان اور رے کے درمیان گھمسان کی لڑائی میں مجوسیوں کو شکست فاش ہوئی اور سندباد فرار ہوتے ہوئے مارا گیا۔ کچھ عرصہ بعد ہرات ہی کے گرد و نواح میں استاد

سیس نامی ایک فتنہ پرور شخص نے نبوت کا دعویٰ کر دیا اور جلد ہی ہزاروں افراد کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ ہرات، بادغیس اور جنوبی اَفغانستان کے بہت سے جاہل اس کے ساتھ ہو لئے اور انہوں نے اَفغانستان کے وسیع وعریض علاقے پر قبضہ کے بعد مرو کے حاکم اجشم کو بھی شکست فاش دے دی۔

منصور نے اس جھوٹے مدعی نبوت کی سرکوبی کے لئے اپنے بہترین جرنیل مقابلے پر بھیجے جنہوں نے سخت لڑائی کے بعد استاد سیس کو گرفتار کر کے منصور کے پاس بھیج دیا جہاں اسے قتل کر دیا گیا۔ اگلے ہی سال آذرویہ نامی ایک مجوسی سردار نے اَفغانستان کے کچھ عصبیت پسند قبائل کو جمع کر کے بغاوت کر دی اور یزید نامی عباسی حاکم کو میدانِ جنگ میں شکست دے ڈالی۔ بعدازاں زرنج کے حاکم معن بن زائدہ پر حملہ کر کے اس کا پیٹ چاک کر دیا۔ ان شورشوں پر عمومی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ابھارنے میں مقامی غیر مسلم پیش پیش تھے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اِسلام دشمن طاقتیں اَفغانستان میں شروع ہی سے غیر معمولی طور پر فعال رہی ہیں اور موقع پاتے ہی انہوں نے اپنے مقامی کارندوں کے ذریعے یہاں شورش وبدامنی برپا کرنے میں کبھی دیر نہیں لگائی۔

<u>خلیفہ ہارون الرشید کے کارنامے:</u> 170ھ (786ء) میں خلافتِ عباسیہ کے عظیم حکمران ہارون الرشید نے مسندِ حکومت سنبھالی اور بڑی حکمت، دانائی، جرأت اور گیر معمولی ہوش مندی سے بگڑتے ہوئے حالات کو سنبھالا، اَفغانستان میں شورشوں کو رفع کرنے پر اس نے خاص توجہ دی اور فضل بن یحییٰ برمکی جیسے مدبر اور حوصلہ مند شخص کو یہاں کا حاکم بنایا۔ فضل بن یحییٰ نے شورشوں پر قابو پا کر جلد ہی اَفغانستان میں امن وامان قائم کر دیا۔ اس دور میں بھی کابل اور گردونواح کے علاقے میں بُدھ مت سے تعلق رکھنے والے قبائل آباد تھے، ان کے حکمران باجگزار ہونے کے باوجود ''کابل شاہی'' کہلاتے تھے، ''کاپیسا'' ان کا پایۂ تخت تھا۔ پہاڑوں کے حصار میں ہونے کے باعث اس پر قبضہ کرنا بے حد مشکل تھا مگر ابراہیم بن جبل نامی ایک عرب امیر نے غور بند کے راستے سے کاپیسا پر کامیاب چڑھائی کی اور کابل شاہیوں کو وہاں سے بیدخل کر کے بگرام میں ان کا شہرہ آفاق بت کدہ جو ''شاہ بہار'' کے نام سے مشہور تھا، تباہ کر ڈالا۔ کابل شاہی اس کے بعد بگرام اور کاپیسا سے کابل شہر کے اس قدیم حصے میں منتقل ہو گئے جو دریائے لوگر کے کنارے آباد ہے۔

<u>اِنقلابی اقدام:</u> اَفغانستان میں حالات معمول پر لانا خلیفہ ہارون الرشید کا ایک بڑا کارنامہ تھا مگر اس سے بھی بڑھ کر ایک ایسا کارنامہ اس کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوا جو نہ صرف اَفغانستان بلکہ سارے عالم اِسلام پر اثر انداز ہوا۔ اس علم دوست خلیفہ نے تمام صوبوں میں فقہ حنفی کو قانونی طور پر نافذ کر دیا اور اس

طرح عالمِ اسلام کو ایک ہی رنگ میں رنگ دیا۔ یہ ایک انقلابی قدم تھا جس سے پورے اسلامی دنیا پر خوشگوار اثرات مرتب ہوئے اور ہر طرف چین واطمینان کی فضا قائم ہوگئی، ہارون الرشید کے دور کو عباسی خلافت کا دورِ زریں کہا جاتا ہے۔

ہارون الرشید سے قبل خلافتِ عباسیہ کے ابتدائی دور میں فقہ کے مدوّنِ اول امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ قرآن وحدیث، آثارِ صحابہ نیز اجماع وقیاس کی روشنی میں اسلامی احکام کی تدوین کا تاریخی کارنامہ انجام دے چکے تھے، مگر خلافتِ عباسیہ کے بانیوں نے اسے سرکاری سطح پر نافذ نہیں کیا تھا۔ تاہم خلیفہ منصور کے جانشین مہدی نے اپنے دور میں امام اعظم رحمہ اللہ کے جلیل القدر شاگرد امام ابو یوسف رحمہ اللہ کو بغداد کے مشرقی حصے کا قاضی بنادیا تھا۔ اس کے بعد خلیفہ ہادی نے انہیں پورے بغداد کا قاضی مقرر کردیا تھا۔ خلیفہ ہارون الرشید نے اس سلسلے کو مزید آگے بڑھایا اور قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کو پورے عالمِ اسلام کا قاضی القضاۃ مقرر کرکے فقہ حنفی کو قانونی طور پر لاگو کردیا جس کے مثبت اثرات جلد ظاہر ہوئے۔

اَفغانستان میں فقہ کی ترویج: اَفغانستان میں فقہ حنفی کی داغ بیل اس سے پہلے پڑ چکی تھی، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے تلامذہ مکی بن ابراہیم اور شقیق بلخی جیسے بزرگوں کا یہاں وسیع حلقۂ اثر تھا، قانونی طور پر فقہ حنفی کے نفاذ کے بعد اہلِ اَفغانستان پر یہ رنگ مزید پختہ ہوگیا۔ چنانچہ اس دور سے لے کر آج تک عمومی طور پر اَفغانستان کے مسلمان قریباً سو فیصد حنفی ہی چلے آرہے ہیں۔

اَفغانستان میں پہلی خودمختار حکومت: ہارون الرشید کے بعد اس کے دو بیٹوں مامون الرشید اور امین الرشید میں اقتدار کی جنگ تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔ اس کشمکش میں مامون الرشید کو کامیابی حاصل ہوئی اور امین الرشید مامون کے معتمد جرنیل طاہر بن حسین کے ہاتھوں مارا گیا۔ مامون کی خلافت کے دور میں طاہر بن حسین عباسی دربار کا اہم ستون شمار ہوتا تھا مگر اسے یہ خطرہ بدستور لاحق رہتا تھا کہ کہیں مامون کا مزاج برہم ہوجائے اور وہ اسے امین الرشید کے قاتل ہونے کا الزام دے کر قتل کرادے۔ اس خطرے کے پیشِ نظر اس نے مامون سے بڑے محتاط انداز میں خراسان کی حکومت کی درخواست کی۔ مامون پہلے ہی خراسان کی انتظامیہ سے مطمئن نہ تھا چنانچہ اس نے درخواست قبول کرلی اور اسے خراسان سے لے کر سندھ تک کے علاقے کا والی بنادیا۔ چونکہ طاہر بن حسین مامون الرشید کے اقتدار کی راہ ہموار کرنے میں پیش پیش رہا تھا اس لئے مامون کو اس پر بے حد اعتماد تھا، چنانچہ خراسان وسندھ کا گورنر بناتے ہوئے مامون نے اسے غیر معمولی اختیارات دے دیئے۔ یہ گویا اَفغانستان کی ضمنی خودمختاری کا آغاز تھا۔

دو سال بعد طاہر بن حسین نے اَفغانستان پر اپنی گرفت اتنی مضبوط کرلی کہ اسے نمازِ جمعہ کے خطبے سے

خلیفہ کا نام خارج کرنے سے بھی کوئی جھجک محسوس نہ ہوئی۔ طاہر بن حسین اس کے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہ رہا مگر اس کی اولاد نے اَفغانستان پر اپنا تسلط برقرار رکھا، اَفغانستان کی یہ پہلی خودمختار مسلم سلطنت دولت طاہریہ کے نام سے مشہور ہوئی اور قریباً نصف صدی تک قائم رہی۔ اس نے اَفغانستان کی فلاح بہبود میں نمایاں کردار ادا کیا۔ زراعت اور صنعت وحرفت کو ترقی دی، علمی کاموں کی حوصلہ افزائی کی۔ اس دور میں خراسان اور ملحقہ علاقوں میں علمِ حدیث کی محنت اپنے عروج پر تھی۔ عظیم محدث امام ابوداؤد السجستانی کا تعلق اسی دور سے ہے۔

امام ابوداؤد السجستانی رحمہ اللہ: جنوبی اَفغانستان کے علاقے سیستان سے تعلق رکھنے والے عالمِ اِسلام کے یہ عظیم محدث 202ھ میں پیدا ہوئے۔ سیستان کو سجستان بھی کہا جاتا ہے، اسی لئے وہ سجستانی کی نسبت سے مشہور ہوئے، انہوں نے سنن ابی داؤد کے نام سے احادیث کا وہ بلند پایہ مجموعہ ترتیب دیا جسے حدیث کے مستندترین ذخیروں میں ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ سنن ابوداؤد میں 14,800 احادیث جمع کی گئی ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ جیسے جلیل القدر فقیہ اور محدث سنن ابوداؤد کو بے حد پسند فرمایا کرتے تھے۔ وہ امام ابوداؤد کے استاد بھی تھے مگر خود انہوں نے بلکہ ان کے بعض اساتذہ نے بھی امام ابوداؤد رحمہ اللہ سے استفادہ کیا ہے اور ان سے روایت لی ہے۔

امام ابوداؤد رحمہ اللہ قوتِ حافظہ، تقویٰ، عبادت، ریاضت، مجاہدے اور علمی ولولے میں اپنی مثال آپ تھے۔ علمِ حدیث کے میدان میں انکے فن کا لوہا ساری دنیا نے مانا ہے، کہا جاتا تھا: ''ابوداؤد کیلئے علمِ حدیث اس طرح نرم کردیا گیا ہے جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کیلئے لوہا۔'' امام ابوداؤد رحمہ اللہ 275ھ (888ء) میں فوت ہوئے۔

بارہ سو سال پہلے کی اِسلامی تحریک: تیسری صدی ہجری کے وسط میں اَفغانستان اور اس کے گرد ونواح پر پھیلی ہوئی خودمختار دولت طاہریہ جو درحقیقت عباسی خلفاء کے زیرِ سرپرستی تھی، زوال کا شکار ہوگئی۔ کئی وسیع وعریض علاقے اس کے قابو سے باہر نکل گئے اور نتیجتاً اَفغانستان کے طول وعرض میں طوائف الملوکی کا دوردورہ ہوگیا۔ دنیاپرست امراء اور خودغرض سرداروں نے اپنے اپنے علاقوں پر آزاد حکومتیں قائم کرلیں اور عوام کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے لگے۔ اِسلامی احکام کا اجراء طاقِ نسیاں میں ڈال دیا گیا اور شعائرِ اِسلامیہ کی ناقدری ہونے لگی۔ ان حالات میں جنوبی اَفغانستان سے صفاری تحریک کا آغاز ہوا جو اپنے مقاصد، طریقِ کار اور کارناموں کے لحاظ سے ماضی قریب میں اَفغانستان پر حکومت کرنے والی طالبان تحریک سے بے حد مشابہہ تھی۔

بدامنی اور طوائف الملوکی کے اس زمانے میں جبکہ ہر گروہ اور ہر قبیلہ ایک دوسرے کے خلاف تلواریں تیز کر رہا تھا، ایک نئی جماعت خود بخود بنتی جا رہی تھی، یہ وہ لوگ تھے جو اس سے قبل اِسلام اور کفر کے معرکوں میں رضاکارانہ طور پر سرگرمی سے حصہ لیتے رہے تھے۔ جہادی مہمات، سپاہیانہ ورزشیں اور آلاتِ حرب کے کرتب ان کی روح کی تسکین کا سامان تھے۔ پہلے اُموی اور عباسی خاندانوں میں اقتدار کی کشمکش اور پھر مقامی امراء میں کرسی کی کھینچا تانی اور رنت نئے سیاسی انقلابات نے انہیں بددل کر دیا تھا، چنانچہ وہ کسی خاص حکومت، امیر یا گروہ سے منسوب ہونے کی بجائے الگ تھلگ ہو گئے اور اس طرح ان کا علیحدہ تشخص وجود میں آیا۔ ان میں علاقے اور زبان کی کوئی تحدید نہیں تھی، ہر نسل کے لوگ اس میں شامل تھے۔ اَفغانستان کے علاوہ ماوراء النہر، ایران اور ایشیائے کوچک میں بھی اسی اندازِ فکر کے باعث سپاہیانہ وقلندرانہ مزاج کا حامل ایک مستقل طبقہ وجود میں آ گیا۔ اس طبقے کے لوگوں کو کابل میں ''کاکا'' قندھار میں ''جوان'' عرب ممالک میں ''فتیٰ''، ماوراء النہر میں ''غازی'' اور ایشیائے کوچک میں ''اخی'' کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ عرب مورخین عام طور پر انہیں متطوعہ (رضاکار) کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ تزکیہ باطن اور اصلاحِ نفس کی فکر، اعمالِ صالحہ کی پابندی، کثرتِ ذکر، سادہ زندگی، عیش وعشرت سے کنارہ کشی، حکمرانوں اور امراء کے درباروں سے لاتعلقی، گھڑسواری، پہلوانی اور دیگر فنونِ حرب کی مسلسل مشق وریاضت ان کے نمایاں اوصاف تھے۔ ان کا لباس درویشانہ وسپاہیانہ علامات کا امتزاج ہوا کرتا تھا جس کے باعث وہ دور سے پہچانے جاتے تھے۔ اس جماعت کے بچے کھچے افراد انیسویں صدی عیسوی کے اواخر تک اَفغانستان میں پائے جاتے تھے، کاکا عبدالشکور، صوفی عبدالغنی، مرزا عبدالعزیز لنگر زمین اور کاکا نقرہ اس جماعت کی آخری یادگار تھے، اس کے بعد یہ لوگ عنقا ہو گئے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے جہادِ روس کی بدولت انہی صفات کی ایک تازہ دم نسل تیار کر دی جو طالبان کی شکل میں آج بھی سرگرم ہے۔

<u>یعقوب بن لیث الصفاری</u>: تیسری صدی ہجری کے وسط میں متطوعہ کی یہ جماعت جنوبی اَفغانستان میں صالح بن نصر کنانی نامی ایک مجاہد کے زیرِ قیادت سرگرم تھی۔ ان دنوں وہاں خارجیوں نے غیر معمولی قوت حاصل کر لی تھی اور عقائد باطلہ کی برملا تشہیر کے ساتھ ساتھ وہ سیاسی طور پر غلبے کے لئے مسلح ہو چکے تھے۔ ان کی زیادتیوں نے عوام کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ صالح بن نصر ''متطوعہ'' جوانوں کو ساتھ لے کر اسی گمراہ فرقے سے نبرد آزما تھا۔

انہی دنوں صوبہ نیم روز کے شہر ''زرنج'' میں یعقوب بن لیث صفاری نامی ایک غریب اور گم نام

نوجوان تلاشِ روزگار کے سلسلے میں آیا۔ یہاں معمولی دھندے کے ذریعے وہ روزانہ آدھا درہم کمانے لگا، اس دوران اسے رضا کاروں اور خارجیوں کے درمیان معرکوں کا علم ہوا۔ دینی حمیّت نے اسے چین سے نہ بیٹھنے دیا اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صالح بن نصر کی خدمت میں جا پہنچا۔ صالح بن نصر کی ماتحتی میں اس نے خارجیوں کے خلاف زبردست کارنامے انجام دیے۔ یعقوب کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے صالح بن نصر نے اسے پہلے ''بست'' کا ناظم اور پھر اپنا جانشین بنا دیا۔ صالح بن نصر کے بعد یعقوب بن لیث نے ان پُرجوش کارکنوں کی قیادت سنبھالی جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا زبردست ولولہ رکھتے تھے۔ یہ 253ھ (867ء) کی بات ہے۔ یعقوب نے اپنے رضا کاروں کو مزید منظم کیا اور اس گروہ کو ایک تحریک بنا دیا جو تاریخ میں ''صفاری تحریک'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

یعقوب بن لیث الصفاری کا نسلی تعلق ان عرب مجاہدین سے تھا جو پہلی اور دوسری صدی ہجری میں جنوبی اَفغانستان آئے تھے اور یہیں بس گئے تھے۔ چار پشتیں گزر جانے کی وجہ سے ان کے خاندان مقامی زبان اختیار کر چکے تھے مگر عربوں کی وہ خصوصیات ان میں ہنوز موجود تھیں جس نے اِسلام کو مشرق سے مغرب تک پھیلا دیا تھا۔

یعقوب بن لیث کی زندگی قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی حمیتِ دینی، بادہ نشینانِ عرب کی جفاکشی اور سرفروشانِ اِسلام کی بلند نگاہی کا مرقع تھی، اس کی غذا انتہائی سادہ تھی اور لباس درویشانہ...... وہ زمین پر بیٹھنے اور سونے کا عادی تھا، شعائرِ اِسلامیہ کے استحکام اور حدود اللہ کے نفاذ کا زبردست جذبہ رکھتا تھا، مہمات کے دوران اس کے کہے ہوئے اشعار اس کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ کہتا تھا:

خراسان احویها واعمال فارس وما انا من الملك العراق بآیس

انما امور الدین ضاعت واهملت ورثت فصارت کالرسوم الدوارس

ترجمہ: ''خراسان اور فارس میرے قبضے میں آچکے ہیں اور میں عراق پر قبضہ کرنے سے بھی مایوس نہیں ہوں۔ بلاشبہ دینی شعائر اس طرح ضائع اور معطل کر دیے گئے ہیں کہ اب وہ بوسیدہ نشانیاں معلوم ہوتے ہیں۔'' (مروج الذہب للمسعودی: 125/2)

دور اندیش قائد اور مؤمنانہ صفات: یعقوب بن لیث تاریخ کے ان نامور افراد میں سے ایک ہے جنہیں شجاعت و حمیّت اور زہد و ایثار کے ساتھ ساتھ غیر معمولی ذہانت و فراست تدبر اور حزم و احتیاط جیسی مؤمنانہ صفات وافر مقدار میں عطا ہوئیں۔ مردم شناسی میں وہ اپنے دور کا امام تھا۔ اس کا کہنا تھا:

''جس شخص کو میں چالیس دن کی ہم نشینی کے باوجود نہ پہچان سکوں، کوئی دوسرا اسے چالیس سال

میں بھی نہیں پہچان سکتا۔"

وہ ایک مجاہد اور سپاہی ہونے کے علاوہ رموز سیاست کا بھی ماہر تھا۔ دوراندیشی اور منصوبہ سازی میں اپنی مثال آپ تھا۔ یاد رہے کہ ماضی قریب اور حال کے بعض تاریخ نگاروں نے یعقوب بن لیث کو ایک لٹیرے کے طور پر مشہور کیا ہے جو تاریخی حقائق کے بالکل خلاف اور اسلامی تاریخ کو داغدار کرنے کے مترادف ہے۔

کابل کی فتح کا جامع منصوبہ: یعقوب بن لیث نے رضا کاروں کی قیادت سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے مقامی شر پسندوں سے جہاد کا آغاز کیا۔ جنوبی افغانستان میں خارجیوں سے زبردست معرکوں کے بعد اس نے ان کی طاقت توڑ کر رکھ دی اور ان کے سردار عمار کو قتل کرا کے اس کی لاش زرنج کے پھاٹک پر لٹکا دی۔ یہ صفاری تحریک کی پہلی بڑی کامیابی تھی۔ صفاری تحریک کے دوراندیش قائد کو بخوبی علم تھا کہ جب تک پامیر کی چوٹیوں سے ہلمند کے صحراؤں تک تمام علاقے ایک مضبوط حکومت کے زیر انتظام نہیں آجاتے اس خطے میں امن وامان کا قیام ناممکن ہے، مگر اس مقصد کی راہ میں کابل کی بدھ مت بادشاہت سب سے بڑی رکاوٹ تھی جو شمالی اور مشرقی افغانستان میں اپنے حامی قبائل کے ذریعے بار بار فتنوں کی آگ بھڑکاتے رہتے تھے۔

کابل کے بادشاہ حکمرانوں کا خاندان "کابل شاہی" کہلاتا تھا اور ہر حکمران "رتبیل" کے لقب سے پہچانا جاتا تھا۔ افغانستان میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ابتدائی فوج کشی سے لے کر تیسری صدی ہجری تک کابل کا شاہی خانوادہ اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے تھا۔ اگرچہ فاتح افغانستان حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے پہلی صدی ہجری میں زبردست معرکہ آرائی کے بعد کابل کو فتح کر لیا تھا مگر پہاڑوں میں گھرے اس مورچہ بند شہر کی فطری سنگینی، یہاں کے باشندوں کی جنگجوئی اور حریت پسندی دیکھتے ہوئے یہی بہتر سمجھا گیا کہ کابل شاہیوں سے صلح اطاعت کا پیمان لینے کے بعد انہیں مقامی حکومت پر برقرار رکھا جائے۔ دوسری صدی ہجری تک یہی صورتحال برقرار رہی، اس دوران کابل حکومت نے بیسیوں بار بغاوت کی اور بار بار ملک میں شورش کے شعلے بھڑکانے میں ملوث رہی مگر اس کے فتنے کا تدارک کسی سے نہ ہوسکا۔

177ھ (793ء) میں خلیفہ ہارون رشید کا جنگجو کمانڈر ابراہیم بن جبل غوربند کے راستے سے کابل پر حملہ کر کے بگرام پر جہاں "کابل شاہی خاندان" آباد تھا بزور شمشیر قبضہ کر لینے میں کامیاب ہوگیا تھا مگر مرکزی شہر پر وہ بھی تسلط حاصل نہ کرسکا تھا۔ اس وقت سے کابل شاہیوں نے بگرام کو چھوڑ کر کابل کی قدیم آبادی میں اپنا مرکز بنالیا تھا۔ ہارون رشید، مامون اور معتصم باللہ جیسے آہنی حکمرانوں کا دور گزرتے ہی انہوں نے دوبارہ سرکشی شروع کر دی، شمالی افغانستان میں شورش کو شہ دینے والے بھی یہی لوگ تھے۔

یعقوب بن لیث نے کابل کو فتح کرنے کیلئے جامع منصوبہ بندی شروع کی چونکہ وہ خود افغانی تھا۔ اس لئے ملک کے نشیب وفراز سے خوب واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کابل پر مضبوط ہاتھ ڈالنے کیلئے سہ سمتی حملہ ضروری ہے اور اس کیلئے جنوبی، مشرقی اور مغربی صوبوں کو فتح کرنا ناگزیر ہے، جہاں تک شمالی اضلاع کا تعلق ہے وہاں کامیاب پیش قدمی کابل کی فتح پر موقوف ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ بارہ سو سال بعد قندھار سے اٹھنے والی ''طالبان تحریک'' نے بھی حملے کیلئے ہو بہو یہی خطوط اختیار کئے اور یعقوب بن لیث کی طرح تقریباً پورے افغانستان پر کامیابی سے فتوحات کے پرچم نصب کئے۔

ہرات اور فارس کی فتح: یعقوب بن لیث نے جنوبی افغانستان پر قبضے اور اسے شور شرابے سے پاک کرنے کے بعد مغربی افغانستان کا رخ کیا۔ چھوٹے چھوٹے شہروں کو مطیع بناتے اور وہاں شرعی احکام نافذ کرتے ہوئے وہ ہرات کی طرف بڑھا جہاں دولت طاہریہ کا حاکم محمد بن ادریس حکومت کر رہا تھا۔ یعقوب نے ایک شدید لڑائی کے بعد ہرات اور گردونواح کے تمام علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ یہ 254ھ کا واقعہ ہے۔ ایک نئی ابھرتی ہوئی قوت کے ہاتھوں ہرات جیسے بڑے شہر کی فتح ایک غیر معمولی خبر تھی جو آناً فاناً پورے عالم اسلام میں پھیل گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ دنیا کو صفاری تحریک کی قوت کا اندازہ ہوا۔ اگلے سال 255ھ میں یعقوب صفاری نے مغرب کی طرف مزید پیش قدمی کی تاکہ کابل کی طرف بڑھتے ہوئے اپنی پشت پر فارس کے خنجر کی ضرب سے محفوظ رہا جاسکے۔ مغرب میں کرمان کی فتح یعقوب بن لیث کیلئے ایک بڑا چیلنج تھی جو افغانستان اور فارس کے درمیان اہم قلعہ بند شہر تھا۔ یہ اگرچہ کاغذی کارروائی میں دولت طاہریہ کے نام تھا، مگر طاہری حکمرانوں کی گرفت یہاں برائے نام تھی، عملی طور پر یہاں کسی کی حکومت نہ تھی۔ اہل فارس کی زد سے بچنے کیلئے اس شہر پر قبضہ ضروری تھا۔ فارس کا حکمران بھی صورتحال دیکھ رہا تھا۔ یعقوب بن لیث کے کرمان کی طرف بڑھنے کی خبر سن کر اس نے ایک زبردست لشکر کرمان پر قبضے کیلئے بھیج دیا۔

یعقوب ابھی کرمان سے دو دن کی مسافت پر تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ فارس کی فوج کرمان پر قابض ہوگئی ہے۔ یعقوب نے وہیں پڑاؤ ڈال دیا اور کئی ہفتوں تک کوئی حرکت نہ کی، کرمان پر قبضہ کرنے والی فوج کا سردار طوق بن مسلم یعقوب کی خاموشی کو اس کی بزدلی پر محمول کرتا رہا، دو ماہ گزرتے ہی طوق کا جاسوس خبر لایا کہ یعقوب اپنی فوج سمیت جنوبی افغانستان واپس روانہ ہوگیا ہے۔ طوق نے اطمینان کا سانس لیا۔ دوسرے دن جاسوس نے بتایا کہ یعقوب مسلسل واپسی کی راہ پر ہے اور دو منازل دور جاچکا ہے۔ طوق کو اپنی فتح کا یقین ہوگیا اور اس نے ''جشن فتح'' منانے کا اعلان کردیا۔ ہتھیار سمیٹ لئے گئے

اور شراب و کباب کا دور چلنے لگا۔ یعقوب کو اس موقع کا انتظار تھا۔ دو منازل دور جا کر وہ بجلی کی طرح پلٹا اور دو دن کا فاصلہ ایک دن میں طے کر کے کرمان کی فصیل کے سامنے آن پہنچا۔ ناؤ ونوش میں مشغول فوجی کوئی مزاحمت نہ کر سکے اور کرمان پر یعقوب کا قبضہ ہو گیا۔ اس موقع پر یعقوب نے حریف سردار کو اس کی شرب نوشی پر شرم دلائی اور اپنے موزے سے خشک روٹی کے ٹکڑے نکال کر دکھاتے ہوئے کہا:

''اے طوق! میں دو ماہ سے مسلسل یہی موزے پہنے ہوئے ہوں اور اسی موزے میں رکھی ہوئی یہ خشک روٹی میری غذا ہے اور تمہارا یہ حال ہے کہ محفل شراب آراستہ کیے بیٹھے ہو؟''

کابل کی بت پرست بادشاہت کا خاتمہ: اُدھر کابل کا بادشاہ، یعقوب بن لیث کے عزائم سے بے خبر نہ تھا، اس نے دفاع کی بجائے اقدام کا فیصلہ کیا اور ایک زبردست لشکر لے کر جنوبی افغانستان کی طرف پیش قدمی کی۔ راستے میں اسے کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی اور وہ قندھار تک پہنچ گیا۔ یعقوب بن لیث کی قوت کابل شاہ سے بہت کم تھی مگر اس کا مؤمنانہ جذبہ کام آیا اور ''مطوعہ'' (رضا کار جماعت) کے پُرجوش نوجوانوں کو لے کر وہ شاہ کابل کے لشکر سے بھڑ گیا۔ ایک زوردار معرکہ کے بعد بُت پرست فوج کو شکست ہوئی اور کابل کا بادشاہ رتبیل مارا گیا۔ یہ فتح کابل شاہی حکومت کے خاتمے میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

کابل میں نئے بادشاہ کا تقرر عمل میں آیا اور نئے ''رتبیل'' نے کچھ عرصہ بعد اپنے ایک حامی سردار کو حملے کے لئے بھیجا۔ یہ حملہ بھی ناکام ہوا، یعقوب بن لیث نے حملہ آور لشکر کو شکستِ فاش دے کر مار بھگایا۔ ان ناکامیوں کے بعد کابل حکومت یعقوب بن لیث سے خائف ہوگئی اور اس نے اقدام کی بجائے دفاع کی پالیسی اختیار کرنا مناسب سمجھا۔

شیراز پر قبضہ: اس عرصے میں یعقوب بن لیث کو اپنی حکومت مزید وسیع اور مضبوط کرنے کا موقع مل گیا جو کہ کابل پر فیصلہ کن حملے کے لئے ناگزیر عمل تھا۔ اس نے شیراز کی طرف پیش قدمی کی تیاری کی جو فارس کا مرکزی مقام تھا۔ شیراز کے حاکم علی بن حسین کو پہلے ہی یعقوب کے حملے کا خطرہ تھا۔ اس نے اپنی فوج کو ایک کوہستانی درّے میں لا کھڑا کیا۔ اس درّے کے ایک طرف ایک ناقابل عبور پہاڑ تھا اور دوسری سمت ایک تند و تیز نہر بہہ رہی تھی۔ درّے کا دہانہ اتنا تنگ تھا کہ ایک وقت میں صرف ایک شخص گزر سکتا تھا۔ نہر کو عبور کرنا بھی کسی فوج کے لیے بہت مشکل تھا۔ علی بن حسین نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ''یعقوب کی فوج نہر عبور کر کے ہماری طرف نہیں بڑھ سکے گی اور اسے مایوس ہو کر لوٹنا پڑے گا۔''

یعقوب نے نہر سے ایک میل دور پڑاؤ ڈالا اور صرف ایک محافظ کے ساتھ نہر کے کنارے پر پہنچ کر دشمن کی مورچہ بندی کا بچشم خود معاینہ کرنے لگا۔ علی بن حسین اپنے کچھ ساتھیوں سمیت درّے کے

دہانے پر موجود تھا۔ وہ وہیں سے اسے گالیاں دینے لگا۔ یعقوب نے کوئی جواب نہ دیا اور کچھ سوچتا ہوا خاموشی سے لوٹ گیا۔

اگلے دن ظہر کے وقت اس نے سواریوں کو ہر قسم کے بوجھ سے خالی کرنے کا حکم دیا۔ سپاہیوں کو کہا کہ صرف نیزے لے کر گھوڑوں پر سوار ہو جائیں۔ پھر وہ ایک کتے کو لے کر نہر کی طرف چلا اور اسے پانی میں پھینک دیا۔ کتا تیرتے ہوئے نہر کے دوسرے کنارے پر پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ حسین بن علی اور اس کے سپاہی یہ مضحکہ خیز منظر دیکھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ ادھر یعقوب نے کتے کو پیرتا دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ نہر کو کس جگہ سے پار کیا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنے گھوڑے کو کتے کے پیچھے پانی میں ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے سپاہی بھی پیچھے پیچھے پانی میں اتر گئے۔ حسین بن علی اور اس کے سپاہیوں نے یہ غیر متوقع منظر دیکھا تو ان کے چھکے چھوٹ گئے۔ یعقوب کی فوج تھوڑی ہی دیر میں نہر کے پار آ گئی اور حسین بن علی کے سپاہیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ تنگ درّے کی وجہ سے انہیں پسپائی کا موقع بھی نہ مل سکا۔ حسین بن علی نے بھاگنے کی کوشش کی مگر اس ہنگامے میں اس کا گھوڑا بدک گیا اور نیچے گرتے ہی وہ گرفتار ہو گیا۔ یعقوب نے شیراز پر قبضہ کر لیا اور خلافتِ عباسیہ سے پورے فارس کی حکمرانی کا پروانہ حاصل کر لیا۔ شیراز پر اس کے قبضے کا یہ قصہ ابن اثیر الجزری نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔

کابل کی تاریخی فتح: آخر کار 257ھ (871ء) میں یعقوب نے کابل کا رخ کیا، کابل شاہ نے اپنے بیٹے کی قیادت میں اس کا راستہ روکنے کے لئے ایک فوج بھیجی۔ زابل کے میدانوں میں ایک ہولناک جنگ ہوئی جس میں کابلی شہزادہ گرفتار ہو گیا اور اس کی فوج شکست کھا کر منتشر ہو گئی۔ اب صفاری تحریک کے مجاہدین ایک ریلے کی طرح کابل کی طرف بڑھے۔ شاہ کابل خود میدان میں آیا مگر کابل کی فتح یعقوب بن لیث کے نام مقدر ہو چکی تھی۔ بدھ مت کے پیروکار کابل شاہی خاندان کا آخری ''رتبیل'' بری طرح ہزیمت اٹھا کر فرار ہونے پر مجبور ہوا۔ کچھ عرصہ وہ گردیز کے علاقے میں مقیم رہا پھر اسے غیر محفوظ سمجھتے ہوئے دریائے سندھ کے پار ''اٹک'' منتقل ہو گیا اور وہیں گمنامی کی موت مر گیا۔ اس کے ساتھ ہی صدیوں قدیم اس بادشاہت کا جو اسلامی فاتحین کے لئے ایک طویل عرصہ تک دردِ سر بنی رہی، خاتمہ ہو گیا۔

اِسلامی لشکر نے کابل میں داخل ہو کر بت خانے مسمار کر دیئے اور بت پرستوں کے صدیوں سے جمع شدہ خزانے مالِ غنیمت میں حاصل کئے۔ اس مالِ غنیمت میں سے بیش قیمت تحائف اور نوادر دربارِ خلافت میں بھیجے گئے۔ عباسی خلیفہ نے یعقوب بن لیث کو پورے افغانستان کا پروانہ فرمانروائی جاری کر دیا۔

شمالی اَفغانستان پر قبضہ، دولتِ طاہریہ کا خاتمہ: کابل کی فتح کے بعد یعقوب بن لیث کے لئے شمالی

افغانستان کی راہ بالکل صاف ہو چکی تھی، اس نے دشمنوں کو کوئی مہلت دیئے بغیر بامیان کا رخ کیا اور اسے فتح کرتے ہوئے بلخ جا پہنچا، بلخ اور گرد و نواح کے علاقوں پر قبضے کے بعد اس نے آسانی سے تخار پر بھی قبضہ کر لیا اور یوں صفاری تحریک نے اسلامی تاریخ میں پہلی بار پورے افغانستان کو ایک حکومت کے پرچم تلے یکجا کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اگرچہ یعقوب بن لیث کی بڑھتی ہوئی طاقت خلافتِ عباسیہ کے لئے بھی باعثِ تشویش تھی مگر یعقوب نے دربار خلافت سے اپنے تعلقات حتی الامکان خوشگوار رکھے اور سوائے ایک دو مواقع کے اس نے کبھی دربار خلافت کو کسی شکایت کا موقع نہ دیا۔ 258ھ (872ء) میں اس نے نیشاپور پر قبضہ کر کے زوال پذیر دولتِ طاہریہ کا خاتمہ کر دیا، یہ اس کی آخری بڑی کامیابی تھی۔

ترقیاتی کارنامے: آخرکار 266ھ (880ء) میں اس عظیم اِسلامی سپوت نے وفات پائی۔ اس کا دور افغانستان کی تاریخ کا روشن ترین دور تھا، شعائرِ اِسلامیہ ہر طرف زندہ ہو چکے تھے، اس نے بُت پرستی، شِرک، جاہلانہ رسوم اور باطل نظریات کا خاتمہ کر دیا۔ اِسلامی تعلیمات کو عام کیا، مساجد، مدارس، مکاتب اور کُتب خانے قائم کئے، زراعت میں ترقی کے لئے آب پاشی کے نظام کو ترقی دی، خشک علاقوں میں جا بجا تالاب بنوائے اور کنویں کھدوائے، بندِ ہر برود اور بند دریائے ہلمند کی تعمیر اس کے یادگار کارنامے ہیں۔ اس کے فرمان پر کئی علاقوں میں نہریں نکالی گئیں۔ مغربی اور جنوبی افغانستان کے خطرناک ریگستانوں میں سفر انتہائی مشکل تھا۔ یعقوب نے ان صحراؤں میں جگہ جگہ بلند مینار تعمیر کرائے جن سے مسافر رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ صحرا کی آندھیاں بستیوں اور دیہاتوں کو سخت نقصان پہنچاتی تھیں۔ اس کے حکم پر ایسے مقامات پر لکڑی کی مضبوط اور بلند فصیلیں تیار کرائی گئیں جو آندھیوں کا زور روک سکتی تھیں۔

یعقوب نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک مزدور اور معمولی پیشہ ور کی حیثیت سے کیا تھا، اس لئے وہ غریب طبقے کی مشکلات سے خوب آگاہ تھا۔ اس نے پیشہ وروں اور مزدوروں کی ترقی کے لئے انقلابی کام کئے، کئی نئے پیشے جاری کئے اور بے روزگاروں کو روزگار فراہم کیا۔ دریائے ہلمند میں کشتی رانی کا آغاز اسی کے حکم سے ہوا تھا۔ اس کے ہاں علماء کرام اور ماہرینِ فن کا بڑا اعزاز ہوتا تھا۔ تاریخ، ادب، ریاضی اور فلکیات میں اس کے دور میں غیر معمولی کام ہوا۔

علامہ مسعودی اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''افواج کی قیادت کے ساتھ ساتھ یعقوب کا سیاسی تدبّر اس پائے کا تھا کہ عجم کے گزشتہ حکمرانوں میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ لوگ اس کے احکام کے مطیع اور اس کی اطاعت کے پابند تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس کا جود و کرم عام تھا، اس نے لوگوں کو بھلائی سے مالا مال کر دیا تھا۔ اس

کا رعب ان کے دلوں پر چھایا ہوا تھا۔" (مروج الذہب: 2/125)

صفاریوں کے دیگر حکمران، عمرو بن لیث: یعقوب بن لیث کے بعد اس کے بھائی عمرو بن لیث نے اَفغانستان کی مسند اقتدار سنبھال کر دولت صفاریہ کی شان و شوکت کو برقرار رکھنے اور صفاری تحریک کے مقاصد کی تکمیل کی جدو جہد جاری رکھی۔ پانچ چھ برس تک اس نے بڑے آن بان سے حکومت کی، مگر اس دوران عباسی خلافت نے جو صفاری تحریک کی قوت سے خائف تھی، دولت صفاریہ کے خلاف اقدامات شروع کر دیے۔ 271ھ (884ء) میں عباسی خلیفہ معتمد نے عمرو بن لیث کو عطا کردہ خراسان کا پروانہ سرپرستی منسوخ کر دیا جس کے بعد دونوں حکومتوں میں ٹھن گئی اور کشیدگی بڑھتی چلی گئی۔

سامانی امراء کا عروج: ان دنوں ماوراء النہر میں ایک اور قوت پرورش پا رہی تھی۔ یہ سامانی خاندان کے امراء تھے جن کا آبائی وطن بلخ تھا اور مامون الرشید کے زمانے سے ان کے آباؤ اجداد ماوراء النہر کے مختلف شہروں کے حاکم چلے آ رہے تھے۔ خلافت بغداد نے صفاری تحریک کی قوت توڑنے کیلئے انہیں استعمال کیا جس کے باعث دولت صفاریہ روز بروز کمزور پڑنے لگی۔ حکمران بغداد کی شہ پر 285ھ (898ء) میں سامانی خاندان کے امیر اسمٰعیل سامانی نے دریائے آمو عبور کر کے اَفغانستان پر حملہ کر دیا' عمرو بن لیث نے بلخ پہنچ کر اس کا مقابلہ کیا مگر شکست کھائی اور بدقسمتی سے گرفتار ہو گیا۔ امیر اسمٰعیل سامانی نے اسے پابہ زنجیر بغداد بھیج دیا جہاں ایک عرصے تک قید خانے میں رکھنے کے بعد اسے قتل کر دیا گیا۔

طاہر صفاری اور دیگر صفاری حکمران: عمرو بن لیث کا پوتا طاہر صفاری اس کے جانشین کے حیثیت سے سامنے آیا مگر وہ ناتجربہ کار اور کم ہمت تھا' زوال پذیر حکومت اور خالی ہوتے ہوئے خزانے کو سہارا دینے کے لئے اس نے عوام پر ٹیکس لگانا شروع کر دیئے جن سے عوام بلبلا اٹھے' عوام کے احتجاج اور بغاوت نے آخر کار طاہر صفاری کو اَفغانستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور لیث بن علی بن لیث نے اس کی مسند سنبھالی، اس کے بعد اس کا بھائی معدل بن علی بن لیث اس خاندان کا آخری حکمران ثابت ہوا۔ صفاری خانوادے کے یہ آخری چند ورثاء سامانی حکمرانوں کے حملوں اور عباسی خلیفہ کی سیاسی گرفت سے نہ بچ سکے اور ایک ایک کر کے تیزی سے اپنے انجام کو پہنچے۔ اس طرح 298ھ میں صفاری حکومت کا دور اختتام پذیر ہوا۔

سامانی حکومت کا قیام: امیر اسمٰعیل سامانی حکومت کا بانی تھا۔ وہ عباسی خلافت سے پروانہ حکومت لے کر 298ھ (910ء) میں اَفغانستان پر قابض ہو گیا، یہ اَفغانستان میں دولت سامانیہ کا آغاز تھا۔ ویسے دولت سامانیہ کی اصل بنیاد اس سے بہت پہلے 261ھ (874ء) میں ماوراء النہر میں رکھی گئی

تھی۔ افغانستان پر تسلط کے بعد اس حکومت نے ایران کے کئی صوبوں پر بھی قبضہ کرلیا۔ تقریباً سوا صدی تک یہ حکومت قائم رہی مگر تاریخ افغانستان میں اس کا کوئی غیر معمولی کردار نہیں ہے۔ امیر اسمٰعیل سامانی کے بعد نصر بن اسمٰعیل، نوح بن نصر اور عبد الملک اس خاندان کے مشہور فرمانروا گزرے ہیں۔

افغانستان کا دورِ زوال: 349ھ (960ء) میں عبد الملک کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں میں اقتدار کی رسہ کشی ہونے لگی جس کے نتیجے میں افغانستان سے لے کر ماوراء النہر کی آخری حدود تک تمام علاقہ طوائف الملوکی کی لپیٹ میں آ گیا۔ اسی دوران موقع سے فائدہ اٹھا کر چینی ترکستان کے ''ایلک خانی'' خاندان نے بھی اس خطے پر تسلط کے لئے ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔

نازک حالات: چوتھی صدی ہجری کے وسط کا یہ دور نہ صرف افغانستان بلکہ سارے عالم اِسلام کے لئے انتہائی نازک تھا، افغانستان اور ترکستان جو اِسلامی دنیا کا مشرقی حصار کہلاتے تھے کسی مستحکم حکومت سے محروم تھے۔

عالم اِسلام کی اس سرحد کے پار چین کی وسیع وعریض سلطنت تھی جہاں مرکز میں سونگ خاندان کی قدیم بادشاہت تھی اور گردونواح میں یوغور، تاتاری، تاجویت اور درجنوں جنگجو قبائل بستے تھے، اس خطے میں منگولیا کے نیم جنگلی لوگ بھی آباد تھے جن کی خوں خواری سے ہر قوم لرزہ براندام رہتی تھی۔ مشہور سیاح ابن حوقل کے بقول ''چین کی سرحد عالم اِسلام کی سب سے خطرناک سرحد تھی''۔ اس کی حفاظت کے لئے مشرق میں ایک مستقل اور مضبوط اِسلامی حکومت کا وجود ہمیشہ ناگزیر رہا ہے مگر دولت صفاریہ کے خاتمے اور دولت سامانیہ کے زوال کے بعد یہاں کسی پائیدار حکومت کا قیام خواب وخیال بن کر رہ گیا تھا۔ ادھر صفاریہ کے ہاتھوں جلا وطن ہونے والے کابل کے بت پرست، بدھ مت، اور برہمن دریائے سندھ کے پار وہند (اٹک) میں مسلمانوں کے ہاتھوں بت خانوں کی پامالی پر پیچ پا تھے اور ہندوستان کے بہت سے راجے مہاراجے افغانستان کے مسلمانوں سے اپنے جھوٹے معبودوں کی توہین کا انتقام لینے کے لئے پر تول رہے تھے۔

عراق میں قرامطیوں اور مصر میں فاطمیوں کا فتنہ: جس طرح جسم کی قوت مدافعت کمزور پڑ جائے تو امراض اس میں ڈیرہ ڈال لیتے ہیں، اسی طرح عالم اِسلام میں سیاسی ابتری اور طوائف الملوکی سے باطل نظریات کے جراثیم کو پنپنے کا خوب موقع مل رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں قرامطہ نامی ایک شیطانی تحریک طوفانی رفتار سے پروان چڑھ چکی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے عالم اِسلام کے قلب وجگر کو چھید ڈالا تھا۔ قرامطی تحریک کا بانی قرمطہ نامی ایک عجمی شخص تھا۔ ابلیسی ذہنیت رکھنے والا یہ عجمی دجال بخوبی جانتا تھا کہ کھلم کھلا اِسلامی عقائد کا انکار کر کے وہ کبھی مسلمانوں میں اپنی دعوت کو فروغ نہیں دے

سکتا' چنانچہ وہ کلام اللہ اور احادیث کی فلسفیانہ تاویلات کر کے لوگوں کو راہ راست سے بھٹکانے لگا۔

اس نے اپنی دعوت کی ابتداء کوفہ سے کی' اہل بیت کی محبت کا دعویٰ کر کے اس نے ہزاروں افراد کو اپنے جال میں پھانس لیا، اس تحریک کا آغاز دولت صفاریہ کے ایام زوال میں ہوا تھا اور دولت سامانیہ کے دور میں یہ فتنہ عروج پر تھا۔ عراق میں ان کا زور اتنا بڑھ چکا تھا کہ حجاج کا کوئی قافلہ ان کے ظلم سے محفوظ نہ تھا' یہ تحریک عالم اِسلام کے مشرق کی طرف پھیلتے ہوئے سندھ اور ملتان تک اپنے پنجے گاڑ چکی تھی اور دنیا رحمتِ عالم ﷺ کے پیامِ رحمت کے نام پر شر و فساد کے سیاہ کارنامے دیکھ کر انگشت بدنداں تھی۔ ادھر مصر میں باطنی اسمٰعیلی فرقے کے داعیوں نے فاطمی خلافت کے نام سے ایک متوازی خلافت قائم کر کے عالم اِسلام کے اتحاد کو پارہ پارہ کر ڈالا تھا۔ اگرچہ مصر میں اہلسنّت والجماعت کی اکثریت تھی مگر حکومتی مظالم کے باعث وہ اہلسنّت کے شعائر کا اظہار تک نہیں کر سکتے تھے۔

مآخذ و مراجع

- ...... الکامل فی التاریخ ج 3، ابن اثیر الجزری رحمہ اللہ
- ...... تاریخ الاسلام، حافظ ذہبی رحمہ اللہ
- ...... مروج الذہب ج 2، المسعودی رحمہ اللہ
- ...... تاریخ اِسلام، شاہ معین الدین ندوی مرحوم
- ...... Encyclopedia of Islam.V.1

چوتھا باب

غزنوی حکمران

چوتھی صدی ہجری کے وسط میں ایک اَفغانستان کیا پوری اِسلامی دنیا زوال و انحطاط کی تاریکیوں کا شکار تھی اور ہر کفریہ طاقت مسلمانوں سے آمادہ پیکار تھی۔ طاغوتی قوتیں چاہتی تھیں کہ آگے بڑھ کر دینِ احمد ﷺ کا چراغ گل کر دیں کہ یکا یک خداوند قدوس کی رحمت مسلمانوں کی طرف متوجہ ہوئی اور اَفغانستان سے وہ رجل رشید ظاہر ہوا جس کی شمشیر بے نیام نے بحیرہ ارال سے لے کر بحر ہند کے ساحل تک اِسلام کی راہ میں حائل ہر رکاوٹ کے پرخچے اڑا دیئے۔ یہ مردِ مجاہد سلطان محمود غزنوی رحمہ اللہ تھے جنہوں نے اس زمانے میں ایک بار پھر قرونِ اولیٰ کے مجاہدین کی یاد تازہ کر دی اور جن کی ہیبت کے باعث عالم کفر کو عالم اِسلام کے بارے میں اپنے برے ارادے ترک کرنے پڑے۔

سلطان محمود غزنوی رحمہ اللہ اَفغانستان کے ان عظیم فرمانرواؤں میں سے ہیں جن کے بغیر اَفغانستان ہی کی نہیں، دنیا کی تاریخ بھی نامکمل محسوس ہوتی ہے۔ ان کی داستانِ حیات بڑی دلچسپ اور ولولہ انگیز ہے، مگر اس کے آغاز کے لئے ہمیں ایک بار پھر اَفغانستان کی سامانی بادشاہت کی طرف لوٹنا ہوگا۔

<u>دولتِ غزنویہ کا بانی، سبکتگین:</u> سامانی خانوادے کے دورِ زوال میں الپ تگین نامی ایک بااثر امیر نے غزنی میں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی تھی۔ یہ 351ھ (962ء) کی بات ہے۔ الپ تگین نے 15 سال یہاں بڑے دھڑلے سے حکومت کی، اس کے افسران میں سبکتگین نامی ایک نوجوان بے حد قابل تھا۔ یہ نوجوان دراصل ایک غلام تھا جسے الپ تگین نے ترکستان کے ایک تاجر سے خرید کر اپنے خواص میں شامل کر لیا تھا۔

رفتہ رفتہ سبکتگین نے اپنی قابلیت، وفاداری اور شجاعت کی بنا پر الپ تگین کے ہاں اتنا مقام حاصل کر لیا کہ الپ تگین نے اسے اپنا داماد بنا لیا۔ الپ تگین کی وفات کے بعد سبکتگین اس کی جگہ غزنی کا حاکم بن گیا۔ سبکتگین جذبہ جہاد سے سرشار ایک عالی ہمت، غیرت مند مسلمان تھا۔ ہندوستان کے راجاؤں کے

خطرناک تیور اور بُرے ارادے اس سے پوشیدہ نہ تھے، علاوہ ازیں وہ شمال مشرق میں چین کی طرف سے ممکنہ خطرات سے بھی بے خبر نہ تھا۔ اس نے اقتدار سنبھالتے ہی ایک مضبوط اِسلامی حکومت کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ سب سے پہلے اس نے جنوبی اَفغانستان کا رخ کیا اور اسے فتح کرتے ہوئے بلوچستان جا پہنچا۔ اس نے خضدار تک کا علاقہ طوفانی رفتار سے زیرنگین کر لیا اور واپس غزنی پہنچ کر سرزمین ہند میں اِسلام کی مشعلیں جلانے کے لئے منصوبہ بندی کرنے لگا۔

<u>ہندوستان پر پہلا حملہ:</u> سلطان سبکتگین کا لقب ناصر الدین تھا یعنی ''دین کا مددگار'' اور واقعی اس نے خود کو اس لقب کا حق دار ثابت کیا۔ ہندوستان میں اِسلامی فتوحات کے ایک تاریخی سلسلے کی بنیاد اس کے ہاتھوں پڑی۔

ان دنوں ہندوستان کے شمالی علاقوں پر راجہ جے پال کی حکومت تھی۔ لاہور، کشمیر اور ملتان کے علاوہ ''لمغان'' کا علاقہ بھی اس کے قبضے میں تھا۔ یاد رہے کہ پشاور سے آگے پاک اَفغان سرحدی اضلاع اس دور میں ''لمغان'' کے نام سے مشہور تھے۔ گویا اَفغانستان کی سرحدوں پر ہندو راجہ کا مکمل تسلط تھا اور وہ کسی بھی وقت اَفغانستان پر فوج کشی کر سکتا تھا۔ سبکتگین نے اَفغانستان کے سرحدی کوہساروں پر راجہ جے پال کے تسلط کو ٹھکراتے ہوئے 367ھ (977ء) میں راجہ جے پال کے زیر تسلط علاقے پر حملہ کیا، چند سرحدی قلعے فتح کر کے مفتوحہ علاقے میں کئی مساجد تعمیر کرائیں اور واپسی اختیار کی۔ اس مہم سے اس مردِ مجاہد نے سرزمین ہند میں جہاد کے ایک طویل سلسلے کا آغاز کر دیا تھا۔ سلطان سبکتگین کی یہ مومنانہ جرأت دیکھ کر راجہ جے پال کی نیند حرام ہو گئی۔ اس نے اردگرد کے راجاؤں سے امدادی فوجیں طلب کیں اور ایک بڑا لشکر لے کر غزنی کی طرف بڑھا۔

<u>جے پال سے مقابلہ:</u> امیر ناصر الدین سبکتگین نے دشمن کی آمد کی خبر پا کر غزنی سے کوچ کیا اور پشاور کے قریب لمغان کے میدانوں میں جے پال کا سامنا کیا۔ راجہ جے پال کی قیادت میں سپاہیوں کا ایک سیلاب اُمڈا چلا آ رہا تھا۔ جنگی ہاتھیوں کا ایک خوفناک ریلا بھی اس کی فوج میں شامل تھا، مگر سبکتگین نے بڑی بے جگری سے اس کئی گنا طاقتور دشمن کا مقابلہ کیا۔ شہزادہ محمود غزنوی نے کم عمری کے باوجود اس جنگ میں بھرپور حصہ لیا اور اپنی زیر قیادت فوج کے ساتھ ہندوؤں کے دانت کھٹے کر دیے۔ اس دوران اللہ کی غیبی مدد طوفانِ بادوباراں کی شکل میں نمودار ہوئی اور سردی اتنی بڑھ گئی کہ میدانی علاقوں کی آب و ہوا کے عادی ہندو سپاہی ہمت ہار گئے۔ ان کے لشکر کے بیشتر گھوڑے اور بار برداری کے جانور شدید برف باری سے ہلاک ہو گئے۔ جے پال نے یہ منظر دیکھ کر مکمل شکست سے بچنے کے لئے مذاکرات کی راہ اختیار کی اور مندرجہ ذیل شرائط پر صلح نامہ مرتب ہو گیا:

1. فوری جنگ بندی ہوگی اور مسلمان افواج واپس لوٹ جائیں گی۔
2. راجہ جے پال کی سلطنت میں سلطان سبکتگین کے احکام نافذ ہوں گے۔
3. ہندو سلطنت مسلمانوں کو باقاعدگی سے خراج کی رقم ادا کرتی رہے گی۔
4. پچاس ہاتھیوں کی ایک فوج اور ایک لاکھ درہم کی خطیر رقم سبکتگین کے حوالے کی جائے گی۔

محمود غزنوی نے اپنی خداداد بصیرت کی بنا پر اس صلح نامے کی مخالفت کی اور جنگ جاری رکھتے ہوئے ہندوؤں کو مکمل شکست دینے پر اصرار کیا مگر سبکتگین نے اپنی فطری رحم دلی سے مجبور ہوکر صلح نامے پر دستخط کر دیئے۔اس نے امراء کی ایک جماعت راجے پال کے ہاں رقم اور مطلوبہ ساز وسامان کی وصولی کے لئے چھوڑ دی اور خود غزنی کی راہ لی۔

جے پال کی بدعہدی اور لمغان کی دوسری جنگ: راجہ جے پال نے مصیبت ٹلتے ہی آنکھیں پھیر لیں اور غزنوی سلطنت کے ان امراء کو جو معاہدے میں طے شدہ رقم اور سامان وصول کرنے اس کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے گرفتار کرلیا۔سبکتگین کو اس بدعہدی کی اطلاع ہوئی تو اسے ہندوؤں کی بدطینتی پر بے حد غصہ آیا۔اس نے جے پال کو اس بدعہدی کی سزا دینے کے لئے چند ماہ بعد ایک بار پھر لمغان کا رخ کیا۔

جے پال کو یقین تھا کہ سبکتگین دوبارہ حملہ آور ہوگا اس لئے وہ پہلے ہی زبردست تیاریوں میں مصروف تھا۔اجمیر، قنوج، دہلی اور کالنجر کے راجاؤں نے بھی ہندو دیومالائی ازم کی حفاظت کے نام پر اپنے اپنے لشکر جے پال کی امداد کے لئے بھیج دیئے تھے۔لمغان کے وادیوں میں ایک بار پھر دونوں حریف آمنے سامنے ہوئے۔سبکتگین نے ایک پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ کر دشمن کی فوج کا نظارہ کیا۔ جے پال کا لشکر اردگرد کی تمام وادیوں میں پھیلا ہوا تھا۔اس لشکر میں صرف گھڑسوار سپاہیوں کی تعداد ایک لاکھ تھی۔ پیادوں کا (جو عموماً گھڑسوار دستوں سے زیادہ ہوتے ہیں) کوئی شمار ہی نہ تھا۔

معرکے کے آغاز سے قبل سبکتگین نے اپنی افواج کے سامنے تقریر کی۔ جہادی آیات اور احادیث پڑھ کر ان کے لہو کو گرمایا اور پھر انہیں اپنی حکمت عملی سے آگاہ کرتے ہوئے طبل جنگ پر چوٹ لگانے کا حکم دیا۔

امیر ناصر الدین سبکتگین نے دشمن کی کئی گنا تعداد کے مقابلے میں قریب قریب وہی حکمت عملی اختیار کی جو غزوہ موتہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ہرقل کے ٹڈی دل لشکر کے خلاف اپنائی تھی۔اس نے اپنی فوج کو پانچ پانچ سو سپاہیوں کے دستوں میں تقسیم کر دیا اور میدان جنگ میں ایسی جگہ صف بندی کی جہاں ایک وقت میں دشمن کے کم سے کم سپاہی مقابل آسکیں۔اس حکمت عملی کے مطابق مسلمانوں کے پانچ پانچ سو سپاہی یکے بعد دیگرے دشمن کے مقابل آتے رہے، جب ایک دستہ تھک جاتا تو فوراً دوسرا دستہ

اس کی جگہ لے لیتا۔اس طرح مسلمان کم سے کم نقصان اُٹھا کر بے تکان لڑتے رہے جبکہ ہندوؤں کی ہر صف بے شمار لاشوں اور زخمیوں کو اُٹھا کر فرار ہوتی رہی۔ جوں ہی سلطان سبکتگین نے یہ اندازہ کیا کہ دشمن کا حوصلہ پست ہو چکا ہے، عمومی حملے کا عَلم بلند کر دیا گیا، مسلمان مجتمع ہو کر یک بارگی دشمن پر حملہ آور ہوئے اور ہندو سر پر پاؤں رکھ کر اٹک کی طرف بھاگے، غزنوی لشکر نے دریائے سندھ تک ان کا تعاقب کیا اور بڑی تعداد میں فرار ہوتے ہوئے دشمنوں کا کام تمام کر دیا۔اس فتح کے بعد پشاور میں مسلمانوں کا ایک مضبوط مرکز قائم ہو گیا۔امیر ناصر الدین سبکتگین نے دو ہزار چنیدہ سپاہی پشاور کی حفاظت کے لئے چھوڑے اور خود غزنی کا رخ کیا۔کچھ عرصہ اس نے دریائے آمو کے پار مہمات انجام دیں اور بقیہ زندگی امن وامان سے رعایا کی فلاح و بہبود اور دیکھ بھال میں صرف کی۔

سبکتگین کی وفات: امیر ناصر الدین سبکتگین نے بیس سال تک اِسلام کا پرچم بلند کرنے کی تگ ودو کے بعد شعبان 387ھ (اگست 997ء) میں وفات پائی۔اپنی 56 سالہ زندگی میں امیر نے غلامی سے لے کر بادشاہت کا محیر العقول سفر طے کیا۔اس کی داستانِ حیات کا آغاز غریب الوطنی، کسمپرسی اور غلامی سے ہوا۔ وفاداری، خدمتگاری اور فرض شناسی کے اوصاف اس کے لئے ترقی کا زینہ بنے اور تختِ شاہی پر پہنچ کر اس نے حکومت، سیاست، عدالت، عسکری قیادت، جذبۂ جہاد اور رعایا پروری کا بہترین نمونہ پیش کیا۔

تاریخ فرشتہ میں جامع الحکایات کے حوالے سے امیر سبکتگین کی ترقی و کامرانی کے بارے میں ایک عجیب قصہ منقول ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سبکتگین امیر الپ تگین کی ملازمت کے زمانے میں ایک عرصے تک نیشاپور میں متعین رہا تھا۔ان دنوں سبکتگین کو شکار کا بہت شوق تھا۔ایک دن وہ گھوڑے پر سوار شکار کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا کہ اسے ایک ہرنی دکھائی دی جو اپنے بچے کے ساتھ گھاس چر رہی تھی، سبکتگین نے گھوڑا اس کی طرف دوڑایا۔ ہرنی ہاتھ نہ آئی تو سبکتگین نے اس کے بچے کو پکڑ لیا اور گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھ کر شہر کی طرف روانہ ہوا۔کچھ دور جا کر اس نے پلٹ کر دیکھا تو ہرنی کو پیچھے آتے پایا، ماں اپنی ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر زبانِ حال سے بچے کی رہائی کی فریاد کر رہی تھی۔ سبکتگین کا دل بھر آیا اور اس نے بچے کو آزاد کر ایا۔بچہ اچھلتا کودتا ماں کے پاس پہنچ گیا۔ہرنی جنگل کی طرف جاتے ہوئے بار بار مڑ کر امیر سبکتگین کی طرف یوں دیکھتی جیسے اس کا شکریہ ادا کر رہی ہو۔اسی رات امیر نے خواب میں حضور رحمت دو عالم ﷺ کی زیارت کی۔آپ ﷺ نے فرمایا: ''سبکتگین! تم نے ایک بے زبان جانور پر رحم کیا ہے، تمہارا یہ عمل اللہ کی بارگاہ میں بہت مقبول ہوا ہے، تمہیں چاہئے کہ یہی طریقہ اختیار کیے رہو اور رحم کو کبھی ترک نہ کرو۔'' اس واقعہ کے کچھ ہی عرصے بعد سبکتگین حیرت

انگیز رفتار سے ترقی کرتا ہوا مسندِ سلطنت تک جا پہنچا۔

حکیمانہ اقوال: سبکتگین غیر معمولی عقل و فہم رکھتا تھا۔ دنیا کا بغور مشاہدہ کر کے نتائج اخذ کیا کرتا تھا۔ اس کے اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بادشاہ ہی نہیں مفکر بھی تھا۔ شہزادہ محمود غزنوی کو ایک باغ کی تعمیر میں مصروف دیکھا تو اسے نصیحت کی:

"بیٹا! اس کی بجائے اگر اہل علم کی دلوں کی زمین میں محبت و احسان کے بیج بوؤ تو ان کے پھل تمہیں دین و دنیا کی سعادت کی لذت عطا کریں گے اور تا حشر تمہارا نیک نام زندہ رہے گا۔"

وفات سے چار دن پہلے کہا: "ہم طرح طرح کے مصائب اور امراض میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں اور ہر مصیبت و مرض میں نجات کا خیال کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخری مصیبت موت کا پیغام لاتی ہے اور غفلت کے عالم میں موت کا پھندا ہمارے گلے میں ڈال کر ہمیں اس دنیا سے لے جاتی ہے۔"

سلطان محمود غزنوی کے دورِ حکومت کا آغاز: امیر ناصر الدین سبکتگین کے تین بیٹے تھے، محمود، اسماعیل اور نصر۔ چونکہ امیر کی وفات کے وقت محمود اور نصر دور دراز مقامات پر مہمات انجام دے رہے تھے اس لیے سبکتگین نے انتظامی مصلحت کے تحت وفات سے قبل اُمور سلطنت اسماعیل کے حوالے کر دیے تھے۔ چنانچہ اسماعیل سبکتگین کے جانشین کی حیثیت سے حکومت کرنے لگا، چونکہ اسماعیل کم عمر اور ناتجربہ کار تھا اس لیے عمائدِ سلطنت کو خدشہ ہوا کہ کہیں مملکت کا نظام ابتر نہ ہو جائے۔ سلطان محمود غزنوی اس وقت نیشاپور میں تھے۔

انہوں نے اسماعیل کو یہ خط لکھا:

"والد محترم کی وفات کے بعد تم مجھے سب سے زیادہ عزیز ہو مگر کم سنی کے باعث اُمور سلطنت کا انتظام تمہارے بس کی بات نہیں ہے، تمہیں جانشین بنانے سے والد محترم کی مراد یہ تھی کہ دیگر مہمات میں مشغول ہونے کی وجہ سے اس وقت غزنی کی حکومت کا انتظام سنبھالنا ہمارے لیے ممکن نہ تھا۔ اب میری رائے یہ ہے کہ تم غزنی کی آبائی حکومت میرے سپرد کر دو، اس کے عوض میں بلخ اور خراسان تمہارے ماتحت کر دوں گا۔"

سلطان محمود کا یہ پیغام ملکی سیاست کے لحاظ سے قرینِ مصلحت تھا مگر اسماعیل نے اقتدار کے نشے میں اس پر کوئی غور نہیں کیا، بالآخر امراء سلطنت کے مشورے کے مطابق سلطان نے اسماعیل سے غزنی کی حکومت بزورِ قوت چھین لی۔ اسماعیل کو گرفتار کر کے جرجان کے قلعے میں نظر بند کر دیا گیا تاہم سلطان نے اس کے ساتھ اتنی رعایت کی کہ اس کے لیے قلعے میں تمام سہولتوں اور آسائشوں کا انتظام کر دیا۔

خواب سچا ہو گیا: تاریخ فرشتہ کے مطابق سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت 10 محرم 357ھ (29 اگست 977ء) کی شب ہوئی تھی، اسی رات ان کے والد نے خواب دیکھا تھا کہ ان کے گھر سے ایک پودا اُگا اور آناً فاناً بہت بڑا اور سایہ دار درخت بن گیا، اس کی شاخیں ہر طرف پھیل گئیں یہاں تک کہ پوری دنیا اس کے سامنے میں آ گئی۔

بوقت سحر سبکتگین بیدار ہو کر اس خواب کے بارے میں غور کر رہا تھا کہ اسے بیٹے کی پیدائش کی اطلاع دی گئی۔ سبکتگین نے سوچا اس خواب کی تعبیر یہی ہے کہ یہ بچہ دنیا کا بہت بڑا حکمران بنے گا۔ اس خواب کی تعبیر کے مطابق سلطان محمود غزنوی 388 رحمۃ اللہ علیہ ھ میں 31 سال کی عمر میں غزنی کے تخت پر براجمان ہوئے۔

لڑکپن کا شوق اور ولولہ: سلطان محمود غزنوی نے مسندِ حکومت سنبھالنے کے بعد ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کے لیے تیاری شروع کر دی۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ سلطان محمود اپنے لڑکپن میں غزنی کے جنگلات میں شکار اور فوجی مشقوں کی مصروفیات کے دوران ہندوستان سے آنے والی شاہراہ پر نظر رکھتے تھے، ہندوستان سے کوئی قافلہ آتا دیکھتے تو فوراً لپکتے اور مسافروں سے ہندوستان کے بارے میں سوالات کرتے۔ اس ملک کی زرخیزی اور شادابی کے قصے سن کر وہ بہت محظوظ ہوتے۔ وہاں کے گنجان شہروں، کھلے میدانوں اور موجیں مارتے دریاؤں کے تذکرے سن کر ان کے تجسس میں مزید اضافہ ہو جاتا لیکن جب انہیں بتایا جاتا کہ وہاں مسلمانوں کی آبادی برائے نام ہے تو انہیں بہت افسوس ہوتا۔ خصوصاً ہندو راجاؤں کے ظلم و ستم اور برہمنوں کے مذہبی اقتدار تلے سسکتے ہوئے عوام کے حالات سن کر انہیں سخت صدمہ ہوتا اور وہ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کے لیے بے چین ہو جاتے۔ اپنے لڑکپن ہی میں وہ تہیہ کر چکے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں حکومت عطاء کی تو وہ سرزمین ہند میں اسلام کا پرچم لہرانے اور وہاں مسلمانوں کی مضبوط حکومت قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔

اندرونی مہمات: غزنی کی حکومت سنبھالتے ہی سلطان محمود غزنوی نے اس دیرینہ آرزو کی تکمیل کا عہد کر لیا تھا مگر اس سے قبل موجودہ حکومت کو اتنا مضبوط کرنا ضروری تھا کہ وہ ہندوستان جیسی عظیم سلطنت سے بلا تردد ٹکر لے سکے۔

اس مقصد کے لیے سلطان محمود غزنوی نے پہلے ان علاقوں کو زیرِ نگیں کرنے کی کوشش کی جو غزنوی سلطنت کے لیے کسی بھی لحاظ سے خطرہ ثابت ہو سکتے تھے۔ اس سلسلے میں سلطان نے طویل جنگی مہمات سر کیں۔ نیشاپور میں بغاوت کی آگ بھڑکتی دیکھ کر اسے ٹھنڈا کیا، خراسان پر مکمل قبضے کے لیے سامانی امراء سے بھی کشمکش جاری رہی۔

سامانی حکومت کا خاتمہ: اس دوران دریائے آمو کے پار سامانی حکمرانوں اور ترکستان کے ایلک خانی تاجداروں میں بھی کشا کشی ہو رہی تھی، آخر کار ترکستانی حکمران نے 389ھ (998ء) میں کاشغر سے بخارا پر یلغار کر کے سامانی حکمران عبد الملک بن نوح اور اس کے حامیوں کو قتل کر دیا اور اس طرح ایک سو اٹھائیس سال تک وسط ایشیا اور افغانستان پر حکومت کرنے والے سامانی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ سامانی حکومت خراسان پر سلطان محمود کے قبضے میں بڑی رکاوٹ تھی، اس رکاوٹ کے دور ہوتے ہی خراسان کا وسیع وعریض علاقہ غزنوی حکومت کے ماتحت آ گیا۔

عباسی خلافت سے اچھے مراسم: 390ھ (999ء) میں سلطان نے ہرات اور جنوبی افغانستان پر قبضہ کیا۔ بغداد میں اس وقت القادر باللہ عباسی خلافت کا تاجدار تھا۔ سلطان محمود غزنوی نے اس سے اچھے مراسم رکھے اور خلافتِ عباسیہ کے لیے بہت سی مہمات انجام دیں جن کے صلے میں خلیفہ نے سلطان کو ''امین الملت ویمین الدولۃ'' کا خطاب دیا۔

ہندوستان پر حملے کی تیاریاں: ملکی مہمات سے فارغ ہوتے ہی سلطان نے اشاعتِ اِسلام کا عہد نبھانے کے لیے ہندوستان پر لشکر کشی کے لیے تیاری شروع کر دی، یہ حملہ اس لیے بھی ضروری ہو گیا تھا کہ ہندوستان کے راجہ جے پال نے سبکتگین کے زمانے میں طے شدہ خراج دینا بند کر دیا تھا اور آمادۂ پیکار تھا، اسے اس بدعہدی کی سزا دینا ناگزیر تھا تاہم یہ مہم آسان نہ تھی، غزنی سے ہندوستان تک کا راستہ انتہائی دشوار گزار اور پر خطر تھا۔ اس کے لیے خطیر اخراجات کی ضرورت تھی مگر اللہ تعالیٰ نے عسکری اخراجات کا انتظام اپنے غیبی خزانے سے یوں فرما دیا تھا کہ سلطان کی تخت نشینی کے کچھ ہی دنوں بعد سیستان میں سونے کی ایک کان دریافت ہوئی تھی۔ یہ کان سونے سے بھرپور تھی، انتظام سلطنت اور فوج کشی کے اخراجات کے لیے اس سے حاصل شدہ سونے سے سلطان کو غیر معمولی سہارا ملا۔ سلطان محمود غزنوی کی وفات کے بعد یہ کان ایک زلزلے میں ناپید ہو گئی۔

ہندوستان پر پہلا حملہ: ہندوستان پر سلطان محمود غزنوی کا پہلا حملہ ایک تیز رفتار آپریشن کی طرح تھا، جس میں سلطان نے لمغان کے چند سرحدی قلعوں کو جے پال سے چھین کر ہندوستان کے خلاف اعلانِ جنگ کیا۔ اس حملے کی تاریخ واضح نہیں ہے، قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ 390ھ کے اواخر یا 391ھ کے اوائل میں ہوا تھا۔

ہندوستان پر دوسرا حملہ: شوال 391ھ (اگست 1000ء) میں سلطان محمود غزنوی رحمہ اللہ دس ہزار مجاہدین کو ہمراہ لے کر غزنی سے پشاور روانہ ہوئے اور درۂ خیبر کو عبور کے پشاور کے میدان میں خیمہ زن

ہوئے۔ راجہ جے پال بیس ہزار گھڑسواروں اور تیس ہزار پیادوں کے ساتھ مقابلے پر آیا، اس کے ساتھ تین سو جنگی ہاتھی بھی تھے۔

8 محرم 392ھ (28 نومبر 2001ء) کو دونوں فوجیں ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑیں، گھمسان کی لڑائی کے دوران ہندوؤں کے جنگی ہاتھی سخت تباہی مچا رہے تھے، سلطان کے حکم پر کچھ کارآزما مجاہدین نے جنگی ہاتھیوں پر تلواروں سے حملہ کیا اور ان کی سونڈیں کاٹ ڈالیں، پھر کہنہ مشق تیراندازوں نے تیر برسا کر ان کی ٹانگیں چھید دیں۔ ہاتھی غل مچاتے ہوئے اپنی فوج کی طرف پلٹے اور اپنی ہی صفوں کو روندنے لگے۔ مسلمانوں نے موقع سے فائدہ اُٹھا کر ایک سخت ترین حملہ کیا اور ہندوؤں کو تتر بتر کر دیا۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو شاندار فتح نصیب ہوئی، راجہ جے پال اپنے خاندان کے پندرہ اہم افراد سمیت گرفتار ہو گیا جبکہ اس کے لشکر کے پانچ ہزار سپاہی قتل ہوئے۔

سلطان محمود غزنوی نے برف باری کا موسم ختم ہوتے ہی غزنی کی طرف کوچ کیا۔ جاتے ہوئے انہوں نے راجہ جے پال اور دیگر ہندوؤں قیدیوں کو اپنا باج گزار بنا کر رہا کر دیا۔ سلطان کی جانب سے ایک بدترین دشمن سے یہ حسنِ سلوک مسلم فاتحین کے بلند اخلاق کی بہترین مثال ہے۔

جے پال کا عبرت ناک انجام: ہندوؤں کے ہاں یہ رسم چلی آتی تھی کہ جو راجہ جنگ میں دو مرتبہ گرفتار ہو جائے وہ حکومت کے قابل نہیں رہتا تھا اور اسے اپنے جرم کی سزا میں آگ میں جلنا پڑتا تھا۔ چنانچہ جے پال نے حکومت اپنے بیٹے انند پال کے حوالے کر دی اور خود بھڑکتی ہوئی آگ میں جل کر خودکشی کر لی۔ جے پال کی خودکشی کے بعد اس کے بیٹے انند پال نے ویہند (اٹک) کی سلطنت کو مکمل شکست سے بچانے کی خاطر سلطان محمود غزنوی سے مصالحت کو ترجیح دی۔ یوں کچھ عرصے تک دریائے سندھ کا ساحل پرامن منظر پیش کرتا رہا۔

ہندوستان پر تیسرا حملہ: سلطان کو ویہند کے سرسبز و شاداب علاقے کی فوری فتح سے زیادہ ہندوستان کے وسط میں آباد ہندو راجاؤں کی ان بڑی بڑی سلطنتوں کو مسخر کرنے سے دلچسپی تھی جہاں ہندوؤں کی صدیوں پرانی سلطنتیں آباد تھیں۔ ان میں ان گنت قلعے اور لاتعداد سپاہی تھے اور وہاں کے راجے غزنی سے اُٹھنے والی فتوحات کی آندھی کی روک تھام کے لیے اپنی فوجی قوت میں تیزی سے اضافہ کر رہے تھے۔ انند پال سے مصالحت کے بعد سلطان کو آگے بڑھنے کا راستہ مل گیا تھا، اس لیے وہ 395ھ (1005ء) میں ہندوستان کے ایک مضبوط گڑھ کی فتح کے لیے روانہ ہوئے، جسے فتح کیے بغیر وسطی ہندوستان میں پیش قدمی ممکن نہ تھی۔ عرب مؤرخین نے اس مقام کو "بھاطنہ" کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس

کی تعیین میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے تاہم مجموعی آراء کے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ملتان کے قریب واقع ''قلعہ بھیٹرہ'' تھا۔ یہاں کا راجہ بجے راؤ بڑا سرکش اور مغرور حکمران تھا، اس کی عسکری طاقت نہایت مستحکم تھی۔

سلطان محمود غزنوی کے شہر کے قریب پہنچتے ہی بجے راؤ کی فوجیں میدان میں نکل آئیں۔ تین دن تک گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی، کشتوں کے پشتے لگتے رہے مگر جنگ کا کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ سلطان محمود غزنوی کو خطرہ محسوس ہوا کہ اگر جلد ہی جنگ کا فیصلہ نہ ہوا تو کمک نہ ہونے کی وجہ سے اسلامی لشکر شکست کھا جائے گا۔ چوتھے دن انہوں نے اپنی باقی ماندہ فوج کو فتح یا شہادت کا ہدف دے کر آخری حملے کے لیے برانگیختہ کیا، اَفغان اور ترک سپاہی تکبیر کے نعرے لگاتے ہوئے دشمن کی صفوں میں جا گھسے، اس کے باوجود دشمن کے جوش وخروش میں کوئی کمی نہ آئی۔ سورج کی شعاعیں زرد پڑنے لگیں تو سلطان کا اضطراب بڑھ گیا، انہوں نے بارگاہ ایزدی میں گڑگڑا کر دُعا کی۔ اور پھر قلب لشکر کی قیادت کرتے ہوئے دشمن سے ٹکرا گئے، چند منٹ کے اندر اندر میدان کا نقشہ پلٹ گیا اور مسلمان سپاہیوں نے بجے راؤ کے لشکر کا قلب چیر کر اسے پسپا ہو جانے پر مجبور کر دیا۔

سورج غروب ہونے سے پہلے بجے راؤ میدانِ جنگ سے بھاگ کر قلعے میں چھپ گیا۔ اِسلامی لشکر نے آگے بڑھ کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ قلعے کے گرد فصیل کی بلندی اور خندق کی چوڑائی کے باعث اِسلامی لشکر فوراً آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ سلطان کے حکم پر سپاہی خندق کو مٹی اور پتھروں سے پاٹنے لگے۔ یہ دیکھ کر بجے راؤ کی ہمت جواب دے گئی اور وہ رات کی تاریکی میں فرار ہو گیا تاہم سلطان کے سپاہی جو اس کی تاک میں تھے، اسے ایک پہاڑی علاقے میں گھیرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بجے راؤ نے گرفتاری کی ذلت سے بچنے کے لیے سینے میں خنجر بھونک کر خودکشی کر لی۔ اس کا سر کاٹ کر سلطان کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو مال غنیمت میں دو سو اسّی (280) ہاتھی اور بے شمار زر و جواہر ملے۔ اس معرکے سے واپسی میں دریائے سندھ عبور کرتے ہوئے شدید طغیانی کے باعث لشکر اِسلام کو خاصا جانی نقصان اُٹھانا پڑا۔ یہ ہندوستان میں سلطان کی تیسری مہم تھی جس میں سلطان کو فتح کے ساتھ ساتھ بڑی کٹھن آزمائشیں بھی پیش آئیں۔

سلطان کا چوتھا حملہ: ملتان ان دنوں صوبہ سندھ میں شمار کیا جاتا تھا۔ عالمِ اِسلام میں گمراہی، فساد اور خونریزی کے سیاہ کارنامے انجام دینے والی قرامطی تحریک کے باقی ماندہ افراد عباسی خلفاء اور مسلم سلاطین کے ہاتھوں ہزیمتیں اُٹھانے کے بعد سندھ کو اپنی پناہ گاہ سمجھ کر اِدھر آ نکلے تھے اور ایک عرصے

سے ملتان ان کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔

ان کے پیشوا ابوالفتح داؤ دکی ملتان پر باقاعدہ حکومت تھی اور یہاں سے مسلمانوں کی جڑیں کاٹنے اور اِسلام کے مقابلے میں ایک متبادل دین متعارف کرانے کا کام زور وشور سے جاری تھا۔

بھٹیز کی فتح کے دوران ملتان کے نواح سے گزرتے ہوئے سلطان کو قرامطیوں اوران کے پیشوا کی فتنہ انگیزی کا عملی تجربہ ہو چکا تھا، اس لیے غزنی واپس پہنچ کر کچھ اندرونی مہمات سرانجام دیتے ہی سلطان نے 396ھ (1006ء) میں ایک بار پھر اپنے گھوڑے کی باگ ہندوستان کی طرف پھیر دی۔ قرامطی، سلطان کی نیت سے بے خبر نہ تھے۔ انہوں نے ویہند کے راجہ انند پال کو جس کی سلطان محمود غزنوی سے مصالحت برقرار تھی، سلطان کے خلاف بھڑکایا اور مشترکہ محاذ بنا کر سلطان سے اپنے باپ کا انتقام لینے کی ترغیب دی۔ انند پال جوان دنوں لاہور میں مقیم تھا، ان کی تکبیس سے مشتعل ہو کر سلطان سے مقابلے پر تل گیا اور لاہور سے پشاور پہنچ کر سلطان کی راہ میں فوج کھڑی کر دی۔

سلطان نے اس غیر متوقع مزاحمت کا بڑی حوصلہ مندی سے سامنا کیا، انہوں نے اپنے بعض نمائندے انند پال کے دربار میں بھیج کر اسے جنگ سے باز رہنے کی تلقین کی۔ اس حکمت عملی سے انند پال کی فوج میں پھوٹ پڑ گئی، بہت سے ہندو افسران معرکہ جنگ میں شریک نہ ہوئے اور مقابلہ پر آنے والے باقی ہندو لشکر کو غزنوی سپاہ نے چند منظم حملوں میں شکست فاش دے دی۔ انند پال فرار ہو کر کشمیر کی طرف نکل گیا۔ غزنوی لشکر نے مفرورین کا دریائے چناب کے کنارے تک تعاقب کیا اور اس کے بعد اپنے اصل ہدف ملتان کا رُخ کیا۔ قرامطی حکمران ابوالفتح داؤ د نے انند پال کا عبرتناک انجام دیکھ کر سلطان کے سامنے سرتسلیم خم کرنے ہی میں عافیت سمجھی۔ ابھی سلطان ملتان کی مہم سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ انہیں ہرات پر ترکستانی سردار ایلک خان کے حملے کی اطلاع ملی جس کے باعث انہیں فوراً اُفغانستان واپس جانا پڑا۔

دریائے آمو کا خونریز معرکہ: سلطان نے ملتان اور شمالی اُفغانستان کے درمیان پھیلے ہوئے وسیع وعریض میدان، خطرناک صحراء، بلندوبالا پہاڑ اور تندوتیز دریا طوفانی رفتار سے عبور کیے اور بلخ سے آگے دریائے آمو کے قریب ڈیرے ڈال دیے۔ ایلک خان کی فوج کے ساتھ چینی ترکستان کے بادشاہ قدرخان کے معاون دستے بھی تھے۔ اس لشکر جرار کے مقابلے میں سلطان محمود نے اُفغان سرداروں کو بڑی تنظیم کے ساتھ صف آرا کیا۔ قلب لشکر پر اپنے بھائی نصیرالدین، میمنہ پر التون تاش اور میسرہ پر ہرات کے گورنر ارسلان جاذب کو مقرر کیا۔

نقارے پر چوٹ پڑتے ہی ہولناک جنگ شروع ہوگئی، چینیوں اور ترکستانیوں کے جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ فضا سہمی جاتی تھی، قریب تھا کہ سلطانی لشکر کو شکست ہوجاتی، سلطان گھوڑے سے اتر پڑے ......زندگی اور موت کے کھیل سے بے پرواہ ہوکر بارگاہ خداوندی میں سجدہ ریز ہوئے اور آنسو بہا کر اس کی نصرت طلب کی۔

دُعا سے فارغ ہوتے ہی سلطان نے ایک ہاتھی پر سوار ہوکر خود دشمن کے علمبردار پر حملہ کیا، سلطانی ہاتھی نے چشم زدن میں حریف کے علمبردار کو سونڈ میں لپیٹ کر ہوا میں اُچھال دیا اور دشمن کی صفوں میں گھستا چلا گیا، ترکستانیوں کی صفیں درہم برہم ہوگئیں اور آخر کار ایک خونریز معرکے کے بعد دشمنوں کا سرکش سیلاب بخارات کی طرح تحلیل ہونے لگا۔ سلطان نے دشمنوں کا تعاقب شروع کیا اور کئی دن تک ان کا پیچھا جاری رکھا تاکہ دشمنوں کو مکمل طور پر ختم کردیا جائے مگر برف باری کا موسم شروع ہوچکا تھا لہٰذا لشکر کے لیے آگے بڑھنا شدید مشکل ہوگیا۔ تعاقب کی تیسری رات اتنی شدید برف باری ہوئی کہ غزنوی سپاہ کے ہاتھ پاؤں شل ہوگئے۔

<u>سردی کیوں غضب ڈھا رہی ہے:</u> اُس رات سلطان اپنے افسران کے ساتھ ایک گرم خیمے میں انگیٹھیوں سے ہاتھ تاپ رہے تھے۔ انگیٹھیوں کے باعث خیمے میں اتنی گرمی ہوگئی تھی کہ امراء لشکر اپنے گرم کپڑے اُتار اُتار کر ایک طرف رکھتے جارہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر سلطان نے مزاحاً ایک غلام سے کہا: ''ذرا باہر جاکر سردی سے کہو وہ کیوں غضب ڈھا رہی ہے، ہمارا تو یہ حال ہے کہ بدن سے کپڑے اُتارتے جارہے ہیں۔''

غلام باہر گیا اور چند لمحوں بعد واپس آکر کہنے لگا: ''سردی نے جواباً کہا ہے بادشاہ اور امراء پر تو میرا بس نہیں چلتا مگر میں ملازموں کو آج رات اتنا بدحال کردوں گی کہ صبح بادشاہ اور امراء کو گھوڑوں کی دیکھ بھال خود کرنا ہوگی۔''

سلطان محمود غزنوی نے اس دلچسپ جواب میں چھپے ہوئے طنز کو بھانپ لیا۔ وہ سمجھ گئے کہ اتنی شدید برف باری میں سپاہیوں اور ملازموں کو مزید سفر پر مجبور کرنا زیادتی ہے۔ اگلے دن انہوں نے فوج کو واپسی کا حکم دے دیا۔ یہ سلطان کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ ایک غلام کی بات سے بھی نصیحت حاصل کرنے میں توقف نہ کیا...... ورنہ اقتدار کے نشے میں دھت رہنے والے عام حکمران ایسی راست گوئی کہاں برداشت کرسکتے ہیں۔

<u>ہندوستان کی پانچویں مہم:</u> ایلک خان سے معرکے کے فوراً بعد سلطان محمود غزنوی کو ہندوستان

مقبوضات میں بغاوت کی اطلاع ملی۔ اپنی غیر حاضری کے دوران وہ ہندوستان میں راجہ سکھ پال نامی ایک نومسلم کو اپنا قائم مقام بنا آئے تھے جو راجہ جے پال کا نواسہ تھا اور نواسۂ شاہ کے لقب سے مشہور تھا۔ سلطان کی عدم موجودگی میں سکھ پال مرتد ہو کر بغاوت پر آمادہ ہو گیا۔ سکھ پال کو مہلت دینا ہندوستان کے تمام مقبوضات سے محرومی کے مترادف تھا اس لیے سلطان کسی تاخیر کے بغیر ہندوستان پہنچے اور سکھ پال کو گرفتار کر کے غزنی لے آئے۔ اس فوری کارروائی کے نتیجے میں ہندوستان کے مسلم مقبوضات ہندوؤں کے قبضے میں جانے سے بچ گئے۔

<u>انند پال کی سازشیں:</u> سلطان محمود غزنوی کی ان مصروفیات کے دوران راجہ انند پال نے موقع پا کر گرد و نواح کے تمام راجاؤں کو ایک بار پھر ہندو مت کے تحفظ کے نام پر سلطان کے خلاف یکجا کر لیا تھا۔ اس نے ہندو راجاؤں کو اس قسم کے پیغامات بھیجے تھے: ''سلطان محمود ہندو مت کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ اگر اسے نہ روکا گیا تو وہ پورے ہندوستان کو برباد کر دے گا، اگر تمہیں مذہب اور وطن کی لاج رکھنی ہے تو میرے ساتھ مل کر محمود کا مقابلہ کرو۔''

ان پیغامات نے ہندوؤں کو بھڑکا دیا تھا۔ کھوکھر قوم کے ہزاروں ہندو انند پال کی پکار پر پشاور کے قریب صف بندی کر چکے تھے۔ ہندوؤں کے ولولے کا یہ عالم تھا کہ ان کی عورتوں نے اپنے زیورات تک فروخت کر کے محاذ جنگ کے لیے اسلحہ فراہم کیا تھا۔ دہلی، قنوج، اجمیر، اجین، کالنجر اور گوالیار کے راجے بھی اپنے لشکر لے کر یہاں پہنچ گئے تھے۔

<u>ہندوستان پر چھٹا حملہ:</u> یہ اطلاعات پا کر سلطان محمود غزنوی 399ھ (1009ء) میں غزنی سے پشاور پہنچے۔ ہندوؤں کی تعداد لاکھوں تک تھی اور وہ مذہبی جوش و جذبے سے تپے ہوئے تھے، مگر جوں ہی اسلامی لشکر تکبیر کے نعرے بلند کرتا ہوا ان کے بالمقابل فروکش ہوا، ان کا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا، انند پال سمیت تمام راجے مہاراجے جنگ سے جی چرانے لگے۔ چالیس دن اسی حیص بیص میں گزر گئے۔ ہندو لشکر خاموشی سے پڑاؤ ڈالے رہا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا مسلمانوں کے لیے خوراک و رسد کے مسائل بڑھتے جا رہے تھے، اس لیے جنگ میں تاخیر مسلمانوں کے حق میں نہ تھی تاہم ہندو لشکر کی بے پناہ تعداد کو دیکھتے ہوئے سلطان نے دفاعی پیش بندیوں کے لیے اس فارغ وقت کو کارآمد بنایا اور اپنے لشکر کے گرد کئی گہری اور چوڑی خندقیں کھدوا ڈالیں۔ ان خندقوں پر چھ ہزار تیر اندازوں کے لیے مورچے بنا دیے گئے اور پوری اسلامی فوج نے ایک قلعے کی مانند محفوظ ٹھکانہ حاصل کر لیا۔

<u>ہولناک جنگ اور نصرتِ خداوندی:</u> اکتالیسویں روز سلطان نے جنگ شروع کرنے کا حکم دیا،

ایک ہزار گھڑسوار تیرانداز طوفان کی طرح خندقوں کے حصار سے نکلے اور ہندو لشکر پر تیروں کی بوچھاڑ کر کے واپس پلٹے، ہندو لشکران کے تعاقب میں خندق تک آ گیا جہاں باقی اِسلامی لشکران کی مزاج پرسی کے لیے تیار تھا، اس طرح زوردار لڑائی شروع ہوگئی۔ یہ جنگ کئی دن تک جاری رہی۔

ایک دن کھوکھروں کے تیس ہزار سپاہی دو اطراف سے خندق عبور کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ خندقوں کے دفاع پر مقرر چھ ہزار تیراندازان کے نرغے میں آ گئے، مسلمانوں کے سنبھلتے سنبھلتے ہندوؤں کا باقی لشکر بھی آن پہنچا اور پانچ ہزار مسلم تیرانداز آناً فاناً شہید ہوگئے۔ مسلمان دونوں طرف سے پس رہے تھے اور شکست فاش کے قریب تھے کہ یکایک اللہ کی رحمت نے پانسہ پلٹ دیا، مسلمانوں کی تیر اندازی اور آتش گیر پچکاریاں پھینکنے والے سپاہیوں کی کوشش سے انندپال کا دیو پیکر ہاتھی گھبرا گیا اور اپنے لشکر کو روندتا ہوا واپس بھاگا، اس سے ہندوؤں کی اگلی صفیں ٹوٹ گئیں، سینکڑوں افراد کچلے گئے اور بہت سے ڈر کر بھاگ نکلے، اس سے پچھلی صفوں کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ ہمیں شکست ہوگئی ہے، پھر کیا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے تمام راجے اپنے سپاہیوں کو لے کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ سلطان محمود غزنوی غیبی امداد کا یہ منظر دیکھ کر سجدے میں گر پڑے۔ اس جنگ میں مسلمان شدید نقصان اُٹھانے کے باوجود فتح یاب رہے جبکہ بیس ہزار ہندو تہہِ تیغ ہوئے۔ سلطان نے دس ہزار گھڑسوار دشمن کے تعاقب میں روانہ کر دیے جنھوں نے گھیر گھار کر فرار ہونے والے آٹھ ہزار ہندوؤں کو چن چن کر ہلاک کیا۔ انندپال کو شکست دینے کے بعد سلطان نے ان تمام ہندو راجاؤں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا جو انندپال کے پرچم تلے مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہوئے تھے۔

<u>نگرکوٹ کی فتح:</u> اب سلطان نے شمالی ہندوستان کا رُخ کیا اور کوہ ہمالیہ کے دامن میں کانگڑہ پہنچ کر یہاں کے مرکز ''نگرکوٹ'' کا محاصرہ کر لیا۔ یہ ہندوؤں کا مقدس مقام تھا جس کے بارے میں ان کا عقیدہ تھا کہ کسی مسلمان کی یہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ شہر کا قلعہ ''بھیم قلعہ'' کے نام سے مشہور تھا جو نہایت مستحکم تھا، یہاں کسی راجہ کی بجائے پنڈتوں اور پجاریوں کی حکومت تھی۔ پورے ہندوستان کے بت پرست یہاں کے مندروں میں بھینٹ چڑھاتے اور نذرانے دیا کرتے تھے۔ سلطان نے کچھ دنوں کے محاصرے کے بعد شہر پر قبضہ کر لیا۔

بھیم قلعہ کے برہمنوں سے جو مال و دولت سلطان کے ہاتھ لگا اس میں سات لاکھ سرخ دینار، دو ہزار من خالص چاندی، سات سو من سونے اور چاندی کے ظروف و آلات اور بیس من ہیرے جواہرات تھے۔ مجموعی طور پر یہ دولت کسی بڑے سے بڑے ملک کے خزانے سے بھی زیادہ تھی۔ غزنی پہنچ کر

سلطان نے ایک کشادہ میدان میں تین دن تک اس مالِ غنیمت کی نمائش کی، لوگ دور دور سے آ کر اسلام کی اس فتح پر اظہارِ مسرت کرتے۔ سلطان نے اس موقع پر غرباء و فقراء اور مستحق افراد میں بے اندازہ دولت تقسیم کی۔

اس مالِ غنیمت میں چاندی کا ایک مکمل گھر بھی شامل تھا جسے الگ الگ حصوں میں تقسیم کرنا اور دوبارہ جوڑنا چنداں مشکل نہ تھا، یہ دولت کے پجاریوں کی صنعت و حرفت کا ایک عجیب نمونہ تھا۔

ساتواں حملہ: سلطان کا ساتواں حملہ وسطی ہند کی ایک ریاست ''ناران'' پر تھا۔ اس حملے میں ناران کے راجہ نے جنگ کی ابتداء ہی میں شکست کے آثار دیکھ کر سلطان سے مصالحت کر لی۔ اس کامیابی کے ساتھ ہی سلطان کو افغانستان میں غور کے امراء کی بغاوت کی خبر ملی۔ سلطان نے تیزی سے واپس کوچ کیا اور غور پہنچ کر باغیوں کی سرکوبی شروع کی۔ ابھی وہ باغیوں سے دو دو ہاتھ کر رہے تھے کہ انہیں اطلاع پہنچی کہ ملتان میں قرامطی پیشوا ابوالفتح نے ایک بار پھر علمِ بغاوت بلند کر دیا ہے۔

آٹھواں حملہ: ملتان کے قرامطی حکمران ابوالفتح لودھی کی بغاوت کی اطلاع پاتے ہی سلطان نے ''غور'' سے ہندوستان کی طرف کوچ کیا۔ یہ 401ھ (1010ء) کا واقعہ ہے۔ اس سے قبل 396ھ (1005ء) میں ابوالفتح لودھی سلطان کے ملتان پر حملے کے دوران اظہارِ اطاعت کر کے اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا، مگر اس بار اس کا جرم قابلِ معافی نہ تھا۔ سلطان نے ملتان پہنچ کر چاروں اطراف سے سخت ناکہ بندی کر لی تاکہ ابوالفتح کے لیے فرار ہونا ممکن نہ رہے۔ اس کے بعد غزنوی افواج ایک سخت حملہ کر کے شہر میں گھس گئیں۔ قرامطیوں کو چن چن کر بے دریغ قتل کیا گیا اور ان کے بہت سے افراد کے ہاتھ پاؤں کاٹ کے انہیں نشانِ عبرت بنا دیا گیا۔ ابوالفتح لودھی کو زندہ گرفتار کر لیا گیا، سلطان اسے اپنے ساتھ افغانستان لے گئے اور غور کے قلعے میں قید کر دیا جہاں وہ طبعی موت مر گیا۔ قرامطی ایک طویل عرصے سے عالمِ اسلام کے لیے ناقابلِ تلافی نقصانات کا باعث بنتے چلے آ رہے تھے اس لیے سلطان نے ان سے کوئی رعایت نہ برتی، اس سخت پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے بعد قرامطی برصغیر میں تقریباً ناپید ہو گئے۔

نواں حملہ: سلطان محمود غزنوی کے گزشتہ حملوں نے پنجاب سے کشمیر کی سرحدوں تک پھیلی ہوئی سلطنت ویہند کو پارہ پارہ کر ڈالا تھا اور اس کے حاکم انند پال کا ہمالیہ کے دامن تک تعاقب کیا جا چکا تھا۔ سلطان کی واپسی کے بعد انند پال نے ''نندنہ'' (موجودہ پنڈ دادن خان) کو اپنا پایۂ تخت قرار دے کر کوہستانِ نمک سے مشرقی پنجاب میں شوالک کی پہاڑیوں تک اپنی سلطنت کی شیرازہ بندی کرنے میں کامیابی حاصل کر لی، اس کے ساتھ ساتھ اس نے مزید جنگوں سے بچنے کے لیے سلطان سے اپنی روش مصالحانہ

کر لی۔ سلطان نے بھی اس سے مزید تعرض کی ضرورت نہ سمجھی اور وسطی ہندوستان پر توجہ مرکوز کر دی۔
402ھ (1011ء) میں سلطان نے دریائے جمنا اور دریائے سرسوتی کے درمیان واقع تھانیسر پر حملے کا ارادہ کیا جو ہندوؤں کے نزدیک ایسا ہی مقدس تھا جیسے مسلمانوں کے لیے مکہ معظمہ۔ یہاں کے قدیم مندر کے سب سے بڑے بُت کو ''جگ سوم'' کہا جاتا تھا اور ہندوانہ عقیدے کے مطابق یہ بُت سب سے پہلے انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی وجود میں آیا تھا۔ تھانیسر پر حملے کے لیے سلطان کو ایک بار پھر انند پال کے مقبوضہ علاقوں سے گزرنا پڑا، انند پال نے سابقہ تجربات کو ملحوظ رکھتے ہوئے سلطان کو اس شرط پر راہداری کی سہولت دے دی کہ اس کی سلطنت کو پامال نہ کیا جائے۔ علاوہ ازیں اس نے اسلامی لشکر کی رہنمائی کے لیے دو ہزار سوار بھی مہیا کیے۔
ادھر تھانیسر میں سلطان کی آمد کی خبر مشہور ہوئی تو ہندو پیشواؤں نے قاصد بھیج کر سلطان کو پیش کش کی کہ اگر سلطان تھانیسر کے بُت خانے کو نقصان نہ پہنچائے تو وہ ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار ہیں مگر سلطان کا جواب تھا: ''دنیا سے بت پرستی کو ختم کرنا ہمارا اصل مقصد ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم تھانیسر جیسے بُت پرستی کے مرکز کو نظر انداز کر دیں۔''
سلطان کے اس دوٹوک جواب سے دہلی کے راجہ سمیت تمام چھوٹے بڑے حکمران مشتعل ہو گئے اور تھانیسر کے دفاع کے لیے مقابلے میں مشترکہ محاذ بنانے کی تیاری کرنے لگے مگر سلطان نے نہایت تیزی سے پیش قدمی کی اور ان کے یکجا ہونے سے پہلے ہی تھانیسر پہنچ گئے۔
یہاں ہندوؤں نے پہاڑی گھاٹیوں میں مورچہ بندی کر رکھی تھی اور دریائے سرسوتی کے کنارے ہاتھیوں کے دستے کھڑے کیے ہوئے تھے تاکہ مسلمان دریا پار نہ کر سکیں، مگر سلطان نے کسی بات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے حملہ کر دیا۔ سلطان کے حکم پر سب سے پہلے سرفروش تیر اندازوں کا ایک دستہ دریا کے تیز بہاؤ میں لہروں سے اُلجھتا ہوا دریا کے دوسرے کنارے جا پہنچا اور دشمن پر ٹوٹ پڑا۔ جب تک دشمن ان کو روکنے میں مصروف رہا، کئی اور دستے یکے بعد دیگرے مختلف مقامات سے دریا عبور کر کے دشمن پر حملہ آور ہو گئے۔ سورج غروب ہونے تک معرکہ جاری رہا اور اتنی لاشیں گریں کہ دریائے سرسوتی کا پانی سرخ ہو گیا آخر کار سلطان نے اپنی خاص فوج کے ذریعے دشمن پر سخت ترین حملہ کیا اور انہیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا اور شہر پر بزور شمشیر قبضہ کر لیا۔ اس صورتحال میں سلطان کسی معاہدے کے پابند نہ تھے اس لیے اُنہوں نے تمام بتوں کو توڑ ڈالا اور بڑے بت ''جگ سوم'' کو غزنی بھجوا کر شارع عام پر پھینکوا دیا۔ ایک عرصے تک راہ گیر اسے روندتے رہے یہاں تک کہ اس کا نام ونشان تک مٹ

گیا۔ تھانیسر کے مندر سے سلطان کو 450 مثقال وزن کا ایک یاقوت بھی ہاتھ لگا تھا جسے دنیا کی تاریخ کا سب سے بڑا یاقوت قرار دیا جاتا ہے۔

دسواں حملہ: انند پال نے تھانیسر کے معرکے میں سلطان سے تعاون کیا تھا اس لیے سلطان نے سلطنت ویہند کے بچے کھچے حصے کو کوئی گزند نہ پہنچائی مگر اس کے کچھ ہی عرصے بعد انند پال مر گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا ترلوچن پال حکمران بنا جس نے سلطان سے مخاصمانہ روش اپنالی۔ آخر سلطان نے 404ھ (1013ء) میں ''ویہند'' کی سلطنت کو مکمل طور پر ختم کرنے کے لیے ان کے نئے پایۂ تخت ''نندنہ'' پر حملہ کیا۔ ترلوچن پال نے نندنہ کے قلعے کی حفاظت پر اپنے بیٹے بھیم پال کو مامور کیا اور خود کشمیر کی طرف نکل گیا۔ بھیم پال نے نندنہ کی راہ میں پہاڑی گھاٹیوں پر جنگی ہاتھیوں کے دستے کھڑے کر دیے۔ اِسلامی لشکر کئی دن کی متواتر کوششوں کے باوجود گھاٹیاں عبور نہ کر سکا، یہ صورت حال دیکھ کر دشمن کے حوصلے بلند ہو گئے اور وہ کھلے میدان میں نکل آیا۔ مسلمانوں نے ہاتھیوں کی صفوں کو نیزوں کی انیوں سے چیر دیا اور دشمن کو پے در پے حملے کر کے شکست فاش دے دی۔

نندنہ پر قبضے کے بعد سلطان نے ترلوچن پال کے تعاقب میں کشمیر کا رُخ کیا۔ ترلوچن پال جو کشمیری راجاؤں کی مدد سے کشمیر میں تازہ افواج تیار کر رہا تھا یہ خبر سن کر وہاں سے بھی فرار ہو گیا اور مشرقی پنجاب میں اپنی سلطنت کے آخری مورچے ''شوالک'' کی پہاڑیوں میں جا چھپا۔ اِدھر سلطان نے کشمیر کے گرد و نواح میں تمام رئیسوں اور راجاؤں کو مسخر کر لیا۔ مغربی پنجاب اور کشمیر میں ہندو دیومالائی ازم کا بُت ٹوٹ چکا تھا، اس لیے لوگ جوق در جوق اِسلام قبول کرنے لگے۔ ریاست جموں کے حاکم نے دس ہزار افراد کے ساتھ سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر اِسلام قبول کیا۔

گیارہواں حملہ: 402ھ (1015ء) میں سلطان نے کشمیر کی فتوحات کی تکمیل کا عزم کر کے ایک بار پھر رختِ سفر باندھا۔ ابھی وہ کشمیر کے ایک اہم قلعے ''لوہ کوٹ'' کے محاصرے میں مشغول تھے کہ سخت برف باری شروع ہو گئی جس سے غزنوی لشکر کے لیے محاصرہ برقرار رکھنا ناممکن ہو گیا۔ واپسی کے سفر میں اِسلامی فوج راستہ بھٹک کر کسی ایسی خطرناک وادی میں جا نکلی جہاں ہر طرف پانی ہی پانی دکھائی دیتا تھا چونکہ برف باری نے تمام راہیں مسدود کر دی تھیں اس لیے لشکر بری طرح پھنس گیا اور ہزاروں سپاہی پانی میں ڈوب کر جاں بحق ہو گئے۔ مورخین کے مطابق یہ سلطان کی زندگی کی واحد مہم تھی جو ناکام رہی اور سلطان نے اس سفر میں جو جانی نقصان اُٹھایا وہ ان کے تمام معرکوں کے نقصانات سے زیادہ تھا۔

خوارزم پر قبضہ: خوارزم کا حکمران ابوالعباس مامون سلطان محمود غزنوی کا بھانجا تھا۔ 407ھ

(1016ء) میں کچھ فتنہ پردازوں نے اسے قتل کر دیا۔ جس سے خوارزم کا امن و امان تہہ و بالا ہو گیا۔ خوارزم چونکہ وسط ایشیا کا مرکز اور افغانستان کا قریبی پڑوسی ملک تھا، اس لیے سلطان وہاں کے حالات سے لاتعلق نہیں رہ سکتے تھے۔ علاوہ ازیں اپنے بہنوئی کے قاتلوں کو سزا دینا بھی انصاف کا تقاضا تھا، لہٰذا سلطان نے غزنی سے بلخ کی طرف کوچ کیا اور دریائے آمو عبور کر کے خوارزم کی حدود میں قدم رکھ دیا۔ حریف افواج نے مقابلے کی کوشش کی مگر سلطان کے سامنے ان کی زور آزمائی بے سود ثابت ہوئی۔ سلطان نے خوارزم کو زیرِ نگین کر کے اپنے وفادار سپہ سالار التون تاش کو وہاں کی ولایت عطا کی اور کامیاب و کامران واپس لوٹ آئے۔

بارہویں مہم: قنوج شمالی ہندوستان میں ہندوؤں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ یہ ہندوستان کا دارالسلطنت بھی رہا تھا، یہاں کا حکمران بڑی آن بان کا مالک تھا۔ شہر کی وسعت کئی میلوں پر محیط تھی، شہرِ پناہ اور قلعہ بلندی اور مضبوطی میں اپنی مثال آپ تھے۔ قدیم تاریخ سے محمود غزنوی کے زمانے تک کسی بیرونی حملہ آور نے قنوج تک پہنچنے کی جرأت نہیں کی تھی مگر سلطان محمود غزنوی نے اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے اس مہم کا بیڑا اُٹھالیا۔ غزنی سے قنوج تک تین ماہ کا سفر تھا۔ دریائے سندھ، جہلم، چناب، ستلج، بیاس، جمنا اور گنگا جیسے سات بڑے دریا اس طویل مسافت میں حائل تھے۔

دُشوار سفر: مگر سلطان نے سفر کی ٹھان لی اور افغانستان سے وسط ایشیا تک کے نو مفتوحہ علاقوں کے تمام جنگجو اس بار اپنے لشکر میں شامل کر لیے۔ اس طرح ایک لاکھ بیس ہزار مجاہدین کا لشکر جرار بت کدوں کے مرکز کی طرف روانہ ہوا۔

موسم سرما میں اِسلامی لشکر نے جمنا کے اِس طرف میرٹھ پر قبضہ کیا اور پھر 20 رجب 409ھ (3 دسمبر 1021ء) کو یہ لشکر دریائے جمنا کی یخ بستہ لہروں سے پار ہو چکا تھا۔ جمنا کے پار برن (بلند شہر) کا قلعہ سر اُٹھائے کھڑا تھا مگر اِسلامی لشکر کے حوصلوں نے اسے جلد ہی سرنگوں کر ڈالا، میرٹھ کا راجہ ''ہروت'' دس ہزار افراد سمیت مشرف بہ اِسلام ہو گیا اور عمائد حکومت نے 30 ہاتھی اور اڑھائی لاکھ روپیہ سلطان کی نذر کیا۔

مہابن کی تسخیر: قلعہ مہابن یا مہاون بھی جمنا کے کنارے تھا، اس کا حاکم ''راجہ گل چند'' سلطان کے خوف سے ایک ہاتھی پر سوار ہو کر اپنی فوج سمیت جمنا کے پار جنگلات میں روپوش ہو گیا۔ سلطان نے اس کا تعاقب کر کے جنگل کا محاصرہ کر لیا۔ زبردست جنگ کے بعد پچاس ہزار ہندو تہہ تیغ ہو گئے اور راجہ نے اپنی بیوی سمیت خودکشی کر لی۔ قلعہ مہابن سے بے شمار دولت کے علاوہ غنیمت میں اَسی ہاتھی حاصل ہوئے۔

متھرا کی فتح: ''متھرا'' ہندوؤں کا مذہبی مرکز تھا اور دہلی کے راجہ کے مقبوضات میں شامل تھا، ہندوؤں کے

نزدیک اسے سری کرشن کی جنم بھومی ہونے کے ناطے بے پناہ احترام حاصل تھا۔ یہاں کی آبادی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی جس میں جمنا کے دونوں طرف ایک ہزار قلعے اور بے شمار عظیم الشان مندر تھے۔ سلطان نے کسی دشواری کے بغیر متھرا پر قبضہ کرلیا اور بت خانوں کو منہدم کرنے میں کسی رعایت سے کام نہ لیا۔

متھرا کی فتح کے بعد سلطان نے غزنی کے امراء کو ایک خط میں متھرا کی طلسمی تعمیرات اور بے پناہ دولت کا حال یوں لکھا: ''اس شہر میں ایک ہزار نہایت بلند محل (قلعے) ہیں، اکثر سنگِ مرمر کے ہیں۔ مندروں کی تعداد اتنی ہے کہ انہیں منہدم کراتے کراتے میں تھک گیا ہوں لیکن انہیں گن نہیں سکا۔ جیسی عمارتیں یہاں ہیں ایسی کوئی عمارت بہت ماہر کاریگروں کے ہاتھوں ہی تعمیر کرائی جاسکتی ہے۔''

متھرا کے مالِ غنیمت میں پانچ بت مکمل سونے کے اور سو (100) بت چاندی کے ہاتھ لگے۔ مال غنیمت میں ملنے والی چاندی اتنی تھی کہ اسے لادنے کے لیے سو اونٹ منگوانے پڑے۔

قنوج کی فتح: متھرا کے بعد سلطان نے اپنی اصل منزل قنوج کی طرف کُوچ کیا۔ قنوج کا راجہ ''جے پال'' فوجِ کثیر کا مالک ہونے کے باوجود ڈر کر فرار ہوگیا۔ یہاں دریائے گنگا کے ساتھ ساتھ شہر کی فصیل کے اندر سات مضبوط قلعے تھے جن میں چار چار ہزار سال پرانے بت خانے بھی تھے۔ سلطان نے ان قلعوں کو فتح کرلیا جس کے باعث قنوج شہر کا مدافعانہ نظام کمزور پڑ گیا، شہر کے نئے راجہ کورہ (کنور رائے) نے سلطان کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنے اہل وعیال سمیت اِسلام قبول کرلیا۔

برہمنوں کا مرکز منج: قنوج کے بعد سلطان نے موجودہ کانپور سے دس میل کے فاصلے پر برہمنوں کے مرکز منج شہر کا محاصرہ کرلیا۔ یہاں کے لوگ انتہائی متعصب ہندو تھے۔ پندرہ دن کے محاصرے کے باوجود انہوں نے ہار نہ مانی۔ آخر میں وہ ہتھیار سنبھال کر باہر نکل آئے اور لڑتے لڑتے مارے گئے۔ باقی ماندہ افراد نے قلعے کی فصیل سے کود کر خودکشی کرلی یا اپنے بال بچوں سمیت آگ میں کود کر خود کو ختم کرلیا۔ دراصل برہمنوں نے ان لوگوں کے دلوں میں سلطان محمود غزنوی اور مسلمانوں کی اس قدر نفرت بٹھادی تھی کہ انہوں نے ہتھیار ڈالنے پر موت کو ترجیح دی اور جو لڑنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے وہ خودکشی کے بغیر نہ رہے۔

یہ واقعہ مسلم فاتحین کے بارے میں برہمن ذہنیت کی حد درجہ گھٹن اور تنگ نظری کا عکاس ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے عوام کو مسلمانوں سے کسی خیر کی توقع سے بالکل مایوس کردیا تھا حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔

بزدل راجہ: سلطان کا اگلا حملہ قلعہ اسونی پر تھا، یہ موجودہ فتح پور سے شمال مشرق کی جانب تقریباً 17 کلومیٹر کے فاصلے پر گھنے جنگلات میں گھرا ہوا ہے۔ اس وقت اس کے گرد ایک طویل اور گہری خندق

تھی۔ یہاں کے راجہ چنڈیل بھور کے پاس پانچ مزید قلعے بھی تھے۔ اگر وہ جم کر لڑتا تو مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا سکتا تھا مگر اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ اپنے خزانے اور اہل وعیال سمیت کوہستانی علاقے کی طرف فرار ہو گیا۔ سلطان نے قلعہ اسونی پر قبضہ کر لیا اور باقی پانچوں قلعے منہدم کرا دیئے۔

خداداد ہاتھی: اس کے بعد سلطان راجہ چندرائے کے علاقے کی طرف بڑھے۔ وہ اپنے ہاتھیوں اور سپاہیوں سمیت جنگلات میں چھپ گیا۔ اس کے پاس ایک کوہ پیکر جنگی ہاتھی تھا جس کی مثال پوری سرزمین ہند میں نہ تھی۔ راجہ کے فرار کے بعد یہ ہاتھی خود بھاگ کر ایک رات سلطان کے فوجی کیمپ میں آ گیا اور سیدھا شاہی خیمے کے پردے کے سامنے پہنچ کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ سلطان محمود اسے عطیۂ خداوندی سمجھ کر بے حد خوش ہوئے۔ اس خوشی میں ایک تقریب کا اہتمام کیا اور اس لاثانی ہاتھی کو ''خداداد'' کا نام دیا گیا۔ اسی سفر میں سلطان نے ایک بار پھر کشمیر کے ناقابل تسخیر قلعے لوہ کوٹ کا محاصرہ کیا...... مگر اس بار بھی انہیں ناکامی ہوئی۔ سلطان نے حالات سازگار نہ دیکھ کر محاصرہ اُٹھا لیا اور لاہور کا رُخ کیا جہاں انند پال کا بیٹا حاکم تھا، وہ سلطان کی آمد کی خبر سن کر بھاگ نکلا۔ سلطان نے لاہور سمیت پورے مغربی پنجاب پر قبضہ کر لیا اور اسے باقاعدہ غزنی کی سلطنت کا حصہ بنا کر اپنے وفادار غلام ایاز کو یہاں کا گورنر مقرر کر دیا۔

عجیب وغریب چیزیں: سلطان کی یہ مہم نہایت کامیاب رہی تھی، وسیع وعریض علاقہ اور بڑے بڑے نوادرات ہاتھ آئے تھے۔ ایک عجیب پتھر ملا تھا جسے گھس کر گہرے سے گہرے زخم پر لگا دیا جاتا تو راتوں رات وہ زخم مندمل ہو جاتا۔ ایک ایسا پرندہ بھی ہاتھ آیا تھا جو زہر کی پہچان رکھتا تھا۔ اگر اس کے ارد گرد کوئی زہریلی چیز موجود ہوتی تو وہ بے چین ہو کر آنسو بہانے لگتا تھا، یہ پرندہ سلطان نے تحفے کے طور پر اس وقت کے خلیفہ القادر باللہ عباسی کی خدمت میں بغداد روانہ کر دیا۔

ہندو قیدی: سلطان کی ان مہمات میں بے شمار ہندو قیدی بنا کر غزنی لے جائے گئے تھے۔ غزنی میں ان کی اس قدر بہتات ہوئی کہ انہیں کوڑیوں میں فروخت کیا گیا۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں ان کی اکثریت مسلمان ہو گئی تھی جبکہ کچھ اپنے آبائی مذہب پر برقرار رہے تھے۔ افغانستان میں آج بھی کچھ ہندو آباد ہیں۔ بعض مورخین انہیں انہی ہندوؤں کی اولاد بتاتے ہیں جو سلطان محمود کے ساتھ افغانستان آئے تھے۔

فتح نامہ: اس مہم سے فراغت پر سلطان نے اپنی فتوحات پر مشتمل ایک کتاب ''فتح نامہ'' مرتب کرا کے خلیفہ بغداد کو روانہ کی۔ یہ 410ھ (1022ء) کا قصہ ہے۔ خلیفہ نے یہ کتاب ایک بڑی تقریب میں سب کو سنوائی۔ یہ کتاب دور دور تک پھیل گئی اور سلطان کی حیرت انگیز فتوحات پر عالمِ اسلام کے طول

وعرض میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

مسجد عروس فلک: ان فتوحات کی شکر گزاری کے طور پر سلطان نے غزنی میں ''عروس فلک'' نامی شاندار مسجد کی تعمیر کا آغاز کیا، اس کے ساتھ ایک بڑا مدرسہ بھی بنوایا جس میں طلبہ اور مدرسین کے لیے تمام سہولیات مہیا کی گئیں۔ ہزاروں کتب پر مشتمل ایک وسیع کتب خانہ بھی بنوایا گیا۔

تیرہواں حملہ: آپ پڑھ چکے ہیں کہ ہندوستان کے دارالحکومت قنوج کے راجہ کنور نے نہ صرف سلطان کی اطاعت قبول کرلی تھی بلکہ اسلام بھی قبول کرلیا تھا۔ اس کے مسلمان ہوجانے پر ہندو سخت مشتعل تھے اور سلطان محمود کی واپسی کے بعد کالنجر کا راجہ ''نندا'' اسے بدترین انجام کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ سلطان کو غزنی میں یہ خبریں ملیں تو فوج کو ہندوستان کی طرف کوچ کا حکم دیا مگر ابھی کچھ فاصلہ طے ہوا تھا کہ قنوج کے نومسلم راجہ کے قتل کی افسوس ناک اطلاع آن پہنچی۔ مخبر نے بتایا کہ کالنجر کے راجہ نے باقاعدہ فوج کشی کر کے اسے قتل کیا ہے۔ سلطان کو اس اطلاع سے بے حد صدمہ پہنچا۔ انہوں نے لشکر کو فوری طور پر آگے بڑھایا اور ہندوستان کی حدود میں داخل ہوگئے۔ دریائے جمنا طغیانی پر تھا اور دوسرے کنارے پر انند پال کا بیٹا ترلوچن پال اپنے لشکر کے ساتھ سلطان کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ کہنے کو تو وہ راجہ نندا کی مدد کے لیے آیا تھا مگر دراصل وہ سلطان سے لاہور کی شکست کا بدلہ دریائے جمنا کے کنارے لینا چاہتا تھا۔ یہ بدطینت خاندان سلطان کے ہاتھوں بار بار شکست کھانے اور اظہار اطاعت کرنے کے باوجود اپنی فطرت سے مجبور تھا۔

سلطان کے اشارے پر آٹھ ہزار جانباز دریا میں اُتر گئے اور لہروں کو چیر کر کنارے جا لگے۔ ان کے پیچھے پیچھے اور بھی کئی دستے دریا عبور کرنے میں کامیاب ہوگئے، ترلوچن پال کا لشکر مختصر سی مزاحمت کے بعد بھاگ کھڑا ہوا اور سلطانی لشکر نے کالنجر پہنچ کر راجہ نندا کو مقابلے میں آنے کی دعوت دی۔ سلطان کے پاس اس بار زیادہ فوج نہ تھی جب کہ راجہ نندا 36 ہزار سواروں، 45 ہزار پیادوں اور 640 ہاتھیوں کو لے کر مقابلے پر نکلا تھا۔ ہاتھیوں کی اتنی بڑی تعداد اب تک کسی جنگ میں مقابل نہیں آئی تھی اس لیے سلطان پریشان ہوگئے۔ ایک ٹیلے پر چڑھ کر وہ دشمن کی تیاریوں اور ہاتھیوں کی فوج کا نظارہ کر رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اتنی کم فوج کے ساتھ مقابلے کے لیے آجانا نادانی تھی۔

رات کو انہوں نے اللہ کی بارگاہ میں زار و قطار رو کر فتح کی دُعا کی۔ یہ دُعا ایسی قبول ہوئی کہ رات ہی کو نندا نے جنگ کا ارادہ ترک کردیا۔ اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ راتوں رات میدان سے فرار ہوگیا، کالنجر سے سلطان کی افواج کو 580 ہاتھی اور بے شمار مال غنیمت حاصل ہوا۔ سلطان اس فتح کے بعد واپس اُفغانستان لوٹ گئے۔

چودھویں مہم: کچھ مدت بعد سلطان کو معلوم ہوا کہ شمالی ہندوستان کے بعض علاقوں میں اب تک بت پرستی زور وشور سے جاری ہے۔ ان میں قیرات اور ناردین کے علاقے زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔ اگلی مہم میں سلطان نے قیرات اور ناردین ہی کو ہدف بنا کر وہاں حملہ کیا۔ دونوں علاقے آسانی سے فتح ہو گئے۔ ناردین میں ایک نیا قلعہ بھی تعمیر کرایا۔ ناردین کے سب سے بڑے مندر کو مسمار کرنے کے دوران ایک پتھر برآمد ہوا جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ یہ مندر 40 ہزار سال پرانا ہے۔ تاہم یہ خلاف حقیقت بات تھی۔

قیرات اور ناردین سے کون سے علاقے مراد ہیں؟ تاریخ فرشتہ کے مطابق یہ ہندوستان اور ترکستان کے درمیان ایک سرد خطہ ہے جہاں کے سبزہ زار اور پھل بے حد مشہور ہیں۔ جدید تحقیق کے مطابق اس سے پاکستان کے شمالی علاقے چترال، سوات اور کافرستان وغیرہ مراد ہیں۔

پندرہواں حملہ: سلطان نے کالنجر کے راجہ نندا کی قوت کو مکمل طور پر توڑنے کے لیے 413ھ (1022ء) میں ایک بار پھر ہندوستان پر فوج کشی کی۔ پہلے گوالیار کا محاصرہ کیا جہاں کے راجہ نے اطاعت کا وعدہ کر کے امان حاصل کر لی۔ اگلی منزل کالنجر تھی جہاں راجہ نندا موجود تھا۔ اس نے بھی مرعوب ہو کر صلح کی درخواست کی اور تین سو مست ہاتھی فیل بانوں کے بغیر سلطان کی خدمت میں پیش کیے تاکہ مسلمانوں کی ہمت آزمائی جائے...... سلطان کے حکم پر ترک سپاہی کسی ہچکچاہٹ کے بغیر ان ہاتھیوں پر لپک کر سوار ہو گئے اور انہیں قابو کر لیا۔ یہ دیکھ کر ہندو راجہ اور اس کے امراء عش عش کر اُٹھے۔

415ھ (1024ء) میں سلطان محمود غزنوی اپنی طاقت کا سکہ ہر طرف جما چکے تھے۔ ان کی ذاتی کمان میں 54 ہزار سپاہی اور تین سو ہاتھیوں کی فوج تھی۔ ان کے علاوہ ہزاروں سپاہی خوارزم سے دریائے جمنا تک چھاؤنیوں اور حفاظتی چوکیوں میں موجود تھے۔

اس سال سلطان نے وسط ایشیا میں علی تگین نامی باغی سردار کا فتنہ فرو کرنے میں بھی کامیابی حاصل کی تھی۔ یہ سلطان کے انتہائی عروج واقبال کا زمانہ تھا اور ہندوستان کے تمام راجے مہاراجے ان سے لرزہ براندام تھے۔

سومنات کی مہم: سلطان محمود غزنوی رحمہ اللہ کی فتوحات کے اس سلسلے میں اب ہم اس یادگار معرکے کا ذکر کرتے ہیں جس نے سلطان کا نام تاریخِ عالم میں شمس وقمر کی طرح روشن کیا اور جس کے تذکرے سے آج بھی ہر مسلمان کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ سلطان نے اس موقع پر ایسی جرأت وبسالت کا مظاہرہ کیا جس کی مثالیں کم یاب ہیں، اس عظیم معرکے کو تاریخ میں ''سومنات کی فتح'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان دنوں سلطان محمود غزنوی اس بات پر غور کر رہے تھے کہ ہندوؤں کے بڑے بڑے مندر، قلعے،

شہر اور ملک مجاہدین کی شمشیرِ بے نیام کے سامنے سرنگوں ہو چکے ہیں مگر اس کے باوجود ہندوستان کے عوام اب تک بت پرستی کے اندھیروں میں اُسی طرح بھٹک رہے ہیں اور بتوں کا طلسم اب تک ان کے ذہنوں پر چھایا ہوا ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

سلطان کے استفسار پر چند معتمد افراد نے بتایا کہ مغربی ہندوستان میں سمندر کے کنارے ایک شاندار مندر ہے۔ جہاں ''سومنات'' نامی ایک بت ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق ''سومنات'' تمام بتوں کا بادشاہ ہے اور باقی تمام بت اس کے وزیر اور غلام ہیں۔ انسانوں کی روحیں مرنے کے بعد سومنات کے دربار میں حاضر ہوتی ہیں اور وہی انہیں ''نیا جنم'' عطا کرتا ہے۔ سلطان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ برہمن ہندو عوام کے حوصلوں کو برقرار رکھنے کے لیے یہ پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ اب تک وہی بت کدے مسلمانوں کے ہاتھوں پامال ہوئے ہیں جن سے سومنات ناراض تھا، چنانچہ اس نے ان بتوں کی حفاظت نہ کی۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمان انہیں تباہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ورنہ سومنات ایک لمحے میں مسلمانوں کو نیست و نابود کر سکتا ہے۔

سولہواں حملہ: ہندوؤں کی اس بدعقیدگی اور گمراہ کن پروپیگنڈے کا جادو توڑنے کے لیے سلطان محمود غزنوی نے ایک بار پھر کمر ہمت باندھی اور جمعہ 20 شعبان 416ھ (15 اکتوبر 1025ء) کو غزنی سے سومنات کی طرف روانہ ہوئے۔ تیس ہزار سپاہی ان کے ہم رکاب تھے اور بہت سے رضا کار بھی۔

سومنات کا مندر: بھارت کے صوبۂ گجرات کے جزیرہ نما کاٹھیاواڑ میں سمندر کے کنارے سومنات نامی شہر آج بھی آباد ہے اور سومنات کا مندر بھی۔ سومنات اصل میں دو لفظوں سوم اور ناتھ کا مرکب ہے۔ سوم کا معنیٰ ہے چاند اور ناتھ کا معنیٰ ہے سردار۔ اس طرح سومنات کا مطلب ہوا چاند کا سردار۔ سومنات کا بت عام بتوں کی طرح چہرے یا ہاتھ پیروں والا مجسمہ نہیں تھا۔ بلکہ یہ لنگ (عضوِ تناسل) کی شکل کا تھا جو دیکھنے میں کھمبے کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اس کی لمبائی پندرہ فٹ تھی۔ یہ چھ فٹ چبوترے میں گڑا ہوا تھا اور نو فٹ باہر تھا۔

ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ کسی زمانے میں سوم یعنی چاند دیوتا نے کوئی گناہ کر ڈالا تھا جس کے کفارے کے طور پر اس نے مہادیو کے لنگ کا یہ بت بنا کر اس مندر میں رکھ دیا تھا۔ اس جھوٹی کہانی نے ہندوؤں کے نزدیک اس بت کو بے حد مقدس بنا دیا تھا۔ اس مندر میں عوام کا اس قدر ہجوم رہتا تھا کہ دو ہزار پجاری انہیں پوجا پاٹ کے آداب سکھانے میں مشغول رہتے تھے۔ وہ رقاصائیں اور گلوکارائیں جو مندر میں ناچتی گاتی تھیں 500 تھیں۔ مندر کے مستقل اخراجات کے لیے گرد و نواح کے راجاؤں نے دس ہزار

دیہاتوں کی آمدنی وقف کر رکھی تھی۔ اس کے علاوہ تحائف اور نذرانوں کا ایک سیلاب ہر طرف سے اُمڈا چلا آتا تھا۔ مندر کی محفوظ دولت ہندوستان کے تمام راجاؤں سے زیادہ تھی۔ اس بت خانے کی عمارت مخروطی تھی اور کئی منازل پر مشتمل تھی۔ اس کے مغرب کی طرف ایک بہت کشادہ چبوترا تھا جس کی سیڑھیاں سمندر کے پانی میں اُترتی چلی جاتی تھیں۔ جب سمندر کی لہریں سیڑھیوں سے ٹکرا کر پلٹتیں تو ہندو یہ سمجھتے کہ یہ بھی دیوتا کی عبادت کر رہی ہیں۔

مندر کے اندرونی حصے کے ایک وسیع مگر تاریک کمرے میں وہ بت تھا جس کی پوجا کی جاتی تھی۔ اس کمرے کی چھت 56 ستونوں پر کھڑی تھی۔ رات کے وقت بھی یہاں کسی چراغ یا قندیل کا انتظام نہ کیا جاتا بلکہ روشنی کے لیے وہ جواہرات اور ہیرے کافی تھے جو چھت میں لگے فانوسوں میں جڑے ہوتے تھے۔ بت کی پوجا کے وقت ایک بہت بڑی گھنٹی بجائی جاتی تھی، اس گھنٹی کی زنجیر کا وزن دو سو من تھا اور وہ مکمل طور پر سونے سے ڈھالی گئی تھی۔ بت کے اشنان (غسل) کے لیے دریائے گنگا سے پانی کے بے شمار ڈول، متواتر پہنچتے رہتے تھے حالانکہ گنگا یہاں سے 18 سو کلومیٹر سے زیادہ فاصلے پر ہے۔ پوجا کے اوقات میں تین سو گویے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ان کے بھجن گانے کا انداز سامعین کو بے خود کر دیتا تھا۔ بھجن کے ساتھ ساتھ سومنات کی رقاصاؤں کا رقص دیکھ کر حاضرین پر عجیب سی مستی طاری ہو جاتی تھی۔ چاندنی راتوں میں جب سمندر کا پانی جوش میں اوپر اٹھتا تو سومنات کے پجاری اسے بھی بت کا کمال سمجھ کر خوش ہوتے۔ چاند گرہن کے موقع پر سارا گجرات یہاں اُمڈ آتا اور ایک لاکھ سے زیادہ افراد بیک وقت سومنات کی عبادت کے لیے جمع ہو جاتے۔

کٹھن سفر: سلطان محمود غزنوی ان تمام تفصیلات کو جاننے کے بعد گجرات کی طرف رواں دواں تھے۔ رمضان کے مہینے میں وہ ملتان پہنچے اور کچھ دن ٹھہر کر راجستھان کی طرف مڑ گئے۔ اس انتہائی وسیع وعریض اور دشوار گزار صحرا کو عبور کرنے کے لیے انہوں نے بیس ہزار اونٹوں پر پانی اور خوراک کا ذخیرہ ساتھ لے لیا تھا۔ سفر کا یہ خطرناک ترین مرحلہ طے ہوا تو سامنے ''اجمیر'' کا شہر نظر آیا۔ سلطان نے شہر سے خوراک و رسد حاصل کر کے وقت ضائع کیے بغیر آگے کوچ کر دیا۔ راستے میں کئی اور قلعے بھی آئے، اکثر قلعہ داروں نے مرعوب ہو کر لڑے بغیر ہی دروازے کھول دیے۔

سلطان نہروالہ (پٹن گجرات) پہنچے تو وہاں کے باشندے نقل مکانی کر چکے تھے۔ یہ ماہ ذی قعدہ 415ھ کے ابتدائی دن تھے۔ سلطان نے یہاں سے مزید رسد حاصل کی اور اگلے مرحلے میں سومنات کے قریب جا پہنچے۔

مضبوط دفاع: سومنات سے تین میل کے فاصلے پر دریائے سرسوتی کاٹھیاواڑ کے سمندر میں گرتا تھا۔ دریا اور مندر کے درمیان سومنات کا شہر آباد تھا۔ یہاں سمندر کے ساحل پر سومنات کی مشہور تجارتی بندرگاہ بھی تھی۔ مندر کی بیرونی دیوار ایک الگ شہر کی طرح فصیل کی طرح نہایت بلند اور مضبوط تھی۔ اس وسیع احاطے میں سومنات کا قلعہ بھی تھا اور اس کی حفاظت کے لیے ایک مستقل فوج بھی یہیں مقیم تھی۔ سلطان کی آمد کی خبر سُن کر سولنگی خاندان کے بڑے راجہ بھیم دیو سمیت گرد و نواح کے 27 راجے سومنات کی حفاظت کے لیے متحد ہو چکے تھے۔

سومنات کے سامنے: جمعرات 14 ذی قعدہ (6 جنوری 1026ء) کی سرد صبح سلطان محمود غزنوی دو ماہ چوبیس دن کا تھکا دینے والا سفر طے کر کے سومنات کی فصیل کے سامنے جا پہنچے۔ دور ہی سے مندر کے سنہری کلس سورج کی کرنوں سے چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔ سمندر کا بپھرا ہوا پانی قلعے کی دیواروں کے ساتھ ٹکرا رہا تھا اور فصیل پر لاتعداد افراد کھڑے تھے۔ یہ ہندوؤں کی وہ اجتماعی طاقت تھی جو ہر طرف سے سمٹ کر کفر و شرک کے اس تاریک ترین مورچے میں جمع ہو چکی تھی۔ ان میں سپاہی بھی تھے اور رضا کار بھی، مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، بوڑھے اور بچے بھی۔ یہ سب سومنات دیوتا کے ہاتھوں مسلمانوں کے بھسم ہونے کا منظر دیکھنے فصیل پر چڑھے تھے۔ وہ بے ہنگم انداز میں شور مچا رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے۔ مشتعل پجاری چلّا چلّا کر کہہ رہے تھے: ''ہمارا معبود سومنات خود تمہیں یہاں گھسیٹ لایا ہے تاکہ تم سب کو نیست و نابود کر دے۔''

پہلے دن کی لڑائی: اِسلامی لشکر نے سومنات کی فصیل کے باہر پڑاؤ ڈال دیا، سلطان محمود کے حکم سے جانباز سپاہی صف در صف فصیل کی طرف بڑھے اور تیر اندازی سے ان دشمنوں کو گھائل کرنے لگے جو فصیل پر چڑھے ہوئے تھے۔ فصیل سے بھی سنگ باری اور تیروں کی بوچھاڑ جاری رہی مگر کچھ ہی دیر میں ہندوؤں کو یہ خیال آیا کہ سومنات کی موجودگی میں ہمیں جنگ کرنے کی ضرورت نہیں۔ سومنات خود ہی انہیں ہلاک کر دے گا۔ یہ سوچ کر ان کی بڑی تعداد فصیل سے اُتر کر مندر میں چلی گئی۔ پجاری سومنات کے سامنے گڑگڑا کر فریادیں کرنے لگے، جبکہ مسلمان موقع سے فائدہ اُٹھا کر فصیل کے ایک حصے پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ تاہم انہیں روکنے کے لیے اب بھی جنگجو ہندو خاصی تعداد میں موجود تھے۔ اندھیرا پھیلنے تک فصیل سے لاشیں گرتی رہیں، رات کی تاریکی میں مسلمان واپس اپنے پڑاؤ میں آ گئے۔ یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ ہندو سومنات کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگانے پر آمادہ ہیں۔

لڑائی کا دوسرا دن: اگلے دن سلطان کی قیادت میں اِسلامی لشکر نے ایک بار پھر زوردار حملہ کیا۔ مجاہدین

فصیل پر کئی سمتوں سے حملہ آور ہوئے، ان کی تیراندازی نے فصیل پر متعین ہندو سپاہیوں کو سر اُٹھانے کا موقع نہ دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سینکڑوں مجاہدین سیڑھیوں اور کمندوں کے ذریعے فصیل پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے اور ایک ریلے کی طرح تیزی سے قلعے کے صحن میں اُترنے لگے۔ ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد مندر میں جمع تھی۔ سومنات کو خطرے میں دیکھ کر وہ بت سے لپٹ کر اس کی حفاظت کی قسمیں کھانے لگے۔ انہوں نے تلواریں سونتیں اور جتھوں کی صورت میں مندر سے نکل نکل کر قلعے میں جمع ہونے لگے اور مندر کے وسیع صحن میں ایک خونریز جنگ شروع ہو گئی، شام تک کشتوں کے پشتے لگتے رہے۔ یہاں تک کہ اندھیرا پھیل گیا۔

دوسرے دن کی لڑائی کے اختتام پر مسلمان قلعے کے ایک حصے پر قبضہ کر چکے تھے اور اب ان کے سامنے سومنات کا مندر تھا جس میں لاتعداد ہندو اپنے دیوتا کے تحفظ کے لیے سر ہتھیلی پر لیے کھڑے تھے۔

فیصلہ کن معرکہ: اگلے دن جنگ کا فیصلہ کن مرحلہ شروع ہونے کو تھا کہ سلطان کو ایک پریشان کن اطلاع ملی۔ ''دابشلیم'' اور ''پرم دیو'' نامی دو جنگجو ہندو راجا زبردست لشکر لے کر سومنات کے پجاریوں کی مدد کے لیے آ رہے تھے۔

یہ اطلاع پا کر سلطان، نے اپنی فوج کے بڑے حصے کو قلعے سے باہر نکال لیا اور کھلے میدان میں صفیں بنانے کا حکم دیا۔ ہندو لشکروں کے پہنچتے ہی گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ مندر میں ناقوس اور گھنٹے بجنے لگے۔ سومنات کے پجاریوں کو یقین تھا کہ اس موقع پر سومنات کی طاقت ہی ان ہندو افواج کو کھینچ کر لائی ہے اور عنقریب یہاں مسلمانوں کی لاشیں چیل اور کوؤں کی خوراک بن رہی ہوں گی۔ ہندوستان کے میدانوں میں اتنا سخت معرکہ پہلے کبھی نہیں لڑا گیا تھا۔ ہندو لشکروں کا بے پناہ دباؤ مسلمانوں کی صفوں کو درہم برہم کیے دے رہا تھا اور ان کی پشت پر قلعے اور مندر میں دشمنوں کا ایک اور سیلاب بھی ان پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار تھا۔ ان کے لیے کوئی جائے فرار نہیں بچی تھی۔ ہر کوئی یہ محسوس کر رہا تھا کہ چند لمحوں میں مسلمانوں کے قدم اُکھڑ جائیں گے۔

اس نازک صورت حال میں سلطان محمود غزنوی سجدے میں گر پڑے اور حق تعالیٰ شانہٗ کے سامنے اس عاجزی اور بے بسی کے ساتھ دُعا کی کہ رحمتِ خداوندی کو جوش آ گیا۔ دعا کے بعد سلطان گھوڑے پر سوار ہوئے اور سپاہیوں کو اپنی قیادت میں لے کر دشمن پر ایک طوفانی حملہ کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں راجہ پرم دیو اور راجہ دابشلیم کے لشکر سر پر پاؤں رکھ کر میدان جنگ سے بھاگ رہے تھے اور مندر کے ہندو مایوسی کے عالم میں اپنے ہونٹ کاٹ رہے تھے۔

میدان کو دشمنوں سے صاف کرنے کے بعد غزنوی سپاہ کا ریلا ایک بار پھر قلعے میں داخل ہونے لگا۔ ادھر ہندوؤں نے بھی مندر کی حفاظت کے لیے دوبارہ شدید ترین مزاحمت شروع کر دی۔ ان کی ٹولیاں یکے بعد دیگرے سومنات کے سامنے جا کر گڑگڑاتیں اور پھر نئے جوش وجذبے کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ آور ہو جاتیں۔

مندر کی طلسمی عمارت کے ہر گوشے میں اِسلام اور کفر کا فیصلہ کن معرکہ جاری تھا۔ ہندوؤں کی اس قدر لاشیں گریں کہ مندر کا صحن، راہداریاں، سیڑھیاں، کمرے اور چبوترا سب خون آلود ہو گئے۔ جب اِسلامی لشکر مندر کے مرکزی ہال تک جا پہنچا تو لڑنے والوں کی ہمت جواب دے گئی اور وہ مندر کا ہال پھلانگ کر سمندر کی طرف اُترنے والی سیڑھیوں کی طرف بھاگے۔ وہاں سینکڑوں کشتیاں موجود تھیں۔ ہزاروں برہمنوں، پنڈتوں، پجاریوں اور یاتریوں نے ان میں بیٹھ کر سری لنکا کا رُخ کیا مگر انہیں معلوم نہ تھا کہ سلطان نے ان کا بندوبست کر رکھا ہے۔ مسلمانوں کا ایک دستہ کشتیوں میں ان کی مزاج پرسی کے لیے پہلے سے گھات میں تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مفرور پجاریوں کی بڑی تعداد سمندر میں غرق ہو گئی۔ اس شاندار فتح کے بعد سلطان محمود غزنوی سومنات بت کو دیکھنے کے لیے بت کدے کے مرکزی ہال میں آئے۔ پجاریوں کو یقین تھا کہ سلطان وہاں پہنچتے ہی بھسم ہو جائیں گے مگر جب انہیں صحیح وسلامت دیکھا تو انہیں یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں یہ بت بھی ''متھرا'' اور ''تھانیسر'' کے بتوں کی طرح پاش پاش نہ کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے سلطان سے درخواست کی کہ وہ منہ مانگی دولت لے لیں مگر اس بت کو باقی رہنے دیں۔

اس درخواست کے جواب میں سلطان کے یہ الفاظ تاریخِ اِسلام کے تابندہ نقوش بن گئے: ''اگر میں تمہارے کہے پر چلوں گا تو دنیا مجھے 'محمود بت فروش' کے نام سے یاد کرے گی جبکہ مجھے یہ پسند ہے کہ دنیا اور آخرت میں مجھے 'محمود بت شکن' کے نام سے پکارا جائے۔''

سلطان نے سومنات کو توڑ ڈالا اور بت پرستی کے اس مرکز کو اُجاڑ کر دم لیا۔ ہندوستان میں بت پرستی کا یہ سب سے بڑا مرکز سلطان کے ہاتھوں اس طرح ویران ہوا کہ بت پرستوں پر اپنے جھوٹے خداؤں کی بے بسی بالکل واضح ہو گئی۔

کندھ کوٹ پر قبضہ: سومنات کی فتح کے بعد سلطان غزنی واپس جانا چاہتے تھے مگر اس سے پہلے نہر والہ کے راجہ پرم دیو کی سرزنش ضروری تھی جس نے سومنات کی جنگ میں ہندوؤں کے لیے امدادی فوج بھیج کر مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔ پرم دیو ''کندھ کوٹ'' کے قلعے میں پناہ لیے ہوئے تھا جس کی حفاظتی

خندقیں بہت گہری تھیں مگر سلطان کسی دُشواری کے بغیر قلعے تک پہنچ گئے اور پرم دیو بھاگ نکلا۔

بھیانک سازش: سلطان کو اطلاع مل چکی تھی کہ بعض ہندو راجے مسلمانوں کی واپسی کے دوران انہیں روکنے کی کوشش کریں گے۔ چونکہ غزنی جلد واپسی ضروری تھی اس لیے سلطان نے کسی نئی مہم میں الجھنے سے بچنے کے لیے راستہ تبدیل کرلیا اور مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے سندھ کا رُخ کیا۔

اس دوران رہنمائی کا کام ایک ہندو برہمن انجام دے رہا تھا۔ وہ لشکر کو ایک ایسے صحرا میں لے آیا جہاں پانی کا ایک قطرہ تک نہ تھا اور راستے کا کوئی پتہ نہ تھا۔ اس لق دق بیابان میں سپاہیوں اور جانوروں کا پیاس سے برا حال ہوگیا۔

مورخ فرشتہ کے بقول سپاہیوں کے لیے وہ جنگل میدانِ قیامت بن گیا تھا، رات کے وقت یہ حالت دیکھ کر سلطان نے برہمن رہبر سے پوچھا: ''تم فوج کو کس سمت لے جا رہے ہو؟''

''موت کی طرف'' اس نے مکاری سے مسکرا کر جواب دیا۔ ''میں سومنات کا جاںنثار ہوں میں جان بوجھ کر تم سب کو یہاں لایا ہوں تاکہ تمہیں ہلاک کر کے انتقام کی آگ بجھا سکوں۔''

سلطان نے اس بدبخت کو قتل کرادیا، پھر اللہ تعالیٰ کے حضور اس مصیبت سے نجات کے لیے بے تابانہ دُعا کی۔ اسی شب صحرا کے شمالی سمت عجیب سی روشنی دکھائی دی۔ سلطان نے لشکر کو اس جانب چلنے کا حکم دیا۔ صبح تک وہ روشنی کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ سورج کی پہلی کرنوں کے ساتھ دریائے سندھ کے ساحل پر لہلہاتے کھیت، نہریں اور تالاب ان کے سامنے تھے۔ مجاہدین نے جی بھر کر پیاس بجھائی۔ ان کی سواریاں بھی سیراب ہوگئیں۔

دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے سلطان ملتان پہنچے اور ایک طویل مہم کے بعد 11 صفر 417ھ (2 اپریل 1026ء) کو غزنی پہنچ کر دم لیا۔

سترہواں حملہ: سومنات سے واپسی کے سفر میں دریائے سندھ کے کنارے جاٹ قبائل نے اِسلامی لشکر پر پے در پے حملے کر کے خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ یہ جنگجو قبائل جنگلات سے نکل کر یکدم حملہ آور ہوتے اور سامانِ رسد لوٹ کر لے جاتے تھے۔ محرم 418ھ (مارچ 1027ء) میں سلطان نے ان سرکش قبائل کی سرکوبی کے لیے پنجاب کا رُخ کیا۔ ملتان پہنچ کر سلطان نے چودہ سو کشتیاں تیار کرائیں، جن کے سامنے اور دائیں بائیں لوہے کی مضبوط لمبی اور نوکدار سلاخیں لگی تھیں۔

جاٹ قبائل کو سلطان کی آمد کا پتا چلا تو وہ چار ہزار کشتیوں میں سوار ہوکر اِسلامی لشکر کے مقابلے پر آئے۔ ایک منفرد انداز کی جنگ شروع ہوئی۔ جاٹوں کی کشتیاں مسلمانوں کی کشتیوں کے قریب آتے

ہی فولادی سلاخوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی تھیں۔ اس جنگ میں جاٹوں کے ہزاروں آدمی ڈوب کر اور ہزاروں فرار ہوتے ہوئے خشکی پر متعین افواج کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ ہندوستان میں یہ سلطان کا سترھواں اور آخری حملہ تھا۔

آخری مہمات: سلطان کی آخری مہمات 418ھ (1027ء) کے اواخر میں سلجوقی قبائل اور قرامطیوں کے خلاف شروع ہوئیں۔ سلجوقی قبائل دریائے آمو عبور کر کے گردونواح میں افراتفری پھیلا رہے تھے۔ سلطان کا کوئی سالار انہیں دبانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ آخر سلطان محمود غزنوی نے خود جا کر ان کی سرکوبی کی۔ اس کے ساتھ ساتھ سلطان نے خراسان کے شمال مغرب میں مزید پیش قدمی کر کے ''رے'' پر قبضہ کر لیا جہاں قرامطی اور دیگر گمراہ فرقے کے پیروکاروں کو ہاتھ پیر پھیلانے کا موقع مل رہا تھا۔ سلطان نے ''رے'' پر قبضے کے بعد اس خطے کے تمام بے دینوں اور زندیقوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

آخری سفر: سلطان محمود غزنوی سالہا سال تک انتھک مہمات اور اسفار کے باعث بیمار پڑ چکے تھے مگر ایک عرصے تک انہوں نے اپنی بیماری کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ آخر مرض نے شدید نوعیت اختیار کر لی۔ اسی حالت میں سلطان نے ایک دن اپنے تمام مال و اسباب کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ ایک میدان میں تمام ہاتھی، اونٹ، گھوڑے اور دیگر جانوران کے سامنے پیش کیے گئے۔ سلطان کچھ دیر تک انہیں بغور دیکھتے رہے پھر کچھ سوچ کر اتنا روئے کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ ایک تاریک رات میں جبکہ بارش اور گرج چمک سے فضا میں طوفان کا سماں تھا، اس عظیم مجاہد نے چپ چاپ اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ تاریخ وفات 23 ربیع الثانی 421ھ (29 اپریل 1030ء) ہے۔

سلطان کو اسی شب غزنی کے قصر فیروز میں دفن کر دیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اُفغانستان خوش قسمت ہے: سلطان محمود غزنوی کا دورِ حکومت اُفغانستان میں امن و امان، فتوحات و تعمیرات، خوشحالی و ترقی، علوم دینیہ کی اشاعت و ترویج اور صنعت و حرفت کے عروج کا روشن ترین دور تھا۔ دنیا میں ایسے حکمران بہت کم جنم لیتے ہیں۔ اُفغانستان کی سرزمین خوش قسمت ہے کہ بحیرہ ارال سے بحرِ ہند تک مثالی عدل وانصاف سے حکومت کرنے والے سلطان محمود غزنوی نے اس کی کوکھ سے جنم لیا تھا......اور پھر اسی کی آغوش میں واپس چلا گیا۔

اسلاف کی روایات زندہ کر دیں: سلطان محمود غزنوی رحمہ اللہ کی زندگی عدل و انصاف، جہاد فی سبیل اللہ اور رعایا پروری کے لیے وقف تھی اور انہوں نے صحیح معنوں میں اسلاف کی روایات کو زندہ کر دیا تھا۔

وہ قرونِ اولیٰ کے مثالی حکمرانوں کی طرح اپنی رعایا کا حال معلوم کرنے کے لیے گشت کیا کرتے تھے۔اس سلسلے میں ان کے واقعات بڑے حیرت انگیز ہیں۔ایک رات وہ اپنے خادم کے ساتھ پیدل کسی گلی سے گزر رہے تھے کہ ایک طالب علم کو دیکھا جو کسی دکان کے چراغ کے قریب ہو کر کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔غریب طالب علم کے پاس ذاتی روشنی کے لیے کوئی انتظام نہیں تھا۔سلطان نے اس کی پریشانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے خادم کو حکم دیا کہ وہ شاہی قندیل طالب علم کے حوالے کر دے۔

اسی رات سلطان کو حضور اکرم ﷺ کی زیارت ہوئی اور آپ ﷺ نے فرمایا:

"اے ناصر الدین سبکتگین کے بیٹے! خدا تمہیں بھی حشر میں ایسی ہی عزت دے جیسے تم نے میرے ایک وارث کی عزت کی ہے۔"

عشق رسول ﷺ: حضور ختم المرسلین ﷺ سے سلطان کو ایسی عقیدت و محبت تھی کہ بغیر وضو اسم مبارک زبان پر نہ لاتے تھے۔سلطان کے ایک درباری کا نام محمد تھا۔سلطان بھی ہمیشہ اسے اسی نام سے پکارا کرتے تھے۔ایک دن سلطان نے اسے خلاف معمول "تاج الدین" کہہ کر پکارا۔اس درباری نے یہ خیال کر کے کہ سلطان مجھ سے ناراض نہ ہو گئے ہوں اگلے دن سے دربار میں حاضری ترک کر دی۔ سلطان نے اسے بلا کر معاملہ دریافت کیا اور اس کا شبہ دور کرتے ہوئے کہا: "مجھے تم سے کوئی خلش نہیں ہے۔صرف اتنی بات ہے کہ جب میں نے تمہیں پکارنا چاہا تو میں باوضو نہیں تھا،شرم آئی کہ مقدس نام بے وضو کس طرح لوں۔اس لیے تاج الدین کہہ کر مخاطب کیا۔"

بت شکنی کا کارنامہ: غیر مسلم مورخین سلطان محمود کی بت شکنی کو ہدف تنقید بناتے ہوئے انہیں ایک بے رحم اور متعصب حکمران ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر بحیثیت مسلمان کم از کم ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کی روشنی میں بت شکنی اللہ کے دین کے داعیوں کی روشن ترین روایت رہی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بت شکنی پر نطقِ خداوندی نے قرآن مجید میں انہیں متعدد مقامات پر زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔حضور خاتم النبیین ﷺ نے فتح مکہ کے بعد مسجد الحرام میں داخل ہوتے ہی بتوں کو پاش پاش کر دیا اور اس میں ذرا سی بھی تاخیر برداشت نہیں کی۔سلطان محمود نے اسلاف کی انہی روایات کو باقی رکھا اور جہاں جہاں فتح پائی وہاں شرک کی ان یادگاروں کو مسمار کر دیا۔ صرف افغانستان میں بامیان کا علاقہ ایسا تھا جو اپنی پیچیدہ تر گزرگاہوں کے باعث سلطان کی دسترس میں نہ آسکا ورنہ بامیان کے بت بھی سلطان کے ہاتھوں تباہ ہو چکے ہوتے۔بت شکنی کی اس روایت کو دورِ حاضر میں طالبان نے زندہ کیا اور اپنے سات سالہ مثالی دورِ حکومت میں نہ صرف عام تصویروں اور

مجسموں کو مٹا ڈالا بلکہ بامیان کے دیوہیکل بتوں کو بھی پہلی بار بارود سے اُڑا کر بت پرستوں کے جگر چیر ڈالے اور اس طرح خود کو اسلاف کا صحیح وارث ثابت کیا۔

سلطان محمود غزنوی کا غزنی: سلطان محمود صرف جہانگیر فاتح ہی نہیں جہاندار حاکم بھی تھے۔ چوتھی صدی ہجری کے اختتام اور پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں سلطان محمود کا ''غزنی'' اِسلامی تہذیب کے عظیم الشان مراکز میں نمایاں مقام حاصل کر چکا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بغداد، غرناطہ، قرطبہ اور دمشق کی رعنائیاں غزنی میں جلوہ گر ہو رہی ہیں۔ دنیا بھر سے علماء، فقہاء، محدثین، ادباء، شعراء اور دانشور یہاں کھنچے چلے آرہے تھے۔ اسلحہ سازی، طب و جراحت، فن تعمیر اور نقاشی کا ایک سے ایک بڑا ماہرِ فن یہاں موجود تھا۔ وہ غزنی جسے چوتھی صدی ہجری کی ابتداء میں ایک معمولی سا شہر سمجھا جاتا تھا، اب وسط ایشیا، اَفغانستان، ایران اور ہندوستان کے وسیع علاقوں پر مشتمل سلطنت غزنویہ کا پایہ تخت بن چکا تھا۔

ان دنوں غزنی کے دربار سے علوم وفنون کے وہ گوہر نایاب وابستہ تھے جن کی چمک دمک آج تک نگاہوں کو خیرہ کر رہی ہے۔ ان میں البیرونی جیسا ہر فن مولا دانشور بھی تھا جس نے خوارزم کا دربار چھوڑ کر سلطان محمود کا دامن تھاما اور ہندوستان پر سلطان کے حملوں کے دوران ہندوستانی تہذیب وتمدن کے گہرے مشاہدے کے بعد اپنی شاہکار کتاب ''کتاب الھند'' تصنیف کی۔

البیرونی بیک وقت ایک عالم، ریاضی دان، جغرافیہ دان، ماہر لسانیات اور ماہر فلکیات تھا۔ اس دربار میں ابونصر الفارابی جیسا منطق وفلسفہ کا امام بھی تھا جس نے ارسطو کے فلسفہ کی نہ صرف تشریح کی بلکہ اس کی غلطیاں بھی درست کیں اور منطق کو نئے سانچے میں ڈھالا۔ علم نباتات کا ماہر علامہ ابوالخیر محمد بھی سلطان کے مصاحبین میں سے تھا جسے نباتات اور زرعی فنون میں حجت مانا جاتا ہے۔ اسی دربار میں فردوسی جیسا نابغۂ روزگار شاعر بھی تھا جس نے ''شاہنامہ'' کے عنوان سے قدیم ایران واَفغانستان کی منظوم تاریخ لکھی۔ یہ ادبی شاہ پارہ آج بھی فارسی ادب کی جان سمجھا جاتا ہے۔ سلطان کے خزانے سے ہر سال 4 لاکھ درہم ان علماء پر خرچ کئے جاتے تھے۔ سلطان کا تعمیر کردہ غزنی کا ''دارالعلوم'' عالم اِسلام کی بہترین درسگاہوں میں سے ایک تھا۔ سلطان محمود غزنوی خود بھی علم کے دلدادہ تھے، وہ جہاں میدان جنگ کے شیر جری تھے وہاں علمی حلقوں میں ایک عالم، ادیب اور شاعر کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ ان کی علمی استعداد بہت بلند تھی۔ مؤرخین کے مطابق فقہ اور حدیث کے موضوعات پر سلطان کی کئی تصانیف تھیں جو زمانے کی دست برد نے ضائع کر دیں۔ سلطان محمود کا ''غزنی'' ان کے بعد زیادہ عرصہ اپنی شان وشوکت قائم نہ رکھ سکا، وہ سنہرا غزنی اب تاریخ کی کتب اور شعراء کی شاعری ہی میں زندہ ہے۔

آج غزنی کے کچے مکانات، کھنڈروں کی طرح گری ہوئی عمارتوں اور خاموش گلیوں کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کرسکتا کہ کسی زمانے میں یہاں ہر وقت کھوے سے کھوا چھلتا تھا اور یہاں کے دربار میں بڑے بڑے حکام اور سلاطین سر جھکا کر آتے تھے۔

اولیاء اللہ سے عقیدت: سلطان کو اولیاء اللہ سے بڑی عقیدت تھی۔ بالخصوص اس دور کے عظیم صوفی بزرگ شیخ ابوالحسن خرقانی رحمہ اللہ سے ان کا نیازمندانہ تعلق بہت گہرا تھا۔ سلطان اپنے غلام ایاز کے ساتھ غلاموں جیسے کپڑے پہن کر شیخ کی خانقاہ میں حاضر ہوئے تھے اور واپسی پر شیخ نے انہیں اپنا خرقہ عنایت کیا تھا۔

مرقدِ محمود: اپنے وقت کا یہ جہانگیر جس کی سطوت وہیبت سے چین کے تاجدار اور روم کے فرمانروا تک لرزہ براندام تھے، آج غزنی کی آبادی سے دور ایک سڑک کے کنارے بوسیدہ اور ٹوٹے پھوٹے مزار کی خاک میں محوِ خواب ہے۔ قبر پر ایک شکستہ کتبہ ہے جس پر عربی میں تحریر ہے: ”سلطان رحمۃ اللہ علیہ نے جمعرات 23 ربیع الثانی کو وفات پائی۔ اللہ ان کی قبر کو نورانی اور ان کے چہرے کو روشن کرے۔“

سلطان کے جانشینوں میں اختلاف: سلطان محمود غزنوی رحمہ اللہ کے تین بیٹے تھے۔ مسعود، محمد اور عبدالرشید۔ سلطان نے وفات سے پہلے اپنی سلطنت دو حصوں میں تقسیم کر کے خوارزم، عراق اور ایران کا علاقہ بڑے بیٹے مسعود کو اور غزنی، پنجاب اور خراسان کا علاقہ منجھلے بیٹے محمد کے نام کر دیا تھا تا کہ دونوں بھائی اقتدار کے لئے دست وگریبان نہ ہوں مگر سلطان کے آنکھیں بند کرتے ہی دونوں بھائیوں میں اقتدار کی جنگ شروع ہوگئی۔

سلطان محمد نے 421ھ (1030ء) میں اپنے عظیم والد کی وفات کے فوراً بعد ان کی وصیت کے مطابق غزنی اور ہندوستانی مقبوضات کا انتظام سنبھال لیا تھا مگر سلطان مسعود عمر میں بڑا ہونے کے ناتے غزنی کے تخت کو اپنا حق سمجھتا تھا چنانچہ اس نے فوج کشی کر کے اپنے چھوٹے بھائی کو اقتدار سے محروم کر دیا اور قلعے میں قید کر کے آنکھوں سے بھی اندھا کرا دیا۔ سلطان محمد بے چارہ بمشکل پچاس دن حکومت کر سکا۔ جبر وتشدد کے اس ناروا سلوک نے گویا اسی دن سلطنت غزنی کے زوال کا بیج بو دیا تھا۔

سلطان مسعود کا دور: سلطان مسعود ذاتی طور پر ایک بہادر اور جنگجو انسان تھا۔ اپنے دور میں اس نے کئی کامیاب مہمات سر کیں، کرمان، خضدار اور طبرستان کو فتح کیا۔ کشمیر کے ناقابل تسخیر قلعے ”سرستی“ اور ہندوستان کے اہم شہروں سون پت اور ہانسی پر قبضہ کیا، مگر اپنے باپ جیسی قائدانہ صفات اس میں نہ تھیں۔ ہندو امراء جنہیں سلطان نے بڑی مشکل سے دبایا تھا سلطان مسعود میں تدبر کی کمی کو بھانپ کر اسلامی سلطنت کو سبوتاژ کرنے کے لئے اندر ہی اندر ایک نیا کھیل کھیلنے لگے تھے۔ وہ قلعے میں قید نابینا

سلطان محمد، اس کی اولاد اور حمایتیوں کو وقت آنے پر استعمال کرنے کی سازشیں کرنے لگے۔ یہ غزنوی خاندان کے وہ لوگ تھے جنہیں سلطان مسعود کے غزنی پر جبراً قبضے نے آگ بگولا کر رکھا تھا۔

ہندو امراء نے سب سے پہلے وفاداری کے مختلف کارناموں اور اس سے زیادہ جی حضوری اور خوشامد کے ذریعے سلطان مسعود کا اعتماد حاصل کیا۔ بعد ازاں انہوں نے سلطان کو ترک اور اَفغان سالاروں سے بدگمان کر دیا اور خود اس کے دستِ راست بن گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ سلطان نے ایک ہندو تلک رائے کو سلطنت کا سپہ سالار اعظم بنا ڈالا۔ اس صورت حال سے اَفغان اور ترک امراء سلطان سے بددل ہونے لگے اور پنجاب میں غزنوی افواج کے کمانڈر احمد نیال تگین نے خودمختاری کی پیش بندیاں شروع کر دیں۔

سلطان مسعود نے اسے سزا دینے کے لئے ہندو سپہ سالار تلک رائے کو بھیج دیا جو کہ ایک غیر دانش مندانہ فیصلہ تھا۔ تلک رائے نے احمد نیال تگین کے ترک اور اَفغان سپاہیوں کو چن چن کر قتل کیا، اس موقع پر جاٹ بھی اس قتل عام میں شریک ہو گئے اور انہوں نے احمد نیال تگین کو دریائے سندھ پار کرتے ہوئے پکڑ لیا اور بلا تامل قتل کر دیا۔ بظاہر تو یہ نظر آتا تھا کہ ہندو اور جاٹ سلطان مسعود کے حکم پر عمل کرتے ہوئے سلطنت غزنی کے استحکام میں حصہ لے رہے ہیں مگر درحقیقت وہ مسلم سپاہیوں سے انتقام لے رہے تھے اور عوام و حکام میں بداعتمادی کی خلیج وسیع کر رہے تھے۔ دوسری طرف سلطان مسعود کی تازہ فتوحات سے غزنوی سلطنت کی حدود بظاہر وسیع ہو رہی تھیں مگر وہ اندرونی کمزوری جو ترک اور اَفغانستان سپاہیوں کی بے چینی سے پیدا ہوئی تھی اغیار سے پوشیدہ نہ تھی۔ ان دنوں خراسان میں سلجوقی امراء کی ایک نئی طاقت تیزی سے ابھر رہی تھی جس نے بعد میں وسط ایشیا، عراق اور ایشیائے کوچک میں عظیم سلجوقی سلطنت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ انہی سلجوقی امراء نے موقع سے فائدہ اٹھا کر سلطان مسعود کے مقبوضات پر دھاوا بول دیا۔

غزنوی سلطنت کی اقتصادی تباہی: سلطان مسعود نے 432ھ (1040ء) میں مرو کے میدان میں سلجوقیوں کا سامنا کیا مگر شکست فاش سے دوچار ہوا۔ اگرچہ اس موقع پر غزنوی افواج میں اَفغان، ترک اور ہندو بھی شامل تھے مگر شکست کی ذمہ داری اَفغانوں اور ترکوں پر نہیں بلکہ ہندوؤں پر عائد ہوتی تھی جو میدانِ جنگ سے فرار ہونے میں سب سے آگے تھے۔ تاہم سلطان مسعود نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا۔ اس کا دل غزنی اور اَفغانوں سے کچھ ایسا کھٹا ہوا کہ اس نے اپنے بیٹے مودود کو غزنی کا نائب حکمران مقرر کر کے لاہور کو دارالسلطنت بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

غزنی کے مخلص امراء نے بار بار سمجھایا کہ یہ ایک وقتی شکست تھی، ان شاء اللہ ہم بہت جلد حریف

بدلہ لے لیں گے، مگر سلطان نے ایک نہ سنی اور غزنی کی تمام دولت، خزانے، اور انواع و اقسام کے نوادرات سینکڑوں اونٹوں اور ہاتھیوں پر لدوا کر لاہور کی طرف کوچ کر دیا۔ اس کے منظور نظر ہندو امراء جو دارالسلطنت کی تبدیلی کے پرجوش حامی بلکہ اس کے اصل محرک تھے ساتھ ساتھ تھے۔ جوں ہی اس قافلے نے دریائے سندھ عبور کر کے ارضِ ہند میں قدم رکھا، ہندو سرداروں اور سپاہیوں کے تیور بدل گئے۔ اسلامی سلطنت کا وہ عظیم الشان خزانہ جو ایک صدی میں جمع کیا گیا تھا ہندو سپاہیوں نے دیکھتے ہی دیکھتے لوٹ لیا اور جنگلوں میں غائب ہو گئے۔ سلطان کے ساتھ کچھ مسلمان امراء اور سپاہی تھے جن کے باعث اس کی جان بچ گئی ورنہ شاید ہندو اسے زندہ نہ چھوڑتے۔

سلطان مسعود کا انجام: سلطنتِ غزنی کی اس معاشی تباہی کے بعد سلطنت کے خیر خواہ امراء نے متفقہ طور پر سلطان مسعود کو نا اہل قرار دے کر معزول کر دیا اور برسوں سے اس کی قید میں پڑے ہوئے نابینا سلطان محمد کو آزاد کر کے بادشاہ بنا دیا۔ سلطان محمد نے حکومت سنبھالنے کے بعد اپنے بڑے بھائی سے اپنی بینائی چھیننے کا بدلہ تو نہیں لیا البتہ اسے اس کی مرضی کے مطابق ''کری'' کے قلعے میں نظر بند کر دیا۔ بہر حال سلطان مسعود کے دن پورے ہو چکے تھے۔ چند دنوں بعد سلطان محمد کے بیٹے احمد نے باپ کی اجازت کے بغیر از خود جوش انتقام میں اسے قتل کر دیا۔

سلطان محمد کو جب اطلاع ملی کہ اس کے جنونی مزاج بیٹے نے سلطان مسعود کو کیری کے قید خانے میں قتل کر دیا ہے تو اسے بہت افسوس ہوا۔ اس نے سلطان مسعود کے بیٹے شہزادہ مودود کو جو بلخ میں مقیم تھا معذرت کا خط لکھا۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ شہزادہ مودود نے جوابی خط میں باپ کا بدلہ لینے کی دھمکی دی۔

432ھ (1040ء) میں شہزادہ مودود نے اپنے حمایتیوں کو لے کر سلطان محمد کے خلاف معرکہ آزمائی کا آغاز کر دیا۔ زبردست جنگ کے بعد اسے فتح حاصل ہوئی۔ سلطان محمد اپنے بیٹوں اور بہت سے امراء سمیت گرفتار ہوا۔ شہزادہ مودود کے حکم سے ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

سلطان مود ۔د کا دور: اگر نیا حکمران سلطان مودود حکمت و بصیرت سے کام لیتا تو سلطنت میں تعمیر و ترقی اور استحکام کا ایک نیا دور شروع ہو سکتا تھا مگر ہوسِ اقتدار ایک بار پھر راہ میں آڑے آ گئی۔ ان دنوں سلطان مسعود کا دوسرا بیٹا، شہزادہ مجدود ہندوستانی مقبوضات کے رقبے میں اضافے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ قریب تھا کہ وہ دہلی کو بھی فتح کر لیتا مگر اچانک اسے یہ اطلاع ملی کہ اس کا بھائی، سلطان مودود اس کی کامیابیوں سے خائف ہو کر اس کی طاقت کو کچلنے کے لیے لاہور کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے۔ اس اطلاع نے دہلی کے قریب پڑاؤ ڈالے ہوئے شہزادہ مجدود کو لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ لاہور پہنچ کر

اس نے سلطان مودود سے مقابلے کی تیاری شروع کر دی مگر جنگ سے پہلے ہی ایک صبح وہ اپنے بستر پر مردہ پایا گیا۔ یہ طبعی موت تھی یا کوئی سازش!! مورخین یہ معما حل نہیں کر سکے۔

ہندوؤں کی سرکشی: مجدود کی موت کے بعد سلطان مودود ہی غزنوی سلطنت کا واحد مطلق العنان بادشاہ تھا۔ اب بظاہر حالات پر اس کی گرفت مضبوط ہو جانی چاہیے تھی مگر غزنوی خانوادے میں جاری برسوں کی خانہ جنگی نے ہندوستان کے باقی ماندہ ہندو حکمرانوں کو بہت نڈر بنا دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے سلطان مودود کے دورِ حکومت میں 435ھ (1043ء) میں دہلی اور گرد و نواح کے راجاؤں سے مل کر غزنوی سلطنت کے اہم ہندوستانی شہروں، پانسی، تھانیسر اور نگرکوٹ پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ہندو لاہور کی طرف بڑھے اور اس کا محاصرہ کر لیا تاہم لاہور کے مسلمانوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور انہیں واپس لوٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ مودود کے زمانے میں وسطِ ایشیا کے سلجوقی ترکوں کی طاقت مزید بڑھ گئی اور انہوں نے خراسان اور فارس کے تمام علاقے غزنوی حکومت سے چھین لیے۔ اس طرح سلطان محمود غزنوی کی عظیم الشان سلطنت اس کے پوتے کے دور میں سمٹ کر نصف کے قریب رہ گئی۔

سلطان عبد الرشید اور اس کی اولاد: 441ھ (1049ء) میں سلطان مودود نے وفات پائی اور اس کا بھانجا علی، بادشاہ بنا۔ یہ بڑا رعایا پرور اور عوام دوست حکمران تھا۔ مگر اسے صرف دو برس کی حکومت نصیب ہوئی۔ اس لیے کہ اس کے چچا عبد الرشید نے جو کہ سلطان محمود غزنوی کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا، اس کے خلاف بغاوت کر کے 443ھ (1050ء) میں اس سے حکومت چھین لی۔ سلطان عبد الرشید کا دور اس سے بھی زیادہ مختصر ثابت ہوا۔ اس کے دورِ حکومت میں صرف ایک قابلِ ذکر کام ہوا، وہ یہ کہ اِسلامی لشکر نے نگرکوٹ کا قلعہ ہندوؤں سے بازیاب کرا لیا۔ سلطان عبد الرشید نے ایک سردار طغرل کو فوج کا سپہ سالار بنا دیا تھا۔ اسی نے بغاوت کر کے سلطان عبد الرشید کو قتل کر دیا۔ اس کا دورِ اقتدار ایک سال سے بھی کم تھا۔

اس کے بعد 444ھ میں سلطان مسعود کے بیٹے فرخ زاد نے حکومت سنبھالی۔ وہ ذاتی طور پر ایک بہادر سپاہی، دلیر حاکم اور ماہر سیاست دان تھا۔ اس کا دورِ حکومت مثالی ثابت ہو سکتا تھا مگر اس کا زیادہ زمانہ سلجوقیوں سے لڑتے اور محلاتی سازشیں نمٹانے میں گزر گیا۔ بہرکیف فرخ زاد نے غزنوی سلطنت کی گرتی ہوئی دیواروں کو سہارا دینے کی پوری کوشش کی۔ اس کی وفات 450ھ (1058ء) میں ہوئی۔

اس کے بعد اس کا بھائی ابراہیم تخت نشین ہوا، وہ بہت صالح، باکردار اور عابد و زاہد شخص تھا۔ ان دنوں سلجوقی سلطنت اپنے عظیم حکمران ملک شاہ کے زیرِ سایہ عالمِ اِسلام کی مضبوط ترین حکومت کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ سلطان ابراہیم نے حکمت و تدبر کے ساتھ اس سے اچھے مراسم قائم کر لیے اور کئی

عشروں سے جاری سلجوقی وغزنوی رقابت کا خاتمہ کردیا۔اس جھنجھٹ سے نجات پانے کے بعد سلطان ابراہیم نے ازسرِ نو ہندوستان میں اپنے دادامحمود غزنوی کی فتوحات کی یادیں تازہ کرنے کا عزم کیااور لشکر لے کرلاہور سے تین سومیل کے فاصلے پر''پٹن'' کے قلعے پر حملہ کیااوراس پر قبضہ کرلیا۔اس کے بعداس نے شمالی پنجاب کے گھنے جنگلات کے درمیان ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پرواقع''روپال'' نامی ناقابل تسخیر قلعے کوبھی خداداد ہمت اورآہنی عزم کی بدولت فتح کرلیا۔

مؤرخین کے مطابق سلطان ابراہیم نے اس کے بعدایک اورغیر مسلم قوم تک اِسلام کی دعوت پہنچانے کے لیے گھنے جنگلات اوردشوارگزارراستوں کا سفرشروع کیا۔اس قوم کے آباءواجدادکوقدیم ایرانی بادشاہ افراسیاب نے جلاوطن کرکے یہاں بھیجاتھا۔ان کا یہ علاقہ''درہ'' کہلاتا تھا۔سلطان نے تین ماہ کی مہم جوئی کے بعدیہ علاقہ فتح کرلیامگر یہ لوگ اِسلام قبول کرنے پرآمادہ نہ ہوئے۔سلطان ابراہیم،غزنوی خاندان کوزوال سے دوبارہ عروج کی طرف لے جانے والاحکمران تھا۔اس کا 31 سالہ دورامن وامان اورترقی وخوشحالی کادورتھا۔وہ بیحد سخی،غریب پروراوررعایاپرمہربان تھا۔عالم فاضل اوربہترین خوش نویس بھی تھا۔ہر سال اپنے ہاتھ سے قرآن مجید کے ایک نسخے کی کتابت کرتا تھا۔اس نے 481ھ میں وفات پائی۔

اس کا بیٹا سلطان مسعودبن ابراہیم اس کا جانشین ہوا۔وہ بھی اپنے باپ کے نقش قدم پرچلتارہااورسولہ سال عدل وانصاف سے حکومت کرکے 508ھ میں فوت ہوا۔بعدازاں اس کے بیٹے ارسلان شاہ اوربہرام شاہ یکے بعددیگرے تخت نشین ہوئے۔ارسلان شاہ کا تین سالہ دورآسمانی حوادث اورقدرتی مصائب کی داستان تھا۔جبکہ بہرام شاہ کا 35 سالہ طویل دورعروج سے شروع ہوکرزوال پراختتام پذیر ہوا۔اس کے دورمیں علوم وفنون اورادب کوبہت ترقی ہوئی۔فارسی کے مشہورشاعرحکیم سنائی رحمۃ اللہ اسی کے دورسے تعلق رکھتے تھے۔ہندوستان کی مشہورادبی کتاب''کلیلہ ودمنہ'' کا پہلی بارفارسی میں ترجمہ بھی اسی کے دورمیں ہوا۔مگرآخرمیں بہرام شاہ کا سامناغور کے پہاڑوں میں پرورش پانے والی ایک نئی جنگ آزما قوت سے ہوا۔یہ غوری امراء کی طاقت تھی جواپنی خودمختار سلطنت تشکیل دیناچاہتے تھے۔غوریوں کے سردارعلاؤالدین غوری نے ایک لشکرِ جرار لے کربہرام شاہ کے خلاف فوج کشی کی اوراسے بری طرح شکست دی۔اس شکستِ فاش نے غزنوی اقتدار کی چمک دمک کویکدم گہنادیااورآنے والاکوئی حکمران سلطنت کی گرتی ہوئی ساکھ کوسنبھال نہ سکا۔بہرام شاہ نے 547ھ(1152ء) میں وفات پائی۔

بہرام شاہ کے جانشین خسروشاہ نے غوریوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مرعوب ہوکرغزنی سے جلاوطنی اختیارکرلی اورپایہ تخت لاہور منتقل کرلیا۔یہ دیکھ کرغوری امراء کی ہمت اوربڑھ گئی۔ان کے

سردار علاؤالدین جہاں سوز نے غزنی پر حملہ کر کے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور غزنویوں سے نفرت کا اظہار کرنے کے لیے شہر کو جلا کر خاکستر کر ڈالا۔ اس حادثے کے بعد سلطان محمود غزنوی کا غزنی جو بغداد اور قرطبہ کے ہم پلہ شمار ہونے لگا تھا، پھر کبھی اپنی سابقہ شان وشوکت کے ساتھ آباد نہ ہوسکا۔

اب غزنوی خاندان کی حکومت صرف ہندوستانی علاقوں میں باقی رہ گئی تھی۔ غزنوی حکمران خسرو شاہ کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے خسرو ملک نے اپنی سابقہ عظمت کی بازیافت کے لیے ہندوستان کی حدود میں کئی مہمات سر کیں مگر وہ غوریوں سے ٹکر لینے کی ہمت نہ کرسکا۔ آخر کار 28 سال تک حکومت کرنے کے بعد 582ھ (1186ء) میں انہی کے ہاتھوں اقتدار سے محروم ہوا۔ اس طرح خراسان، وسط ایشیا اور ہندوستان پر دھاک بٹھانے والی غزنوی سلطنت سوا دو سو سال پورے کر کے صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔

مآخذ و مراجع

- ...... تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ رحمہ اللہ
- ...... طبقات ناصری، قاضی منہاج السراج الجوزجانی رحمہ اللہ
- ...... الکامل فی التاریخ، جلد 4، ابن اثیر الجزری رحمہ اللہ
- ...... تاریخ ابن خلدون، جلد 4، علامہ عبدالرحمن ابن خلدون

پانچواں باب

غوری حکمران

غوری سلطنت کا قیام: ''غور'' وسطی افغانستان میں ارزگان، بامیان اور ہرات کے درمیان واقع ایک وسیع و عریض مگر بنجر اور ویران علاقہ ہے۔ یہ سنگلاخ پہاڑوں اور ریتیلے ٹیلوں کا مسکن ہے، جہاں موسم سرما میں سردی نا قابل برداشت ہوتی ہے اور گرمی میں صحرا شعلہ جوالہ بن جاتا ہے۔ موسم کی سختی اور ماحول کی صعوبتوں کے باعث یہاں کے باسی بے حد سخت جان ہوتے ہیں۔

اعزالدین: انہی سخت جان اور دلیر لوگوں میں سے ایک شخص اعزالدین حسین تھا، اس شخص کے حالات بڑے عجیب ہیں۔ غزنوی حکمرانوں کے غور پر قبضے کے بعد اعزالدین کا باپ اہل و عیال سمیت ہندوستان کی طرف نکل بھاگا تھا۔ کچھ عرصے بعد اسے یادِ وطن نے ستایا تو اہلِ خانہ کو ہمراہ لے کر واپس ہوا۔

راہ میں ایک دریا عبور کرتے ہوئے طغیانی کے باعث اس قافلے کی کشتی اُلٹ گئی، تمام خاندان ڈوب گیا، صرف اعزالدین بچ گیا، ایک ٹوٹے ہوئے تختے کو پکڑ کر وہ دریا کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہنے لگا، اس وقت دریا کے تیز بہاؤ میں ایک شیر بھی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا، اس نے بھی اس تختے پر پنجے گاڑ دیے، اعزالدین اور شیر تین دن تک اسی طرح دریا کے بہاؤ پر تنکے کی طرح بہتے رہے۔ تین دن بعد تختہ کنارے سے جا لگا...... شیر جنگل میں غائب ہو گیا اور اعزالدین بھوک سے بے حال گرتا پڑتا قریبی بستی میں پہنچا۔ وہاں اسے چور سمجھ کر گرفتار کر لیا گیا۔

اعزالدین نے سات سال قید خانے میں گزارے، آخر حاکمِ شہر کی موت کے بعد اسے رہائی نصیب ہوئی۔ رہا ہوتے ہی اعزالدین غزنی کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں ڈاکوؤں کا ایک گروہ ملا جس نے اسے پکڑ لیا۔ اسی دوران غزنی کے سپاہی ڈاکوؤں کا کھوج لگاتے ہوئے وہاں پہنچ گئے اور تمام ڈاکوؤں کے ساتھ اعزالدین کو بھی گرفتار کر لیا۔ یہ سلطان ابراہیم کا زمانہ تھا، سلطان کے حکم سے تمام ڈاکوؤں کے سر قلم کیے جانے لگے، اعزالدین کی باری آئی تو اس نے آسمان کی طرف سر اُٹھا کر فریاد

کی: ''یا اللہ! میں بے گناہ کس لیے مارا جارہا ہوں؟ تیری ذات تو ہر ظلم وجور سے پاک ہے؟'' جلاد یہ سن کر حیران ہوگیا۔ دوبارہ تفتیش کی گئی تو اعزالدین نے اپنا حال تفصیل سے کہہ سنایا۔ سلطان کو آگاہ کیا گیا تو اس نے اسے بلا کر اس سے ساری داستان خود سنی اور نہ صرف یہ کہ آزاد کردیا، بلکہ اپنا خاص درباری بنالیا۔ اس طرح اعزالدین کے ایام مصیبت ختم ہوئے۔

سلطان ابراہیم کی اولاد کے دور حکومت میں اعزالدین کو غور کا گورنر بنادیا گیا۔ اللہ نے اسے سات بیٹے عطا کیے۔ ہر ایک صاحب شمشیر ثابت ہوا، انہیں ہفت اختر کہا جاتا تھا، انہوں نے غزنوی سلطنت کے مختلف علاقوں میں بڑے بڑے عہدے حاصل کیے۔ مدتوں بعد ان میں سے ایک بیٹے قطب الدین کو غزنوی حکمران بہرام شاہ نے بدگمانی کے باعث قتل کرادیا۔ اس کے ردعمل کے طور پر اس کے بھائی سیف الدین نے غزنی پر حملہ کرکے بہرام شاہ کو فرار ہونے پر مجبور کردیا، اور غزنی میں خودمختار بادشاہی کا اعلان کردیا مگر یہ حکومت زیادہ دن نہ چل سکی اور بہرام شاہ نے غزنی پر دوبارہ قبضہ کرکے سیف الدین کو عبرتناک موت کا نشانہ بناڈالا۔

علاؤالدین جہاں سوز: سیف الدین کے ایک اور بھائی علاؤالدین غوری نے اپنے بھائی کا بدلہ لینے کے لیے سلطنت غزنی سے مستقل معرکہ آرائی شروع کردی جس کا کچھ حال آپ غزنوی حکمرانوں کے ضمن میں پڑھ چکے ہیں۔ اقتدار کی اس کشاکشی میں غوریوں کا پلہ بھاری رہا، حتیٰ کہ غزنوی حکمران غزنی چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔

علاؤالدین نے غزنوی سلطنت کے پایۂ تخت غزنی پر قبضے کے بعد انتہائی بے رحمی کا ثبوت دیتے ہوئے شہر کو راکھ کا ڈھیر بنا کر تاریخ میں ''جہاں سوز'' کا لقب حاصل کیا۔

مورخین کے مطابق غزنی کا شہر سات دن تک مسلسل جلتا رہا تھا اور اس دوران علاؤالدین غوری نغمہ وطرب کی محفل سجا کر خوشی کے گیت گا رہا تھا۔ اس تباہی کے بعد غزنی میں سلطان محمود غزنوی، سلطان مسعود اور سلطان ابراہیم کے قبروں کے سوا کوئی عمارت باقی نہ بچی۔ موجودہ غزنی اس قدیم غزنی سے بالکل الگ ایک نئی بستی ہے جسے بعد کے حکمرانوں نے آباد کیا تھا۔

غیاث الدین اور شہاب الدین: غوری خاندان کو اصل شہرت اعزالدین کے پوتوں غیاث الدین اور شہاب الدین کے کارناموں کی وجہ سے ملی۔ یہ دونوں بھائی اپنے ظالم چچا علاؤالدین جہاں سوز کے مخالف تھے اور اس کے دور میں قید وبند کی سختیاں جھیلتے رہے تھے۔ اس کی موت کے بعد رہائی پانے پر انہوں نے اپنے چچا کے جانشین سیف الدین سے معرکہ آرائی شروع کی اور غالب آکر غور کی حکومت

سنبھال لی۔ غیاث الدین غوری نے فیروز کوہ کے مضبوط قلعے کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا اور اپنے بھائی شہاب الدین غوری کو افواج کا سپہ سالار اور غور کا گورنر بنا دیا۔ شہاب الدین غوری کا اصل نام محمد بن سام اور لقب معز الدین تھا تاہم تاریخ میں وہ شہاب الدین غوری کے نام سے یاد کیا گیا۔

مثالی بھائی: غیاث الدین اور شہاب الدین کے ستارۂ اقبال کی بلندی درحقیقت سرزمین اَفغانستان اور برِصغیر کے لیے ایک نئے روشن دور کی نوید تھی۔ یہ دونوں بھائی بلا کے بہادر، عالی ظرف اور سخی تھے۔ کہنے کو تو بادشاہت غیاث الدین کی تھی مگر دونوں بھائی درحقیقت مل جل کر اس طرح حکومت کر رہے تھے کہ ''ایک جان دو قالب'' کی مثال صادق آتی تھی۔ تاریخ میں حکمران بھائیوں کے ایسے اتحاد و اتفاق کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔

غیاث الدین نے امورِ سلطنت میں اور شہاب الدین غوریؒ نے فنونِ حرب میں بہت جلد اپنی قابلیت کا لوہا منوالیا۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ غزنوی خانوادے کی بکھری ہوئی باقیات کو سلطنتِ غوری میں شامل کرنے کے بعد ہندوستان میں ایک نئی اِسلامی سلطنت کی بنیاد رکھیں۔

غزنوی حکومت کا خاتمہ: ان دنوں خسرو ملک لاہور میں غزنوی خاندان کے آخری تاجدار کی حیثیت سے حکومت کر رہا تھا۔ 582ھ (1186ء) میں شہاب الدین غوری نے کسی خونریزی کے بغیر لاہور پر اچانک قبضہ کر کے خسرو ملک کو رخصت کر دیا اور یوں غزنوی خاندان کی حکومت دنیا کے نقشے سے ختم ہوگئی۔

شہاب الدین غوری کے ہندوستان پر حملے: لاہور پر قبضے سے پہلے شہاب الدین غوری ہندوستان پر پانچ حملے کر چکے تھے جن کا خلاصہ یہ ہے: ❶...... 573ھ میں ملتان پر حملہ کر کے قرامطیوں کی نئی آبادکاری کی بیخ کنی کر دی، اس کے فوراً بعد ''اُچ'' پر قبضہ کر کے وہاں کی ہندو شہزادی کو مشرف بہ اِسلام کیا اور اپنی ملکہ بنایا۔ ❷...... 574ھ میں ملتان اور اُچ کے راستے راجستھان کا صحرا عبور کر کے گجرات میں راجہ ''بھیم دیو'' سے ٹکر لی۔ اس ہولناک جنگ میں مسلمانوں کو بری طرح شکست ہوئی، شہاب الدین غوری اور بچے کھچے سپاہی بمشکل غزنی واپس پہنچ سکے۔ ❸...... 575ھ میں پشاور کے گردونواح میں کئی اضلاع پر قبضہ کیا۔ ❹...... 576ھ میں سندھ کی مشہور بندرگاہ دیبل پر حملہ کیا اور دریائے سندھ کے تمام ساحلی شہروں پر قبضہ کر لیا۔ ❺...... 580ھ میں پنجاب کا رُخ کیا اور مقبوضہ علاقوں میں قدم جمانے کے لیے دریائے راوی اور چناب کے درمیان سیالکوٹ کا مضبوط قلعہ تعمیر کرایا۔

بھٹنڈہ کی مہم: ان مہمات سے شہاب الدین غوری کے جنگی تجربات اور مہارت میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا اس لیے اب وہ ذہنی طور پر سرزمین ہندوستان میں ایک فیصلہ کن معرکے کے لیے تیار تھے۔ اس مقصد کے

لیے سلطان محمود غزنوی کی طرح ہندوستان کے قلب کو چیرنا ضروری تھا۔ چنانچہ شہاب الدین غوری نے 587ھ میں ہندوستان کا چھٹا سفر کیا اور اجمیر کے راجا کا سب سے مضبوط قلعہ بھٹنڈہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ یہ قلعہ ہندوستان کے بڑے بڑے راجاؤں کے نزدیک مرکزی اہمیت کا حامل تھا۔ اس کی فتح کے بعد ہندوستانی سورماؤں سے ایک سخت ترین معرکہ ناگزیر تھا، مگر مسلمان سپاہی تعداد میں کم تھے اس لیے شہاب الدین غوری نے ملک بہاؤ الدین ٹونکی کو ایک فوجی دستے کے ساتھ بھٹنڈہ کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی اور خود واپسی کے لیے ساز و سامان درست کرنے کا حکم دیا، مگر اسی وقت اطلاع ملی کہ مشہور ہندو سورما ''پرتھوی راج'' نے دہلی کے راجہ ''کھنڈے رائے'' اور متعدد راجاؤں کو مسلمانوں کے خلاف لشکر ترتیب دینے پر آمادہ کرلیا ہے۔ یہ لوگ دو لاکھ گھڑسواروں، تین ہزار ہاتھیوں اور ان گنت پیادوں کے ساتھ بھٹنڈہ کی طرف بڑھتے چلے آرہے ہیں۔

تراوڑی کے میدان میں: یہ اطلاع پاکر شہاب الدین غوری نے اپنی فوج کی کمی کو نظر انداز کرتے ہوئے ہر قیمت پر دشمن کا سامنا کرنے کا فیصلہ کرلیا اور دشمن کی آمد کا انتظار کرنے کی بجائے از خود پیش قدمی کرنے کا حکم دیا۔ اِسلامی لشکر نے بھٹنڈہ کے قلعے سے باہر نکل کر دہلی کا رُخ کیا، دوسری طرف سے ہندوؤں کا سیلاب اُمڈا چلا آرہا تھا۔ دہلی سے چالیس میل کے فاصلے پر ''تراوڑی'' کے میدان میں دونوں فوجیں معرکہ آرا ہوئیں۔ دریائے سرسوتی کی لہریں اچھل اچھل کر اس خون ریز لڑائی کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ ہندو بڑے جوش وجذبے سے لڑ رہے تھے مگر شہاب الدین غوری نے بڑی بے جگری سے ان کو روکے رکھا، قریب تھا کہ وہ ان کا رُخ پھیر دیتے کہ اِسلامی لشکر کے دائیں اور بائیں بازو کے افسران کی ہمت جواب دے گئی اور ہندوؤں کے زوردار حملوں کے سامنے ان کے قدم اُکھڑ گئے۔

تھوڑی ہی دیر میں میدانِ جنگ دو اطراف سے صاف ہوچکا تھا اور اِسلامی لشکر کے قلب کے مٹھی بھر سپاہی شہاب الدین غوری کی قیادت میں تین اطراف سے دشمن کے حملوں کا مقابلہ کررہے تھے۔ صورتِ حال کی نزاکت دیکھ کر ایک افسر نے غور کے مردِ قلندر سے کہا: ''حضور! دایاں اور بایاں بازو کٹ چکا، ہراول کے اَفغان اور خلجی سردار بھی بھاگ نکلے، خدارا! اپنی جان بچائیں، لاہور کی سمت نکل چلیں۔'' مگر شہاب الدین غوری فرار ہونے کی بجائے اپنے جانثار ساتھیوں سمیت دشمن پر پل پڑے اور ہندوؤں کی لاشوں کے ڈھیر گرتے چلے گئے۔

یہ دیکھ کر دہلی کا راجہ خود اپنے ہاتھیوں اور زرہ پوش دستے کے ساتھ آگے بڑھا۔ شہاب الدین غوری نے بھی اسے دیکھ لیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر اس پر حملہ کردیا۔ ان کا فولادی نیزہ ہاتھی کے دانتوں کو توڑتا ہوا اس

کے منہ میں گھستا چلا گیا۔ ہاتھی کے منہ سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا، وہ خوفناک انداز میں چنگھاڑا مگر اس سے پہلے کہ وہ بدک کر اپنا رُخ پھیر لیتا، ہندو فرمانروا نے شہاب الدین پر تلوار کا زوردار وار کر دیا۔

یہ ضرب ایسی کاری لگی کہ مسلمان قائد پر غشی طاری ہوگئی اور گھوڑے کی لگام ان کے ہاتھ سے نکلنے لگی۔ ہندو گھڑ سوار اور پیادے اپنے افسران کے اشارے پر مسلم قائد کو گرفتار کرنے کے لیے چیختے چلاتے آگے بڑھے مگر ایک خلجی مجاہد بجلی کی طرح اُچھل کر شہاب الدین کے گھوڑے پر جا بیٹھا، اس نے ایک ہاتھ سے اپنے قائد کو سہارا دیتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے لگام تھامی اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ اگلے ہی لمحے وہ تیروں کی بارش اور تلواروں کی کاٹ کے درمیان سے نکل کر میدانِ جنگ کے گرد و غبار میں غائب ہو چکا تھا۔

گمشدہ قائد کی تلاش: مسلمانوں کا فرار ہونے والا لشکر میدانِ جنگ سے 20 میل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا، شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا، اس وقت تک پیچھے رہ جانے والے اکثر زخمی سپاہی بھی پڑاؤ تک پہنچ چکے تھے مگر قائدِ لشکر کا کچھ پتہ نہ تھا۔ آخر شہاب الدین کے چند غلاموں نے میدانِ جنگ کا رُخ کیا۔ وہ رات کے اندھیرے میں لاشوں کے درمیان اپنے آقا کو ڈھونڈتے اور پکارتے رہے۔ شہاب الدین غوری انہی لاشوں کے درمیان ایک جگہ بے یار و مددگار پڑے تھے۔ ہندو سپاہی انہیں شکل سے نہیں پہچانتے تھے، اس لیے انہیں مردہ یا شدید زخمی سمجھ کر چھوڑ گئے تھے۔ اپنے غلاموں کی آواز سن کر شہاب الدین غوری نے جو اس وقت تک بے ہوشی سے کچھ افاقہ پا چکے تھے، انہیں پکارا...... غلام دوڑتے ہوئے ادھر آئے، آقا کو پا کر ان کی خوشی قابلِ دید تھی۔ شہاب الدین غوری کے زخم اتنے شدید تھے کہ انہیں گھوڑے پر ڈالنا ممکن نہ تھا لہٰذا انہیں جھولا نما بستر پر ڈال کر کاندھوں پر اُٹھا لیا گیا۔ رات بھر سفر کرنے کے بعد صبح تڑکے وہ اپنی لشکر گاہ پہنچ گئے۔

غوری اور پرتھوی کا ٹکراؤ: سلطان شہاب الدین غوری کی شکست کے بعد پرتھوی راج نے بٹھنڈہ کا محاصرہ کر لیا، جہاں سلطان کا نائب ضیاء الدین ٹونکی مختصر سی فوج کے ساتھ موجود تھا، اس نے 13 ماہ تک قلعہ بند ہو کر مقابلہ کیا مگر آخر کار مجبوراً اسے قلعہ دشمن کے حوالے کرنا پڑا۔ ادھر سلطان شہاب الدین ہندوؤں سے بدلہ لینے کے لیے بے تاب تھے، انہوں نے افغانستان واپس لوٹ کر ان بزدل امراء کو سرِ عام شرمسار کیا جو میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے تھے، ان امراء کی گردنوں میں توبرے (وہ تھیلے جن سے گھوڑا دانا کھاتا ہے) لٹکا کر انہیں پورے شہر میں پھرایا گیا۔

سلطان شہاب الدین کی اپنی یہ حالت تھی کہ انہوں نے ہر قسم کی راحت و آسائش حتیٰ کہ پیٹ بھر کر کھانا اور نرم بستر پر سونا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ دن رات ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری کے لیے سوچ و بچار میں مصروف تھے۔

اس غیرت مند حکمران نے ایک سال تک اپنا لباس بھی تبدیل نہیں کیا، آخر کار ایک لاکھ سات ہزار سپاہیوں کا ایک لشکر تیار ہو گیا جسے لے کر غور کا شیر اپنی شکار گاہ کی طرف روانہ ہوا۔

دل موہ لینے والا نسخہ: سلطان کے ساتھ وہ امراء بھی تھے جو گزشتہ جنگ میں شکست کے ذمہ دار تھے، سلطان کی ان سے ناراضی بدستور باقی تھی اور انہیں اب بھی ان پر اعتماد نہ تھا، اس لیے جنگی امور کے مشورے کے علاوہ عام دربار میں بھی انہیں شریک نہیں کیا جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر ایک معتمد بوڑھے سردار نے بادشاہ سے کہا: ''حضور! اب تک آپ کے جانثار اس بات سے لاعلم ہیں کہ آنجناب کا ارادہ کیا ہے؟''

سلطان نے یہ سن کر حسرت ناک لہجے میں کہا: ''کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ پورا سال میں نے کس قدر رنج و غم میں گزارا ہے، کفار کے ہاتھوں مسلمانوں کی شکست کے بعد میں نے آج تک بیوی کا منہ دیکھا ہے نہ لباس تبدیل کیا ہے۔ جن بزدل امراء نے میدان جنگ میں میرا ساتھ چھوڑا تھا، مجھے ان سے کوئی اُمید نہیں ہے، اسی لیے میں ان سے ملنا نہیں چاہتا۔ بہرکیف اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے انہیں اس لشکر میں اپنے ہمراہ لیے جا رہا ہوں۔''

یہ سن کر بوڑھے سردار نے مؤدبانہ لہجے میں کہا: ''سلطانِ عالی وقار! اللہ تعالیٰ آپ کو کامیاب و فتح مند اور دشمنوں کو ناکام و نامراد کرے۔ مجھے توقع ہے کہ یہ امراء اس بار اپنی گزشتہ غفلت کی تلافی کریں گے، میری درخواست یہ ہے کہ آپ ان کا قصور معاف کر کے انہیں اپنے پاس حاضری کا موقع عنایت کریں۔ آپ کا یہ سلوک انہیں صحیح روش پر لے آئے گا۔''

سلطان نے یہ درست مشورہ قبول کر لیا اور ان امرا کو بلا کر انہیں خلعتوں اور تحائف سے نوازا ان کی گزشتہ کوتاہی کی معافی کا اعلان کیا اور آئندہ ذمہ داری سے کام لینے کی تاکید کی۔

تراوڑی کے میدان میں: لاہور پہنچ کر شہاب الدین غوری نے اتمامِ حجت کے لیے پرتھوی راج کے نام دعوت اِسلام کا پیغام بھیجا۔ پرتھوی راج نے اس کا کوئی مثبت جواب نہ دیا بلکہ مقابلے کی تیاری شروع کر دی۔ اس نے ہندوستان کے طول و عرض سے تمام راجوں، مہاراجوں کو اپنی مدد کے لیے طلب کر لیا اور ایک عظیم متحدہ لشکر کے ساتھ پیش قدمی شروع کر دی۔ یکم جمادی الثانیہ 588ھ (14 جون 1192ء) کو دریائے سرستی کے کنارے تراوڑی کے میدان میں دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے۔ پرتھوی راج کے ماتحت 150 ہندو حکمرانوں کی تین لاکھ افواج کا سیلاب تھا، تین ہزار جنگی ہاتھی بھی اس لشکر میں شامل تھے۔ لڑائی سے پہلے ان ڈیڑھ سو ہندو حکمرانوں نے اپنے ماتھوں پر تلک لگا کر اپنے 33 کروڑ دیوی اور دیوتاؤں کی قسمیں کھائیں کہ وہ مسلمانوں کو نیست و نابود کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

سلطان شہاب الدین نے صبح سویرے اپنی افواج کو میدان میں آگے بڑھایا۔ اس فوج کو چار حصوں میں منقسم کیا گیا تھا۔ لڑائی شروع ہوئی تو میدانِ جنگ موت کا الاؤ بن کر بھڑکنے لگا۔ ہر طرف لاشوں کے ڈھیر لگ رہے تھے، تین گنا سے زائد ہندو مسلمانوں کو دبانے کی پوری کوشش کر رہے تھے، خاص کر ان کے تین ہزار ہاتھیوں کا ریلا مسلمان جانبازوں کو بری طرح دھکیل رہا تھا۔

سلطان کی ہدایت کے مطابق مسلمان سپاہی ہاتھیوں کے ریلے کے آگے پسپا ہو کر منتشر ہونے لگے۔ جب ان کے تعاقب میں ہاتھیوں کا دستہ اِدھر اُدھر بکھر گیا تو مسلمانوں نے پلٹ کر حملہ کر دیا اور فیل بانوں کو چن چن کر نشانہ بنایا۔

سلطان کے مختلف حربوں اور چالوں کے باوجود ہندو لشکر کے قدم نہ اُکھڑ سکے، ادھر سورج غروب ہونے لگا تھا، سلطان نے یہ دیکھ لیا تھا کہ دشمن لڑتے لڑتے تھک چکا ہے اور جنگ بندی کی صورت میں کل تازہ دم ہو کر سامنے آجائے گا۔ اس صورتِ حال کو سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے 12 ہزار تازہ دم گھڑسواروں کو ساتھ لے کر خود دشمن پر طوفانی حملہ کر دیا۔ اس سے دشمن کی صفوں میں بھگدڑ مچ گئی، بڑے بڑے ہندو راجے مارے گئے، ''کھنڈے راؤ'' جو مسلمانوں کا زبردست حریف تھا، موقع پر تہہ تیغ ہو گیا۔ پرتھوی راج میدان سے بھاگ نکلا مگر دریائے سرسوتی کے کنارے مسلمان سپاہیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ سلطان نے اسے اِسلام دشمنی کی سزا میں قتل کرا دیا۔ اس شاندار فتح کے بعد سلطان نے پرتھوی راج کے پایۂ تخت اجمیر پر بھی قبضہ کر لیا۔ سلطان کی غزنی واپسی کے بعد اس کے نائب قطب الدین ایبک نے اسی سال دہلی اور میرٹھ کو فتح کر کے ان تمام علاقوں میں اِسلامی شریعت کا نفاذ کر دیا۔

بنارس اور قنوج کی فتح: بنارس میں راجہ جے چند مسلمانوں کے خلاف ایک نئی فوج تیار کر رہا تھا، اس کی قوت بہت بڑھ گئی تھی، یہ اطلاع پا کر سلطان شہاب الدین غوری نے ایک بار پھر ہندوستان کا رُخ کیا۔ ''اٹاوہ'' کے قریب دونوں فوجوں کا ٹکراؤ ہوا۔ جے چند تین ہزار ہاتھی اور بیشمار سپاہی لے کر میدان میں آیا تھا مگر اسے شکست فاش ہوئی۔ بنارس، قنوج اور گردونواح کا وسیع علاقہ غوری سلطنت میں شامل ہو گیا۔

592ھ (1195ء) میں سلطان نے ہندوستان میں ایک مختصر مہم کے دوران ''تھنکر'' (بیانہ) کا علاقہ فتح کر لیا۔ شہاب الدین غوری نے اب تک کی یہ تمام عظیم الشان فتوحات اپنے بڑے بھائی سلطان غیاث الدین غوری کے دورِ حکومت میں انجام دی تھیں۔ اگرچہ عسکری اور دفاعی اُمور کے علاوہ اپنے ماتحت صوبوں غزنی وغیرہ میں انہیں بڑی حد تک خود مختاری حاصل تھی تاہم بادشاہت غیاث الدین کے پاس تھی۔ کچھ عرصے بعد سلطان غیاث الدین کا انتقال ہو گیا اور شہاب الدین غوری نے باقاعدہ

تختِ شاہی سنبھال لیا۔ یہ 599ھ (1202ء) کا واقعہ ہے۔

شہاب الدین غوری کی خوارزم شاہ سے لڑائی: شہاب الدین غوری کی حکمرانی کے ابتدائی دور میں سلطنتِ غور کے وسط ایشیا میں تیزی سے عروج پانے والی خوارزمی سلطنت سے سرحدی معاملات پر اختلافات پیدا ہو گئے۔ بات سرحدی جھڑپوں سے بڑھ کر باقاعدہ جنگوں تک پہنچ گئی۔ ان لڑائیوں کے آخری مرحلے میں شہاب الدین غوری نے خوارزم میں گھس کر وہاں کے پایۂ تخت ''اورگنج'' کا محاصرہ کر لیا مگر خوارزمی افواج نے غوریوں کے پڑاؤ کی جانب ''آمو'' دریا کا پانی چھوڑ دیا، جس سے غوری خیمہ گاہ جھیل کی شکل اختیار کر گئی اور شہاب الدین غوری کو شدید نقصانات برداشت کر کے پسپا ہونا پڑا۔ واپسی کے سفر کے دوران غوریوں کو چینی ترکستان کے قراخطائی قبائل سے واسطہ پڑ گیا، جنھوں نے اکثر غوری سپاہیوں کو قتل کر ڈالا۔ شہاب الدین کے ساتھ بمشکل 100 آدمی رہ گئے، تاہم لڑتے بھڑتے ہوئے وہ دشمن کی گرفت سے نکل کر بخیریت غور پہنچ گئے۔ قراخطائی قبائل کے بوڑھے سردار ''طانیکو طراز'' نے، جس کی عمر سو سال سے زائد تھی، اس جنگ میں شہاب الدین کی معرکہ دانی کا مشاہدہ کرنے کے بعد کہا تھا: ''میں نے زندگی بھر اس جیسا دلیر، قوی اور باہمت انسان نہیں دیکھا۔''

خوارزم سے صلح: شہاب الدین غوری نے خوارزم سے شکست کھانے کے بعد بدلہ لینے کی بجائے مصالحت کی راہ پسند کی۔ خوارزم شاہ کا قاصد ان دنوں دربارِ غور پہنچ کر اس سلسلے میں بات چیت کر رہا تھا۔ شہاب الدین نے دور اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا مثبت جواب دیا، یوں دو مسلم حکومتوں میں جنگوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اور ان کی قوت تعمیری کاموں میں خرچ ہونے لگی۔

پنجاب میں اِسلام کی تبلیغ: پنجاب کے مختلف علاقوں میں ''کھوکھر'' قوم بڑی تعداد میں بستی ہے۔ یہ جنگجو لوگ لوٹ مار میں مشہور، بت پرستی میں مبتلا اور تہذیب و تمدن سے نا آشنا تھے، آزاد زندگی بسر کیا کرتے تھے اور مسلمان آبادیوں پر ظلم و ستم کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ ان کا دائرہ کار ''اٹک'' سے لے کر ''کوہ شوالک'' تک پھیلا ہوا تھا۔ ہر مسلم حکومت کے لیے یہ قوم دردِ سر بنی رہتی تھی۔ سلطان شہاب الدین غوری غیر مسلموں کو اِسلام کی تبلیغ سے خاص لگاؤ رکھتے تھے۔ انہی دنوں ایک مسلمان مبلغ کھوکھروں کی قید میں تھا جو بڑا نیک و صالح اور دانا تھا۔ اس نے حکمت و تدبر سے انہیں اِسلام کی خوبیاں سمجھا کر دینِ حق کی دعوت دی۔ کھوکھروں کے سردار کو یہ باتیں بہت پسند آئیں مگر اسے ڈر تھا کہ اِسلام قبول کرنے کے باوجود کہیں مسلمان امراء ان سے انتقام نہ لیں۔ مسلمان مبلغ نے اسے تسلی دیتے ہوئے یقین دلایا کہ قبولِ اِسلام کے بعد سلطان نہ صرف تمہارے سابقہ جرائم کو معاف

کردے گا بلکہ کوہستان نمک کی حکومت تمہیں ہی دے گا۔ اس وعدے پر کھوکھر سردار نے اپنی قوم سمیت اِسلام قبول کرنے کا عندیہ ظاہر کیا۔ مسلمان مبلغ نے خط لکھ کر سلطان کو اس صورت حال سے آگاہ کیا تو انہوں نے حکمت کا ثبوت دیتے ہوئے کھوکھر سردار کو خلعت روانہ کی اور اسے دربار میں طلب کر کے کلمہ طیبہ پڑھایا۔ ساتھ ہی کوہستان کی حکومت اس کے سپرد کردی۔ کھوکھر سردار کی تبلیغ سے کچھ ہی عرصے میں کھوکھروں کی اکثریت مسلمان ہوگئی۔

آخری مہم: کھوکھروں کے جو قبیلے مسلمان نہیں ہوئے تھے وہ مسلمانوں کے خلاف پہلے سے بڑھ کر شورش پسندی کا مظاہرہ کرنے لگے، انہیں بھڑکانے میں ہندو راجاؤں کا بڑا ہاتھ تھا، ''گکھڑ'' بھی اسی علاقے کی غیر مسلم قوم تھے۔ غیر مسلم کھوکھروں اور گکھڑوں کی شورش اس حد تک بڑھ گئی کہ آخر سلطان شہاب الدین غوری ان کا سر کچلنے کے لیے خود ہندوستان آنے پر مجبور ہوگئے۔ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد سلطان ترکستان کے علاقے میں اقدامی جہاد کا ایک زبردست منصوبہ ترتیب دینے لگے۔ انہوں نے اپنی روانگی سے پہلے ہی بامیان کے گورنر کو خط لکھا:

> ''میں ترکستان کے غیر مسلم علاقوں پر لشکر کشی کا رادہ کر چکا ہوں، تمہیں خاص تاکید کی جاتی ہے کہ بامیان کی تمام افواج کو لے کر دریائے آمو کے کنارے پہنچ جاؤ اور وہاں پل تعمیر کرنا شروع کردو تاکہ فوج کو دریا پار کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔''

یہ خط روانہ کر کے سلطان نے خود بھی لاہور سے غزنی کا رُخ کیا۔ راستے میں جہلم سے آگے ''مندرہ'' کے قریب اسلامی لشکر نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا۔ کسی کو خبر نہیں تھی کہ وقت کے اس عظیم فاتح کے قتل کی سازش تیار ہو چکی ہے۔

قاتلانہ حملہ اور شہادت: یہ 3 شعبان 602ھ (16 مارچ 1205ء) کی رات تھی۔ تاریکی میں بیس مسلح افراد شاہی خیمے کے قریب گھات لگائے بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک نے آگے جا کر دربان پر اچانک خنجر کا وار کردیا اور تاریکی میں غائب ہوگیا۔ دربان کی چیخ و پکار سن کر باقی تمام پہرے دار اسی طرف دوڑے، یہی وقت تھا جب بقیہ مسلح افراد نے شاہی خیمے میں گھس کر سلطان کو خنجروں کا نشانہ بناڈالا۔ سلطان نے 22 گہرے زخم کھا کر جان جانِ آفرین کے سپرد کردی۔ حملہ آوروں کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ یہ غیر مسلم کھوکھر تھے جبکہ دوسری روایت کے مطابق یہ بدنام زمانہ باطنی تحریک کے بانی حسن بن صباح کے فدائی خنجر بردار تھے جو عالمِ اِسلام کی دیگر کئی جلیل القدر شخصیات کے خون سے ہاتھ رنگ چکے تھے۔ سلطان شہاب الدین غوری کی میت 22 شعبان کو غزنی پہنچی۔ یہاں انہیں اس عمارت میں دفنایا گیا جو انہوں نے اپنی بیٹی کے لیے تعمیر کروائی تھی۔ ان کی اولاد نرینہ کوئی نہیں تھی، ان کی بیٹی ہی ان کی واحد وارث تھی۔

بے مثل سالار: سلطان شہاب الدین غوری ایک ایمان دار، خدا ترس، رعایا پرور اور غیور مسلم حکمران تھے۔ جنگی فنون میں وہ اپنے زمانے کے بے مثل سالار تھے۔ انہوں نے ہندوستان میں ایسی مستحکم اِسلامی حکومت کی بنیاد رکھی جسے چھ صدیوں تک سبوتاژ نہ کیا جاسکا...... وہ ایک علم دوست انسان تھے۔ علماء اور طلبہ کی بے حد قدر کرتے تھے۔ صوفیا اور صلحاء کی خدمت میں بڑی خوشی محسوس کیا کرتے تھے۔

تعمیر وترقی کا دور: غوریوں کے دورِ حکومت میں اَفغانستان ایک بار پھر علم وادب، تہذیب وتمدن اور صنعت وحرفت میں عروج پر پہنچ گیا تھا۔ غزنی کو چھوڑ کر باقی تمام خراسان اور ہندوستان میں یہ سب سے آباد وشاداب علاقہ شمار ہوتا تھا۔ چھ صدیاں قبل مجاہدینِ اِسلام کے قدموں کی برکت سے اس خطے نے تعمیر وترقی کا جو سفر شروع کیا تھا، اس کے نتائج دیکھ کر ہندوستان اور چین جیسی قدیم سلطنتیں بھی محوِ حیرت تھیں۔ خود مسلم حکومتوں میں بھی اس ملک کا تہذیب وتمدن قابلِ رشک تھا، آنے والا ہر سیاح اَفغانستان کے شہروں کی رونق اور چہل پہل سے ضرور متاثر ہوتا تھا۔

شہاب الدین غوری کے بعد: سلطان شہاب الدین غوری کے بعد سلطنت غوران کے تین وفادار امراء میں اس طرح تقسیم ہوگئی کہ وسطی ہندوستان اور دہلی کے علاقے میں قطب الدین ایبک نے، اَفغانستان کے علاقے میں تاج الدین ایلدز نے اور پنجاب میں ناصر الدین قباچہ نے اپنی اپنی خود مختار حکومتیں قائم کرلیں۔ اس کے ساتھ ہی اَفغانستان کے ضمن میں ہندوستان کی تاریخ کا ایک دور ختم ہوگیا۔ قطب الدین ایبک سے ہندوستان کی مسلم سلطنت کی راہ الگ ہوجاتی ہے جس نے دہلی میں پہلی خودمختار اِسلامی سلطنت قائم کی جبکہ اَفغانستان کی تاریخ میں ہم اگلے دور کی باگ خوارزم شاہی حکمرانوں کے ہاتھوں میں دیکھتے ہیں، جو پچھلی ڈیڑھ صدی سے دریائے آمو کے کنارے آباد ایک شہر ''اورگنج'' میں قائم ہونے والی چھوٹی سی سلطنت کو وسعت دیتے دیتے خراسان تک آن پہنچے تھے۔

مآخذ ومراجع

- ...... طبقاتِ ناصری، قاضی منہاج السراج الجوزجانی رحمہ اللہ
- ...... الکامل فی التاریخ: جلد 4، ابن اثیر الجزری رحمہ اللہ
- ...... تاریخ ابن خلدون: جلد 4، علامہ عبدالرحمن ابن خلدون
- ...... تاریخ ملت: جلد 3، مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم

چھٹا باب

خوارزمی حکمران اور تاتاریوں کا حملہ

ساتویں صدی ہجری کے آغاز میں اَفغانستان کے اقتدار کی باگ خوارزمی حکمرانوں کے ہاتھ میں آگئی۔خوارزم کا مہم جُو بادشاہ ''علاؤالدین محمد خوارزم شاہ'' سمرقند و بخارا سمیت تمام وسط ایشیا پر قابض ہو چکا تھا۔غوری حکمرانوں کے اچانک زوال کے ساتھ ہی اس نے اَفغانستان کے تمام علاقوں کو 608ھ (1211ء) تک کسی خاص مزاحمت کے بغیر اپنے قبضے میں لے لیا اور اپنے بڑے بیٹے شہزادہ جلال الدین منکبرتی کو اَفغانستان میں اپنا نائب مقرر کر دیا۔

اَفغانستان کا سنہرا دور: یہ وہ زمانہ تھا کہ اَفغانستان پیداوار، تجارت اور صنعت و حرفت کے لحاظ سے دنیا کے سب سے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں آ چکا تھا۔ایک ایک شہر میں کئی کئی لاکھ افراد آباد تھے اور ہر طرح کی نعمتیں بلند اقبال مسلم حکمرانوں کے ہاتھوں اَفغان عوام پر نچھاور ہو رہی تھیں۔اَفغانستان میں خوشحالی اور ترقی کا یہ دور یقیناً قابل تعریف اور مقامی لوگوں کے لیے باعث فخر تھا مگر مشیتِ ایزدی اس دھرتی کے باسیوں کو ایک اور مقام کے لحاظ سے قابل فخر بنانا چاہتی تھی جو بظاہر شکست و ریخت اور تباہی و بربادی کے ہولناک مناظر پر مشتمل تھا مگر درحقیقت اس میں امت مسلمہ کے لیے حوصلے اور ولولے کی لازوال داستان پوشیدہ تھی۔

صحرائے گوبی کی تاریک آندھی: یہ وہ دور تھا جب ایشیائے بلند میں چنگیز خان صحرائے گوبی سے نمودار ہو کر سلطنتِ چین کو زیرِ نگین کر چکا تھا اور اب اس کی سفاک نگاہیں عالمِ اسلام پر مرکوز تھیں۔

خوارزم کے حکمران علاؤالدین بن محمد خوارزم شاہ نے عاقبت نااندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے چنگیز خان سے مقابلے کی ٹھان لی اور اس کے لیے کسی پیش بندی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔جب اس کے ایک گورنر نے چنگیز خان کی طرف سے بھیجے گئے تجارتی وفد کو جاسوسی کا الزام دے کر قتل کرا دیا تو چنگیز خان غصے سے بھڑک اُٹھا۔اس نے احتجاج کے طور پر ایک قاصد خوارزم کے دربار میں بھیجا مگر علاؤ

الدین محمد خوارزم شاہ نے اسے بھی قتل کرا دیا۔

چنگیز خان عالمِ اِسلام پر تہلکہ خیز یلغار کے لیے موقع کی تلاش میں تھا۔اس حرکت کو بنیاد بنا کر اس نے ساڑھے سات لاکھ جنگجوؤں کے ساتھ ذی قعدہ 616ھ (1220ء) میں عالمِ اِسلام پر چڑھائی کر دی۔

خوارزمی طاقت کا اصل مرکز ماوراء النہر (وسطِ ایشیا) تھا۔حکومت کے پیشہ ور سپاہیوں کی بیشتر تعداد یہاں سمرقند و بخارا جیسے ان قدیم شہروں کی حفاظت پر مامور تھی جو صدیوں سے اِسلامی تہذیب وثقافت کے امین تھے۔خوارزم شاہ نے چنگیز خان سے پہلا معرکہ دونوں ملکوں کی سرحدوں پر لڑا مگر اسے بری طرح شکست ہوئی۔

اس کے بعد خوارزم شاہ ایسا مایوس ہوا کہ اس نے کہیں چنگیزی افواج کا مقابلہ نہ کیا بلکہ ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف فرار ہوتے ہوئے آخر کار بحیرۂ کیسپین کے ایک جزیرے میں روپوشی اختیار کر لی اور وہیں پیوندِ خاک ہو گیا۔اس کی عدم موجودگی میں اترار، بخارا، سمرقند اور وسط ایشیا کے تقریباً تمام شہر ایک سال کے اندر اندر تاتاریوں کے ہاتھوں کھنڈر بن گئے اور وہاں کی آبادی مکمل طور پر تہ تیغ کر دی گئی۔

اَفغان عوام کا ولولہ انگیز کردار: ان حالات میں جس مردِ مجاہد نے اس عالمی طاغوتی طاقت سے ٹکر لینے کا حوصلہ کیا اسے دنیا سلطان جلال الدین کے نام سے جانتی ہے جو خوارزم شاہ کا بڑا بیٹا اور ولی عہد تھا۔ سلطان جلال الدین کے ساتھ اس تاریخی جہاد میں جس علاقے کے غیور فرزندوں نے شانہ بشانہ حصہ لے کر تاریخ میں اپنا نام روشن کیا وہ اَفغانستان کا مردم خیز خطہ تھا۔ سلطان جلال الدین اپنے والد کی وفات کے بعد مٹھی بھر جانثاروں کے ساتھ تاتاریوں کی مختلف افواج کو جل دیتے ہوئے جنوبی اَفغانستان کے شہر بست پہنچے اور یہاں ایک زبردست جہادی تحریک کا منصوبہ ترتیب دینے لگے۔ہم دورِ جدید میں رہ کر شاید اس وقت کے حالات کی سنگینی کا صحیح اندازہ تو نہیں کر سکتے بہر حال اتنا سمجھ لیجیے کہ اس وقت کفر کی ہمہ گیر طاقت اور فرزندانِ اِسلام کی کسمپرسی کا حال کچھ ایسا ہی تھا جیسا کہ ماضی قریب میں سوویت یونین کی، اور حال میں امریکہ کی اَفغانستان پر یلغار کے ابتدائی دنوں میں تھا۔

سلطان جلال الدین کی تحریکِ جہاد: سلطان جلال الدین نے اَفغانستان میں تحریکِ جہاد کو چار خطوط پر آگے بڑھایا۔ (1) ......عوام کو جہاد کی عام دعوت دینا اور ان کے شکستہ حوصلوں کو از سرِ نو بلند کرنا۔ (2) ......غیر مقبوضہ شہروں کے پیشہ ور سپاہیوں اور عوام کو آخری دم تک لڑنے کی تلقین کرنا۔ (3) ...... مقبوضہ شہروں میں عوامی طاقت سے منظم شورش برپا کرنا۔ (4) ...... ملک کے طول وعرض سے افرادی قوت جمع کر کے چنگیز خان سے فیصلہ کن مقابلے کے لیے ایک عظیم الشان لشکر تیار کرنا۔

ان تمام خطوط پر زور و شور سے کام شروع کر دیا گیا۔علماء اور مبلغین نے عوام میں جہاد کی دعوت عام

کر کے انہیں دشمن کے سامنے جھکانے کی بجائے میدان میں ڈٹ جانے کی تلقین شروع کی۔ چنانچہ اَفغان، ترک اور خلجی سردار جوق در جوق سلطان کے اردگرد جمع ہونے لگے۔ سلطان کی ذاتی کمان میں صرف چند ہزار سپاہی تھے مگر اَفغانستان کے جنگجو عوام کو اپنے ساتھ دیکھ کر انہیں یقین تھا کہ چنگیز خان کی بظاہر ناقابل شکست طاقت کو شکست دی جا سکتی ہے۔

ضرب المثل غلط ثابت کر دی: یہ ایسا دور تھا کہ تاتاری حملہ آوروں کی تیز رفتار یلغار اور حیرت انگیز فتوحات کے سامنے کوئی طاقت ٹِک نہیں سکتی تھی، چنگیز خان کے دو سپہ سالاروں نے چھ ماہ میں کاشغر سے لے کر روس تک کے علاقے پر طوفانی دھاوا بول کر یورپ کے حکمرانوں کو بھی لرزہ براندام کر دیا تھا۔ یہ ضرب المثل عام ہو چکی تھی کہ اگر کوئی تم سے کہے تاتاری شکست کھا گئے ہیں تو ہرگز اس پر یقین نہ کرنا۔ مگر سلطان جلال الدین نے اَفغان عوام کو اپنا دست و بازو بنا کر اس ضرب المثل کو بہت جلد غلط ثابت کر دیا۔

اَفغانستان میں باطل کی متواتر شکستیں: تاتاری ان دنوں قندھار کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ سلطان جلال الدین نے بُست سے قندھار تک کا فاصلہ تیزی سے طے کر کے اچانک تاتاریوں پر حملہ کر دیا، زوردار معرکے کے بعد تاتاریوں کو شکستِ فاش ہوئی۔ کوئی ایک دشمن بھی زندہ بچ کر نہ جا سکا۔

یہ فتح اتنی حیران کن تھی کہ تاتاریوں نے کئی محاذوں پر اپنی یلغار فوراً روک دی اور دوسری طرف مقبوضہ اِسلامی شہروں اور دیہاتوں کے مایوس عوام میں اس فتح کی خبر سے زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی اور انہوں نے جگہ جگہ تاتاریوں کی حکمرانی کو مسترد کرتے ہوئے علم جہاد بلند کر دیا۔ چند دنوں کے اندر اندر غیور اَفغان عوام نے درجنوں شہروں، دیہاتوں اور چوکیوں سے تاتاری سپاہیوں کو چُن چُن کر مار ڈالا۔ سلطان کا تاتاریوں سے اگلا معرکہ غزنی اور زابل کے درمیان ایک کھلے میدان میں ہوا۔ سلطان کے ساتھ اَفغان سرداروں کے مسلح قبیلے موجود تھے جن کی تعداد ایک لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ چار دن کی شدید جنگ کے بعد اللہ کی نصرت سے اِسلامی لشکر کو شاندار فتح نصیب ہوئی۔ تاتاری بری طرح شکست کھا کر بھاگ نکلے۔ چنگیز خان کو اس پر بے حد طیش آیا، اس نے اپنے تمام منتشر سرداروں کو دور دراز کے مقامات سے جمع کر کے طویل غور و خوض کے بعد ایک نیا لشکر مرتب کیا۔ یہ لشکر چنگیز خان کے بیٹے تولی خان کی قیادت میں روانہ ہوا۔ سلطان جلال الدین اس دوران غزنی سے کابل اور پھر کابل سے پروان آ چکے تھے۔ یہیں دونوں فوجوں میں تاریخی لڑائی ہوئی۔ اس بار بھی مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا اور تاتاریوں کو عبرت ناک شکست ہوئی۔ یہ تمام جنگیں جو کہ 618ھ (1221ء) میں لڑی گئی تھیں تاریخی لحاظ سے بے حد اہم شمار ہوتی تھیں۔

مؤرخین اس بات کا حیرت کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں کہ چنگیز خان جیسے فاتحِ عالم کو متواتر شکستوں

سے دوچار کرنا، افغانستان کے بلند ہمت مسلمانوں ہی کا کارنامہ تھا جس کی نظیر کوئی اور قوم پیش نہ کر سکی۔ افغانستان کے ان معرکوں کے علاوہ اس بے لگام طاقت کو کہیں بھی شکست کا سامنا نہیں ہوا تھا۔

ہرات کا معرکہ: ہرات خراسان کا سب سے بڑا شہر تھا۔ یہاں علوم دینیہ اور اِسلامی ثقافت کے سرچشمے تھے۔ چنگیز خان نے اس شہر کو بطور خاص نشانہ بنانے کے لیے اپنے بیٹے تولی خان کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ بھیجا۔ ربیع الاوّل 618ھ میں تولی خان ہرات پہنچ گیا، اس نے قاصد بھیج کر ہرات کے حاکم شمس الدین محمد کو ہتھیار ڈالنے کا کہا۔ دلیر حاکم نے جواب دیا: ''خدا نہ کرے کہ میں ان جنگلیوں کی اطاعت کا طوق اپنی گردن میں ڈالوں۔''

چنانچہ تاتاریوں نے شہر پر حملہ کر دیا۔ سات دن تک کھلے میدان میں خونریز جنگ ہوتی رہی۔ اس دور کی تاریخ میں کھلے میدان میں لڑی جانے والی اتنی طویل جنگ کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ آخر کار میدان کار زار میں شمس الدین محمد شہید ہو گیا اور اہل شہر میدان سے پیچھے ہٹ کر شہر پناہ میں محصور ہو گئے۔

نویں دن تولی خان خود فصیل کے سامنے آیا اور چلاّ کر کہا: ''ہرات کے لوگو! کان کھول کر سن لو! میں چنگیز خان کا بیٹا تولی خان ہوں۔ ہتھیار ڈال دو اور سالانہ خراج کا نصف پیشگی میرے حوالے کر دو۔ میں تمہاری جان بخشی کا وعدہ کرتا ہوں۔'' اس معاہدے پر اہل شہر نے دروازے کھول دیے مگر تاتاریوں نے اندر داخل ہو کر بارہ ہزار افراد کو جنگ میں شرکت یا سلطان جلال الدین کی حمایت کے الزام میں شہید کر دیا جن میں عظیم محدث امام البزاز رحمہ اللہ بھی شامل تھے۔ وہ صرف سات واسطوں سے حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث نقل کیا کرتے تھے۔

قاضی وحید الدین کا قصہ: ہرات کے مشہور عالم دین قاضی وحید الدین تاتاریوں کے خلاف اس جہاد میں شریک تھے اور فصیل شہر سے دشمن پر تیر برسایا کرتے تھے۔ ایک دن وہ جنگ کے ہنگامے میں پھسل کر فصیل کے باہر کھودی گئی خندق میں گر گئے۔ اس کے باوجود زندہ سلامت رہے۔ تولی خان نے انہیں گرفتار کر کے چنگیز خان کے پاس بھیج دیا۔

چنگیز خان ان کے علم و فضل سے متاثر ہو گیا۔ ایک دن اس نے پوچھا: ''آپ کا کیا خیال ہے...... کیا اس قتل عام کے باعث دنیا میں میرا نام روشن رہے گا؟''

قاضی صاحب نے ''سچ کہو اگرچہ کڑوا ہو'' (الحدیث) پر عمل کرتے ہوئے فرمایا: ''انسان کا نام انسانوں کے درمیان ہی باقی رہتا ہے، جب آپ انسانوں کو اس طرح قتل کرتے چلے جائیں گے تو آپ کا نام لینے والا کون باقی رہے گا؟'' یہ سن کر چنگیز خان برہم ہو گیا اور قاضی صاحب کی جان خطرے میں پڑ

گئی۔چنگیز خان نے مجلس برخاست کی تو قاضی صاحب موقع پا کر وہاں سے فرار ہو گئے۔

طالقان کا معرکہ: بلخ، جوزجان اور فاریاب کو فتح کرنے کے بعد تاتاریوں کا ایک لشکر طالقان پہنچا۔ یہاں کا مرکزی قلعہ "نصرت کوہ" اپنی وسعت، بلندی اور مضبوطی میں بے مثال تھا۔تاتاری سات ماہ تک اسے فتح نہ کر سکے۔مجاہدین رات کو پوشیدہ راستوں سے باہر نکل کر تاتاری لشکر پر شب خون مارتے اور خاصا جانی و مالی نقصان کر کے واپس چلے آتے۔بعض اوقات وہ دشمن کے مویشی اور اناج کے ذخائر بھی لوٹ لیتے۔آخر چنگیز خان خود اس محاذ پر آ گیا،اس نے قلعے کے سامنے لکڑیوں اور مٹی کا ایک ٹیلہ تعمیر کرا کے فوج کو دیوار پھلانگنے کا حکم دیا۔یہ دیکھ کر مجاہدین قلعے کے دروازے کھول کر باہر نکل آئے۔ بہت سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے اور بہت سے پہاڑی گھاٹیوں میں روپوش ہو کر بچ نکلے۔

قلعہ گرزیوان: قلعہ گرزیوان شمالی اَفغانستان سے بامیان جانے والی شاہراہ پر واقع تھا۔طالقان کے بعد چنگیز خان نے اس پر حملہ کیا۔یہاں تھوڑے سے سپاہی تھے جنہوں نے حیرت انگیز بہادری کے ساتھ ایک ماہ تک اس طوفان کا مقابلہ کیا،جب آخری محافظ بھی شہید ہو گیا تب جا کر چنگیز خان اندر داخل ہو سکا۔

قلعہ کالیون: ہرات سے 60 میل دور قلعہ کالیون واقع تھا۔ یہاں کے دلیر سپاہیوں نے محصور رہ کر پورے ایک سال چار ماہ تک تاتاریوں کا مقابلہ کیا۔آخر میں صرف پچاس مجاہدین باقی رہ گئے۔تب تاتاری دیواریں پھلانگ کر قلعے میں گھس گئے۔تمام مجاہدین مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

قلعہ اشیار اور قلعہ فیوار: قلعہ اشیار کا حاکم امیر محمد مرغزی تھا جو طالقان اور بامیان کے راستے میں تاتاری لشکر پر چھاپہ مار حملے کرتا رہا تھا۔تاتاریوں نے یہاں حملہ کیا تو حاکم نے پندرہ ماہ تک مورچہ بندرہ کر شدید مقابلہ کیا۔اس دوران قلعے میں خوراک کے ذخائر ختم ہو گئے اور اکثر محصورین بھوک سے جاں بحق ہو گئے۔جب تاتاری قلعے میں گھسے تو امیر محمد مرغزی اور اس کے باقی ماندہ تیس ساتھی ان سے لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔"قلعہ فیوار" کے محصورین بھی قحط کے باوجود دو ماہ تک مقابلے میں ڈٹے رہے اور آخری سانس تک جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

قلعہ سَیْفرُوْد: قلعہ سَیْفرُوْد غور کے بے آب و گیاہ صحرا میں واقع تھا۔قلعے کے محافظوں نے انجام کی پروا کیے بغیر کئی ماہ تک قلعہ بند ہو کر تاتاریوں کا مقابلہ کیا۔آخر قلعے میں صرف ایک دن کے بقدر پانی باقی رہ گیا۔تب قلعہ دار ملک قطب الدین نے اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے طے کیا کہ کل تمام مسلح آدمی قلعے کے مختلف گوشوں میں چھپ جائیں اور دروازہ کھول دیا جائے۔ تاتاری جب قلعے کے اندر بکھر جائیں تو ہر طرف سے ان پر اچانک حملے کیے جائیں اور لڑتے لڑتے شہادت پانے کی کوشش کی

جائے۔ مگر اسی رات برف باری شروع ہوگئی اور صبح تک مجاہدین کے پاس دو ماہ کا آبی ذخیرہ جمع ہوگیا۔ تاتاری یہ دیکھ کر مایوس ہوگئے اور واپس چلے گئے۔ موسم گرما میں تاتاری لشکر دوبارہ محاصرے کے لیے آن پہنچا، مگر اس وقت تک قلعے کے باشندے خوراک اور پانی کے ذخائر جمع کر کے طویل مدت تک جنگ کے لیے تیار ہو چکے تھے، تاتاریوں کو دو ماہ کی بے سود جنگ کے بعد ناکام ہو کر واپس جانا پڑا۔

فیروز کوہ: فیروز کوہ غور کا دوسرا بڑا قلعہ تھا۔ بیس ہزار تاتاری اکیس روز تک اس کا محاصرہ کر کے حملے کرتے رہے۔ مجاہدین ثابت قدم رہے۔ آخر کار شدید ترین برف باری کی شکل میں غیبی مدد نازل ہوئی اور تاتاریوں کو محاصرہ چھوڑ کر واپس جانا پڑا۔

قلعہ تولک: قلعہ تولک کا آٹھ ماہ تک محاصرہ ہوا۔ محافظین نے دشمن کی ایک نہ چلنے دی۔ آخر کار تاتاریوں کو ناکام واپس جانا پڑا۔

ہرات میں انقلاب: کچھ مدت بعد ہرات میں ایک انقلاب آیا، محکوم مسلمانوں نے تاتاری حاکم اور اس کے سپاہیوں کو قتل کر دیا اور اپنی نئی خود مختار حکومت تشکیل دے دی۔ اس خبر سے چنگیز خان نہایت برافروختہ ہوا اور اس نے ایک بڑا لشکر ہرات کی طرف روانہ کیا۔ ہرات کے لوگ نئے حاکم ملک مبارز الدین کی قیادت میں تاتاری لشکر کے سامنے ڈٹ گئے۔ ساڑھے چھ ماہ تک جنگ ہوتی رہی۔ آخر کار حملہ آوروں کی منجنیقوں نے فصیل کو شکستہ کر کے ایک جانب سے گرا دیا۔ تاتاریوں نے شہر میں گھس کر تمام آبادی کو جس کی تعداد سولہ لاکھ کے لگ بھگ تھی، قتل کر ڈالا اور شہر کو جلا کر برباد کر دیا۔ تاتاریوں کے جانے کے بعد ایک سہما ہوا شخص کسی پوشیدہ گوشے سے باہر نکلا اور اپنے سر پر یوں ہاتھ پھیرنے لگا جیسے اس کے موجود ہونے کا یقین کر رہا ہو۔ تب بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا: ''شکر ہے! مجھے زندگی کا ایک لمحہ اور مل گیا۔''

اس شخص کے علاوہ پندرہ افراد اور تھے جو سولہ لاکھ کی آبادی میں سے بچ گئے تھے۔ کچھ دنوں بعد گرد و نواح کی تباہ شدہ بستیوں کے چوبیس پناہ گزین ان کے ساتھ آ ملے۔ پندرہ سال تک ہرات کے کھنڈرات میں ان چالیس افراد کے علاوہ کوئی اور آباد نہ ہوا۔ ان لوگوں کی رہائش سلطان غیاث الدین غوری کی تعمیر کردہ مسجد کے گنبد کے نیچے تھی، ہرات کی عمارتوں میں سے یہ گنبد واحد شے تھی جو باقی رہ گئی تھی۔

بامیان کا معرکہ: اس دوران چنگیز خان بامیان کے محاصرے میں مصروف تھا۔ محصور مسلمانوں نے اس علاقے سے بڑی بڑی چٹانیں اور پتھر پہلے سے ہی غائب کر دیے تھے تاکہ تاتاری انہیں منجنیقوں میں استعمال نہ کر سکیں۔ چنگیز خان کے حکم سے فصیل کے سامنے لکڑی کے مورچہ بند مینار کھڑے کر دیے گئے۔

تاتاری ان میناروں پر چڑھ کر فصیلوں پر موجود شہر کے محافظ دستوں سے مقابلہ کرنے لگے۔ تب اہل شہر نے آتش گیر مادّہ پھینک کر لکڑی کے ان میناروں کو آگ لگانا شروع کردی۔ جواب میں تاتاریوں نے سرکے میں بھیگی ہوئی کھالیں ان میناروں پر لپیٹ کر انہیں آتش زدگی سے محفوظ بنالیا۔ اس جنگ میں چنگیز خان کا ایک پوتا مسلمانوں کی تیراندازی سے مارا گیا۔ چنگیز خان نے اپنے پوتے کی لاش اپنے خیمے میں منگوائی۔ اسے دیکھ کر اپنا ''خود'' سر سے اُتار پھینکا اور ''آخری حملے'' کا حکم دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ قلعہ فتح ہونے تک حملہ جاری رہنا چاہیے۔ تاتاریوں نے فصیل کو توڑنا شروع کردیا اور آخرکار ایک جانب شگاف ڈال کر اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ شہر فتح کرنے کے بعد چنگیز خان نے حکم دیا کہ کسی بھی جاندار شے کو بھی زندہ نہ چھوڑا جائے، چنانچہ نہ صرف انسانوں بلکہ کتوں، بلیوں اور چوہوں تک کو چن چن کو ختم کردیا گیا۔ تمام درخت اور پودے اُکھاڑ دیئے گئے، عمارتیں منہدم کر کے نذرِ آتش کردی گئیں۔

منہاج السراج کے مؤلف قاضی جوزجانی کا بیان ہے کہ شمالی مغربی اُفغانستان کے شہروں کو چھوڑ کر صرف بستیوں، دیہاتوں اور قصبات میں جو لوگ قتل کیے گئے تھے ان کی تعداد چوبیس لاکھ کے لگ بھگ تھی۔

تاتاری یلغار کے خلاف اُفغانستان کے غیور اور شجاع مجاہدوں کے کارناموں کی یہ چند جھلکیاں ہیں جو کتبِ تواریخ کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں بلاشبہ دشمنانِ اسلام کے خلاف ہر دور میں صفِ اول میں رہنے والے ان مجاہدوں نے تاتاری سیلاب کا جس ہمت و پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا، تاریخ عالم میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہی وجہ تھی کہ درندہ صفت چنگیز خان نے اُفغانستان کو برباد کرنے میں انتہائی شدت سے کام لیا اور بار بار یہاں قتلِ عام کرایا تاکہ مجاہدین کی یہ سرزمین ہمیشہ کے لیے ویران اور غیر آباد ہوجائے۔ چنگیز خان کے منشی عطا ملک جوینی نے سچ کہا تھا کہ آج سے لے کر قیامت تک اس ملک میں انسانوں کی پیدائش اور افزائش کا سلسلہ جاری رہے تب بھی یہ ملک اس برباد شدہ آبادی کے دسویں حصے کے برابر بھی گنجان آباد نہ ہوسکے گا۔ (تاریخ جہاں کشا، جوینی)

<u>جاںنثار اور غدار</u>: اس دوران جبکہ اُفغانستان کے مختلف گوشوں میں مجاہدین کے چھوٹے چھوٹے گروہ چنگیزی افواج کو چھٹی کا دودھ یاد دلا رہے تھے اور چہاریکار میں سلطان جلال الدین کی قیادت میں ترک اور خراسانی قبائل تاتاریوں کے ٹڈی دل کو تیسری بار عبرتناک شکست دے چکے تھے، ایک عجیب سانحہ نمودار ہوا۔ اس سانحے کا سب سے بڑا ذمہ دار اِسلامی لشکر کا ایک سردار سیف الدین اغراق تھا۔

امراء کی غداری: سیف الدین اغراق کا تعلق پشاور کے نواح سے تھا، یہ ایک بہادر مگر خودسر اور مغرور

سردار تھا، اس دور میں پشاور اَفغانستان کا ایک حصہ تھا۔ اَفغانستان پر تا تاریوں کی چڑھائی روکنے کے لیے سیف الدین اغراق پشاور سے 40 ہزار جنگجو لے کر غزنی چلا آیا اور سلطان جلال الدین کے ساتھ تحریکِ جہاد میں شامل ہو گیا۔ غزنی کے معرکے میں اس نے خوب دادِ شجاعت دی۔ معرکۂ پروان کی فتح میں بھی اس کا نمایاں حصہ تھا، اس فتح کے بعد ابھی مال غنیمت تقسیم نہیں ہوا تھا کہ سیف الدین اغراق غنیمت میں حاصل کردہ ایک گھوڑے پر اپنا حق جتانے لگا، یہ دیکھ کر لشکر کے ایک اور سردار امین الملک نے اسے روکا۔ دونوں میں تلخ کلامی شروع ہو گئی۔ سیف الدین اغراق نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا۔

بات اتنی بڑھ گئی کہ فریقین میں تصادم کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ سیف الدین اغراق کو گھوڑا نہ ملا تو وہ سخت جھلایا اور رات کی تاریکی میں اپنی 40 ہزار فوج کو لے کر پشاور کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ کئی اور اَفغان سردار بھی سلطان جلال الدین کا ساتھ چھوڑ گئے جن میں نوح جہاندار اور اعظم ملک خلجی کے نام قابل ذکر ہیں۔

یہ اَفغانستان کی تاریخ کا ایک المیہ رہا ہے کہ ہر دور میں یہاں جلیل القدر مجاہدین کے ساتھ ساتھ شقی القلب غدار بھی نظر آتے ہیں۔ ایسے غداروں کی سیاہ کارستانیاں مجاہدین اِسلام کی برسوں کی محنت پر پانی پھیرتی رہی ہیں تاہم شہداء کے مقدس خون سے غداری کرنے والے ایسے لوگوں کا انجام ہمیشہ نہایت عبرتناک ہو رہا ہے۔

<u>خوارزمی مجاہد کی شکست:</u> سیف الدین اغراق، اعظم ملک خلجی اور نوح جہاندار کی علیحدگی کے بعد سلطان جلال الدین کے پاس بہت کم فوج رہ گئی تھی اس لیے وہ چنگیزی افواج کے سیلاب کے سامنے حکمتِ عملی کے تحت پسپا ہو کر اٹک کے قریب دریائے سندھ کے ساحل باغ نیلاب تک آ گئے۔ یہ جگہ اَفغانستان کی آخری سرحد تھی اور اس کے پار ہندوستان کا علاقہ شروع ہوتا تھا۔ یہاں ایک ہولناک جنگ کے بعد چنگیز خان نے سلطان جلال الدین کو شکست دے دی۔ سلطان جلال الدین گھوڑے سمیت دریائے سندھ کی لہروں میں کود گئے اور چنگیز خان کی گرفت سے بچ نکلے۔ وہ بقیہ زندگی چنگیز خان اور اس کے نائبین کے خلاف مصروفِ جہاد رہے اور بالآخر 628ھ میں روپوش یا شہید ہو گئے۔ ان کی کاوشیں بارآور ثابت نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ مسلمانوں کا انتشار اور غداروں کی کثرت تھی۔ اگر سرزمین اَفغانستان میں سیف الدین اغراق جیسے غدار پیدا نہ ہوتے تو سلطان جلال الدین کے ہاتھوں اَفغانستان کی وادیوں میں اِسلام کی سربلندی اور کفر کی شکست کا ایک ایسا روشن باب تحریر ہوتا جس سے زمانے کی آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ بہرکیف تاریخ میں اس بات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ اَفغانستان

کو جہاں مسلمانوں کے دورِ عروج میں محمود غزنوی جیسے جہانگیر فاتح کا مسکن بننا نصیب ہوا، وہاں دورِ تنزل و انحطاط میں اسے خوارزم کے مجاہدِ اعظم کے مضبوط ترین مورچے کی حیثیت حاصل رہی۔

سیف الدین اغراق اور اس کے ساتھیوں کا انجام: سیف الدین اغراق اور اس کے ہمنوا سلطان جلال الدین کے جہادی کیمپ سے نکل کر ننگرہار چلے گئے تھے۔ جب انہیں چنگیز خان کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو وہ وہاں سے پشاور روانہ ہوگئے۔ چونکہ یہ سب غدار تھے اس لیے ان کے دلوں میں مزید مال و دولت اور ریاست کے حصول کے لیے ایک دوسرے کے خلاف اندیشے جنم لے رہے تھے، جلد ہی ان میں تو تکار شروع ہوگئی جس کے نتیجے میں سیف الدین اغراق اور نوح جہاندار ایک دوسرے سے بے حد نالاں ہوگئے۔ یہ صورت حال دیکھ کر ایک دن اعظم ملک خلجی، سیف الدین اغراق کے خیمہ گاہ میں آیا اور چنگیزی خطرے کا احساس دلا کر اسے نوح جہاندار سے صلح پر آمادہ کرنے کی کوشش کرنے لگا...... مگر سیف الدین اغراق نوح جہاندار کا نام سن کر ہی آپے سے باہر ہوگیا اور اعظم ملک کو اپنے خیمے میں چھوڑ کر سیدھا نوح جہاندار کے کیمپ کی طرف دوڑ پڑا۔ جوں ہی اسے نوح جہاندار دکھائی دیا اس نے تلوار کا وار کردیا، نوح جہاندار کو گہرا زخم لگا مگر وہ بچ گیا جبکہ اس کے قبیلے والے سیف الدین اغراق پر چڑھ دوڑے اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ سیف الدین اغراق کے قتل کی خبر اس کے پڑاؤ میں پہنچی تو اس کے ساتھیوں کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ اس قتل میں اعظم ملک کا ہاتھ ہے جو ان کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ انہوں نے اسی وقت اعظم ملک کو گھیر کر قتل کر ڈالا۔

اعظم ملک کے قتل کی خبر سن کر خلجی قبیلے نے اغراق کے قبیلے پر حملہ کردیا، جبکہ اِدھر اغراق کا قبیلہ اپنے سردار کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے نوح جہاندار کے قبیلے سے برسرِ پیکار تھا۔ قصہ مختصر غداروں کے یہ تینوں قبیلے چند ہی دن میں آپس میں لڑ مر کر تباہ ہوگئے۔ جو زندہ بچ گئے وہ پشاور پر چنگیز خان کے حملے کے موقع پر تاتاریوں کے ہاتھوں مارے گئے۔

سرمایہ ضائع ہوگیا: مقامِ عبرت ہے کہ یہ ہزاروں مسلح مسلمان جو کہ امت مسلمہ کا بہترین سرمایہ تھے اور افغانستان کے محاذوں پر اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے تاریخ کا رُخ بدل سکتے تھے، جب ذاتی مفادات اور دنیوی اغراض کے باعث مجاہدین کی صفوں سے الگ ہوئے تو اپنی جان و مال تک کا تحفظ نہ کرسکے۔ دشمن کا کیا بگاڑ سکتے، خود آپس میں لڑ کر ختم ہوگئے۔ ان کی عاقبت نااندیشی کے نتیجے میں دنیائے اِسلام میں تاتاریوں کو بے دریغ آگے بڑھنے کے مواقع ملے اور چھ سو سالہ قدیم اِسلامی علوم وفنون اور تہذیب و تمدن کے ذخائر اس طرح ناپید ہوگئے، جیسے ان کا کبھی وجود ہی نہ تھا، خاص طور پر

افغانستان کو چنگیزی افواج نے اس طرح تباہ و برباد کیا کہ تقریباً نصف صدی تک یہ صرف کھنڈروں اور قبرستانوں کی سرزمین دکھائی دیتا تھا۔ ان غداروں کے اعمال بد کی وجہ سے افغانستان بلکہ عالمِ اسلام کا اکثر حصہ ایک صدی تک تاتاریوں کا غلام بنا رہا۔

افغانستان کے تاتاری حکمران: 624ھ (1226ء) میں چنگیز خان بیمار ہو کر مر گیا اور اس کی مقبوضہ عظیم سلطنت اس کے بیٹوں میں تقسیم ہو گئی۔ وسطِ ایشیا کے مقبوضہ مسلم ممالک چغتائی خان کے قبضے میں آگئے جبکہ سائبیریا سے لے کر بلغاریہ تک کے سرد برفانی علاقے جوجی خان کو ملے۔ چین اور منگولیا کے علاقوں میں چنگیز خان کے جانشین کے طور پر حکومت کرنے کا اعزاز اوکتائی خان کے حصے میں آیا۔

افغانستان کی ازسرِنو آبادکاری کا آغاز: چنگیز خان کی موت کے بعد جب عالمِ اسلام کے مقبوضہ ممالک تاتاری شہزادوں میں تقسیم ہوئے تو افغانستان سب سے برباد خطہ شمار کیا جاتا تھا، یہاں آباد گنے چنے مسلمان کسی شمار ہی میں نہ تھے تاہم اس سے اگلے دور میں یہاں کچھ آبادی شروع ہوئی اور مسلمان مبلغین نے خفیہ طور پر حکمران طبقے اور تاتاریوں میں اسلام کی تبلیغ کا کام بھی شروع کر دیا جس کے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔

افغانستان میں تاتاری حکومت کے ابتدائی دور میں افغانستان کی تباہ شدہ سرزمین کے لیے کسی باقاعدہ حکومت کے قیام کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ البتہ اس کے جنگلات اور پہاڑ، وسط ایشیا کے حاکم چغتائی خان اور ایران پر قابض ایل خانی تاتاریوں کے درمیان معرکوں کا میدان بنے رہے۔ اوکتائی خان کی موت کے بعد جب منگوخان تاتاریوں کا خاقان بنا تو اس کے بھائی ہلاکو خان نے افغانستان کو اپنی تحویل میں لے لیا، اس وقت افغانستان میں کابل، قندھار، ہرات، زابل، بلخ، جوزجان، فاریاب، طالقان اور بدخشاں جیسے تمام شہر تودۂ خاک بن چکے تھے۔ صنعت و حرفت، زراعت و آبپاشی اور علم و ادب کا نام و نشان تک باقی نہ رہا تھا۔ افغانستان میں فقط وہ انسان زندہ بچے تھے جو شہروں اور قصبات سے دور عام شاہراہوں اور راستوں سے ہٹ کر پہاڑوں کی چوٹیوں اور دڑوں میں زندگی گزارا کرتے تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جن سے افغانوں کی نسل دوبارہ چلی......اور یہاں انسانی آبادی کا ازسرِنو آغاز ہوا۔

لرزہ خیز مظالم: ہلاکو خان کی جانب سے افغانستان کو اپنی تحویل میں لینے کے بعد ان بچے کھچے لوگوں پر بھی سخت ترین ٹیکس عائد کر دیے گئے۔ ٹیکس ادا نہ کرنے کی صورت میں ان پر مظالم کے پہاڑ توڑے جانے لگے۔ مردوں کو شکنجوں میں کسا جاتا اور عورتوں کو برہنہ کر کے پستانوں کے بل لٹکا دیا جاتا، بہت سے افراد کی آنکھیں، منہ اور ناک سلائی کر کے بند کر دیے جاتے اور وہ تڑپ تڑپ کر مر جاتے۔ ان

ناقابل برداشت مظالم سے بچنے کے لیے لوگ اس حد تک مجبور ہو گئے کہ اپنے بچوں کو فروخت کر کے رقم حاصل کرتے اور اسے تاتاری حکومت کو ٹیکس کے طور پر ادا کرتے۔

اہلِ علم کی حالت زار: اہلِ علم و ادب کی اکثریت جو بڑے شہروں میں آباد تھی شہید ہو چکی تھی یا ہندوستان اور مصر جیسے دور دراز علاقوں کی طرف ہجرت کر گئی تھی۔ تاہم کچھ مسلمان فضلاء کو تاتاریوں نے جبری طور پر اپنی حکومت کی مشینری چلانے کے لیے ملازم رکھ لیا تھا۔ ان کی زندگی سہولیات سے آراستہ ہونے کے باوجود غلامانہ تھی۔ معمولی شک وشبہے کی بنا پر ایسے دانشوروں اور فضلاء کو بے رحمانہ طریقے سے موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا تھا۔ درسِ نظامی کی مشہور کتاب مختصر المعانی کا متن علامہ ابو یوسف یعقوب السکاکی کی ''مفتاح العلوم'' سے ماخوذ ہے، یہ علامہ سکاکی بھی چغتائی خان کے دربار میں ملازم رکھ لیے گئے تھے۔ چغتائی خان نے صرف شک کی بنیاد پر انہیں قتل کرا دیا۔

مجد الدین نامی ایک ماہرِ فن مسلمان طبیب چغتائی خان کا خاص معالج تھا، جب چغتائی خان بیمار ہو کر مرا تو اس کی ملکہ نے علاج کامیاب نہ ہونے کی سزا کے طور پر مجد الدین کو اس کے تمام بچوں سمیت تہ تیغ کر ڈالا۔ تاتاریوں کے ان مظالم کے نتیجے میں اَفغانستان ایسا برباد ہوا کہ اس کا کوئی شہر ایسا نہ تھا جس کی آبادی آیندہ سو ڈیڑھ سو برس میں 50 ہزار تک بھی پہنچ سکی ہو۔

تصوف کی طرف عوامی رُجحان: اس شکستگی، تباہی اور یاس کے عالم میں باقی ماندہ مسلمانانِ اَفغانستان اگر کسی چیز کے سہارے زندہ رہ سکتے تھے تو وہ اللہ کی یاد اور اس کا تعلق تھا، چنانچہ اس دور میں یہاں کے باشندے تیزی سے تصوف کی طرف مائل ہوئے جو انسان کو اللہ کی محبت، اس کی طرف انابت، مصائب وحوادث پر صبر، تھوڑے مال پر قناعت، دنیا سے لاتعلقی، فکرِ آخرت اور نفس کشی کا عادی بناتا ہے۔ تصوف کے مختلف سلاسل کو اس دور میں یہاں غیر معمولی پذیرائی نصیب ہوئی، یہاں کی اگلی نسل کے ادباء اور شعراء کے کلام میں بھی صوفیانہ تعلیمات کا گہرا عکس نظر آتا ہے۔

تاتاریوں کا قبولِ اِسلام: تاتاریوں کے اَفغانستان پر تسلط کے باعث مغل زبان کے بہت سے الفاظ یہاں کی مقامی زبانوں دری اور پشتو میں شامل ہو گئے...... مگر اس سے زیادہ اثر خود تاتاریوں پر مقامی مسلمانوں کے سادہ اِسلامی تہذیب وتمدن کا ہو رہا تھا۔ اس دور میں اَفغانستان سے لے کر قفقاز تک تمام تاتاری سلطنتوں میں اِسلام کے گمنام مبلغین حکمران طبقے کو اِسلام کی دعوت دینے کا آغاز کر چکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک صدی کے جاں گسل آزمائشی دور کا خاتمہ تاتاریوں کے فوج در فوج اِسلام میں داخلے پر ہوا۔ 663ھ (1265ء) میں ہلاکو خان کی موت کے بعد اَفغانستان کلی یا

جزوی طور پر جن تاتاری حکمرانوں کے زیر تسلط رہا ان کے نام درج ذیل ہیں:

① اباقاخان	663ھ (1265ء) تا 680ھ (1281ء)
② تکودار سلطان احمد	680ھ (1281ء) تا 682ھ (1283ء)
③ ارغون خان	682ھ (1283ء) تا 689ھ (1290ء)
④ کیخاتو	689ھ (1290ء) تا 694ھ (1294ء)
⑤ بابدو خان (صرف چند ماہ حکومت کی)	694ھ (1294ء) تا 694ھ (1294ء)
⑥ غازان سلطان محمود	694ھ (1294ء) تا 703ھ (1303ء)
⑦ اولجایتو سلطان محمد خدا بندہ	703ھ (1303ء) تا 716ھ (1316ء)
⑧ ابوسعید بہادر خان	716ھ (1316ء) تا 735ھ (1335ء)

اُفغانستان اور ایران کے تاتاری حکمرانوں میں سے سلطان احمد نے سب سے پہلے اِسلام قبول کیا، پھر سلطان محمود غازان، سلطان محمد اور سلطان ابوسعید مسلسل مسلمان بادشاہ گزرے...... ان سب سے پہلے جوجی خان کے بیٹے برکہ خان نے اِسلام قبول کیا تھا جو بحیرہ ارال کے اردگرد سلطنت کا وارث تھا۔ اس نے اِسلام قبول کرنے کے بعد مسلمانوں کو اپنے چچازاد بھائی ہلاکو خان کے مظالم سے نجات دلانے کے لیے اس سے ایک زبردست جنگ لڑی اور اسے شکست فاش دی تھی۔

مسلم تاتاری حکمرانوں کا دور: غیر مسلم تاتاری حکمرانوں نے تو اُفغانستان کو صرف انسانوں کی قتل گاہ اور اپنے مویشیوں کی چراگاہ کے طور پر استعمال کیا تھا، مگر اِسلام قبول کرنے والے تاتاری حکمرانوں نے از سرنو اُفغانستان کی آبادکاری کا کام شروع کیا چونکہ اس دوران چنگیز خان کی نسل بہت پھیل گئی تھی اور اس کی آل اولاد کے درجنوں خاندان وجود میں آچکے تھے اس لیے ان کے مابین حصول اقتدار کے لیے کشت وخون بھی جاری رہا جس سے اُفغانستان بھی متاثر ہورہا تھا تاہم یہ جنگیں محدود پیمانے پر تھیں اور انسانوں کے قتل عام کے وہ مناظر اب نہیں دُہرائے جارہے تھے جو کہ تاتاریوں کی بہیمانہ روایات کا حصہ تھے۔

نومسلم تاتاری حکمرانوں کے کارنامے: نومسلم تاتاری حکمرانوں میں سے سلطان محمود غازان، سلطان محمد خدا بندہ اور سلطان ابوسعید نے مسلمانوں کی ترقی کے لیے بہت کام کیا، انہوں نے نئے سرے سے آبادکاری پر توجہ دی۔ اُفغانستان میں تجارتی قافلوں کی آمدورفت تاتاریوں کے مظالم کے ڈر سے کئی عشروں سے بند تھی، اسے دوبارہ بحال کیا گیا۔ اب مسلمانوں کی تہذیب وتمدن اور صنعت وحرفت کا نیا گلشن آباد ہونے لگا۔ چونکہ تاتاری حکمرانوں کا تعلق چین سے تھا، اس لیے ہند، عراق اور

اَفغانستان کے مسلمانوں کے تعلقات وسطی چین تک وسیع ہونے لگے۔

چینی صنعت کاروں نے اپنے فن نقاشی کو اَفغانستان، ہند اور وسط ایشیا تک منتقل کیا جبکہ اَفغانستان سے قالین بافی کا ہنر چین پہنچا۔ تہذیبی، ثقافتی اور صنعتی روابط کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے قول وعمل سے اِسلام کا پیغام چین کے ان دور دراز علاقوں تک پھیل گیا جو اَب تک اس سے محروم تھے۔ محمود غازان نے اپنی سلطنت کی وسعت کے لیے شام پر حملہ بھی کیا تھا مگر پھر امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ جیسے جلیل القدر عالم کی نصیحتیں سن کر وہاں قتل وغارت سے باز رہا۔ اس نے اُجڑی ہوئی مسلم دنیا کو آب پاشی کے ذریعے زرخیز بنانے پر خاص توجہ دی اور ظالمانہ ٹیکس ختم کر دیے۔

اہل سنت اور شیعوں کی کشمکش: تاتاریوں کے اِسلام میں داخل ہونے کے اس زمانے میں مسلمانوں کے ہر فرقے اور جماعت کے افراد ان نو مسلموں کو اپنی جانب مائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں خراسان اور ایران میں شیعہ علماء بہت سرگرم تھے۔ انہیں سب سے بڑی کامیابی اس وقت حاصل ہوئی جب محمود غازان کے بعد آنے والے تاتاری نو مسلم بادشاہ، سلطان محمد خدابندہ نے شیعہ مذہب قبول کر لیا۔ اس بادشاہ کی حکومت اَفغانستان، بروس، خوارزم اور عراق تک وسیع تھی۔

سلطان محمد خدابندہ اِسلام کی خوبیاں دیکھ کر اپنے ہزاروں ہم قوموں سمیت شروع میں عام اہل سنت کے مذہب کے مطابق مسلمان ہوا تھا مگر جلد ہی اس کے دربار کے ایک شیعہ فقیہہ جمال الدین ابن مطہر نے اس کے ذہن پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا۔ سلطان خدابندہ ویسے بھی علماء اور درویشوں کی بڑی عزت کرتا تھا۔ جمال الدین بن مطہر کے علم وفضل نے اسے اپنا گرویدہ بنا لیا اور وہ آنکھیں بند کر کے اس کی ہر بات پر اعتبار کرنے لگا۔ جمال الدین نے اس کی جہالت اور سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر اسے سمجھانا شروع کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت کے اصل حق دار اہل بیت ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق تھی جسے ابوبکر وعمر (رضی اللہ عنہما) نے غصب کر لیا، اہل سنت جو اس ظلم میں ان کے ساتھ ہیں ایک باطل مذہب کی پیروی کر رہے ہیں۔ جب کہ حضرت علی اور اہل بیت کو ماننے والے شیعانِ علی صحیح اِسلامی تعلیمات پر عمل کر رہے ہیں۔

الغرض سلطان خدابندہ نے ان باتوں پر یقین کر کے نہ صرف شیعہ مذہب اختیار کر لیا بلکہ فقیہہ ابن مطہر کے کہنے پر اہل سنت کے مذہب کو خلاف قانون بھی قرار دے دیا۔ چوں کہ اس کی حکومت خراسان، ایران اور عراق تک پھیلی ہوئی تھی اس لیے ان تمام ممالک میں اہلسنّت سخت آزمائش کی زد میں آ گئے۔ ابن مطہر کے بہکانے پر سلطان نے یہ حکم بھی دیا کہ مساجد میں جمعہ کے خطبے میں صرف

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے حامی صحابہ مثلاً عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا نام لیا جائے، جبکہ ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سمیت بقیہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کے اسماء خارج کر دیے جائیں۔ یہ نو مسلم تاتاریوں کو استعمال کر کے عالم اسلام کے بہت بڑے طبقے کو ان کے ایمان و عقائد سے محروم کرنے کی سازش تھی جسے چند جرأت مند علماء نے کامیاب نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے سرکاری حکم ماننے سے انکار کر دیا اور خطبے میں خلفائے اربعہ کا نام لیتے رہے۔ سلطان محمد کو معلوم ہوا تو نہایت غضب ناک ہوا اور اس نے ان علماء کو شکاری کتوں کے آگے پھینکنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اپنے بدترین دشمنوں کو نہایت اذیت ناک سزائے موت دینے کے لیے دیو پیکر آدم خور کتے پال رکھے تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ قیدی کو ایک چار دیواری میں کھڑا کر کے اس پر کتے چھوڑ دیے جاتے۔ قیدی جان بچانے کے لیے بھاگتا اور کتے اس کا تعاقب کرتے ہوئے اسے بھنبھوڑتے رہتے حتیٰ کہ اس کا کام تمام کر کے اس کی ایک ایک بوٹی کھا جاتے۔

گرفتار شدہ علماء میں سے اس سزا کے لیے سب سے پہلے جن کو لایا گیا وہ شیراز کے قاضی مجد الدین تھے۔ سلطان خدابندہ ان دنوں اپنے موسم گرما کے راحت کدے 'قراباغ' میں رہائش پذیر تھا۔ اس کے حکم پر قاضی صاحب کو چار دیواری میں لا کر شکاری کتوں کو ان پر چھوڑ دیا گیا۔ سلطان کے درباری اپنے زعم میں ایک منکرِ دین کی موت کا تماشا دیکھنے وہاں موجود تھے۔ قاضی صاحب کتوں کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر ذرا بھی نہ گھبرائے بلکہ اطمینان سے کھڑے رہے۔ جوں ہی کتے ان کے قریب پہنچے، یکدم رک گئے اور اپنی دُمیں ہلا ہلا کر عاجزی کا اظہار کرنے لگے۔ یہ خبر سلطان کو پہنچی تو وہ حیرت زدہ رہ گیا اور سمجھ گیا کہ یہ بزرگ حق پر ہیں۔ وہ ننگے پاؤں دوڑا آیا اور قاضی صاحب کے قدم چومنے لگا۔ اس کے بعد اس نے شیعہ عقائد سے توبہ کر لی اور پوری سلطنت میں ازسرِ نو اہل سنت کے عقائد و رسوم کا احیاء کیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے شریعت کے خلاف تمام رسموں پر پابندی لگا دی۔

دیگر تاتاری مسلم سلاطین: اس کے جانشین سلطان ابو سعید نے 12 برس کی عمر میں حکومت سنبھال لی تھی اور ایک مثالی حکمران کی طرح اپنے فرائض انجام دیے۔ اسی زمانے میں نئے تجارتی راستے دریافت ہوئے۔ ہندوستان سے تجارتی قافلے پہلے پشاور، کابل اور بلخ سے ہوتے ہوئے اورگنج (خوارزم) تک پہنچا کرتے تھے، اب سمندری راستہ بھی استعمال ہونے لگا، یعنی ہندوستان کے ساحل سے تجارتی جہاز خلیج فارس میں بندرگاہ ہرمز پر لنگر انداز ہوتے اور یہاں سے تجارتی مال ایران اور اَفغانستان کے سرحدی علاقوں سے گزار کر وسطِ ایشیا پہنچا دیا جاتا۔

ہلاکو خان سے سلطان ابو سعید تک اَفغانستان کے تمام تاتاری حکمران ایران کو اپنا مرکز بنا کر

افغانستان پر حکومت کرتے رہے۔ سلطان ابو سعید کی کوئی اولاد نہ تھی اس لیے اس کی جانشینی کے معاملے پر امراء سلطنت میں اختلاف ہوگیا۔ اس موڑ پر آ کر ایران کی تاتاری حکومت کمزور ہوگئی اور حکمران اس تیزی سے تبدیل ہوئے کہ 20 سال میں آٹھ بادشاہ آئے اور چلے گئے۔ اس کے بعد سلطنت میں ابتری پھیل گئی اور مختلف علاقوں میں خود مختار حکومتیں قائم ہوگئیں...... یہ گویا ان علاقوں میں تاتاری حکومت کا دور اختتام تھا۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر افغانستان کے مغربی صوبے ہرات میں شمس الدین بن ابوبکر کرت نامی ایک سردار نے آزاد حکومت قائم کر لی۔

مآخذ و مراجع

- ...... تاریخ جہاں کشا، عطا ملک جوینی
- ...... تاریخ ابن خلدون: جلد 5، عبد الرحمن ابن خلدون
- ...... جامع التواریخ، رشید الدین
- ...... روضۃ الصفا، میر خواند
- ...... مطلع السعدین، کمال الدین سمرقندی
- ...... البدایۃ والنہایہ، حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ
- ...... الکامل فی التاریخ: جلد 8، ابن اثیر الجزری

ساتواں باب

اَفغانستان شاہانِ کرت کے دور میں

جن دنوں چنگیز خان اَفغانستان کی مہمات میں مصروف تھا، غور کے صحرا میں رکن الدین نامی ایک سردار ''خیسار'' کے قلعے کی حفاظت کرر ہا تھا۔ یہ قلعہ ہرات سے غور کی جانب آتے ہوئے ''غور'' کی سرحد پر تھا۔ رکن الدین، غوری حکمرانوں کا پروردہ تھا اوران کے زمانے ہی سے اس علاقے کا سردار چلا آرہا تھا...... چنگیز خان کے سپاہی یہاں پہنچے تو اس نے اطاعت کا اظہار کیا اور بھاری ٹیکس ادا کرنے کے وعدے پر ان کی ماتحتی قبول کرلی...... اس طرح اپنی مصلحت اندیشی کے ذریعے وہ اس قلعے اور اس کی آبادی کو بچانے میں کامیاب ہوگیا۔ اَفغانستان کی ویرانی، غور کی تپتی ہوئی دھوپ اور صحرائی آندھیوں میں رکن الدین نے 26 سال تک اس قلعے پر حکومت کی۔ چنگیز خان اور اس کی اولاد کی جانب سے اَفغانستان پر مسلط کردہ ظالم گورنروں کے ظلم وستم وہ اس اُمید پر برداشت کرتا رہا کہ شاید کبھی اس علاقے میں ایک آزاد حکومت قائم کرنے کا موقع مل جائے۔ اس دوران جرماغون، جنتمور، گرگوز، اسیرارغون اور طائر بہادر جیسے تاتاری گورنر اَفغانستان پر حاکم رہے اور رکن الدین نے ان کے ساتھ بڑی احتیاط سے معاملات نبھائے، اس کا انتقال 643ھ (1245ء) میں ہوا۔

شمس الدین کرت: رکن الدین کے بعد اس کے نواسے ''شمس الدین محمد کرت'' نے غور کے اس قلعے کا انتظام سنبھالا، اس نے تاتاریوں کے لیے بہت سی حکومتی اور انتظامی خدمات انجام دیں۔ خصوصاً چغتائی کے دور حکومت میں ہندوستان پر تاتاریوں کے حملے کے دوران اس کی کوششوں سے لاہور کسی خونریزی کے بغیر تاتاریوں کے قبضے میں آگیا۔ ان خدمات سے خوش ہوکر تاتاریوں کے خاقان منگوخان نے اسے پورے اَفغانستان میں اپنا نائب مقرر کرلیا۔

شمس الدین محمد کرت نے طویل عمر پائی اور 32 سال تک حکومت کی۔ اَفغانستان کی نیابت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد اس نے اس تباہ شدہ ملک کی ازسرنو تعمیر پر توجہ دی۔ لٹے پٹے عوام کو حوصلہ دیا، انہیں

جنگلوں اور پہاڑوں سے نکال کر دوبارہ ان شہروں میں بسانے کی کوشش کی جو قبرستان بن چکے تھے۔اس کی جدوجہد کے نتیجے میں اُجڑے ہوئے شہر دوبارہ آباد ہونے لگے، تاہم انہیں ان تاتاریوں کی خونریزی سے بچائے رکھنا، جو اب بھی ان کے حاکم تھے، آسان نہ تھا۔اس دوران تاتاری شہزادوں کی آپس کی جنگیں کبھی اَفغانستان کی سرحدوں پر اور کبھی اس کی حدود کے اندر بھی ہوتی رہیں مگر شمس الدین نے بڑی حکمت کے ساتھ خود کو غیر جانبدار رکھا۔اس نے کچھ اَفغانستان کے کچھ ایسے علاقے بھی فتح کر لئے جو پہلے اس کے زیرِ انتظام نہیں تھے، اس طرح اس کی طاقت خوب بڑھ گئی۔

غیر جانبدارانہ پالیسی: 667ھ (1268ء) میں وسطِ ایشیا کے تاتاری شہزادے براق خان نے دریائے آمو عبور کر کے اَفغانستان کے شمالی صوبوں پر قبضے کی کوشش کی، اسے روکنے کے لیے ایک اور تاتاری شہزادے اباقا خان نے اپنی فوج لے کر اس طرف پیش قدمی کی۔دونوں کی جنگ کے دوران ملک شمس الدین نے کسی کا ساتھ نہ دیا اور خیسار کے قلعے میں چپ چاپ حالات کا مشاہدہ کرتا رہا۔اس جنگ میں اباقا خان کو فتح ہوئی مگر اسے اس بات پر سخت طیش تھا کہ ملک شمس الدین نے جنگ میں اس کا ساتھ کیوں نہیں دیا۔اس نے غصے سے بپھر کر ہرات کی ان زیرِ تعمیر بستیوں کو جو شمس الدین آباد کر رہا تھا دوبارہ تباہ کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔اس موقع پر اس کے ایک مسلمان درباری نے بمشکل منت ساجت کر کے اسے اس فیصلے پر عمل سے باز رکھا۔اس واقعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں تاتاریوں کے ماتحت مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی کام کرنے والوں کو قدم قدم پر کتنے سخت امتحانات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

''کرت'' کی اولاد: ملک شمس الدین محمد کرت کے بعد اس کی اولاد میں شمس الدین کہین 667ھ (1278ء) سے 705ھ (1305ھ) تک، ملک فخر الدین 705ھ (1305ء) سے 707ھ (1307ء) تک اور ملک غیاث الدین اوّل 707ھ (1307ء) سے 729ھ (1328ء) تک اَفغانستان میں تاتاریوں کی نیابت میں حکومت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ان سب نے سرزمین اَفغانستان کو دوبارہ آباد کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

اس دوران تاتاریوں میں اِسلام کی دعوت عام ہو چکی تھی اور ان کا حکمران طبقہ تیزی سے اِسلام قبول کر رہا تھا۔اس لیے اَفغانستان کے مسلمانوں سے ظلم وستم کی گھٹائیں چھٹتی جا رہی تھیں۔

پہلا خود مختار حکمران: اس خاندان میں امیر معز الدین حسین وہ پہلا شخص ہے جس نے مستقل طور پر خود مختار حکومت قائم کی۔اس کے دور میں ایران کے نومسلم ایل خانی تاتاری جو کہ اَفغانستان کے لیے نائب

مقرر کیا کرتے تھے، باہمی انتشار کے باعث کمزور ہو چکے تھے۔ خصوصاً سلطان ابوسعید کے بعد ان میں خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی اس لیے اَفغانستان پر تاتاریوں کا تسلط عملاً ممکن نہ رہا تھا۔ امیر معزالدین حسین نے اس صورت حال سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے مقبوضہ اَفغانستانی صوبوں کی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ امیر معزالدین حسین نے 729ھ (1328ء) سے لے کر 771ھ (1369ء) تک حکومت کی۔ یہ بڑا دین پرور اور عوام دوست حکمران تھا۔ اس کا پایہ تخت ہرات تھا، گرد و نواح کے اور کئی اضلاع اس کے ماتحت تھے۔ اَفغانستان کے دیگر تباہ حال علاقے کسی مرکزی حکومت سے آزاد تھے۔ ان میں اوّل تو آبادی برائے نام تھی، دوسرے وہاں زیادہ تر لٹیروں کا راج تھا۔

لٹیروں کی حکومت: انہی دنوں اَفغانستان کے ایک بڑے رقبے پر مسعود اور محمد نامی دو ڈاکوؤں کے گروہ کی اجارہ داری قائم ہوگئی۔ شروع میں ان کے ساتھ صرف پانچ آدمی تھے۔ بعد میں یہ تعداد بڑھتی گئی۔ ان کا مرکز بیہق کے پہاڑوں میں تھا جس تک کسی کی رسائی مشکل تھی۔ یہ لوگ دن بھر اپنی کمین گاہوں میں چھپے رہتے اور رات ہوتے ہی بستیوں اور دیہاتوں پر ٹوٹ پڑتے۔ ان کی لوٹ مار سے خلقت عاجز آ گئی تھی۔ مسعود نے اعلان کر رکھا تھا کہ جو بھی غلام بھاگ کر اس کے پاس آئے گا اسے کسی شرط کے بغیر گروہ کا رکن بنا لیا جائے گا۔ چنانچہ اردگرد کے شہروں سے بیسیوں غلام بھاگ بھاگ کر اس گروہ میں شامل ہونے لگے۔ مسعود ایسے ہر غلام کو گھوڑا، اسلحہ اور مال و دولت دے کر اپنا وفادار بنا لیتا، جو غلام ڈاکے کی کارروائیوں میں زیادہ بہادری کا مظاہرہ کرتا اسے گروہ کے ایک حصے کا سردار بنا دیتا۔ اس طرح اس کے پاس باقاعدہ ایک فوج بن گئی۔ مسعود نے اب باقاعدہ اپنی حکومت کا اعلان کر کے خود کو سلطان مسعود کہلوانا شروع کر دیا۔

مسعود اور اس کے گرد جمع ہونے والے اکثر افراد رافضی تھے۔ اس زمانے میں طوس میں اہل تشیع کے ایک بزرگ امام حسن کی بڑی شہرت تھی۔ مسعود نے نظم و ضبط قائم کرنے کے لیے امام حسن کو قوم کا روحانی پیشوا اور خلیفہ قرار دے دیا اور سخت قوانین لاگو کیے۔ ان قوانین کی اتنی دہشت تھی کہ کہیں سونے چاندی کے سکے بھی گرے پڑے نظر آتے تو کوئی اٹھانے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ اپنی طاقت بڑھانے اور نظم و ضبط قائم کرنے کے بعد اس گروہ نے اَفغانستان سے اہل سنت کی نسل کشی کے مذموم منصوبے پر عمل شروع کر دیا اور مشرق و مغرب کی طرف پاؤں پھیلانے لگے۔ جب وہ ایران کے شہر نیشاپور پر بھی قابض ہو گئے تو ایران کے نومسلم تاتاری حکمرانوں کو خطرے کا احساس ہوا اور سلطان تغلق تیمور (طغتمور) نے ان کی سرکوبی کے لیے ایک لشکر بھیجا مگر مسعود نے اسے مار بھگایا۔ تغلق تیمور نے دوسرا لشکر اپنے نائب

ارغون شاہ کو دے کر بھیجا مگر مسعود نے نہ صرف اسے پسپا کر دیا بلکہ ارغون شاہ کو بھی گرفتار کر لیا۔
یہ دیکھ کر تغلق تیمور پچاس ہزار کا لشکرِ گراں لے کر خود مقابلے میں نکلا مگر مسعود نے اسے بھی شکست دے کر سرخس، زاوہ اور طوس پر بھی قبضہ کر لیا اور طوس میں امام علی بن موسیٰ رضا کے مقبرے کو اپنے خلیفہ کا مرکز قرار دیا۔ اس کے بعد وہ ''جام'' کو فتح کرتے ہوئے ہرات کی طرف بڑھنے لگا اور صرف چھ دن کی مسافت پر آ گیا۔ ہرات کے امیر معز الدین حسین نے اس طوفان کے مقابلے کے لیے اپنے امراء سے مشورہ کیا کہ آیا شہر میں محصور ہو کر ان ڈاکوؤں کا مقابلہ کیا جائے یا آگے بڑھ کر کھلے میدان میں داد شجاعت دی جائے۔ طے یہ پایا کہ باہر نکل کر قسمت آزمائی کی جائے۔ چنانچہ امیر حسین نے ہرات اور ارد گرد کے دیہاتوں سے اہل سنت کے رضا کار جمع کیے، بادغیس اور سمنان کے لوگ بھی ان کی مدد کو آ گئے۔ اس طرح ایک لاکھ بیس ہزار سوار اور پیادے جمع ہو کر روافض کے مقابلے کے لیے نکلے۔ ادھر سے مسعود ایک لاکھ پچاس ہزار افراد کو رکاب میں لے کر آن پہنچا۔ چاشت کے وقت بوشنج کے ریگزار میں دونوں لشکروں کا تصادم ہوا، چار پانچ گھنٹوں کی شدید جنگ کے بعد اہل سنت کو فتح حاصل ہوئی۔ مسعود رافضی بھاگ نکلا اور اس کے ساتھی بھی فرار ہونے لگے۔ ان کے خلیفہ حسن نے بیس ہزار عقیدت مندوں کے ساتھ آخر تک مقابلہ کیا اور آخر کار اپنے اکثر ساتھیوں سمیت قتل ہوا جبکہ چار ہزار افراد قیدی بنے۔ یہ واقعہ 748ھ کا ہے۔ اس فتح سے خراسان اور فارس میں شیعوں کا بڑھتا ہوا زور ٹوٹ گیا جس کا سہرا امیر معز الدین حسین کے سر ہے۔

<u>شاہان کرت کا آخری حکمران</u>: اس خاندان کا آخری حکمران ملک پیر علی غیاث الدین دوم تھا، جو 771ھ (1369ء) میں تخت نشین ہوا۔ اسکے دور میں مغل (تاتاری) قوم میں چنگیز خان کا وہ حقیقی وارث نمودار ہوا جس نے ایک بار پھر مغلوں کی بکھری ہوئی طاقت کو یکجا کر دیا اور چین سے لیکر یورپ تک ایک عظیم مغل سلطنت قائم کر کے تاریخ کے گنے چنے فاتحین میں شمار ہوا۔ اس نامور فاتح کو دنیا ''تیمور لنگ'' کے نام سے جانتی ہے۔ افغانستان کے ''کرت'' خاندان کی حکمرانی کا خاتمہ اسی کے ہاتھوں ہوا۔ تیمور کا ظہور افغانستان کے باشندوں کے لیے آزمائش کے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

<u>ابنِ بطوطہ کا سفرِ افغانستان</u>: اس سے قبل کہ ہم تیمور لنگ کے دور میں افغانستان کے نئے حوادث اور یہاں کے مسلمانوں کو پیش آنے والی نئی آزمائشوں کی داستان شروع کریں مناسب ہوگا کہ نو مسلم تاتاری حکمرانوں اور شاہانِ کرت کے افغانستان کی جھلک اس جہاں دیدہ، معتبر اور ثقہ راوی کی زبانی سنیں جس نے آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) میں تمام عالمِ اسلام کی سیاحت کی تھی اور دنیا کے سب سے بڑے سیاح کی حیثیت سے مشہور ہوا تھا۔ یہ تھے شرف الدین محمد ابن بطوطہ جو مراکش سے چلے اور

75 ہزار میل کا سفر کرتے ہوئے دنیا کے 44 ممالک میں گھومے پھرے۔ انہیں جہاں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جیسے مقدس مقامات کی زیارت اور دہلی، قاہرہ اور دمشق جیسے پررونق شہروں کی سیر کا شوق تھا وہاں وہ یہ بھی دیکھنا چاہتے تھے کہ تاتاریوں کا سیلِ بلاخیز گزر جانے کے بعد عالمِ اسلام کے شدید متاثرہ علاقوں کا کیا حال ہے۔ اگرچہ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ ان علاقوں میں اب پہلے کی طرح آبادی نہیں اور سمرقند و بخارا جیسے بڑے بڑے متمدن شہر قصہ پارینہ بن چکے ہیں مگر وہ یہاں مسلم آبادیات کی نشاۃ ثانیہ کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے اور نوخیز بستیوں اور شہروں کے ارتقائی مرحلے کا بچشم خود جائزہ لینا چاہتے تھے۔

اُفغانستان آنے سے قبل وہ عراق میں نومسلم تاتاری حکمران سلطان ابوسعید سے ملے، وہ لکھتے ہیں:

''جب میں بغداد پہنچا تو عراق کا سلطان ابوسعید بہادر خان یہیں تھا۔ یہ سلطان محمد خدابندہ کی اولاد سے ہے۔ اس کے والدین مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔ سلطان ابوسعید جوان ہے اور تمام لوگوں سے زیادہ خوبصورت ہے۔''

اُفغانستان پہنچنے کے لیے ابن بطوطہ نے خوارزم (وسطِ ایشیا) کا راستہ اختیار کیا۔ وہ خوارزم کے دارالحکومت پہنچے جو اس زمانے میں دوبارہ آباد ہو گیا تھا۔ وہ اس شہر کی تعریف یوں کرتے ہیں:

''شہر خوارزم ترکوں کے بڑے شہروں میں سے ہے۔ بہت بڑا، بہت خوبصورت ہے۔ اس کے بازار دلکش اور راستے وسیع ہیں۔ اس کی آبادی بڑی گنجان ہے۔''

''خوارزم کے باشندوں جیسے شریف، نیک طبیعت اور مسافروں سے محبت کرنے والے لوگ میں نے کہیں نہیں دیکھے۔ یہ لوگ نماز کے بڑے پابند ہیں۔ جماعت کی نماز سے کبھی غیر حاضر نہیں ہوتے۔''

''خوارزم میں میں نے جیسے خربوزے کھائے ایسے مشرق تا مغرب کہیں پیدا نہیں ہوتے۔''

خوارزم کے دارالحکومت ''اورگنج'' کے بعد وہ سمرقند، بخارا اور ترمذ کے علماء و مشائخ سے ملتے ہوئے آخر کار دریائے آمو عبور کر کے اُفغانستان پہنچے۔ یہ 731ھ (1330ء) اور 733ھ (1332ء) کا درمیانی زمانہ تھا۔ ان دنوں اُفغانستان شاہانِ کرت کے اقبال مند حکمران امیر معزالدین حسین کے زیرِ نگین تھا جبکہ عراق اور ایران پر حکومت کرنے والے عادل و منصف نومسلم تاتاری حکمران ابوسعید بہادر خان کی حکومت کے یہ آخری سال تھے۔ شاہانِ کرت کا پایۂ تخت ہرات اب اُفغانستان کا سب سے بڑا شہر بن چکا تھا۔ یہاں اُفغانستان کے باقی ماندہ علماء و فضلا اور ادباء کی وہ کھیپ پناہ لیے ہوئے تھی جس نے تاتاریوں کی غارتگری کے بھیانک دور میں علم و ادب کی میراث کی حفاظت اور اسے اگلی نسلوں تک

پہنچانے کے لیے انتھک جدو جہد کی تھی۔ خانوادہ کرت ان کا محافظ اور کفیل تھا۔

ہرات میں مساجد، مدارس، کتب خانوں، خانقاہوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ بلخ اور مرو کی بجائے اب ہرات ہی وسطِ ایشیا، ایران، چین اور ہندوستان کے درمیان تجارتی چوراہے کا کام دے رہا تھا اور روزانہ آنے جانے والے بے شمار تجارتی قافلوں کی بدولت اس کے بازار دنیا بھر کے سامانِ تجارت سے بھرے ہوئے تھے۔ ابن بطوطہ نے عالمِ اسلام کی سیر کرتے ہوئے انہی ایام میں سرزمینِ افغانستان پر قدم رکھا تھا۔ وہ اپنے سفرنامے میں تحریر کرتے ہیں:

"ترمذ سے ہم دریائے آمو عبور کر کے ملک خراسان (افغانستان) میں داخل ہوئے اور ڈیڑھ دن ایک بیابان صحرا میں سفر کر کے بلخ پہنچے۔ یہ شہر ویران ہو گیا ہے لیکن اس کی جو عمارتیں سلامت ہیں وہ بڑی مضبوط ہیں۔ اس کی آبادی گنجان تھی جو فنا ہو گئی۔ اس کے مدارس اور مساجد پر گزشتہ صنعت کاریوں کے نشانات اب بھی باقی ہیں۔ بدبخت چنگیز خان نے اسے بھی برباد کر دیا تھا۔ ایک تہائی مساجد تو بالکل ملیا میٹ کر دیں کیوں کہ اسے کسی نے بتایا تھا کہ مسجدوں کے کسی ستون کے نیچے ایک خزانہ دفن ہے۔ بلخ کی جامع مسجد دنیا کی تمام مساجد سے زیادہ عمدہ اور کشادہ ہے۔ اس کے ستون بلندی میں مراکش کے شہر رباط کی جامع مسجد کے مشابہ ہیں۔ یہ مسجد بنو عباس کے ایک امیر داؤد بن علی کی بیگم نے بنوائی تھی۔"

"بلخ کے باہر حضرت عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ کا مقبرہ ہے جو بغیر حساب کتاب کے بہشت میں داخل ہوں گے۔ مزار کے ساتھ ایک بہت بڑی خانقاہ بنی ہوئی ہے جہاں ہم ٹھہرے۔ یہاں پانی کا ایک عجیب حوض ہے جس پر اخروٹ کا ایک بہت بڑا درخت لگا ہے۔ یہاں حضرت حزقیل علیہ السلام کا مزار بھی ہے، جس پر ایک عمدہ گنبد بنا ہوا ہے۔"

بلخ سے ہرات کے راستے کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"ہم بلخ سے چلے اور قہستان کے پہاڑوں میں سفر کر کے سات دن بعد ہرات پہنچے۔ راستے میں ہمیں کئی آباد دیہات ملے جہاں پانی کے چشمے اور درخت کثرت سے تھے اور کئی خانقاہیں تھیں، جن میں اللہ کے نیک بندے دنیا کو ترک کر کے عبادت میں مصروف تھے۔"

ہرات کے بارے میں ان کا بیان ہے:

"ہرات خراسان (افغانستان) کے شہروں میں سب سے زیادہ آباد ہے۔ یہاں کے لوگ نیک اور دیانت دار ہیں۔ حنفی مسلک کے ہیں۔ فتنہ و فساد سے دور ہیں۔"

قندوز اور بغلان کے بارے میں ابن بطوطہ نے لکھا ہے:

''ان بستیوں میں اللہ والے بزرگ کثرت سے ہیں۔ باغات اور نہریں بھی ہیں۔ قندوز میں ہم ایک چشمے کے کنارے ایک خانقاہ میں رہے جو شہر کے ایک درویش کی تھی، انہیں شیر سیاہ یعنی کالا شیر کہا جاتا تھا۔ شہر کے والی نے جس کا تعلق موصل سے ہے، ہماری میزبانی کی۔ ہم قندوز کے باہر چالیس دن رہے تاکہ ہمارے اونٹ اور گھوڑے خوب چر لیں، یہاں کی چراگاہیں بہت عمدہ ہیں، گھاس بہت ہے، ترکوں (نو مسلم تاتاریوں) کے سخت احکام کی وجہ سے یہاں گھوڑے چوری نہیں ہوتے۔ لوگ اپنے جانوروں کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔'' اس کے بعد وہ کوہ ہندوکش کے راستے شمالی اَفغانستان سے مشرقی اَفغانستان کی طرف روانہ ہوئے۔ غالباً وہ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے اَفغانستان کے پہاڑ کوہ ہندوکش کی وجہ تسمیہ سے دنیا کو آگاہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''(قندوز میں) ہمارے ٹھہرے رہنے کا ایک سبب برف باری کا خوف بھی تھا، کیوں کہ راستے میں ایک پہاڑ پڑتا تھا جسے کوہِ ہندوکش کہتے ہیں۔ اس کے معنٰی ہیں ''قاتل الہنود'' (ہندوؤں کو قتل کرنے والا)۔ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان سے جو غلام یا باندیاں یہاں لائی جاتی تھیں ان میں سے بہت سے سردی کی شدت اور برف باری کی کثرت سے مر جاتے تھے۔ اس کو عبور کرنے کی مسافت پورے ایک دن کی تھی۔ ہم یہاں اس وقت تک مقیم رہے جب تک موسم کچھ مناسب نہ ہو گیا۔ ہم نے ایک رات کے آخری پہر اسے عبور کرنا شروع کیا اور اگلے دن غروب آفتاب تک چلتے رہے۔ ہم اپنے لبادوں کو اونٹوں کے سامنے بچھا دیتے تھے، وہ ان پر چلتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ وہ برف میں دھنس نہ جائیں۔''

''(کوہ ہندوکش کے سفر میں) ہم اندر شہر (اندراب) پہنچے، یہ کسی زمانے میں ایک شہر تھا مگر (تاتاریوں کے حملے کے بعد) اب اس کا نشان تک بھی باقی نہیں رہا، یہاں ہم نے ایک بڑے گاؤں میں قیام کیا۔ یہاں علماء میں سے ایک بزرگ کی خانقاہ بھی تھی جنہیں محمد اظہروی کہا جاتا تھا۔ ہم نے انہی کے پاس قیام کیا۔ انہوں نے ہمارا بڑا اکرام کیا۔ جب ہم کھانا کھا کر ہاتھ دھوتے تو وہ عقیدت کی وجہ سے ہمارے ہاتھ کا دھوون پی جاتے تھے۔ کوہِ ہندوکش کی چڑھائی تک پہنچنے تک وہ ہمارے ساتھ رہے۔'' پہاڑ کے عجائبات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اس پہاڑ پر ہمیں ایک گرم چشمہ ملا اسی میں ہم نے منہ دھوئے جس سے ہماری کھال جل گئی۔''

ابن بطوطہ کوہ ہندوکش کے سفر میں وادی پنج شیر بھی پہنچے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہم نے پنج شیر میں قیام کیا، جس کے معنی ہیں پانچ پہاڑ۔ یہ ایک بڑا اور خوبصورت شہر تھا جو ایک نیلی اور بہت بڑی نہر کے کنارے آباد تھا۔ یہ نہر بدخشاں کے پہاڑوں سے نکلتی ہے جن میں یاقوت بھی پائے جاتے ہیں لیکن بد بخت چنگیز خان نے ان شہروں کو تباہ کر دیا اور پھر یہ آباد نہیں ہو سکے۔''

اسی علاقے میں ان کی ملاقات ایک تین سو سالہ بزرگ سے ہوئی جنہیں شیخ صالح کہا جاتا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''انہیں ابوالاولیاء اور سی صد سالہ کہا جاتا ہے۔ ان کی خانقاہ ایک چشمے کے کنارے ہے۔ میں ان پاس حاضر ہوا اور سلام کیا تو انہوں نے معانقہ کیا۔ میں نے ایسا نرم جسم کسی کا نہ پایا۔ مجھے لگا وہ پچاس سال کے ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ ہر سو برس بعد ان کے بال اور دانت نئے سرے سے اُگتے ہیں۔''

کابل کے بارے میں وہ رقمطراز ہیں:

''کسی زمانے میں یہ بھی ایک بڑا شہر تھا، مگر اب یہاں صرف ایک گاؤں ہے جس میں کچھ عجمی قبائل رہتے ہیں جنہیں ''افغان'' کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ لوٹ مار کرتے رہتے ہیں۔ یہاں بڑے بڑے پہاڑ اور گھاٹیاں ہیں۔''

''غزنی'' کے بارے میں لکھا ہے:

''غزنی سلطان محمود بن سبکتگین کا شہر ہے، سلطان محمود کا شمار دنیا کے عظیم حکمرانوں میں ہوتا تھا۔ اس نے ہندوستان سے کئی جنگیں لڑیں اور متعدد شہر اور قلعے فتح کیے۔ سلطان کی قبر اسی شہر میں ہے جس پر ایک خانقاہ بنی ہوئی ہے۔ یہ پہلے ایک عظیم شہر تھا مگر اب اس کا اکثر حصہ غیر آباد ہے، یہاں شدید سردی پڑتی ہے جس کے باعث یہاں کے باشندے سردی کا موسم گزارنے قندھار چلے جاتے ہیں جو تین دن کی مسافت پر ہے۔ وہ بڑی سر سبز جگہ ہے مگر میں وہاں (قندھار) نہیں جا سکا۔''

مآخذ و مراجع

- ...... مطلع السعدین، کمال الدین سمرقندی
- ...... افغانستان در مسیر تاریخ، میر غلام محمد غبار
- ...... رحلۃ ابن بطوطہ، شرف الدین محمد ابن بطوطہ

آٹھواں باب

تیموری حکمران

افغانستان کی تاریخ تیمور لنگ گورگان کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ مغل قبیلے کی بکھری ہوئی متعدد حکومتوں کو یکجا کر کے ایک عظیم مغل سلطنت قائم کرنے والا یہ مشہور فاتح چنگیز خان کے بیٹے چغتائی کی نسل سے تھا۔ وہ 736ھ (1335ء) میں سمرقند میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ''امیر ترگی'' گورگان قبیلے کا سردار تھا، یہ قبیلہ مغل قبیلے کی شاخ ''برلاس'' سے تعلق رکھتا تھا۔

تیمور کی ابتدائی مہمات: اپنے باپ کی موت کے بعد تیمور قبیلے کا سردار بن گیا، وہ بچپن سے اپنے بڑے بوڑھوں سے چنگیز خان کی فتوحات اور خونریزی کا ذکر سنتا رہا تھا، اس لیے وہ چنگیز خان سے بے حد متاثر تھا۔ اس نے چنگیز خان کی زندگی کو اپنے لیے نمونہ بنالیا اور اس کی طرح بے پناہ خونریزی اور فتوحات کا جنون اس کے سر پر سوار ہوگیا۔

تیمور اگرچہ نومسلم تاتاریوں کی اولاد تھا مگر اس کی صفات و عادات اپنے غیر مسلم آباواجداد کے مشابہ تھیں۔ شجاعت، مہم جوئی، سخت گیری اور جفاکشی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ تیمور ترک زبان کا لفظ ہے جس کے معنی فولاد کے ہیں۔ اپنی زندگی کے مختلف مواقع پر اس نے ثابت کیا کہ وہ سچ مچ فولادی انسان تھا۔ جولانِ طبع کے باعث وہ نوجوانی ہی میں حصولِ اقتدار کے لیے کوشاں ہوگیا۔ اس نے وسطِ ایشیا کے تاتاری حکمران تغلق تیمور کی فوج میں شامل ہوکر افغانستان میں کئی مہمات سر کیں اور متعدد علاقے فتح کیے مگر اس کی بڑھتی ہوئی کامیابیوں نے اس کے آقا تغلق تیمور کے دل میں اندیشے پیدا کردیے اور یوں ان میں پہلے بداعتمادی اور پھر مخاصمت کی صورت حال پیدا ہوگئی مگر تیمور نے ان مشکلات کا پامردی سے مقابلہ کیا۔ یہ اس کی تربیت کا زمانہ تھا۔ 766ھ (1364ء) میں جنوبی افغانستان میں قبائلی جنگجوؤں سے ایک معرکے کے دوران ایک تیر اس کے پاؤں میں پیوست ہوگیا، یہ زخم اتنا شدید تھا کہ وہ زندگی بھر کے لیے لنگڑا ہوگیا، اسی بنا پر اسے تیمور لنگ (لنگڑا تیمور) کہا جاتا ہے۔

خودمختار حکمرانی کا آغاز: افغانستان میں مہمات کی انجام دہی کے دوران امیر حسین نامی ایک سردار تیمور کے ساتھ ہر قدم پر شریک تھا، بعد میں تیمور نے امیر حسین کے مقبوضہ علاقے "بلخ" پر قبضہ کر کے اسے قتل کر دیا۔ تیمور نے یہاں سخت غارت گری کا ثبوت دیا اور بلخ کے قلعے "ہندوان" کو تباہ و برباد کر کے مٹی کا ڈھیر بنا دیا۔ یہ واقعہ 770ھ (1368ء) کا ہے۔ اس فتح کے بعد تیمور نے اپنی امارت اور خودمختار حکمرانی کا اعلان کر دیا۔

وسطِ ایشیا پر قبضہ: تیمور نے جلد ہی وسطِ ایشیا کا رُخ کر لیا اور چند سال کے اندر اندر سمرقند و بخارا سمیت اکثر بڑے شہروں پر قبضہ کر کے تغلق تیمور کے خاندان کو بے دخل کر دیا۔ 781ھ (1379ء) تک وہ وسط ایشیا کے تمام صوبوں کے علاوہ خوارزم پر بھی قبضہ کر چکا تھا۔ اب اس کا ارادہ چین اور ہندوستان فتح کرنے کا تھا مگر اس راہ میں سب سے بڑی دشواری افغانستان کی سنگلاخ زمین تھی، جہاں سیاسی وحدت نہ ہونے کے باوجود درجنوں قبائلی حکمرانوں کی شکل میں رکاوٹوں کا ایک سلسلہ اس کے سامنے تھا۔

افغانستان پر حملہ: ان دنوں افغانستان میں شاہانِ کرت کی زوال پذیر حکومت صرف ہرات کے گرد و نواح میں رہ گئی تھی۔ کرت خاندان کا آخری وارث ملک پیر علی (غیاث الدین دوم) وہاں کا حکمران تھا۔ باقی ملک کئی ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا۔ سیستان میں ملک قطب الدین، فراہ میں ملک جلال الدین، جوزجان میں امیر محمد خواجہ، بدخشاں میں شیخ محمد اور قندوز میں امیر اولجائی کی حکومت تھی۔ اسی طرح کابل، قندھار، پشاور، ننگرہار اور بلوچستان میں مختلف سردار راج کر رہے تھے۔ چونکہ تیمور جوانی کے دور میں افغانستان کی مہمات کے دوران یہاں کے نشیب و فراز دیکھ چکا تھا اور اس علاقے کی اہمیت سے خوب آگاہ تھا، اس لیے اسے اس سرزمین کی فتح سے خاص دلچسپی تھی۔

782ھ (1380ء) میں تیموری افواج نے دریائے آمو عبور کر لیا۔ افغانستان کا ایک سرحدی قلعہ "پوشنگ" سب سے پہلے تیمور کی یلغار کا نشانہ بنا۔ "پوشنگ" کے بہادر قبائلی جانبازوں نے ایک ہفتے تک تیمور کی ٹڈی دل فوج کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا۔ یہ جنگ اتنی شدید تھی کہ خود تیمور دو بار تیروں سے زخمی ہوا۔ آخرکار تیمور نے قلعہ فتح کر لیا اور اسے تاتاری روایات کے مطابق منہدم کرا دیا۔ اس فتح کے بعد تیمور کچھ عرصے تک افغانستان کے منظرنامے کا جائزہ لیتا رہا۔ اب اس کے سامنے سب سے اہم محاذ ہرات کا تھا۔

783ھ (1381ء) میں تیمور کی افواج زمین کا سینہ دہلاتی ہوئی ہرات کے سامنے آ پہنچیں۔ خاندان کرت کے تاجدار ملک پیر علی نے چار دن تک مردانہ وار مقابلہ کیا مگر پھر تیموری افواج کی کثرت سے مرعوب ہو کر صلح کی درخواست کی۔ تیمور نے اس وقت تو اسے اپنے دربار میں بلا کر اچھا سلوک کیا اور

اسے ہرات کی حکومت پر برقرار رکھا مگر کچھ مدت بعد جب شمالی ایران کی ایک مہم سے واپس لوٹے ہوئے اس کا گزر ہرات سے ہوا تو اس نے پیر علی کو اس کے تمام خاندان سمیت زنجیروں میں جکڑ کر سمرقند کے قید خانے بھجوا دیا۔ اس طرح شاہانِ کرت کی داستان کا آخری باب اپنے حسرت ناک انجام کو پہنچا۔ تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ شدہ ہرات کو شاہانِ کرت نے دوبارہ بڑی لگن سے آباد کیا تھا۔ تیمور نے اسے ایک بار پھر تاراج کر دیا، شہر کی فصیل کو گرا دیا اور اس کے فولادی دروازے اکھاڑ کر اپنے ساتھ لے گیا۔

آخری کرت حکمران کا قتل: تیمور کی اس سخت گیری اور سفاکی سے افغانستان کے غیرت مند عوام کی برافروختگی لازمی تھی، چنانچہ اگلے ہی سال ہرات اور غور کے باشندے تیمور کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تیمور نے یہ خبر سن کر فوراً سمرقند کے قید خانے میں محبوس پیر علی غیاث الدین کرت کو اس کے بھائی سمیت قتل کرا دیا۔ پھر وہ ہرات کی طرف لپکا اور بغاوت کو کچلنے کے بعد حکم دیا کہ شہر کو مکمل طور پر تباہ کر دیا جائے۔

اہلِ ہرات پر مظالم: تیمور کے دربار میں علما و فقہاء بھی تھے، تیمور ان کی باتیں سنتا ضرور تھا مگر عمل اپنی مرضی کے مطابق کرتا تھا۔ ذاتی طور پر وہ ایک آزاد مشرب شخص تھا۔ اس کے مذہبی رجحانات میں تشیع کے اثرات بہت واضح نظر آتے ہیں۔ تاہم دربار میں سنی اور شیعہ دونوں طبقوں کے علماء موجود رہتے تھے۔ اس وقت ان اہلِ علم نے پُرزور سفارش کر کے تیمور کو ہرات کی تباہی کا حکم واپس لینے پر آمادہ کر لیا۔ مگر پھر بھی تیمور نے شہر والوں کو امان دینے کے عوض ان پر اتنے بھاری ٹیکس لگا دیے جنہیں ادا کرنا ممکن نہ تھا۔

تیمور کے افسران نے ٹیکس وصول کرنے کے لیے شہر کے ہزاروں باشندوں کو گرفتار کر لیا اور انہیں شکنجوں میں کسنے لگا۔ ان مظالم کے نتیجے میں ان گنت لوگ جاں بحق ہو گئے۔ ایک مؤرخ کے بقول "ہرات میں ایک دُکان بھی کھلی نہ رہ سکی۔ شہر کی گلیوں اور بازاروں میں لاشوں کے ڈھیر دکھائی دے رہے تھے۔"

فتح کا خونی مینار: تیمور کا اگلا حملہ "اسفزار" کے قلعے پر ہوا، یہاں کے شیخ داؤد کی قیادت میں عوام کا ایک انبوہ اس کی اطاعت سے منحرف ہو چکا تھا۔ تیمور نے "اسفزار" پر قبضے کے بعد عوام پر وہ مظالم توڑے کہ لوگ چنگیز خان کی داستانوں کو بھول گئے۔ اس کی سپاہ نے شہر اور قلعے میں لاشوں کے انبار لگا دیے۔ فتح کے اس بہیمانہ رسم سے فارغ ہو کر تیمور نے جبر و تشدد کا ایک اور انتہائی انسانیت سوز کھیل کھیلا۔ اس نے حکم دیا کہ فتح کی یادگار کے طور پر ایک مینار تعمیر کیا جائے اور اس کے گارے میں زندہ انسانوں کا خون استعمال کیا جائے۔ اس حکم کی تعمیل میں تیموری سپاہ نے دو ہزار زندہ افراد کو مٹی کے ڈھیر میں پھینک کر اس طرح کچلا کہ ان کی ہڈیاں، خون اور اعضاء مٹی میں یکجان ہو گئے۔ اس کے بعد اسی خون میں گندھی ہوئی مٹی سے مینار تعمیر کیا گیا۔ مدتوں تک یہ خونی مینار تیمور کی درندگی اور سفاکی کی یادگار کے طور پر پہچانا جاتا رہا۔

جلال آباد کا معرکہ: ہرات کے عوام کا حشر دیکھ کر فراہ کے امیر ملک جلال الدین نے تیمور کے سامنے چپ چاپ ہتھیار ڈال دیے۔ فراہ پر قبضے کے بعد تیمور ''زرہ'' کے قلعے کی طرف بڑھا۔ ایک سخت مقابلے کے بعد یہ قلعہ بھی فتح ہوگیا۔ یہاں سے تیمور نے جلال آباد کا رُخ کیا۔ یہ شہر نومسلم تاتاری حکمرانوں کے دور میں آباد ہوا تھا۔ شہر کے عمائدین نے اظہارِ اطاعت کر کے اپنی جان بچالی مگر عوام تیمور کی حکمرانی قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ سیستان کا امیر قطب الدین ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ انہوں نے تیمور کے خلاف جنگ کا آغاز کر دیا۔ کئی دن تک جلال آباد کی فصیلیں تیموری سپاہ کے لیے ناقابل تسخیر رہیں، اور خونریز لڑائی ہوتی رہی۔ شہر کے لوگوں نے جنگ کے دوران ایک بار حریف کی خوراک و رسد کے ذخائر پر چھاپہ مارا اور مال مویشی لوٹ کر ساتھ لے گئے۔ بہر کیف کئی دن کی جنگ کے بعد بھی جب تیموری افواج پسپا نہ ہوئیں تو ملک قطب الدین نے مایوس ہو کر خود کو تیمور کے حوالے کر دیا مگر شہریوں نے پھر بھی جنگ جاری رکھی۔

ایک دن تیمور شہر کے سامنے اپنی فوج کی صفوں کا معاینہ کر رہا تھا کہ اچانک مسلح عوام کا ایک ہجوم شہر کا آہنی پھاٹک کھول کر تیمور پر حملہ آور ہو گیا پہلے انہوں نے تیروں کی بوچھاڑ کی اور پھر تلواریں سونت کر فوج کی صفوں پر پل پڑے۔

تیمور اس حملے میں خود بھی زخمی ہو گیا تاہم اس کی ٹڈی دل سپاہ عوام کے مشتعل جمِ غفیر کو واپس دھکیلتی ہوئی شہر میں داخل ہو گئیں۔ شہر پر قبضے کے بعد تیمور نے جلال آباد میں قتل عام کرایا۔ ہزاروں افراد جان سے مار دیے گئے۔ شہر کی فصیل، بلند عمارتوں، میناروں اور برجوں کو پیوندِ خاک کر دیا گیا۔ ملک قطب الدین کو گرفتار کر کے سمرقند بھجوا دیا گیا اور جلال آباد کے کھنڈرات پر شاہ شاہان سیستانی کو حاکم مقرر کر دیا گیا۔ یہ شخص اس علاقے کا ایک معزز رئیس تھا اور تیموری افواج کے آتے ہی اس کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہو گیا تھا۔

جنوبی اُفغانستان کی ویرانی: تیمور 785ھ (1383ء) میں جنوبی اُفغانستان کو مکمل طور پر مسخر کرنے کی غرض سے ایک بار پھر اُفغانستان آیا۔ جنوبی اُفغانستان بیرونی حملہ آوروں کے لیے ہمیشہ سخت ترین مزاحمتوں کا مرکز رہا ہے۔ تیمور کو بھی یہاں شدید دشواریوں کا سامنا رہا۔

مقامی باشندوں کی اس مزاحمت کا زور توڑنے کے لیے تیمور نے ایک انتہائی سنگین اقدام کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے ''زرنج'' کی شہری آبادی سے 16 میل دور واقع اس آبی بند کو تباہ کر دیا جس سے اس علاقے کے متعدد شہر، سینکڑوں بستیاں اور دیہات سیراب ہوتے تھے۔ صدیوں پرانا یہ بند ''بندِ رستم'' کہلاتا تھا اور جنوبی اُفغانستان کے مشہور دریا دریائے ہلمند پر بنایا گیا تھا۔ اس بند سے نکالی گئی نہروں

کے باعث جنوبی افغانستان کی آبی ضروریات بخوبی پوری ہوجاتی تھیں۔ آب پاشی کے اس عمدہ نظام کی بدولت یہ علاقہ سرسبز وشاداب چلا آرہا تھا اور یہاں کی زراعت ہمیشہ دیگر علاقوں کے لیے باعثِ رشک رہی تھی۔ مگر تیمور لنگ کے حکم پر جب ''بند رستم'' کو تباہ کردیا گیا تو جنوبی افغانستان میں دوسوکلومیٹر تک ہر طرف خاک اُڑنے لگی۔ صوبہ فراہ مکمل طور پر ریگستان بن گیا۔ ''بست'' اور ''زرنج'' بھی ویران ہوگئے۔ خانہ بدوشوں کے سوا اس علاقے کے تمام لوگ مستقل طور پر نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوگئے۔

اس سرزمین میں درجنوں قلعے، سینکڑوں کوٹھیاں اور ہزاروں مکانات تھے جو لوگوں کے اُجڑ جانے کے بعد صحرائی ریت میں دفن ہوتے چلے گئے۔ آج ان عمارتوں میں سے کسی کا نام ونشان بھی مشکل سے دکھائی دیتا ہے۔

تیمور بھی یہی چاہتا تھا کہ یہ علاقے مزاحمت کرنے والوں سے خالی ہوجائے مگر افسوس اسے یہ خیال نہ آیا کہ دنیا کی رونق انسانوں ہی سے ہے۔ اگر انسان ہی نہ ہوں تو لق ودق صحراؤں کو فتح کرلینا کیا معنی رکھتا ہے۔

بہر کیف تیمور نے اپنی انتہا پسندانہ سوچ کے مطابق جنوبی افغانستان کی ویرانی کے بعد بست، گرمیر اور قندھار سمیت گردونواح کے تمام شہروں پر قبضہ کرلیا۔ قندھار میں اپنے معتمد امیر سیف الدین برلاس اور قندوز میں امیر جہاندار شاہ کو حاکم مقرر کردیا۔ اس دوران حاکمِ کابل بھی تیمور کے سامنے ہتھیار ڈال چکا تھا۔ تیمور نے فتح کی تکمیل کے بعد افغانستان میں زیادہ دن رکنے کا خطرہ مول نہ لیا اور اس تیزی سے واپس چلا کہ 14 دن میں جنوبی افغانستان سے اپنے دارالحکومت سمرقند جا پہنچا۔

قبائلی جنگجوؤں کی مزاحمت: 796ھ (1396ء) میں تیمور نے افغانستان کی حکومت اپنے سب سے باصلاحیت بیٹے شاہ رُخ مرزا کو سونپ دی اور مطمئن ہوکر ہندوستان کو فتح کرنے کے لیے لشکر ترتیب دینے لگا۔

اگلے سال وہ ہندوستان پر حملے کی غرض سے افغانستان میں کوہ ہندوکش عبور کررہا تھا کہ اسے معلوم ہوا ان پہاڑی علاقوں اور راستوں پر صرف مقامی جنگجو قبائلیوں کا راج ہے اور یہاں سرکاری افواج کا کوئی عمل دخل نہیں۔

تیمور نے یہ سنتے ہی لشکر کو روک کر دس ہزار سپاہیوں کو شمال کی طرف پہاڑی گھاٹیوں میں گھس کر مقامی جنگجو قبائل کو مسخر کرنے کا حکم دے دیا۔ تیمور خود بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ نورستان اور وادی پنج شیر تک پہنچ کر حملہ آوروں کی سرکوبی کرنا چاہتا تھا مگر سردی کی شدت اور برف باری کے باعث آخر اسے ناکام واپس آنا پڑا۔ اس کے ہم رکاب دس ہزار سپاہیوں کی بڑی تعداد موسم کی حشر سامانی کا شکار ہوگئی۔ تاہم تیمور

نے واپس آ کر نہ صرف مکمل فتح کا دعویٰ کیا بلکہ اس جگہ فتح کی یادگار بھی تعمیر کر ڈالی۔ اسے احساس ہو چلا تھا کہ ان پہاڑی راستوں پر وہ خطرے کی زد میں ہے اس لیے وہ فوراً پلٹ کر کابل آ گیا اور یہاں سے ہندوستان کا رُخ کیا۔

تیر انداز پٹھان کا حملہ: راستے میں ''ایزیاب'' نامی ایک قلعہ پڑتا تھا، یہاں قبائلی پٹھانوں کا ڈیرا تھا۔ تیمور نے قلعے میں پڑاؤ ڈال دیا اور اس کی ازسرِنو تعمیر کا حکم دیا۔ چودہ دن میں یہ کام مکمل ہو گیا۔ ایک دن تیمور گھوڑے پر سوار قلعے سے باہر نکل کر گردونواح کے خوبصورت ماحول کا لطف اُٹھا رہا تھا کہ اچانک ایک سنسناہٹ نے فضا کے سکوت کو توڑ دیا۔ تیمور کا تربیت یافتہ گھوڑا یہ آواز سنتے ہی اپنی جگہ سے اُچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ ایک تیر تیمور کے بالکل قریب سے گزر کر زمین میں دھنس گیا۔ تیمور نے پلٹ کر دیکھا تو قلعے کی فصیل پر ایک پٹھان ہاتھ میں کمان لیے کھڑا تھا، تیمور فوراً قلعے میں داخل ہو گیا اور اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ قلعے کے نگران موسیٰ خان کو اس کے دو سو آدمیوں سمیت گرفتار کر لیا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی، تاہم تیر اندازی کرنے والا دلیر قبائلی اپنے چھ ساتھیوں سمیت دیر تک تیمور کے سپاہیوں کو نشانہ بناتا رہا، آخر کار اسے گرفتار کر لیا گیا۔ تیمور کے حکم سے تیر انداز کو اس کے ساتھیوں سمیت قتل کر دیا گیا۔ موسیٰ خان اور اس کے آدمیوں کو بھی نہ بخشا گیا اور محض شک کی بنیاد پر انہیں بھی مار ڈالا گیا۔ یہ سب پشتون قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔

دہلی پر قبضہ: تیمور نے وسط ایشیا اور ہندوستان کے دروازے اُفغانستان کو فتح کر لیا تھا، اب وہ بلا روک ٹوک مار دھاڑ کرتا ہوا ہندوستان میں داخل ہو گیا۔ راستے میں آنے والے شہر اس کی تباہ کار فوجوں کے سامنے سرنگوں ہوتے چلے گئے۔ 801ھ (1398ء) کے آغاز میں وہ دہلی میں داخل ہو گیا۔ اس نے شہر کے دروازے پر شراب و کباب کی محفل آراستہ کی اور تین دن تک دہلی میں قتلِ عام اور لوٹ مار کا ہنگامہ برپا رکھا۔ جلد ہی وہ فاتحِ مشرق بن کر ہندوستان سے واپس ہو گیا۔

عراق اور شام پر حملہ: دو برس بعد اس نے مغرب کا رُخ کیا۔ ایران پہلے ہی اس کے قبضے میں تھا، اب اس نے شام اور عراق پر حملہ کیا۔ دمشق اس کے ہاتھوں سوختہ اور تباہ ہوا۔ بغداد میں اس نے چنگیزی روایات کو دہراتے ہوئے بے دریغ قتلِ عام کیا اور 90 ہزار کے لگ بھگ مسلمانوں کو شہید کیا۔ مساجد، مدارس اور خانقاہوں کو چھوڑ کر شہر کی تقریباً تمام عمارات کو گرا کر ملبے کا ڈھیر بنا دیا گیا۔ اس کے بعد اس نے عثمانی ترکوں کی سلطنت پر حملہ کیا جو عالمِ اسلام کی مغربی فصیل کا کام دیتے ہوئے یورپی حکمرانوں سے جہاد میں مصروف تھی۔

بایزید یلدرم کی پشت میں خنجر: تیمور، عثمانی تاجدار بایزید یلدرم کی شان و شوکت سے حسد کرتا تھا اور اسے نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ اس نے ترک سلطنت کے شہر سیواس پر حملہ کر کے چار ہزار ''ارمن'' باشندوں کو

زندہ جلا دیا اور حریف کے ایک ہزار سپاہیوں کو گرفتار کر کے زندہ دفن کر دیا۔ عثمانی بادشاہ بایزید یلدرم ان دنوں برطانیہ، ہالینڈ اور فرانس کے ساتھ ایک فیصلہ کن ٹکر لے کر پورے یورپ کو اِسلامی عملداری میں داخل کرنے کی بھرپور تیاری کر رہا تھا مگر پشت پر تیمور کے حملے نے اسے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے قابل نہ رہنے دیا اور اسے سب کچھ بھول بھال کر تیمور کے مقابلے پر آنا پڑا۔

اس کے نتیجے میں 805ھ (1402ء) میں انگورہ کے مقام پر مغل اور عثمانی افواج میں ہولناک جنگ پیش آئی جو تیمور نے عددی اکثریت کے بل بوتے پر جیت لی۔ بایزید یلدرم شکست کھا کر گرفتار ہوا اور یوں اس مجاہد کا پورے یورپ کو فتح کرنے کا خواب پورا نہ ہو سکا جس کی تمام تر ذمہ داری تیمور پر عائد ہوتی ہے۔

شعبان 807ھ (فروری 1404ء) میں تیمور کا وقتِ آخر آن پہنچا اور وہ اپنی وسیع وعریض سلطنت چھوڑ کر دو گز زمین میں جا سویا۔

کیا تیمور اِسلامی فاتح تھا؟ تیمور ایک عظیم فاتح ضرور تھا مگر اسے اِسلامی تاریخ کے فاتحین میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ اس کے پیشِ نظر کوئی ایسا مقصد نہیں تھا جسے اِسلام سراہتا ہو بلکہ اس کا ہدف اپنے آباء واجداد کی طرح ملک گیری، خونریزی اور حصولِ اقتدار تھا۔ قتل وغارت کا جنونی جذبہ اس کی تمام خوبیوں پر غالب آ جاتا تھا۔ ہر چند کہ وہ مسلمان کہلاتا تھا مگر اپنے عقائد میں وہ اہلسنت والجماعت سے منحرف اور شیعوں سے شدید متاثر تھا۔

تیمور کا درباری علماء سے سلوک: اس کے دربار میں ہر مسلک اور مکتبِ فکر کے علما اور دانش ور موجود تھے مگر ان سب کو تیمور کے مزاج کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ دربارِ تیموری میں حق گوئی کی روایات زندہ کرنے والے علماء کی جگہ نہ تھی البتہ خاموشی سے علمی کام کرنے والے ماہرِ فن علماء کو اپنے دربار کی زینت بنا کر وہ علم دوست ہونے کا اعزاز حاصل کرنے میں ضرور کامیاب رہا۔ میر سید شریف جرجانی اور علامہ سعد الدین تفتازانی اس کی مشہور مثالیں ہیں جو تیموری دربار سے وابستہ رہے اور تیمور بھی کھلے دل سے ان کی کفالت کرتا رہا۔ تاہم بعض اوقات ایسے علماء اور دانش وروں کو تیمور کے عتاب کا نشانہ بن کر سخت ترین سزاؤں کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔

تیمور کا بیٹا شہزادہ میران شاہ ایک بار گھوڑے سے گر کر معمولی سا زخمی ہو گیا۔ اس موقع پر مولانا محمد کاشکی قریب میں نماز ادا کر رہے تھے، استاذ قطب الدین اور حبیب عودی بھی موجود تھے، تیمور نے ان سب کو محض اس وجہ سے پھانسی پر لٹکا دیا کہ ان کی موجودگی میں شہزادہ زخمی کیسے ہو گیا!!

اُفغانستان پر تیموری حکمرانی کے اثرات: تیمور کی فتوحات کا اگر کوئی فائدہ ہوا تو وہ یہ تھا کہ لاکھوں مربع میل میں پھیلی ہوئی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے ایک بڑی سلطنت میں شامل ہو جانے سے برسوں کی

خانہ جنگیوں اور سیاسی چپقلشوں کا ایک طویل عرصے تک کے لیے خاتمہ ہوگیا اور ایک زبردست عسکری نظام کی وجہ سے شاہراہیں اور راستے محفوظ تر ہو گئے تاہم اُفغانستان کے لیے مجموعی طور پر یہ دور انتہائی تنزل کا دور تھا چونکہ اُفغانستان میں حنفی اہل سنت مسلمانوں کی اکثریت رہی ہے، اس لیے تیمور نے تعصب کی وجہ سے اس سرزمین کو پامال کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

تیمور کے جانشین: تیمور نے اپنی زندگی ہی میں اپنے نواسے مرزا پیر محمد کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ تیمور کی موت کے وقت پیر محمد ہندوستان میں تھا۔ موقع پا کر اس کے بھائی خلیل نے بغاوت کر دی اور سمرقند میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا، تاہم پیر محمد نے فوراً ہندوستان سے واپس آ کر امرائے سلطنت کی مدد سے خلیل کو میدانِ جنگ میں شکست دے دی اور اپنا حق حاصل کر لیا مگر اسے زیادہ دنوں تک حکومت کرنے کا موقع نہ مل سکا اس لیے کہ اس دوران تیمور کے بیٹے شاہ رخ نے (جو اپنے والد کی زندگی میں اُفغانستان کا والی مقرر ہو چکا تھا) اقتدار کی کشاکشی میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔

جلد ہی شاہ رخ نے اُفغانستان کی سخت جان افواج کے ساتھ وسط ایشیا کی طرف پیش قدمی کی اور سمرقند پر قبضہ کر کے پیر محمد کو بے دخل کر دیا۔ اب اُفغانستان کے علاوہ پورا وسطِ ایشیا اس کے قدموں میں تھا۔

شاہ رُخ کا سنہرا دور: شاہ رخ نے تقریباً بیالیس سال تک اُفغانستان پر حکومت کی، وہ اس سرزمین کے ان حکمرانوں میں سے ایک تھا جنہوں نے اس اُجڑے ہوئے ملک کو آباد کرنے کی حتی الامکان کوشش کی اور تباہ شدہ علاقوں کو اچھی طرح تعمیر کرایا۔ اس کا دورِ حکومت 807ھ (1404ء) سے لے کر 850ھ (1446ء) تک دیا۔

شہزادہ الغ بیگ کے کارنامے: شاہ رخ کے بیٹے شہزادہ الغ بیگ نے بھی اُفغانستان اور وسطِ ایشیا میں زبردست فلاحی اور رفاہی خدمات انجام دیں۔ وہ اپنے باپ کی زندگی میں تقریباً 35 سال تک سمرقند کا گورنر رہا، اس کے تعمیری کارنامے اس دور سے مشہور و معروف ہو چکے تھے۔ وہ بڑا عالم فاضل انسان تھا، اس کا دماغ اس دور کے جملہ علوم و فنون کو سموئے ہوئے تھا۔ خاص طور پر ریاضی اور فلکیات میں وہ ماضی کے بڑے بڑے ماہرین پر سبقت لے گیا تھا اور سائنس دانوں کی ایک بڑی جماعت اس کے دربار سے وابستہ تھی۔ اس کے دور میں فلکیات کا فن عروج پر پہنچ گیا۔ وہ خود ماہرین فلکیات کے ساتھ مل کر ستاروں، سیاروں اور نظامِ شمسی کا معاینہ کرتا تھا اور اپنے تجربات و مشاہدات کو احاطۂ تحریر میں لاتا تھا۔ اس مقصد کے لیے سمرقند میں اس نے ایک تین منزلہ رصدگاہ بھی تعمیر کی جواب تک موجود ہے۔ سمرقند کا مشہور دینی تعلیمی ادارہ مدرسہ الغ بیگ اور جامع مسجد اپنی مسحور کن دلکشی کے ذریعے آج بھی

اس بادشاہ کے جمالیاتی اور تعمیراتی ذوق کی گواہی دے رہے ہیں۔ جغرافیہ اور طبیعات میں بھی وہ بے حد مہارت رکھتا تھا، اس نے کرۂ ارض کا بہترین نقشہ پیش کیا۔ فلکیات پر اس کے مشاہدات پر مبنی کتاب ''زیچ سلطانی'' کہلاتی ہے جس پر خود الغ بیگ کا مقدمہ بھی موجود ہے۔

یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ حکما اسے نصیرالدین طوسی کے فلکیاتی مشاہدات پر ترجیح دینے لگے تھے۔ فلکیات پر اس کی متعدد تصانیف بھی موجود ہیں مگر افسوس کہ آج مسلم سائنس دان اور ماہرینِ فلکیات ان کتب کے نام تک نہیں جانتے جبکہ یورپ میں 400 برس پہلے ہی پروفیسر جان گریو نے لاطینی زبان میں ترجمہ کر کے انہیں عام کر دیا تھا۔

اہلِ مغرب نے فلکیات کے میدان میں گزشتہ دو صدیوں میں جو حیرت ناک کامیابیاں حاصل کی ہیں وہ ایسے ہی علمی شہ پاروں سے ملنے والے انکشافات پر محنت کا نتیجہ ہیں۔

بیٹے کے ہاتھوں باپ کا قتل: الغ بیگ اپنے باپ شاہ رخ کی زندگی ہی میں اس کا جانشین طے ہو چکا تھا۔ 850ھ (1446ء) میں شاہ رخ کی وفات ہوئی تو الغ بیگ مسندِ شاہی پر براجمان ہوا مگر بادشاہت اسے راس نہ آئی۔ زمامِ اقتدار سنبھالتے ہی اسے فتنوں اور بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس کے بیٹے عبداللطیف نے بغاوت کر کے اس سے حکومت چھین لی۔

الغ بیگ اب اپنے بیٹے کے رحم و کرم پر تھا جب کہ بیٹا باپ کو اس کی علمی سرگرمیوں کے لیے بھی زندہ رکھنے کے لیے تیار نہ تھا، اس نے اقتدار کے نشے سے مغلوب ہو کر باپ کے قتل کا فیصلہ کر لیا۔ سچ ہے کہ یہ نشہ باپ بیٹے جیسے مقدس رشتے کی پہچان تک مٹا دیتا ہے۔

عبداللطیف کو یہ خدشہ تھا کہ اگر الغ بیگ کو سمرقند میں قتل کیا گیا تو عوام مضطرب ہو جائیں گے، چنانچہ اس نے باپ کو حج پر بھیجنے کے بہانے ایک قافلے کے ساتھ سمرقند سے رخصت کر دیا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی۔ قافلہ شہر سے کچھ دور پہنچا تھا کہ سمرقند کی طرف سے ایک سوار سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور پیغام دیا کہ قافلے کو حفاظتی نقطہ نظر سے یہیں کسی بستی کے قریب ٹھہرا لیا جائے۔ چنانچہ قافلے نے ایک سرائے میں پڑاؤ ڈال دیا۔ مشعلیں اور الاؤ روشن کر دیے گئے۔ الغ بیگ دنیا کے بکھیڑوں اور سیاسی چپقلشوں کو بھلا کر حج بیت اللہ کے روح پرور تصورات میں گم تھا کہ یکا یک اس کے خیمے میں عبداللطیف کے خاص آدمی گھس آئے۔ انہوں نے اسے پکڑ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ الغ بیگ اصل ماجرا سمجھ گیا، ان سے اجازت لے کر غسل کیا اور خدا کو یاد کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد حملہ آور اسے پکڑ کر باہر لے گئے، اسے ایک روشن مشعل کے نیچے بٹھا دیا گیا اور پھر تلوار کی ایک کاری ضرب سے اسے قتل کر دیا گیا۔

یہ واقعہ 852ھ (1448ء) کا ہے۔ الغ بیگ کی موت اَفغانستان اور وسط ایشیا کے مسلمانوں کے لئے ایک عظیم سانحہ تھا۔ اس کے سوانح نگاروں کا کہنا ہے کہ دنیا میں کوئی حکمران ایسا نہیں گزرا جو امور ریاست کے ساتھ ساتھ سائنسی علوم وفنون میں بھی الغ بیگ جیسی مہارت رکھتا ہو۔ اس کا حافظہ بھی عجائبات میں سے تھا، وہ مطالعے، تحقیق اور تجربات کے ساتھ ساتھ شکار کا بھی شوقین تھا۔ وہ اپنے ہی شکار کی روداد اور شکار کیے گئے جانوروں کی تفصیلات تحریر کرتا تھا۔ شکار کی یہ تفصیلات فائلوں کی شکل میں محفوظ کرلی جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ ایک سال سے زیادہ ایام کے شکار کی دستاویز کھوگئی۔ الغ بیگ نے ان تمام ایام کے شکاروں کی ڈائری اپنے حافظے کے بل بوتے پر لکھوادی۔ بعد میں گم شدہ دستاویز مل گئی تو نئی تحریر کردہ دستاویز سے تقابل پر پتہ چلا کہ نئی دستاویز میں صرف تین یا چار جانوروں کا اندارج رہ گیا ہے۔

عبداللطیف کا انجام: الغ بیگ کا قتل تیموری سلطنت کے زوال کا آغاز تھا۔ عبداللطیف جس کا تاج وتخت اپنے باپ کے خون سے رنگین تھا، اقتدار کے بھوکے امرءا کو مغلوب نہ کرسکا، چنانچہ ملکی نظام ابتر ہوگیا۔ ادھر قحط اور گراں فروشی نے عوام کی کمر توڑ دی اور حکومت نے ان کی کوئی دادرسی نہ کی۔ تنگ آکر عوام نے عبداللطیف کو قتل کرنے کا منصوبہ بنالیا۔ 853ھ (1449ء) میں عبداللطیف ایک دن مدرسۂ الغ بیگ کے بالمقابل تفریح گاہ ''باغ چنار'' میں چہل قدمی کررہا تھا کہ عوام کے ایک گروہ نے اس پر تیروں کی بوچھاڑ کردی۔ اس کے محافظ بھاگ نکلے، لوگوں نے بادشاہ کا سر کاٹ کر مدرسہ الغ بیگ کے سامنے لٹکادیا۔ باپ کے قاتل اس بدبخت حکمران کو صرف ایک سال حکومت کا موقع مل سکا۔

سلطان ابوسعید کا دور: عبداللطیف کے بعد سمرقند کی حکومت سلطان ابوسعید نے سنبھالی۔ یہ تیمور لنگ کے بیٹے میران شاہ کا نواسہ تھا۔ وسط ایشیا پر تسلط کے بعد اس نے اَفغانستان میں متعدد مہمات سرکیں اور بزورِ شمشیر باغی خودمختار امراء کو مغلوب کرکے تقریباً پورے اَفغانستان پر قبضہ کرلیا۔ اَفغانستان میں اس کی فتوحات کی تکمیل 870ھ (1465ء) میں ہوئی۔ اس کے دورِ حکومت میں ہرات میں طاعون کی وبا پھیلنے سے بہت سے لوگ جاں بحق ہوئے۔

سلطان ابوسعید ایک مہم جو انسان تھا۔ 873ھ (1468ء) میں اس نے شمالی ایران کو فتح کرنے کے لیے لشکرکشی کی مگر آذربائی جان کے علاقے میں موسمِ سرما کی شدت نے اس کی افواج کو خستہ حال کردیا، اس حالت میں اس کے مقابل حسن بیگ نے اسے شکست دے دی۔ ابوسعید گرفتار ہوا اور بعد میں قتل کردیا گیا۔

اس کے بعد اس کے بیٹے سلطان احمد نے 899ھ (1493ء) تک ماوراء النہر میں حکومت کی جبکہ

افغانستان میں اس سلسلے کا آخری بادشاہ سلطان حسین مرزا تھا۔

حسین مرزا اور مزار شریف: سلطان حسین مرزا تیمور کی اولاد میں سے افغانستان کا آخری حکمران تھا، اس نے سلطان ابو سعید کی موت کی خبر سنتے ہی ہرات کو مرکز بنا کر عوام کی حمایت کے ساتھ اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس نے 873ھ (1468ء) سے لے کر 911ھ (1505ء) تک افغانستان اور ایران پر بڑی آن بان سے حکومت کی۔

اس کے دور حکومت میں شمس الدین محمد نامی ایک صوفی نے خود کو حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ کی طرف منسوب کر کے بڑی شہرت پائی۔ اس نے سلطان حسین مرزا کو ایک غیر معتبر کتاب کے ذریعے یہ یقین دلایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر مبارک بلخ کے قریب دیہات ''خواجہ خیران'' میں ہے۔ سلطان حسین اس ''انکشاف'' پر بڑا حیران ہوا۔ کچھ عرصہ بعد بلخ کے سفر کے دوران اس کا گزر خواجہ خیران گاؤں سے ہوا، اس نے گاؤں میں گھوم پھر کر دیکھا تو ایک مزار نظر آیا جس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ اب سلطان حسین کو پکا یقین ہو گیا کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر ہے۔ اگرچہ تاریخی روایات کے لحاظ سے یہ بات بہر صورت غلط ثابت ہوتی ہے مگر سلطان کے حکم پر وہاں ایک شاندار گنبد اور مزار کی عمارت تعمیر کر دی گئی۔

اس مزار کی وجہ سے ''خواجہ خیران'' کا قصبہ اتنا مشہور ہوا کہ لوگ دور دور سے یہاں آ کر بسنے لگے اور بلخ کی رونقیں یہاں منتقل ہونے لگیں۔ رفتہ رفتہ یہ قصبہ ''مزار شریف'' کے نام سے ایک بڑا شہر بن گیا، جو آج افغانستان کے چار بڑے شہروں میں سے ایک ہے۔

مآخذ و مراجع

- ...... مطلع السعدین، کمال الدین عبد الرزاق سمرقندی
- ...... افغانستان در مسیر تاریخ، میر غلام محمد غبار
- ...... رحلۃ ابن بطوطہ، شرف الدین محمد ابن بطوطہ
- ...... تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ
- ...... آئین اکبری، ابو الفضل

نواں باب

اُزبک، اِیرانی اور مغل

افغانستان میں، شیبانی اور بابر: تیمور کے جانشینوں کے زوال کے ساتھ ساتھ افغانستان طوائف الملوکی کا شکار ہوتا چلا گیا، ایک طویل عرصے تک یہ سرزمین اسی کیفیت میں روبہ انحطاط رہی...... محمود غزنوی یا غوری جیسے کسی جری انسان نے یہاں جنم لیا، نہ چنگیز و تیمور جیسا کوئی فاتح قسمت آزمانے ادھر آیا۔

تین طالع آزما: 16 ویں صدی عیسوی کے آغاز میں یکا یک حالات نے ایک نئی کروٹ لی اور افغانستان بیک وقت تین طالع آزماؤں کے درمیان چوگان کی گیند بن گیا۔ یہ شاہ اسماعیل صفوی، بابر اور محمد خان شیبانی تھے۔ شاہ اسماعیل صفوی ایران کا اُبھرتا ہوا مقبول سیاسی رہنما تھا۔ وہ بڑی تیزی سے ایران کے طول وعرض پر چھا گیا تھا اور اب وسطِ ایشیا اور افغانستان کی طرف بڑھنا چاہتا تھا۔ بابر، تیموری نسل کا اقبال مند شہزادہ تھا۔ اس کا باپ عمر شیخ ماوراء النہر کے ایک شہر اندیجان (فرغانہ) کا حاکم تھا۔ 888ھ (1483ء) میں اپنے باپ کی وفات کے بعد جب بابر اندیجان کا حاکم بنا تو اس کی عمر صرف 11 سال تھی، شباب کی حدود میں قدم رکھتے ہی اس نے پورے وسطِ ایشیا کو ایک جھنڈے تلے لانے کے لیے مہم جوئی شروع کر دی، کامیابیوں اور ناکامیوں کے متعدد اُتار چڑھاؤ دیکھنے کے بعد انجامِ کار اسے اپنے حریفوں کے مقابلے میں شکست ہوئی...... وہ زخمی ہو کر فرار ہوا اور ترمذ سے ہوتا ہوا 907ھ (1501ء) میں افغانستان آ گیا۔

ازبکوں کا قائد: محمد خان شیبانی اپنے دور کا سب سے بڑا اور کامیاب حکمران تھا۔ اس کا تعلق اُزبک قبیلے سے تھا جو کہ چنگیز خان کے بیٹے جوجی کی اولاد میں سے اُزبک نامی ایک شخص کی طرف منسوب تھا۔ اُزبک وہ شخص تھا جس نے اپنے بہت سے ہم قدم تاتاریوں کو مسلمان کیا تھا۔ اُزبک قبیلہ وسطِ ایشیا کے شمال کی جانب سرد ترین علاقوں میں آباد تھا۔ یہ لوگ تہذیب و تمدن میں اب تک منگولیا کی روایات پر عمل پیرا تھے۔ ان کی سخت جانی اور درشت مزاجی مشہور و معروف تھی۔ پندرھویں صدی عیسوی میں اس قبیلے

کے ایک باصلاحیت اور قابل شخص ''ابوالخیر'' نے خوارزم میں اپنی حکومت قائم کرلی۔ محمد خان شیبانی اسی ابوالخیر کا پوتا تھا۔ وہ ایک تجربہ کار سپہ سالار اور عالم فاضل آدمی تھا۔ عمدہ ادبی ذوق رکھتا تھا، ترکی زبان کا شاعر بھی تھا۔ اپنے دادا کی وفات کے بعد وہ خوارزم کا حکمران بنا، اس کے دادا نے مصلحت اندیشی کی راہ اپناتے ہوئے وسطِ ایشیا میں کبھی توسیعی عزائم کا اظہار نہیں کیا تھا مگر محمد خان شیبانی نہ صرف وسطِ ایشیا بلکہ افغانستان تک کو زیر نگین کرنا چاہتا تھا۔

شیبانی اور بابر میں کشمکش: 1468ء میں تیموری بادشاہ سلطان ابوسعید کے قتل کے بعد وسطِ ایشیا کی تیموری حکومت بہت کمزور پڑ گئی تھی۔ شیبانی کے پاس جواں ہمت ازبکوں کی بڑی تعداد تھی۔ ان کی مدد سے اس نے پورے وسطِ ایشیا کو اپنی جولان گاہ بنالیا، اس کا سب سے بڑا حریف اس کی مانند فولادی عزم رکھنے والا بابر تھا۔

905ھ (1499ء) میں جب شیبانی نے تیموریوں کے مرکز سمرقند قبضہ کیا تو وسطِ ایشیا کے تمام سردار اور تیموری شہزادے اس کی ہیبت سے مرعوب ہوگئے۔ ایسے میں صرف بابر ہی تھا جو اپنی مختصری فوج کے ساتھ اس کے مقابلے میں ڈٹا رہا۔ 906ھ (1500ء) میں بابر نے شیبانی خان سے سمرقند چھین لیا مگر اگلے ہی سال شیبانی نے اسے سمرقند سے بے دخل کردیا جس کے بعد ہر طرف حالات ناسازگار دیکھ کر بابر افغانستان چلا آیا۔

بابر کابل میں: بابر نے افغانستان میں سب سے پہلی کامیابی کابل میں حاصل کی۔ 911ھ (1505ء) میں وہ یہاں قابض ہوا۔ اپنے خوبصورت محلِ وقوع کے باعث یہ شہر اسے نہایت پسند آیا، اس نے اسے اپنا مرکز بنا کر یہیں رہائش اختیار کرلی۔ بابر کی والدہ قتلق نگار خانم نے جو جلاوطنی میں اس کے ساتھ ساتھ تھی، کچھ دنوں بعد یہیں وفات پائی۔ بابر کا ذوقِ تعمیر بہت اعلیٰ تھا۔ کابل کے حسن سے متاثر ہو کر بابر اسے دوبارہ اچھی طرح تعمیر کرانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ انہی دنوں کابل میں متواتر کئی زلزلے آئے، خستہ حال عمارتیں زمیں بوس ہوگئیں اور شہر کھنڈر بن گیا۔ بابر نے اپنے ذوق کے مطابق شہر کو از سرِ نو تعمیر کرادیا۔ اسی سال بابر نے ہزارہ جات قبائل کے خلاف مہم شروع کی اور وہاں کے سرکش عناصر کی سختی سے سرکوبی کی۔

بابر کی ہندوستان روانگی: کچھ عرصے بعد بابر نے قندھار پر بھی قبضہ کرلیا۔ افغانستان کی سرسبز وادیاں، برف پوش چوٹیاں، سرد اور مست ہوائیں یہاں کے دریاؤں اور چشموں کا سرد وشیریں پانی...... یہ سب چیزیں بابر کے جمالیاتی ذوق کے عین مطابق تھیں...... وہ اس سرزمین کو کبھی چھوڑ دے

کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا...... مگر محمد خان شیبانی جو خود افغانستان پر قبضے کا خواہاں تھا، طوفانی بادل کی طرح اس کی سرحدوں پر گرج رہا تھا۔ بابر کی طاقت اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ 913ھ (1507ء) میں شیبانی نے ہرات پر قبضہ کر کے تیموری خاندان کے آخری حکمران حسین مرزا کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا اور اب وہ بلخ، قندوز اور فرغانہ کو فتح کر کے آگے بڑھا چلا آ رہا تھا۔ بابر کا بھائی ناصر مرزا اس کے ہاتھوں شکست فاش کے بعد پسپا ہو کر کابل پہنچ چکا تھا۔

ان حالات میں بابر کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنی محبوب سرزمین کو چھوڑ کر ہندوستان چلا جائے اور وہاں قسمت آزمائی کرے۔ چنانچہ کابل اور غزنی کو نائبین کے حوالے کر کے وہ ہندوستان چلا آیا جہاں کا تاج وتخت، تقدیر اس کے نام لکھ چکی تھی۔ ہندوستان میں لودھی حکمرانوں کے اقتدار کا خاتمہ کر کے اس نے عظیم مغل سلطنت کی بنیاد رکھی جو 1857ء میں آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر تک مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی یادگار رہی۔

بابر کی افغانستان سے محبت: بابر ہندوستان کا فاتح تو بن گیا اور حالات کے تقاضوں کے باعث وہ مرتے دم تک یہیں مہمات انجام دینے پر مجبور رہا مگر اسے افغانستان کی پُر کیف فضا اور کابل کے گلستانوں کی خوشبوئیں ہمیشہ یاد آتی رہیں۔ وہ ہندوستان کی آب وہوا اور موسم سے لے کر یہاں کی تہذیب وثقافت اور یہاں کے باشندوں کے ذوق ومزاج تک، ہر شے سے بددِل رہا۔ تزک بابری میں اس نے جہاں ہندوستان کی گرم اور مرطوب آب وہوا اور یہاں کے گدلے پانی کا شکوہ کیا ہے وہاں اپنے وطن کے صاف اور ٹھنڈے پانی کی تعریف کی ہے۔ اس کی وصیت تھی کہ اسے ہندوستان کی بجائے اس کے پسندیدہ شہر کابل میں دفنایا جائے۔

بابر کا انتقال 5 جمادی الاولیٰ 937ھ (21 دسمبر 1530ء) کو ہوا۔ وصیت کے مطابق اس کی لاش کو کابل لے جا کر دفن کیا گیا۔ کابل میں بابر کا مزار آج بھی افغانستان سے اس کی دلی محبت کی گواہی دے رہا ہے۔

بابر کی زندگی میں قندھار میں اس کا بیٹا شہزادہ کامران حاکم تھا جبکہ بدخشاں اور کابل ہمایوں کے پاس تھے۔ بابر کے بعد ہمایوں نے ہندوستان جا کر باپ کا تخت سنبھالا اور اسی سے شاہانِ مغلیہ کا سلسلہ آگے چلا۔

شیبانی خان کی اُزبک سلطنت: بابر کا حریف محمد خان شیبانی شمال مغربی افغانستان پر قبضے کے بعد زیادہ عرصے تک زندہ نہ رہ سکا اور 916ھ (1510ء) میں ایران کے حکمران شاہ اسماعیل صفوی سے شکست کھا کر مقتول ہوا۔ اس کی اولاد بھی افغانستان پر زیادہ عرصہ تک حکومت نہ کر سکی اس لیے کہ افغان قبائل اُزبکوں سمیت کسی بھی بیرونی طاقت کا اقتدار برداشت نہیں کر سکتے تھے تاہم شیبانی کا نام تاریخ

میں اس لحاظ سے زندہ رہے گا کہ اس نے وسطِ ایشیا میں پہلی اُزبک سلطنت کی بنیاد رکھی، جس کی سرحدیں اَفغانستان سے جاملی تھیں۔ یہ سلطنت ایک صدی تک باقی رہی، اس میں بارہ بادشاہ گزرے جن کا پایہ تخت اکثر سمرقند اور کبھی کبھار بخارا بھی رہا۔ 1515ء میں اسی کی ایک شاخ خوارزم میں بھی قائم ہوگئی جو 1882ء میں زارروس کے زیرِ تسلط آنے سے پہلے تک خودمختار حیثیت سے باقی رہی۔

شیبانی کی تاسیس کردہ ازبک سلطنت کے اثرات اتنے پائدار تھے کہ 20ویں صدی عیسوی میں سوویت یونین کے قبضے کے بعد بھی اس علاقے کا نام اُزبکستان ہی رہا اور 1991ء میں سوویت بُت پاش پاش ہونے کے بعد اس خطے نے اُزبکستان ہی کے نام سے ایک الگ مسلم مملکت کی حیثیت حاصل کرلی۔

اَفغانستان کی سیاست پر ایران کے اثرات: اَفغانستان اور ایران کے سیاسی تعلقات کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی اہلِ ایران نے اَفغانیوں کے ساتھ برابر کی سطح پر معاملات نبھانے کی سعی کی ہے، دونوں ملک ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن رہے ہیں لیکن جب کبھی انہوں نے اَفغانوں پر سیاسی تسلط قائم کرنے کی کوشش کی، دونوں ملکوں کو بے حد نقصان اُٹھانا پڑا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اَفغان آزاد منش اور نہایت غیور لوگ ہیں، وہ غلامی برداشت کرنے کے عادی نہیں، نیز اپنی حمیت کے بل بوتے پر بیرونی جارحیت کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، پڑوسیوں سے حسن سلوک اور وفاداری ان کا وطیرہ ہے مگر وہ ان کی بالادستی کبھی قبول نہیں کرتے۔

ظہورِ اسلام سے قبل اَفغانستان صدیوں تک ایران کی ساسانی بادشاہت کے ماتحت رہا تھا۔ اِسلام نے اہلِ اَفغانستان کو کسریٰ کے مظالم اور دیگر اقوام کے تسلط سے نجات دلائی تھی، اس لیے اَفغان اِسلام ہی کو اپنا حقیقی نجات دہندہ سمجھتے آئے ہیں۔ دوسری طرف ایران کی بدقسمتی یہ رہی کہ وہاں کے حکمران طبقے میں بار بار ایسے عناصر کا غلبہ ہوتا رہا ہے جو ساسانی بادشاہت اور کسریٰ کی شوکت وہیبت کے طلسماتی تصورات ہی کو ایران کی ترقی اور سربلندی کی معراج سمجھتے رہے ہیں۔ چوں کہ اَفغانستان بھی ساسانی بادشاہوں کے زیرِنگیں ایک صوبہ رہا تھا، اس لیے ایرانی حکمرانوں میں اَفغانستان پر تسلط یا کم ازکم یہاں کی سیاست میں بے جا مداخلت کا جذبہ عموماً کارفرما رہا ہے۔ ماضی بعید میں یہ صورت حال کم رہی مگر سولہویں صدی عیسوی کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ان دونوں ملکوں میں خوشگوار تعلقات کی گھڑیاں بہت مختصر رہی ہیں۔

شاہ اسماعیل صفوی کا دور: اس صورت حال کا آغاز ایران میں صفوی سلطنت کے آغاز سے ہوا، جس کا بانی شاہ اسماعیل صفوی تھا۔ وہ سولہویں صدی عیسوی کے آغاز میں اَفغانستان پر قبضے کے خواہش مند دو فاتحین یعنی بابر اور شیبانی کا ہم عصر اور کانٹے کا حریف تھا۔ وہ ایک زیرک سیاست دان اور تجربہ کار جنگجو

تھا۔ صحیح قول کے مطابق وہ اردبیل کے شیخ صفی کی نسل سے تھا جو بحیرہ خزر کے جنوب میں آباد ترک نسل کے روحانی پیشوا تھے۔

اسماعیل صفوی نے اپنی روحانی و مذہبی حیثیت سے فائدہ اُٹھا کر اپنے حلقۂ اثر کی طاقت کو اقتدار کے لیے بڑی کامیابی سے استعمال کیا اور 908ھ (1502ء) میں عراق عجم، فارس اور شمالی ایران پر قبضہ کر کے ایک مضبوط سلطنت کی بنیاد رکھی جو ایک طرف ترکی کی خلافت عثمانیہ اور دوسری طرف ازبکستان کے شیبانی حکمرانوں اور افغانستان کے قبائلی سرداروں کے لیے آزمائش بنی رہی۔ شاہ اسماعیل صفوی ایک متعصب حکمران تھا۔ اس نے کے اقتدار میں آتے ہی ایران میں اثنا عشری ائمہ کے ناموں کا خطبہ لازمی قرار دے دیا۔ نماز، روزے اور دیگر عبادات میں بھی تمام رعایا کو شیعہ مذہب پر عمل کرنے پر مجبور کیا۔ اس طرز عمل سے شیعہ سنی منافرت کی وہ آگ جو ایک طویل مدت سے دبی ہوئی تھی، پھر بھڑک اٹھی اور ترکی سے لے کر افغانستان تک شیعہ سنی تفرقہ بڑھتا چلا گیا۔ شاہ اسماعیل صفوی کے متعصبانہ رویے سے ایران کے اہل سنت سخت مصائب کا شکار ہوئے اور ان کی خاصی تعداد افغانستان اور ہندوستان کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئی۔

ایران کا افغانستان پر حملہ اور ازبک حکمرانوں سے کشمکش: اسماعیل صفوی ایران میں ایک مضبوط سلطنت قائم کرنے کے بعد افغانستان پر لشکر کشی کے لیے بے تاب تھا مگر اس کا سب سے بڑا مخالف محمد شیبانی خان وسطِ ایشیا میں اسے للکار رہا تھا۔ شاہ اسماعیل صفوی نے بڑی سمجھ بوجھ سے کام لیا اور شیبانی کے مقابلے پر اس وقت نکلا جب مدمقابل پوری طرح تیار نہ تھا۔

شیبانی نے خطرہ محسوس کر کے مرو میں قیام کیا مگر شاہ اسماعیل صفوی کی چال کو نہ سمجھ سکا۔ شاہ اسماعیل صفوی نے 916ھ (1510ء) میں مرو کے قریب اسے مقابلہ پر اُکسایا اور انجام کار زبردست لڑائی کے بعد اسے شکست دے دی اور مقتولین کی کھوپڑیوں کے مینار کھڑے کر کے اہل سنت کے دلوں پر اہل تشیع کی ہیبت بٹھانے کی کوشش کی۔ اب افغانستان پر لشکر کشی کے لیے موقع سازگار تھا، راہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ 916ھ (1510ء) میں شاہ صفوی حدود افغانستان کے قریب طوس، مشہد اور سرخس جیسے اہم شہروں کو فتح کر چکا تھا۔ اس کے فوراً بعد وہ اپنی فوج کے ساتھ ہرات آ پہنچا۔

ہرات اہل سنت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اسماعیل صفوی نے اسے فتح کرتے ہی جامع مسجد میں شدید مذہبی تعصب پر مشتمل احکام کا اعلان کرا دیا۔ اس میں یہ حکم بھی دیا گیا تھا کہ جمعے کے خطبے میں خطباء، ائمہ اثنا عشریہ کے فضائل بیان کرنے کے ساتھ ساتھ خلفائے ثلاثہ (حضرات ابوبکر و عمر اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم) کے

خلاف زبان درازی کریں۔حافظ زین الدین ہراتی رحمۃ اللہ نے یہ اعلان سنا تو اہل ہرات کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے اس ناپاک حکم کی تعمیل سے کھلم کھلا انکار کر دیا۔اس پر صفوی حکومت کے افسران نے انہیں دورانِ نماز بحالتِ سجدہ جامع مسجد ہی میں شہید کر دیا۔اس صورتحال سے ہرات کے لوگوں میں سخت اشتعال پھیل گیا۔لوگوں کو بپھرتا دیکھ کر شاہ اسماعیل صفوی خود وہاں پہنچا اور حکم میں ترمیم کرتے ہوئے کہا کہ خطبے میں صرف ائمہ اثنا عشریہ کے فضائل بیان کرنے پر اکتفا کیا جائے۔اس کے بعد ایرانی فوجوں نے میمنہ، فاریاب، جوزجان اور بلخ بھی یکے بعد دیگرے فتح کر لیا۔اس سے پہلے یہ علاقے ازبک افواج کے قبضے میں تھے مگر شیبانی کی شکست سے ازبکوں کی طاقت ٹوٹ گئی تھی اس لیے افغانستان میں صفوی کو روکنے والا کوئی نہ تھا۔اگرچہ اسماعیل صفوی نے بزور طاقت مغربی اور شمالی افغانستان پر قبضہ کر لیا تھا مگر وہ عوام کے دلوں کو فتح نہ کر سکا۔لوگ اس کے خلاف اٹھنے اور اس کے مقابلے میں کسی بھی بیرونی طاقت کی مدد کرنے کے لیے تیار تھے۔اگر ایرانی بادشاہ افغانستان میں مذہبی رواداری سے کام لیتا تو افغان باشندے اتنی جلد بددل نہ ہوتے مگر ایسا نہیں ہوا اور حاکم طبقہ مذہبی تعصب میں مبتلا ہو کر افغان عوام کے جذبات کو ٹھیس پہنچاتا رہا۔اس کے نتیجے میں افغان باشندوں نے ایک بار پھر وسطِ ایشیا کے ازبک شہزادوں اور امراء کو افغانستان میں مداخلت کا موقع دیا تا کہ وہ انہیں ایرانیوں سے نجات دلائیں۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی و شمالی افغانستان کو ایرانی اور ازبک افواج نے معرکوں کا میدان بنا لیا اور ہر چند ماہ بعد یہاں حکومتیں تبدیل ہونا ایک معمول بن گیا، ملک کی معیشت و زراعت تباہ ہو گئی، تجارتی راستوں پر خاک اڑنے لگی اور قحط نے ہر طرف ڈیرے ڈال دیے۔انجامِ کار اس کشاکشی میں ایرانیوں کا پلہ بھاری رہا اور ازبکوں نے اپنے پاؤں وسطِ ایشیا میں سمیٹ لیے۔شمالی افغانستان کا فقط تھوڑا سا علاقہ ان کے پاس رہ گیا۔931ھ (1524ء) میں شاہ اسماعیل صفوی دنیا سے رخصت ہوا تو شمالی افغانستان کا اکثر اور مغربی افغانستان کا مکمل علاقہ بدستور ایران کے پاس تھا۔

<u>افغانستان اور مغل بادشاہ:</u> افغانستان کے مشرقی اور جنوبی اضلاع اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ اس عرصے میں وہاں بابر، اس کے دوسرے بیٹوں اور اس کے جانشین ہمایوں کی حکومت رہی۔خانہ جنگیوں کے کچھ واقعات کے باوجود یہاں مجموعی طور پر امن وامان کا دور دورہ رہا۔946ھ (1539ء) میں ایک افغان سردار شیر شاہ سوری نے ہمایوں سے ہندوستان کا تاج وتخت چھین کر اسے جلاوطن کر دیا۔ادھر افغانستان کے مغل مقبوضات پر ہمایوں کے بھائیوں نے قبضہ کر لیا تھا، ہمایوں کے پاس اب کوئی جائے پناہ نہ رہی تھی۔

ہندوستان میں شیر شاہ سوری کا دور حکومت مختصر ہونے کے باوجود تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ ہندوستان کے اس افغان حکمران نے عدل وانصاف اور تعمیر وترقی کے بے مثال کارنامے انجام دیے جنہیں احاطہ تحریر میں لانا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ پشاور سے بنگال تک جرنیلی سڑک کی تعمیر اس کا وہ زندہ وجاوید کارنامہ ہے جسے کبھی نہیں بھلایا جا سکتا۔

ایران کی دوبارہ مداخلت: اس دوران ایرانی سلطنت افغانستان وہند کے سیاسی اُتار چڑھاؤ پر گہری نظر رکھے ہوئے تھی۔ جلاوطن مغل حکمران ہمایوں کو شاہ اسماعیل کے جانشین ''طہماسپ'' نے بڑے اعزاز کے ساتھ اپنے ہاں پناہ دی اور اس کی مدد کا وعدہ کیا۔

1544ء میں اس نے ہمایوں کو دس ہزار سپاہی اس شرط پر دیے کہ وہ افغانستان میں اپنے سابقہ مقبوضات میں ائمہ اثنا عشریہ کے نام کا خطبہ جاری کرے گا اور قندھار کو دولتِ صفویہ کے شہزادے مراد صفوی کے نام کر دے گا۔ ہمایوں نے یہ شرط قبول کر لی۔ اس نے ایرانی سپاہ کے ذریعے قندھار، کابل اور زابل میں اپنے بھائی کامران کے خلاف سخت جنگیں لڑ کر اپنا علاقہ دوبارہ حاصل کر لیا اور قندھار شہزادہ مراد صفوی کے سپرد کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد مراد صفوی طبعی موت مر گیا تو ہمایوں نے قندھار کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ افغانستان میں ہمایوں کی مہمات دس سال تک جاری رہیں، آخر کار بدخشاں، تخار، کابل، زابل، قندھار جیسے اہم اضلاع پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ اس کا سب سے بڑا حریف شہزادہ کامران پکڑا گیا، ہمایوں نے اسے اندھا کرا دیا۔ ادھر ہندوستان میں پہلے 952ھ (1545ء) میں شیر شاہ سوری کی شہادت اور پھر 961ھ (1553ء) میں اس کے جانشین سلیم شاہ کی وفات کے بعد حالات تبدیل ہو گئے تھے، اس لیے ہمایوں 962ھ (1554ء) میں دریائے سندھ عبور کر کے ہندوستان پہنچ گیا اور بڑے کشت وخون کے بعد اپنا تخت وتاج واپس لینے میں کامیاب ہوا۔

جنوبی اُفغانستان پر ایران کا تسلط: ہمایوں کی غیر موجودگی میں 964ھ (1556ء) میں شاہ طہماسپ نے ایک بار پھر افغانستان میں مداخلت کی اور قندھار پر قبضہ کر لیا۔ اس سے قبل وہ 943ھ (1536ء) میں بھی افغانستان پر حملہ کر کے قندھار کو مغل شہزادے کامران سے چھین چکا تھا مگر اس کی واپسی کے بعد کامران نے قندھار پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا۔ اب کامران تھا، نہ ہمایوں، اس لیے قندھار پر ایران کا قبضہ مستحکم ہو گیا۔ جنوبی افغانستان خصوصاً قندھار کے بارے میں مغل بادشاہوں اور صفوی حکمرانوں کے درمیان تنازعہ کئی نسلوں تک جاری رہا۔ 1003ھ (1594ء) میں اکبر نے قندھار کو ایرانیوں سے بازیاب کرایا مگر 1030ھ (1620ء) میں شاہ عباس نے اسے دوبارہ چھین لیا۔ 1047ھ (1637ء) میں مغل

بادشاہ شاہ جہاں نے خود افغانستان آکر قندھار فتح کیا مگر اس کے واپس جانے کے بعد 1048ھ (1638ء) میں ایرانی حکمران شاہ عباس صفوی ثانی نے یہاں ایک بار پھر قبضہ کرلیا۔ 1061ھ (1651ء) میں شاہ جہاں نے اپنے بیٹے شہزادہ اورنگ زیب کو قندھار کی تسخیر کے لیے روانہ کیا مگر یہ مہم کامیاب نہ ہوسکی۔ اس طرح طویل عرصے تک جنوبی افغانستان ایرانی سلطنت کا حصہ رہا۔

افغانوں کی مغلوں سے وفاداری: تاریخ افغانستان ہندوستان کے مغل بادشاہوں کے ذکر کے بغیر ادھوری رہتی ہے۔ ان سے پہلے سلطان محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری جیسے فاتحین نے افغانستان کو مرکز بنا کر ہندوستان پر حکومت کی تھی، ان کے بعد ایک طویل عرصے تک دونوں ملکوں کی سیاست الگ الگ قوموں اور خاندانوں کے ہاتھوں میں رہی۔ مغل بادشاہوں نے اس رسم کو بدل دیا اور ہندوستان کو مرکز بنا کر افغانستان پر حکمرانی کی نئی روایت قائم کی۔ افغانوں نے جو کبھی بیرونی حکومتوں کو خوش دلی سے قبول نہیں کرتے، دو صدیوں تک ہندوستان کی مغل سلطنت کو اس لیے مسترد نہ کیا کہ مغل سلطنت کا خمیر افغانستان ہی سے اُٹھا تھا اور اس کے اولین فاتح بابر اور اس کے مورث اعلیٰ تیمور کا افغانستان سے تعلق بہت گہرا تھا۔ اس کے علاوہ افغان امراء اور قبائلی سردار یہ بھی بخوبی جانتے تھے کہ ایران کی صفوی حکومت کی دست درازیوں سے مغل ہی ان کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر دو صدیوں سے زائد عرصے تک اہلِ افغانستان ہندوستان کی مغل سلطنت کے وفادار رہے۔

مغل بادشاہوں کی سنگین غلطی: تاہم مغل بادشاہوں میں سے بابر کے سوا کسی نے افغانستان کی تعمیر وترقی پر خاطر خواہ توجہ نہ دی۔ ان کی جانب سے ترقیاتی کام صرف قلعوں کی مضبوطی اور مرمت یا شاہراہوں کی تعمیر اور حفاظت تک محدود رہے۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ اکثر مغل بادشاہ تعمیری، علمی اور فلاحی ذوق رکھتے تھے مگر اس بارے میں ان کی زیادہ تر توجہ ہندوستان کی جانب مبذول رہی۔ ان کی کاوشوں سے ہندوستان تو علم وادب کا مرکز بن چکا تھا، دہلی اور آگرہ علماء، شعراء اور ادباء سے معمور تھے، مگر افغانستان کے شب وروز تاریکی کی لپیٹ میں تھے۔ دہلی آنے والے اہل علم وفضل کو مغل بادشاہ تو مالامال کر دیتے تھے مگر افغانستان کے اہل علم اور ارباب سخن کی حالت زار وزار تھی۔

افغانستان کے پڑوس میں وسط ایشیا کے اُزبکوں نے بخارا کو اور ایران کے صفویوں نے اصفہان کو علمی، ادبی، تجارتی اور اقتصادی رونقوں کا گہوارہ بنا دیا تھا مگر افغانستان کے وہ بڑے بڑے شہر جن پر کبھی تاریخ ناز کیا کرتی تھی، ویران تھے۔ یہاں گنتی کے چند مدرسوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ ملک علم وادب سے بالکل تہی دامن دکھائی دینے لگا تھا۔

مغل بادشاہوں کی اَفغانستان سے بے اعتنائی: مغل بادشاہوں کا ذوق تعمیر دنیا سے آج تک خراجِ تحسین وصول کر رہا ہے مگر اس کا مظاہرہ ہندوستان ہی میں ہوتا رہا۔ اَفغانستان میں ان کی تعمیرات صرف وہ باغ تھے جہاں مغل حکمران اور شہزادے موسمِ گرما گزارنے آیا کرتے تھے۔ ان میں کابل کا باغِ بابر، کوہ دامن کا باغ استالِف، کابل اور جلال آباد کے درمیان واقع ''باغ نملہ'' قابل ذکر ہیں۔ قندھار کی قدیم آبادی کے قریب ''چہل زینہ'' کے نام سے ایک عمارت بھی مغل بادشاہوں کی یادگار ہے مگر اَفغانستان کی اصل ضروریات میں آب پاشی، زراعت، اقتصادیات، آبادکاری، شہروں کی تعمیر اور تعلیمی نظام پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ مغل دورِ حکومت میں یہاں کوئی ڈیم بنایا گیا نہ نہر کھدوائی گئی۔ مدارس اور علمی مراکز ویران تھے۔ آبادیاں سمٹتی جارہی تھیں۔ مغل بادشاہوں کی ہندوستان نواز پالیسی کے سبب اَفغانستان کے بچے کھچے علماء، شعراء اور ادباء بھی ہندوستان جانے کو ترجیح دیتے تھے۔

قاضی محمد اسلم ہراتی جو یہاں بڑی کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہے تھے جب ہندوستان پہنچے تو بادشاہ وقت شاہ جہاں نے انہیں سونے میں تلوادیا اور ان کے وزن کے برابر چھ ہزار پانچ سو اشرفیاں ان کے حوالے کردیں۔ اس قسم کی مثالوں سے اَفغانستان کے قابل افراد کا ہندوستان کی طرف کھنچتے چلے جانا ایک فطری سی بات تھی۔

جنوبی ومغربی اَفغانستان میں ایرانی آمریت کی جھلکیاں: ان تمام باتوں کے باوجود اہل اَفغانستان ایران کی متعصب شیعہ حکومت پر مغلوں کو ترجیح دیتے تھے جو کہ اہل سنت تھے۔ اہل اَفغانستان دیکھ چکے تھے کہ صفوی سلطنت کے بانی اسماعیل صفوی کے افسران نے اَفغانستان میں قدم رکھتے ہی حافظ زین الدین ہراتی کو محض اس بات پر کہ وہ خلفائے ثلاثہ پر دشنام طرازی کے لیے تیار نہیں تھے، ہرات کی جامع مسجد میں قتل کرادیا تھا۔ وہ یہ بھی دیکھ چکے تھے کہ ایرانی حاکم امیر خان نے اَفغان شاعر ''آگہی ہروی'' کی زبان کاٹنے کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ بھی قلم کرادیے تھے۔ اس کا جرم صرف یہ تھا کہ اس نے سلطنت ایران کے ظلم وجبر کے خلاف اشعار لکھے تھے۔ ''عبدالرحیم شاعر ہوتکی'' کا انجام بھی سب کے سامنے تھا جسے آزادی کا نغمہ لکھنے کی پاداش میں ایرانی حکومت نے جلاوطن کردیا تھا۔

قندھار سمیت جنوب مغربی اَفغانستان کے اکثر اضلاع میں جہاں فارسی زبان رائج تھی ایرانیوں کا اقتدار تھا۔ اس پورے علاقے میں علم وادب کی مٹی پلید کردی گئی تھی۔ علم وادب کی اس ناقدری اور علماء وادباء کی اسی اہانت کے نتیجے میں یہاں اس دور میں کوئی نامور فرد پیدا نہیں ہوا حالانکہ ماضی میں یہی سرزمین فارسی زبان وادب کا اصل مرکز تھی۔ یہاں بہزاد، جامی، حکیم سنائی اور علی شیر جیسے شعراء کے زمزمے گونجتے رہے تھے مگر

اب ایسی کوئی مثال صدیوں سے نایاب تھی۔ فارسی نظم ونثر کے لیے یہ دور سکرات موت کی مانند تھا۔ درحقیقت اَفغانستان کے مغربی وجنوبی صوبوں پر ایران کا اقتدار مکمل طور پر عسکری تسلط تھا جسے عوام کی قطعاً کوئی حمایت حاصل نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ حکومتِ ایران کی طرف سے قندھار اور ہرات میں 20،20 ہزار سپاہیوں پر مشتمل دو بڑی فوجیں ہروقت موجود رہا کرتی تھیں تا کہ کوئی بغاوت کامیاب نہ ہوسکے۔ ان فوجوں کے جملہ اخراجات اَفغانستان کے مفلوک الحال عوام کی چمڑی ادھیڑ کر وصول کیے جاتے تھے۔

پشتو ادب وشاعری کا عروج: مغل بادشاہوں کے زیر انتظام اَفغانستان کے مشرقی اور وسطی صوبے جہاں پختون آبادی تھی اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ ملک کی حالت زار پر سلگتے ہوئے سوالات نے یہاں اسی دور انحطاط میں کئی انقلابی پشتو شعراء کو جنم دیا، جن میں خوشحال خان خٹک کا نام سرفہرست ہے۔ بعد میں رحمن بابا، حمید بابا اور عبدالقادر خٹک نے بھی یہی راہ اپنائی اور پشتو شاعری کو بام عروج تک پہنچا دیا۔ انہی شعراء کی شاعری نے اَفغان عوام کو وہ حوصلہ دیا جس نے انہیں تمام بیرونی طاقتوں کو بے دخل کر کے اپنی حکومت تشکیل دینے پر آمادہ کیا۔

شمالی اَفغانستان کے ازبک حکام کا رویہ: اس دور میں شمالی اَفغانستان کے وہ صوبے جہاں وسطِ ایشیا کے ازبکوں کی حکومت تھی، نسبتاً بہتر حالت میں تھے۔ ازبکوں نے اَفغانستان میں بلخ کو مرکز بنالیا تھا اور ان کے حکام یہاں کے عوام سے قریب تر رہتے تھے۔ مقامی عوام تقریباً تمام معاملات میں آزاد تھے۔ ازبک حکام نے صرف چند اہم امور کی دیکھ بھال کے لیے یہاں کچھ افسران مقرر کر دیے تھے۔ عوام پر سرکاری ٹیکس بھی بہت ہلکے رکھے گئے تھے۔ خود ازبکوں کی خاصی بڑی تعداد شمالی اَفغانستان میں آباد ہو چکی تھی اس لیے انہوں نے یہاں کے باشندوں سے اپنائیت کا سلوک روا رکھا۔

مآخذ و مراجع

- ...... تزکِ بابری، ظہیر الدین بابر
- ...... اَفغانستان در مسیر تاریخ، میر غلام محمد غبار
- ...... تاریخ وسطِ ایشیا، محمد حیات
- ...... Encyclopedia of Islam.V.1

دسواں باب

خود مختاری کی تحریکیں

مغل حکمرانوں کی افغانستان میں ترقیاتی امور سے بے اعتنائی تو شاید افغان عوام کے لیے ایک حد تک قابل برداشت ہوتی مگر وہ اپنے مذہب، ایمان اور غیرت پر آنچ آتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہمایوں کے بعد جب اکبر نے ہندوستان کی مسند اقتدار سنبھالی تو اس کے غرور وتکبر اور خوشامدی درباریوں کی جی حضوری نے جلد ہی اسے ''انا ولا غیری'' کی سیڑھی پر چڑھا دیا۔ اکبر کے دربار میں شاعر، موسیقار، گویّے، مصوّر اور فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے ماہرین کے علاوہ حد درجے گمراہ کن نظریات کے حامل دانشور بھی موجود تھے۔ ابوالفضل اور فیضی جیسے زر پرست علماء اس کے جہل والحاد میں اضافے کا سبب بنتے رہے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ اکبر نے دینِ اِسلام کی جگہ ''دینِ الٰہی'' نافذ کرنے کا اعلان کردیا۔ یہ خود ساختہ دین ہندوانہ تہذیب کی نقالی اور بعض چیزوں میں عیسائیت کی مضحکہ خیز تقلید کے سوا کچھ نہ تھا۔ کفر والحاد کے اس مجموعے کو جب سرکاری حیثیت دے کر پوری مغل مملکت میں بزور قوت نافذ کرنے کی مہم شروع کی گئی تو اِسلام اور مسلمانوں کا درد رکھنے والے بے چین ہو گئے۔

پیر روشن کی تحریکِ جہاد: اس موقع پر جہاں ہندوستان میں اس بے دینی کا مقابلہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کو کھڑا کیا، وہاں افغانستان میں مشیت خداوندی نے شیخ بایزید انصاری رحمہ اللہ کو دین اکبری کے خلاف مسلح جہاد کی ہمت وقوت عطا کی۔ شیخ بایزید انصاری مشہور صوفی بزرگ شیخ سراج الدین انصاری رحمہ اللہ کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے والد شیخ عبداللہ انصاری اپنے زمانے کی یگانہ روزگار روحانی شخصیت تھے۔ شیخ بایزید انصاری رحمہ اللہ مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ نہایت پرہیزگار، جرأت مند اور غیور انسان تھے۔ علم دین اور سلوک واحسان کے شعبوں میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ وہ ایک عمدہ خطیب اور صاحبِ طرز ادیب بھی تھے۔ ان کی کتابیں ''خیر البیان''، ''حال نامہ'' اور ''مخزن الاسلام'' ان کی علمی وادبی مہارت کا ثبوت ہونے کے علاوہ ملتِ اِسلامیہ کے بارے میں ان

کے دردوغم کی آئینہ دار ہیں۔ وہ پشتو، فارسی اور عربی پر بیک وقت عبور رکھتے تھے۔

اس مردِ مجاہد نے ہندوستان اور افغانستان میں اکبر کے مظالم کا بچشم خود مشاہدہ کیا اور زبان وقلم سے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ وہ منتظر تھے کہ شاید اس طرح حالات سدھر جائیں اور حکام اپنی اصلاح کر لیں مگر حالات کی خرابی روز بروز بڑھتی گئی۔ پھر وہ دن آ گیا جب شیخ بایزید انصاری نے حکومت کی اصلاح سے مایوس ہو کر اس کے خلاف تلوار اٹھانے کا عزم کر لیا۔ وہ قندھار کے دورے پر تھے کہ انہوں نے ایک درد ناک منظر دیکھا۔ اکبر کے سپاہی جو بیرم خان نامی مغل امیر کے ماتحت تھے، ایک عورت کو گرفتار کر چکے تھے۔ انہوں نے اس عورت کے بالوں کو ایک چرخی سے باندھ کر اس سے لٹکا دیا اور اس حالت میں چرخی کو چکر دینے لگے۔ عورت کی دلدوز چیخوں نے آسمان کا کلیجہ چیر دیا مگر زمین پر اس کی فریاد کو پہنچنے والا کوئی نہ تھا۔ کسی کی ہمت نہ تھی کہ مغل سپاہیوں کو صنفِ نازک کی اس تذلیل اور انسانیت کے اس توہین سے روکتا۔

شیخ بایزید انصاری نے یہ منظر دیکھا تو ان کا خون کھول اٹھا اور اسی لمحے انہوں نے اکبر کے مظالم سے عوام کو نجات دینے کے لیے شمشیر بکف ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ سوچ بچار اور مشورے کے بعد اس مقصد کے لیے مشرقی اُفغانستان کا علاقہ انہیں موزوں ترین معلوم ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ ہندوستان مغل افواج کا مرکز تھا اور وہاں کے مسلمان آرام پسند تھے۔ نیز وہاں کی اکثریت ہندو تھی جو اِسلام کے نام پر شروع کی گئی اس تحریک کی مخالفت کرتی اور اس مسلح جہاد کے خلاف حکومت ہی کی ہمنوا بنتی۔ اُفغانستان کے غیور عوام چوں کہ پہلے ہی مغل حکمرانوں سے نالاں تھے، اس لیے یہ امید تھی کہ وہ مذہبی غیرت وحمیت کے عنوان سے اکبر کے خلاف تحریک جہاد کا بھرپور ساتھ دیں گے۔

<u>تحریک کا آغاز:</u> صلاح مشوروں کے بعد آخر کار شیخ بایزید رحمہ اللہ نے مغل حکومت کے خلاف ان علاقوں میں جو آج کل صوبہ سرحد اور مشرقی اُفغانستان کا حصہ ہیں تحریک جہاد کا آغاز کر دیا۔ ان کی روحانیت، تقویٰ، علمی کارناموں اور شجاعت کا ہر طرف شہرہ ہو چکا تھا۔ اُفغان عوام جوق در جوق ان کے گرد جمع ہو گئے۔ بیت المال قائم کر دیا گیا جس سے مجاہدین کے لیے اسلحہ اور راشن کا انتظام کیا جانے لگا۔ اس سے غریبوں اور مسکینوں کے لیے رفاہی کاموں کا آغاز بھی کر دیا گیا۔ پختون قبائل میں اس وقت یوسف زئی قبیلے نے بھی اس تحریک میں شمولیت اختیار کر لی اور سالانہ عشر اور خراج کی رقم بیت المال میں جمع کرانے لگے۔

شیخ بایزید انصاری کی اس تحریک سے متاثر ہو کر پختون قبائل کے ایک بااثر رہنما ملا درویزہ نے بھی اکبر کی حکومت کے خلاف مہم کا آغاز کر دیا اور اپنا حلقہ پشاور تک وسیع کر لیا۔ مغل حکومت اس صورت حال سے بے خبر نہ تھی۔ عوام کو شیخ بایزید انصاری کے گرد جمع ہوتے دیکھ کر کابل کے مغل حاکم نے شیخ کو

گرفتار کرلیا اور ان کو سخت تکالیف کا نشانہ بنایا۔ کچھ عرصے بعد حکام نے یہ خیال کر کے کہ ان کا حوصلہ ٹوٹ چکا ہے اور یہ تحریک ختم ہوگئی ہے، انہیں رہا کردیا مگر رہائی پاتے ہی شیخ نے اپنا کام پھر سے شروع کردیا۔ وہ کابل کے مشرق کی جانب نکل گئے اور ''تیراہ'' کے علاقے کو مرکز بنا کر رضا کاروں کی مسلح تربیت شروع کردی۔ کچھ ہی عرصے میں انہوں نے سینکڑوں مجاہد تیار کرلیے۔

شیخ بایزید اچھی طرح جانتے تھے کہ اس مختصر سی طاقت سے اکبر کی لاکھوں پیشہ ور سپاہیوں پر مشتمل افواج کو شکست نہیں دی جاسکتی تاہم وہ مطمئن تھے کہ اس طرح قوم کے سامنے قربانی دینے والوں کا ایک عملی نمونہ تو آجائے گا اور تحریکِ جہاد کی دعوت ہر طرف پھیل جائے گی۔ اپنی تحریروں میں بھی وہ عوام کو دعوت جہاد دیتے رہے، اپنی تصنیف مخزن الاسلام میں وہ تحریر فرماتے ہیں: ''میں لشکر تیار کر رہا ہوں تاکہ سلطنتِ ہند کو شکست دوں۔ ہر وہ شخص جس کے پاس گھوڑا ہے میرے پاس چلا آئے۔''

مشرقی افغانستان سے مغل حکام کو بے دخل کرنے کے لیے انہوں نے پہلا بڑا حملہ جلال آباد پر کیا اور وہاں قبضہ کرلیا۔ کابل کے حاکم محسن خان کو یہ خبر ملی تو وہ ایک بڑی فوج لے کر ان کے مقابلے پر آیا۔

''شنوار'' کا معرکہ اور شیخ کی شہادت: 1579ء میں ''شنوار'' کے میدان میں مٹھی بھر مجاہدین اور سرکاری فوجوں میں زبردست لڑائی ہوئی جس میں شیخ بایزید انصاری شہید ہوگئے۔ ان کی نعش پشاور کے محلے ہشت نگر میں دفن کی گئی۔ شیخ بایزید قبائل میں ''پیر روشن'' کے لقب سے مشہور تھے، اس لیے ان کے پیروکار روشانی کہلاتے تھے۔ ان کی تحریک بھی ''تحریک روشانیان'' کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ وہ خود تو اکبری حکومت کو کوئی بڑا دھچکا نہ پہنچا سکے مگر ان کے جانشینوں نے سولہویں صدی عیسوی میں شروع کی گئی اس تحریک کو سترہویں صدی عیسوی کے اواخر تک جاری رکھا اور مغل حکومت کے لیے دردِ سر بنے رہے۔

شیخ بایزید کے وارث: شیخ بایزید انصاری کی شہادت کے بعد مجاہدین کی قیادت کی ذمہ داری ان کے بیٹے جلال الدین انصاری نے سنبھال لی۔ شیخ جلال الدین اپنے باپ کی طرح دلیر، نڈر اور قائدانہ صفات سے مالا مال تھے۔ انہوں نے مجاہدین کی بھرتی کے کام کو مزید وسعت دی اور ان کی تربیت کو زیادہ منظم کیا۔ جلد ہی ان کے پاس 20 ہزار پیادوں اور 5 ہزار گھڑسواروں کا ایک لشکر تیار ہوگیا جسے لے کر وہ پشاور پر حملہ آور ہوئے اور اکبر کی طرف سے مقرر کردہ وہاں کے گورنر حامد خان بخاری کو قتل کردیا۔ یہ واقعہ اکبر کے غرور و تکبر پر ایک تازیانے سے کم نہ تھا چنانچہ وہ بلبلا اُٹھا اور شیخ جلال الدین کی سرکوبی کے لیے اس نے یکے بعد دیگرے کئی لشکر خیبر کے پہاڑوں کی طرف روانہ کیے۔ اکبر کے نامور امراء مان سنگھ، شمس الدین خانی اور ''زین خان کوکہ'' ان لشکروں کے سالار تھے۔

1585ء اور 1586ء کے دو سال ان خونریز جنگوں میں گزرے۔ مغل افواج ایک سیلاب کی طرح امنڈتی رہیں۔ مجاہدین ان کی بہ نسبت بہت کم تھے پھر بھی لڑتے رہے۔ یوسف زئی، مہمند اور غوریہ خیل قبائل جہاد کی اس تحریک میں شیخ جلال الدین کا بھرپور ساتھ دے رہے تھے۔ چونکہ یہ جنگیں کھلے میدانوں میں صف بندی کے ساتھ لڑی جارہی تھیں اس لیے مغل افواج کا پلہ بھاری رہا اور آخر کار اکبری افواج نے ایک جنگ میں مجاہدین کی مزاحمت کا زور توڑ دیا۔ مجاہدین پسپا ہوگئے، شیخ جلال الدین سوات کی طرف نکل گئے، مغل فوجوں نے ان کے تعاقب میں سوات اور باجوڑ کو کھنگال ڈالا مگر ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔

ایک طویل عرصے تک شیخ جلال الدین کا کچھ پتہ نہ چلا۔ مغل حکومت مطمئن تھی کہ ان کا کام تمام ہوگیا ہے اور پیر روشن کی تحریک جہاد ختم ہوگئی ہے۔ مگر عوام اس پر یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شیخ جلال الدین مغلوں سے چھپ کر ایک عظیم لشکر کی تیاری میں مصروف ہیں۔ جونہی وہ لشکر تیار ہوگا، شیخ جلال الدین منظر عام پر آکر حکومت کا تختہ اُلٹ دیں گے۔ لیکن شیخ جلال الدین کوئی بڑا لشکر تیار نہیں کر رہے تھے، حالات ان کے مخالف ہو چکے تھے۔ حکومتی ایجنٹ لوگوں کو مال وزر کے ذریعے خرید رہے تھے۔ بہرکیف شیخ جلال الدین روپوشی کی اس مسافرانہ زندگی میں بھی مایوس نہیں تھے۔ ہندوستان اور افغانستان کو اکبر کی لادینیت سے بچانے کے لیے وہ تحریکِ جہاد کو ایک نیا رخ دینے پر مسلسل غور وفکر کر رہے تھے۔

وہ جان چکے تھے کہ مغل افواج کی عظیم طاقت کو کھلے میدانوں میں چیلنج کر کے برابر کی سطح پر جواب دینا ان کے بس کی بات نہیں، اس کے لیے کوئی راستہ نکالا جانا چاہیے۔ بڑے غور وفکر اور مشوروں کے بعد انہوں نے جنگ کا وہ انوکھا طریقہ کار پسند کیا جو دورِ حاضر میں ہر ظالم کے خلاف مظلوموں کی مزاحمت کا مقبول ترین انداز بن گیا ہے اور جس کے ذریعے آج کشمیر، عراق، فلسطین اور افغانستان میں مٹھی بھر مسلم جاں باز، دشمنوں کی بڑی بڑی افواج کو ناکوں چنے چبوا رہے ہیں۔ شیخ جلال الدین نے میدان میں آمنے سامنے کی جنگوں کو بڑے لشکر کی تیاری تک مؤخر کر کے گوریلا جنگ کا طریقہ کار اختیار کیا۔ اس جنگی پالیسی کے ساتھ وہ چار سال بعد دوبارہ نمودار ہوئے اور افغانستان کے پہاڑوں کو اکبری افواج کے لیے مقتل بنادیا۔ اکبر کے امراء جعفر بیگ، قاسم خان اور آصف خان، شیخ کے مقابلے سے عاجز آگئے تھے تاہم ایک موقع پر وہ ان کے خاندان کو نرغے میں لینے میں کامیاب ہوگئے اور ان کے بھائیوں کمال الدین اور واحد علی کو گرفتار کرلیا۔ مغل حکومت نے اس کے ساتھ ساتھ سیاسی چالیں بھی چلیں، جوڑ توڑ کر کے قبائل کے بہت سے عمائد، اکابر اور علماء کو شیخ جلال الدین کے خلاف کھڑا کردیا گیا۔

اکبری افواج کی رسوا کن شکست: 1592ء میں شیخ جلال الدین نے یہ محسوس کیا کہ گوریلا جنگ کے

علاوہ مغل افواج پر ایک ایسی کاری ضرب لگانا ضروری ہے جس سے دہلی کا مرکز ہل کر رہ جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ساری قوت جمع کر کے مغل لشکر کو جو اکبر کے مشہور ترین راجا بیربل کی قیادت میں چلا آ رہا تھا، باجوڑ کے قریب گھیر لیا۔ مغل سپاہیوں کو کہیں جائے پناہ نہ ملی اور ان کے 40 ہزار افراد بیک وقت مجاہدین کے ہاتھوں فنا کے گھاٹ اتر گئے۔ اس بڑی کامیابی کے بعد سرحد و افغانستان میں ''دین اکبری'' کا جھنڈا سرنگوں ہو گیا اور دربار دہلی کا افغانستان میں اپنے نائبین سے رابطہ ختم ہو گیا۔ درۂ خیبر پر مجاہدین کا قبضہ تھا اور آمد و رفت مسدود کر دی گئی تھی۔

غزنی کا معرکہ اور شیخ جلال الدین کی شہادت: پانچ سال بعد اکبر نے ایک زبردست فوج بھیج کر درۂ خیبر پر قبضہ کر لیا اور افغانستان کا راستہ کھلوانے کی کوشش کی۔ اس موقع پر مجاہدین اور مغل افواج کا غزنی کے محاذ پر زبردست معرکہ ہوا۔ ممکن تھا کہ مجاہدین جیت جائیں مگر شیخ جلال الدین مغلوں کے ایک حملے میں شدید زخمی ہو گئے اور اسی حالت میں دشمنوں نے انہیں گرفتار کر لیا۔ چونکہ انہیں کسی رعایت کے بغیر فوراً قتل کر دینے کے احکام جاری کر دیے گئے تھے اس لیے انہیں اسی وقت شہید کر دیا گیا اور ان کا کٹا ہوا سر دہلی بھیج دیا گیا۔

یہ 1598ء کا واقعہ ہے، جب شیخ کا سر اکبر کے دربار میں لایا گیا تو اسے دیکھ کر اکبر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سر سے کوئی بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔ اس کے سامنے اب مقابلے پر کھڑا ہونے والا کوئی نہ تھا۔ افغانستان کے شیر کا کٹا ہوا سر اس کے سامنے پڑا ہوا تھا۔

شیخ جلال الدین کا وارث، احداد: تاہم اکبر کا سکون عارضی ثابت ہوا۔ شیخ جلال الدین کے بعد ان کے پیروکاروں نے شیخ کے بھتیجے ''احداد'' کو اپنا رہنما بنا لیا۔ اُدھر دہلی میں اکبر کا انتقال ہو گیا اور جہانگیر نے حکومت سنبھال لی۔ احداد بڑا جنگجو اور غیور انسان تھا، اس نے انتہائی ناموافق حالات میں 27 سال تک اسلام کی سربلندی اور افغانستان کی آزادی کی جنگ لڑی۔ اس کی ساری زندگی کامیابیوں اور ناکامیوں کے نشیب و فراز میں دوڑتے گزری۔ 1610ء میں اس نے کابل پر ایک بڑا حملہ کر کے مغل حکومت کے ہوش اڑا دیے۔ کابل پر قبضے کے بعد اس نے لوگر کو اپنا مرکز بنایا اور مغل افواج کے لیے دردِ سر بن گیا۔

1614ء کے ایک ہی معرکے میں اس نے 3 ہزار مغل سپاہیوں کو مار ڈالا۔ اس کے ساتھ افرادی قوت کم تھی جس کے باعث وہ زیادہ عرصہ ایک جگہ جم نہ سکتا تھا اس لیے کچھ عرصہ قندھار میں گزارا پھر مشرقی افغانستان کے پہاڑوں میں ڈیرا ڈال دیا۔ یہاں قلعہ ''واغر'' اس کا مرکز تھا۔ مغل افواج جو مسلسل اس کا تعاقب کر رہی تھیں، 1625ء میں کہسار ''تیراہ'' میں اسے گھیرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ ایک زبردست لڑائی کے بعد ''احداد'' اپنے مذہب اور وطن پر نثار ہو گیا۔ قلعہ ''واغر'' پر مغل قابض ہو گئے۔ اس کے اہلِ

خاندان پہاڑوں کے پیچ وخم میں روپوش ہو گئے تاہم اس کی ایک بیٹی پیچھے قلعے ہی میں رہ گئی۔ جب اس نے خود کو دشمن کے نرغے میں دیکھا تو آنکھوں پر پٹی باندھ کر قلعے کی بلند فصیل سے کود گئی تا کہ دشمن کے ہاتھ نہ آئے۔ اس طرح اس نے اپنی جان قربان کر کے قید و بند کی ذلت سے نجات حاصل کر لی۔ مغلوں نے ''احداد'' کی لاش پر جشن منایا اور اس کا سر کاٹ کر جہانگیر کے دربار میں بھیج دیا۔

تحریکِ جہاد سے تحریکِ آزادی تک: احداد کے بعد روشانی تحریک کی قیادت کا بوجھ احداد کے بیٹے عبدالقادر کے کاندھوں پر آ پڑا۔ اکبر کی بے دینی اور الحاد کے خلاف جہاد کا علم بلند کرنے والی یہ تحریک اب علاقائی آزادی کی جدوجہد بن گئی تھی کیونکہ ہندوستان میں مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی جرأت واستقامت اور دعوت وعزیمت کے نتیجے میں اکبر کی پھیلائی ہوئی بے دینی کا سیلاب تھم گیا تھا اکبر کی موت کے ساتھ ہی یہ الحادی فلسفہ اپنی موت آپ مر گیا تھا۔ اکبر کے بعد جہانگیر کے دور میں مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک نے امرائے سلطنت کے افکار واذہان تبدیل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی جس کے نتیجے میں جہانگیر کے جانشین شاہ جہاں کے دور میں دینی شعائر کو بتدریج ترقی ہونے لگی تھی۔ ان حالات میں اس دور کے اکثر علماء کے نزدیک سلطنتِ ہند سے جو کہ ایشیا کے بہت بڑے رقبے پر مسلمانوں کی وحدت کی علامت تھی، آزادی حاصل کرنے کی تحریک پر اسلامی جہاد کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا۔

بہرکیف اکبر کی اِسلام دشمنی نے افغانوں کے دلوں میں مغل حکومت سے نفرت کا جو شعلہ بھڑکایا تھا اسے جہانگیر کی سیاست اور شاہ جہاں کا مذہبی اور تعمیراتی ذوق بھی نہ بجھا سکا...... اور وہ اپنی آزادی کے لیے کوشاں رہے۔ عبدالقادر نے شاہ جہاں کے دور میں تحریک کی زمام سنبھالنے کے بعد 1627ء میں مغل افواج کو ایک بڑی شکست دی۔ انہی دنوں پشاور میں کمال الدین نامی ایک اور دلیر لیڈر افغانستان کی آزادی کی جنگ میں کود پڑا تھا۔ اس کے مقام اور تجربے کے پیشِ نظر عبدالقادر اپنے ساتھیوں سمیت اس سے جا ملا۔ تاہم یہ دونوں رہنما مل کر بھی شاہ جہاں کی ریاستی طاقت پر غالب نہ آ سکے۔

عبدالقادر کی خود سپردگی: کچھ عرصہ گزرنے پر عبدالقادر کو یہ محسوس ہونے لگا کہ اب ''جہاد'' کے نام سے جاری یہ تحریک محض مسلمانوں کی خانہ جنگی بن کر رہ گئی ہے۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی کاوشوں سے مغل حکومت میں ہونے والی اصلاحات کے بعد شاہ جہاں کے خلاف تلوار اُٹھانے کی کوئی معقول وجہ نہیں رہی۔ عوام بھی اب پہلے کی طرح جوش وخروش سے تحریک میں حصہ نہیں لے رہے تھے۔

حالات کے ان پہلوؤں پر غور کر کے عبدالقادر نے 1634ء میں مغل حاکم سعید خان کے سامنے ہتھیار ڈال کر خود کو دربارِ دہلی میں پیش کر دیا۔ عبدالقادر کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد تحریک گویا ختم

ہوگئی تھی مگر شاہ جہاں اس موقع پر یہ سوچ کر کہ 60 برس تک جاری رہنے والی یہ تحریک عبدالقادر کے آل اولاد کی سرپرستی میں دوبارہ سر نہ اُٹھالے، اس خاندان کو مکمل طور پر ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کرلیا۔

عبدالقادر کا بیٹا کریم داد سرحدی علاقوں میں اورکزئی اور آفریدی قبائل کے زعماء سے مل کر سلطنت ہند سے اچھے تعلقات استوار کرنے کے لیے صلاح ومشورہ کررہا تھا کہ مغل افواج نے حملہ کرکے اسے اس کے تمام خاندان سمیت گرفتار کرلیا۔ کریم داد کو پشاور لے جاکر قتل کردیا گیا جبکہ اس کے خاندان کے بقیہ تمام افراد جن میں بچے اور خواتین بھی شامل تھے، تمام عمر حکومت کی نگرانی میں رہے۔ اس طرح ''روشانی تحریک'' کے نام سے شروع ہونے والی اَفغانستان کی خودمختاری کی پہلی مؤثر تحریک ختم ہوگئی۔

اورنگزیب عالمگیر کے دور میں: شاہ جہاں کے بعد اورنگزیب عالمگیر جیسے باعظمت، پابندِ شریعت، علم دوست اور اقبال مند فرمانروا نے تختِ دہلی کو رونق بخشی۔ اورنگزیب کے 50 سالہ دورِ حکومت کو ہندوستان کے اِسلامی تاریخ کا عہدِ زریں کہا جاتا ہے۔ 1657ء میں اقتدار حاصل کرتے ہی اس نے پوری سلطنت میں شرعی احکام کو زندہ اور رسومات بد کو ختم کرڈالا۔ ظلم کو مٹایا اور عدل وانصاف کا بول بالا کیا۔ اس کی سیاست، تدبر، عالی ہمتی اور عسکری امور میں مہارت کے باعث ہندوستان کی سرحدیں ان علاقوں تک جاپہنچیں جنہیں اس کے آباؤاجداد بھی ختم نہ کرسکے تھے۔ بڑے بڑے مخالفین اس کے سامنے سرنگوں ہوتے چلے گئے اور کوئی اس کا جم کر مقابلہ نہ کرسکا۔ مگر اس کی زندگی میں ایک ایسا کانٹا تھا جو سالہاسال تک اس کے لیے سوہانِ روح بنا رہا۔ یہ سرحدی قبائل کی جانب سے 30 سالہ خاموشی کے بعد ایک بار پھر مغل حکومت کے خلاف جنگ کا اعلان تھا جس کا آغاز یوسف زئی قبیلے نے کیا۔ اس قبیلے نے آخر دم تک مغلوں کے خلاف جنگ جاری رکھی۔ یہ محاذ سیاستِ عالمگیری کے لیے مشکل ترین مسئلہ بنا رہا۔

نئی تحریک کا آغاز: دراصل اورنگ زیب کی دیگر مہمات نے اسے پختون علاقوں کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال اور وہاں کے عوام کے احساسِ محرومی کی تلافی کا موقع نہ دیا نتیجہ یہ نکلا کہ یوسف زئی قبیلے کے سردار ''باکو خان'' اور خٹک قبیلے کے ''اخوند چالاک خٹک'' نے علم بغاوت بلند کردیا۔ بونیر اور نوشہرہ سے لے کر زابل تک مغل حکومت کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں اور اَفغان عوام کی آزادی کا نعرہ ہر طرف گونجنے لگا۔ قومیت کے جذبے نے اَفغان قبائل میں ایک آگ سی لگادی تھی۔ اب اس طوفان کو روکنا اس مغل حکمران کے لیے سب سے بڑا چیلنج بن گیا تھا جس کی جرأت، سیاست اور فراست نے ہر محاذ پر کامیابیاں حاصل کی تھیں۔

رہنماؤں کا قتل: اورنگ زیب نے مخالف قبائل کی سرکوبی کے لیے تلوار سونت لی اور اپنے بہترین افسران کو قبائلیوں سے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ باکو خان، یوسف زئی اور چالاک خان خٹک نے سرکاری افواج کے

خلاف کئی سخت معرکوں میں بہادری کے جوہر دکھائے اور آخر کار لڑتے بھڑتے قتل ہو گئے۔ اس دوران ایک اور پختون سردار ایمل خان آفریدی قبائل کے علاقے میں ہتھیار اُٹھا چکا تھا۔ اس کی ہمت کا یہ عالم تھا کہ اس نے 1668ء میں کابل کو مغل اہلکاروں سے چھین لیا، تاہم اس کا انجام بھی اپنے ساتھیوں سے مختلف نہ ہوا اور اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ یکے بعد دیگرے مختلف رہنماؤں کی گرفتاری اور قتل کے بعد ممکن تھا کہ یہ تحریک جس تیزی سے ابھری تھی اسی تیزی سے ختم ہو جاتی مگر اس موقع پر افغانوں کی تحریک آزادی کا مقبول ترین رہنما خوشحال خان خٹک آگے آیا اور مغلوں کے خلاف مہمات کی قیادت کرنے لگا۔

خوشحال خان خٹک۔ اکوڑہ خٹک کا شاہین: خوشحال خان خٹک نے 1022ھ (1613ء) میں اکوڑہ خٹک کے قصبے میں جنم لیا۔ یہ قصبہ پٹھانوں کے مشہور سردار ''ملک اکوڑی'' کے نام سے موسوم ہے جسے مغل بادشاہوں کی جانب سے اس علاقے کا نگران مقرر کیا گیا تھا۔ ''ملک اکوڑی'' کے بعد جہانگیر اور شاہ جہاں کے زمانے میں اس کی اولاد اسی عہدے پر برقرار رہی۔ خوشحال خان خٹک اسی ملک اکوڑی کے پوتے شاہباز خان کا بیٹا تھا۔ شاہ جہاں کے دورِ حکومت میں شاہباز خان قبائل کی باہمی جنگ میں قتل ہوا تو خوشحال خان خٹک نے اس کی جگہ سنبھال لی۔ یہ شوال 1050ھ (جنوری 1641ء) کا واقعہ ہے۔ اس وقت وہ 28 سال کا ایک پر جوش اور امنگوں بھرا نوجوان تھا۔ اسے علم و فضل اور شعر و ادب سے بھی وافر حصہ ملا تھا۔ اپنی ان خداداد صلاحیتوں کو وہ پورے اخلاص کے ساتھ مغل سلطنت کی ترقی اور استحکام کے لیے استعمال کرنے لگا۔ وہ سابق حکمران جہانگیر اور اپنے موجودہ ولی نعمت، شاہ جہاں کا مداح تھا اور ان کی تعریف میں اس کے اشعار جا بجا ملتے ہیں۔ ایک طویل عرصے تک وہ مغل حکومت کی خدمات میں مشغول رہا۔ قبائلی علاقوں کا نگران ہونے کے باوجود وہ مرکز دہلی کے ایک بلاوے پر فوراً وہاں جا پہنچتا اور بادشاہ کے حکم پر ہر مشکل سے مشکل مہم کے لیے سر ہتھیلی پر رکھ کر روانہ ہو جاتا۔

اپنے والد کی جانشینی کے بعد 8 سال تک کا عرصہ اس نے مرکزی حکومت کی فوجی مہمات انجام دینے کے لیے ہندوستان میں گزارا۔ مارچ 1642ء میں اس نے کانگڑہ کے راجہ جگت سنگھ کے خلاف مہم میں شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ''تارا گڑھ'' کا مستحکم قلعہ فتح کیا۔ 1055ھ (1645ء) میں مرکز کی ہدایت پر اس نے وسطی افغانستان میں اندراب اور ہندوکش کے پہاڑوں میں ڈیرے ڈال دیے جہاں باغی عناصر پرورش پا رہے تھے۔ اس کی کوششوں سے یہاں امن و امان کی فضا لوٹ آئی۔ اس سے اگلے برس شاہ جہاں نے بدخشاں اور بلخ کے مخالفین کی سرکوبی کے لیے چڑھائی کی۔ خوشحال خان نے بادشاہ کے ہمراہ رہ کر اس موقع پر بھی قابل تحسین کارکردگی دکھائی۔ ان کارناموں کی بنا پر شاہ جہاں اسے

بہت پسند کرتا تھا اور اس کے علم وفضل، فنون حرب میں مہارت اور سیاسی رمز شناسی کو سراہتا تھا۔

مگر خوشحال خان کے مغل سلطنت سے یہ خوشگوار تعلقات اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں ختم ہو گئے۔ جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں اس زمانے میں قبائلی علاقوں میں مغل سلطنت کے خلاف تحریک شروع ہو چکی تھی جسے مغل افواج طاقت کے بل بوتے پر کچلنا چاہتی تھی۔ مغل حکومت کا وفادار ملازم ہونے کی حیثیت سے خوشحال خان خٹک حکومت کے مخالفین کی سرکوبی پر مامور تھا۔ دوسری طرف پٹھان ہونے کے ناتے وہ خود کو اپنی قوم سے الگ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے گفت وشنید، مذاکرات اور صلح وصفائی کے ساتھ اس معاملے کو سلجھانے کی بڑی کوشش کی مگر معاملہ الجھتا ہی چلا گیا۔ اس نے قبائل کو حکومت کے خلاف تلوار اٹھانے سے روکنے کے لیے ہر ممکن تدبیر کی۔ دوسری طرف اس نے حکومت کو سمجھایا کہ اس مسئلے کے لیے طاقت کا استعمال مناسب نہیں، لیکن یہ کوشش رائیگاں گئی۔ آزادی پسند افراد مسلح تحریک سے باز آئے نہ حکومت نے اپنی پالیسی نرم کی۔

خوشحال خان کی آخری کوشش یہ تھی کہ وہ مغلوں اور قبائل کے درمیان ثالث بن جائے اور دونوں فریق اس کے فیصلے کے مطابق صلح کر لیں...... ایسا بھی نہ ہو سکا...... دراصل عالمگیر کے دربار میں خوشحال خان سے حسد کرنے والے امراء موجود تھے جو یہ شکوک پھیلا رہے تھے کہ خوشحال خان یہ سب کچھ اپنی سیاست چمکانے کے لیے کر رہا ہے اور حکومت کو قبائل سے مرعوب کر کے اس کے وقار اور سالمیت کو بٹہ لگانا چاہتا ہے۔

گرفتاری اور رہائی: اس زمانے میں افغانستان اور سرحدی قبائل کا گورنر مہابت خان تھا جو خوشحال خان کی خوبیوں اور وفاداری کا قائل تھا۔ ممکن تھا کہ اس کی موجودگی میں خوشحال خان اور مغل حکومت کے درمیان اعتماد کا رشتہ اتنی جلد نہ ٹوٹتا مگر 1661ء میں اس کا تبادلہ ہو گیا۔ اس کی جگہ امیر خان کا تقرر ہوا جو خوشحال خان کا مخالف تھا۔ پشاور کا امیر مرزا عبدالرحیم بھی اس سے بغض رکھتا تھا۔ ان دونوں عہدے داروں نے عالمگیر کو مسلسل شکایات بھیجنا شروع کیں اور مرکزی حکومت پر زور دیا کہ اس نااہل قبائلی سردار سے تمام اختیارات واپس لیے جائیں۔ چنانچہ مرکز کی جانب سے رفتہ رفتہ خوشحال خان سے تمام اعزازات، مراعات اور اختیارات واپس لے لیے گئے اور آخر کار حاسدین نے بغاوت کے جھوٹے مقدمے میں ملوث کرا کے اسے گرفتار کرا دیا۔

اسے ہندوستان لے جایا گیا اور گوالیار کے قلعے میں کئی برس تک قید رکھا گیا۔ قید وبند کی جسمانی اذیتوں سے زیادہ خوشحال خان کو یہ ذہنی اذیت پہنچی کہ اس کی جانب سے مغل حکومت کی سالمیت، ملک وملت کی بلند اقبالی اور اسلامی برادری کی یک جہتی کے لیے کی گئی کاوشوں کو "غداری" قرار دے دیا گیا

ہے۔ زمانہ قید میں خوشحال خان نے جو دردناک اشعار کہے ہیں وہ اس کے کلام کا سب سے پرسوز حصہ ہیں۔ اہلِ وطن سے جدائی اور آزادی کی نعمت سے محرومی پر اس نے 4 رجب 1077ھ (یکم جنوری 1667ء) کو ''حبس نامہ'' کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھی جو دوسوبیس اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ اس کی شاہکار نظم ہے۔ قید کے دوران اپنے چند شعروں میں وہ کہتا ہے:

''میں ناحق اورنگ زیب کی قید میں ہوں...... خدا گواہ ہے......

میں صرف جھوٹے الزامات کے باعث عتاب کا نشانہ بنا ہوں......

خدا کو حاضر وناظر جان کر کہتا ہوں......

مجھے اپنا کوئی گناہ یا خطا معلوم نہیں لیکن......

لوگ کیسی کیسی باتیں بنا رہے ہیں......

شاید میری قابلیت اور بصیرت ہی میرے لیے مصیبت بنی ہے......

جس امانت داری اور خلوص سے میں نے مغلوں کی خدمت کی......

اَفغانوں میں کوئی دوسرا نہیں جو اس جیسی مثال پیش کرسکے......''

خوشحال خان خٹک کی اس طویل قید کے دوران قبائل میں حکومت کی مخالفت زور پکڑ رہی تھی، خوشحال خان خٹک جیسے مقبول رہنما کی گرفتاری نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا تھا...... تاہم گوالیار کے قلعے میں محبوس یہ خٹک سرداران تمام سرگرمیوں سے لاتعلق تھا۔ وہ قید ہی میں تھا کہ باکوخان، چالاک خان خٹک اور ایمل خان حکومت کے مقابلے کے لیے اٹھے اور قتل کردیئے گئے۔ مغل صوبے دار امین خان نے ایسے تمام مخالفین کو ٹھکانے لگادیا اور بظاہر شورش کا خاتمہ ہوگیا۔ اگر بغاوت کی اس تحریک میں خوشحال خان کا عمل دخل یا باغی رہنماؤں سے اس کا تعلق ثابت ہوجاتا تو کوئی بعید نہ تھا کہ دیگر باغی رہنماؤں کی طرح اسے بھی قتل کردیا جاتا مگر زمانہ قید میں اس کے خلاف تحقیقات سے ایسی کوئی بات ثابت نہ ہوسکی لہٰذا حکومت اسے رہا کرنے پر غور کرنے لگی۔

حالات پرامن دیکھ کر 1079ء (1668ء) میں خوشحال خان خٹک کو رہا کردیا گیا۔ ویسے بھی اس پر کوئی الزام ثابت نہیں ہوسکا تھا اس لیے حکومت کے پاس اسے محبوس رکھنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

خوشحال خان خٹک ایک بار پھر اکوڑہ خٹک کے بلند میدانی علاقے میں آگیا۔ لوگوں نے اس کا پرجوش استقبال کیا۔ مادرِوطن کی پُرکیف فضا نے اس کے جسم کو چھوا تو اس نے اپنے اندر ایک نئی توانائی محسوس کی۔

خودمختاری کی جدوجہد کا آغاز: اب وہ ایک فیصلہ کرچکا تھا...... ایک ایسا فیصلہ جس کا چند برس پہلے

تصور بھی نہیں کر سکتا تھا...... مغلوں سے آزادی حاصل کرنا اب اس کی زندگی کا پہلا اور آخری مقصد تھا ...... وہ اپنے اس عزم کا برملا اظہار کرنے لگا۔ جنگجو قبائل اس کی بہادری، مردانگی اور علم و فضل کے گرویدہ تھے۔ وہ اس کے خیالات سے تیزی سے متاثر ہونے لگے۔ مغلوں کے خلاف مسلح جدوجہد کا جذبہ ایک بار پھر پروان چڑھنے لگا۔ خوشحال خان خٹک کی جوانی کا بھرپور دور مغلوں کی قید و بند کی تکالیف نے نگل لیا اور اب عمر کی 55 بہاریں دیکھنے کے بعد اس میں پہلی جیسی طاقت اور توانائی نہیں رہی تھی مگر اس کا عزم جواں تھا۔ اَفغان قبائل میں اسے بزرگ کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ قوم کے درد میں ڈوبے ہوئے اشعار اس کی زبان و قلم سے نکلتے اور دیکھتے ہی دیکھتے خیبر سے کابل تک ہر محفل کی جان بن جاتے۔ اس کا ہر شعر اَفغانوں کو حریت اور جاں نثاری کا سبق دے رہا تھا۔

خوشحال خان خٹک کی رہائی کے چوتھے سال 1672ء میں درہ خیبر کے آس پاس بسنے والے قبائل کے سردار اکمل خان نے مغلوں کے خلاف از سرِ نو جنگ کا آغاز کر دیا۔ اس نے درۂ خیبر کا راستہ بند کر کے دہلی اور کابل کے مابین سرکاری اہلکاروں کی آمد و رفت منقطع کر دی اور حکومتی عملے کو علاقے سے مار بھگایا۔ اورنگ زیب عالمگیر نے اَفغان قبائل میں علیحدگی کی اس نئی تحریک کو عظیم مغل سلطنت کی سالمیت کے لیے سخت نقصان دہ سمجھتے ہوئے اس کے سدباب کے لیے افواج کو متحرک کیا۔ یکم مئی 1672ء کو مغل افواج نے اپنے سپہ سالار آغر خان کی قیادت میں ''علی مسجد'' نامی ایک مقام کے نزدیک اکمل خان کے حامیوں سے مقابلہ کیا۔ زبردست کشت و خون کے بعد اکمل خان نے مغل افواج کو شکست فاش دے دی۔

خوشحال خان خٹک آزادی کی اس تحریک میں روحِ رواں کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ اس کی تلوار اور قلم کا کمال تھا کہ بے سرو سامان قبائل نے ہمیشہ پیشہ ور سپاہیوں سے میدانِ جنگ میں دو بدو مقابلہ کر کے انہیں پسپا کر دیا۔ اگلے دو برس تک خوشحال خان خٹک کی تلوار مسلسل بے نیام رہی۔ نوشہرہ، ردابہ اور کڑیہ میں ہر جگہ اس نے مغلوں کو شکست دے کر سلطنت دہلی کا وقار خطرے میں ڈال دیا۔ آخر کار مرکز کی طرف سے اس کے مقابلے میں ایک بڑا لشکر بھیجا گیا۔ خوشحال خان پختون قبائل کے پُر جوش نوجوانوں کا ریلا لے کر کڑیہ کے مقام پر ان سے نبرد آزما ہوا۔ 2 مارچ 1674ء کو دونوں فریقوں میں ایک انتہائی خونریز جنگ ہوئی جس میں آزادی کے متوالوں نے شاہی افواج کو بدترین شکست سے دوچار کیا۔ سلطنتِ ہند کے عظیم فرمانروا اورنگزیب عالمگیر کے دورِ اقتدار میں اس سے زیادہ کٹھن موقع شاید پہلے کبھی نہ آیا تھا۔ خطرہ یہ تھا کہ اگر اَفغانستان کے علیحدگی پسندوں کو قابو نہ کیا جا سکا تو پورے ہندوستان میں ہندو راجے خود مختاری کے لیے پر تولنے لگیں گے۔ عالمگیر کے پاس اب اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ

مغلیہ سلطنت کے وقار کے تحفظ کے لیے خود خوشحال خان کے مقابلے پر نکلے۔شکست کی خبر کو سننے کے بعد عالمگیر نے ایک لمحہ بھی توقف نہ کیا۔اس نے اپنے بوڑھے بدن پر جنگ کا لباس سجایا اور ایک بڑی فوج کے ساتھ اُفغانستان کی طرف لپکا۔

عالمگیر حسن ابدال میں: 6 جولائی 1674ء کو یہ لشکر حسن ابدال پہنچا اور عالمگیر نے باغ حسن ابدال میں قیام کیا۔اس مقام کو فوج کا ہیڈ کوارٹر قرار دیا گیا کیونکہ آگے قبائلیوں کا راج تھا۔خوشحال خان عالمگیر کی دین پروری کے باعث اس کا بے حد احترام کرتا تھا مگر سیاسی زندگیوں میں بعض اوقات بہت محترم شخصیات کے بھی خلاف فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔خوشحال خان نے اس موقع پر کھلے میدان میں لڑنے سے زیادہ گوریلا کارروائیوں پر توجہ مرکوز رکھی۔یوسف زئی، مہمند اور غلزئی قبائل کے سردار اپنے اپنے جوانوں سمیت اس جنگ میں شریک تھے۔

حسن ابدال کے مرکز سے عالمگیر نے تمام شورش زدہ علاقوں کی طرف افواج روانہ کیں۔بے شمار معرکے پیش آئے، دونوں فریق بے تحاشا نقصانات کے باوجود ہار ماننے پر تیار نہ تھے۔اس سلسلے نے طول کھینچا۔قبائل ایک جگہ شکست کھا کر پسپا ہوتے تو دوسرے مقام پر مغلوں کو شدید زک پہنچا کر آناً فاناً پہاڑوں میں غائب ہو جاتے۔

خوشحال خان نے میدانی جنگ بھی لڑی اور 1086 (1675ء) میں ''خاپش'' اور ''گنپت'' کے محاذوں پر مغل لشکر کو کھلی شکست دی۔اورنگزیب عالمگیر تین سال تک تختِ دہلی سے سیکڑوں کوس دور حسن ابدال کے پہاڑ کے نیچے ایک خیمے میں بیٹھ کر اس مہم کی نگرانی کرتا رہا۔آخر کار اس کی استقامت رنگ لائی، اس کے ترک سپہ سالار آغر خان نے مہمند اور غلزئی قبائل کو کئی مقامات پر شکست دے کر انہیں مطیع بنالیا۔تحریک آزادی ایک بار پھر تھم گئی۔

تحریک کا زوال: حالات کو قابو میں دیکھ کر تین سال بعد اورنگزیب نے دہلی کی طرف کوچ کیا۔اس اعصاب شکن جنگ نے یہ واضح کر دیا تھا کہ مغل حکومت کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ پختون قبائل کو بزورِ قوت ہمیشہ دبائے رکھے۔ہاں! دل جوئی اور مدارات کے ذریعے ان کی نفرت کو کم کیا جا سکتا ہے۔اس دوران خوشحال خان خٹک پھر حرکت میں آ گیا تھا۔اس نے اپنی مسلح تحریک پھر شروع کر دی۔تاہم اس کے اکثر رفقاء لڑائی میں کام آ چکے تھے، اس لیے اب تحریک میں وہ دم خم نہ تھا۔ادھر عالمگیر نے بھی قبائل کے بارے میں نئی پالیسی پر عمل شروع کرتے ہوئے 1677ء میں امیر خان کو کابل کا صوبیدار مقرر کر دیا۔وہ ایک اچھا منتظم اور سیاست دان تھا۔عوام اس کے حسن انتظام سے متاثر ہوئے اور مغلوں کے

خلاف نفرت کا مادہ کم ہوتا گیا۔ اب خوشحال خان کے قریب ترین ساتھی بلکہ اس کے خاندان کے افراد بھی اس کی تحریک سے متفق نہ رہے حتیٰ کہ اس کے بیٹے اشرف خان اور بہرام خان اس کی کھلم کھلا مخالفت کرنے لگے۔ برسوں کی سخت ترین ریاضت، صدمات اور بے آرامی نے اس بوڑھے سپاہی کو نحیف ونزار کر دیا تھا۔ اپنی آل اولاد کی جانب سے مخالفت کے بعد اس کے لیے تحریک جاری رکھنا ممکن نہ رہا تھا۔ چنانچہ اس نے گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔

مجھے وہاں دفن کرنا: جمعہ 28 ربیع الثانی 1100ھ (19 فروری 1679ء) کو افغانوں کے اس عظیم سپوت نے 78 برس کی عمر میں دار فانی سے کوچ کیا۔ مرتے دم اس کی آخری وصیت یہ تھی:

''مجھے ایسی جگہ دفن کرنا جہاں مغلوں کے گھوڑوں کا غبار بھی نہ پہنچ سکے۔''

چنانچہ اس جانباز سپاہی کو ایک ویرانے میں دفن کر دیا گیا۔ اکوڑہ خٹک کے قصبے سے مغرب کی جانب چار میل دور ایسوڑی کے مقام پر ایک پہاڑ کے دامن میں اس کی قبر آج بھی مظلوموں کو آزادی اور حریت پسندی کا درس دیتی نظر آتی ہے۔ قبر کی لوح پر اس کا ایک شعر کندہ ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

''میں نے افغان قوم کی عزت و ناموس کے لیے تلوار کمر سے باندھی ہے۔ میں زمانے کا غیرت مند، دلیر اور باحمیت انسان 'خوشحال خان خٹک' ہوں۔''

خوشحال خان خٹک کی شاعری کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ اس کی تقریباً ایک سو نظموں کا انگریزی ترجمہ 1862ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک اس کے کلام کو دنیا کی کئی زبانوں میں منتقل کیا جا چکا ہے۔

ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم، خٹک کی شاعری سے بہت متاثر تھے۔ بالِ جبریل میں انہوں نے اس عظیم شاعر کی آخری وصیت کو اپنے الفاظ میں یوں ڈھالا ہے۔

قبائل ہوں ملّت کی وحدت میں گم — کہ ہو نام افغانیوں کا بلند
محبت مجھے ان جوانوں سے ہے — ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند
مغل سے کسی طرح کمتر نہیں — قہستاں کا یہ بچّۂ ارجمند
کہوں تجھ سے اے ہم نشیں دل کی بات — وہ مدفن ہے خوشحال خاں کو پسند
اڑا کر نہ لائے جہاں بادِ کوہ — مغل شہ سواروں کی گردِ سمند

مآخذ و مراجع

- ...... افغانستان در مسیرِ تاریخ، میر غلام محمد غبار
- ...... Encyclopedia of Islam.V.1
- ...... اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ناشر دانش گاہ، پنجاب یونی ورسٹی
- ...... تاریخ حسن ابدال، پروفیسر منظور الحق صدیقی
- ...... اسلامی انسائکلو پیڈیا، سید قاسم محمود
- ...... بالِ جبریل، علامہ محمد اقبال مرحوم

گیارھواں باب

اِیرانی اِقتدار کیخلاف تحریکِ آزادی اور خودمختار ''ہوتکی'' سلطنت کا قیام

اورنگ زیب عالمگیر کے تدبر، تدین، فراست اور اُفغان عوام سے حسن سلوک پر مشتمل پالیسی نے سرحدی قبائل اور مشرقی و وسطی اُفغانستان میں علیحدگی کی تحریک کو ٹھنڈا کر دیا اور وہاں حالات معمول پر آ گئے۔ تاہم جنوبی اُفغانستان جو ایران کے زیر تسلط تھا، ان دنوں شدید سیاسی اضطراب کا آئینہ دار تھا۔

ایران کی صفوی حکومت قندھار سمیت جنوبی و مغربی اُفغانستان کے بہت بڑے علاقے پر طویل عرصے سے قابض تھی اور اُفغان عوام سے اس کا سلوک متعصبانہ تھا۔ اس صورتحال میں اس وقت مزید شدت پیدا ہوگئی جب شاہ حسین صفوی نے 1494ء میں ایران کا اقتدار سنبھالنے کے بعد گرگین خان نامی ایک گرجستانی شخص کو جنوبی اُفغانستان کا گورنر بنا کر بھیج دیا۔ یہ پیشہ ور سپاہی امورِ سیاست سے بالکل ناواقف تھا۔ اس کے نزدیک ہر مسئلے کا واحد حل طاقت کا استعمال تھا، چنانچہ اس نے اُفغان عوام کا جینا دو بھر کر دیا۔ ان دنوں قندھار ہندوستان اور ایران کے درمیان سب سے بڑا تجارتی مرکز بن گیا تھا، اس لیے یہاں کی رونق اور آبادی میں خوب اضافہ ہو رہا تھا۔ یہاں کے بازار دنیا بھر کی تجارتی اشیاء سے بھرے رہتے تھے اور سامانِ تجارت سے لدے قافلے ہمہ وقت قندھار کے مسافر خانوں میں اترتے رہتے تھے۔ مگر اس کے باوجود مقامی لوگوں کی زندگی ایرانی حکومت کی طرف سے عائد کردہ ناقابل برداشت ٹیکسوں کی وجہ سے اجیرن تھی۔ انکی معاشی جدوجہد اور تجارتی سرگرمیوں کا سارا نفع حکومت ہڑپ کر جاتی تھی۔ ممکن تھا کہ وہ بہت پہلے حکومت کے خلاف بغاوت کر دیتے مگر مقامی سرداروں کے باہمی تنازعات نے انہیں کبھی یکجانہ ہونے دیا۔

دوسری طرف علاقے پر ایرانی حکومت کی عسکری گرفت بظاہر بڑی مضبوط تھی۔ گرگین خان عوام کو

مرعوب کرنے کے لیے 20 ہزار سپاہیوں کی فوج ساتھ لایا تھا جس سے عوام پر دباؤ مزید بڑھ گیا تھا۔ قندھار میں جن قبائل کے زعماء اسے کوئی خطرہ محسوس ہوا، انہیں بڑی بے رحمی سے قتل کرڈالا یا جلاوطن کر دیا اوران کی جگہ اپنے حامی سرداروں کو اقتدار میں شامل کیا۔ ابدالی خاندان کو جو قندھار میں نہایت معزز شمار ہوتا تھا ان کے آبائی علاقے ''ارغسان'' سے بے دخل کر کے فراہ کے نزدیک صحرا میں منتقل کردیا جہاں یہ لوگ ایک طویل عرصے تک خانہ بدوشوں کی زندگی گزارتے رہے۔ افغان عوام ذلت ونکبت کے ان دنوں میں کسی نجات دہندہ کو تلاش کررہے تھے..... آخر کار اللہ تعالیٰ نے ان کی دعائیں سن لیں۔ ان کی رہنمائی کے لیے ایک ایسا نوجوان اٹھ کھڑا ہوا جو بظاہر کسی شمار میں نہ تھا مگر قدرت خداوندی نے اسے حیرت انگیز سیاسی بصیرت عطا کی تھی۔

حال کا تاجر، مستقبل کا رہنما: ''میرویس'' نامی یہ نوجوان ہوتکی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ 1673ء میں پیدا ہوا۔ کمانے کے قابل ہوا تو تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ قندھار میں ایک عام شہری کی سی زندگی گزارنے والا نوجوان میرویس جلد ہی ایک کامیاب تاجر بن گیا اور اچھا خاصا نفع کمانے لگا۔ اس کا حلقہ احباب روز بروز وسیع ہوتا گیا مگر اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ وہ سرکاری کارندے تھے جو اس کے نفع کا بڑا حصہ وصول کرلیتے تھے۔ ہر افغانی کی طرح میرویس کو بھی اس سے سخت صدمہ ہوتا مگر عام لوگوں کی طرح صرف کڑھنے اور جھنجھلانے کا عادی نہ تھا بلکہ وہ سوچتا تھا کہ کسی طرح اس ظالم وجابر حکومت سے نجات حاصل کی جائے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ مقامی سرداروں اور قبائلی زعماء میں سے کوئی بھی ایرانی حکومت کے خلاف سرنہیں اٹھا سکتا۔ کسی میں اس سے مقابلے کی طاقت نہیں ہے۔ آخر کار اس نے خود ہی یہ مہم انجام دینے کا تہیہ کرلیا۔ بظاہر یہ کام ناممکن تھا مگر قندھار کے اس نوجوان کے ذہن میں خفتہ سیاسی صلاحیتوں کو قدرت خداوندی نے اس طرح بیدار کردیا تھا کہ اس کو غلامی کے اس اندھے کنویں سے نکل کر منزل آزادی تک رسائی کا راستہ نظر آ گیا تھا۔

میرویس کی منصوبہ بندی: قندھار میں ایک تاجر کی حیثیت سے اس کے مراسم بڑے بڑے لوگوں سے تھے۔ جن میں قبائل کے سردار اور علماء سے لے کر حکومتی افسران تک شامل تھے۔ میرویس اپنا دائرہ تعلقات مزید بڑھاتا گیا حتیٰ کہ قندھار اور گردونواح میں اسے جانی پہچانی شخصیت کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اب اس نے اپنے منصوبے کے دوسرے مرحلے میں قدم رکھا اور ایک وسیع حلقہ اثر رکھنے والے تاجر کی حیثیت سے قندھار کے گورنر ''گرگین'' سے مراسم بڑھانا شروع کیے۔ گرگین اقتصادی وتجارتی امور میں اس کی مہارت سے خاصا متاثر ہوا۔ میرویس نے اسے اپنے خلوص، وفاداری اور عقیدت کا

یقین دلا کر جلد ہی شیشے میں اتار لیا۔ کچھ ہی عرصے میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ گرگین خان نے مختلف حکومتی خدمات اس کے سپرد کرنا شروع کر دیں۔

اس کے حکم سے میرویس کبھی سخت مزاج اور تند خو قسم کے لوگوں سے ٹیکس وصول کرتا، کبھی مالیاتی امور کا حساب کتاب دیکھتا اور کبھی حکومت کے دیگر امور میں مفید تجاویز دیتا۔ گرگین خان ہر کام اس کے مشورے سے کرنے لگا۔ گویا عملاً وہ اس کی مٹھی میں تھا۔ اس کے مشوروں سے حکومت کی آمدنی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد اسے ''کلانتری'' نامی ایک چھوٹے شہر میں بلدیاتی امور کا نگران (ناظمِ شہر) بنا کر بھیج دیا گیا۔ میرویس نے خود کو اس علاقے کا بہترین منتظم ثابت کیا۔ وہ سب کی غمی اور خوشی میں شریک ہوتا، حکومت اور عوام دونوں اس سے مطمئن رہے۔ ابدالی خاندان کا داماد ہونے کی وجہ سے عوام اس کی بے حد عزت کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ اسے عوامی لیڈر کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

میرویس اب منصوبے کے اگلے مرحلے کا آغاز کرنے لگا تھا مگر درمیان میں ایک بھیانک غلطی آڑے آ گئی، وہ عوام کے نمایندوں سے ''گرگین'' کی مسلسل زیادتیوں پر نہ ختم ہونے والی فریادیں سنتا رہتا تھا۔ اگرچہ اس کا اصل ہدف ایرانی حکومت سے آزادی حاصل کرنا تھا مگر چوں کہ اس وقت گرگین بھوت بن کر انہیں نوچ رہا تھا اس لیے وہ عجلت پسندی میں پڑ کر اس سے فوری نجات حاصل کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ اس میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ عوام کے نالے اسے بے چین کیے ہوئے تھے۔ اس نے سوچا شاید شاہ ایران عوام کی حالت زار اور آہ وزاری سے متاثر ہو جائے، چنانچہ اس نے عوام کی فریادوں کو تحریری شکل دے کر معزز افراد پر مشتمل ایک خفیہ وفد تیار کیا اور یہ تحریر ان کے ہاتھوں شاہ حسین صفوی کے دربار میں روانہ کی تاکہ وہ حالات کے صحیح رخ اور حقائق سے آگاہ ہو کر عوام کی شکایات کا ازالہ کر سکے۔ میرویس کا اس وفد کو بھیجنا در حقیقت بہت بڑی سیاسی غلطی تھی۔ وہ ایرانی حکومت سے جو توقعات وابستہ کیے ہوئے تھا وہ محض خوش فہمیاں تھیں۔ چنانچہ یہ وفد دربار میں باریاب نہ ہو سکا۔ اس پر مستزاد یہ کہ سارا کچا چٹھا گرگین تک پہنچ گیا۔ اس نے فوری طور پر میرویس کو اس کے عہدے سے معزول کر کے وفد کے افراد سمیت گرفتار کر لیا اور انہیں سپاہیوں کی تحویل میں اس پیغام کے ساتھ دربار ایران روانہ کر دیا کہ یہ حکومت کے خلاف بغاوت کے مرتکب ہوئے ہیں۔

میرویس کے منصوبوں کا قلعہ زمین بوس ہو چکا تھا۔ وہ لمحہ بھر میں محرم سے مجرم اور افسر سے اسیر بن گیا تھا۔ کئی سال کی صحرا پیمائی کے بعد آج وہ اپنے سفر کے نقطۂ آغاز پر نہیں بلکہ اس سے کوسوں پیچھے جا پڑا تھا۔ اس وفد اور شکایتی مراسلے کی روانگی یقیناً اس کے پہلے سے طے شدہ اصل منصوبے کا حصہ نہ تھی بلکہ

یہ ایک عاجلانہ فیصلہ تھا جس کے نقصانات فوراً ظاہر ہو گئے۔ اگر وہ اس غلطی کا مرتکب نہ ہوتا تو اس کا سفر دھیرے دھیرے منزل کی طرف درست سمت میں جاری رہتا۔ مگر اب تو وہ ایک قیدی کی حیثیت سے اصفہان جا رہا تھا۔ جب کہ اس کے پیچھے قندھار میں ستم شعار گورنر کے مظالم مزید بڑھ گئے تھے۔ اب وہ کسی مقامی فرد پر اعتبار کے لیے قطعاً تیار نہ تھا۔

اسارت، ایران کے سیاسی حالات کا جائزہ اور سفرِ حج: میرویس نشانِ منزل مٹتا دیکھ کر بھی مایوس نہ ہوا۔ اس نے اسارت کے ایام کو تجرباتی اور مشاہداتی وقفے کے طور پر استعمال کر کے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچ بچار جاری رکھی۔ اس نے پوری بصیرت کے ساتھ دیکھا کہ ایران کی حکومت حد درجے آرام پسند اور کاہل ہے، حکمران بے فکری کے ساتھ دادِ عیش دینے میں مصروف ہیں۔ امراء وزراء اور افسران رشوت خور ہیں، خیانت عام ہے، فرائض منصب کا لحاظ کرنے والے اہلکار بہت کم ہیں، ناچ رنگ اور شراب و کباب ثقافت بن چکی ہے، نظام حکومت اتنا بگڑا ہوا ہے کہ خود ایرانی عوام اپنے مسائل کے حل سے مایوس نظر آتے ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر میرویس نے یہ اندازہ لگایا کہ حکومت ایران کی سطوت و شوکت محض دکھاوا ہے۔ اگر افغانستان کے عوام یک بارگی اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں تو ایرانی سلطنت ہرگز ان پر قابو نہیں پا سکے گی۔

اس دوران عدالت میں اس کے خلاف مقدمہ زیرِ سماعت تھا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ اس کے خلاف گواہ فراہم نہ ہو سکے۔ اس نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنا مقدمہ لڑا۔ چنانچہ گرگین کی جانب سے اس پر عائد کردہ الزام پایہ ثبوت کو نہ پہنچ سکا۔ اور ایرانی عدالت نے اس کی صفائی قبول کرتے ہوئے رہا کر دیا۔ آزادی پاتے ہی وہ ایرانی وزیر اعظم کی اجازت سے حج کے لیے روانہ ہو گیا، سفر کے ساتھیوں میں اسے افغانستان و ایران کی سیاست پر گہری نظر رکھنے والے چند دوست مل گئے۔ ان سے مشورے کے دوران طے پایا کہ آئندہ افغان علماء کو آزادی کی تحریک کی بابت مشاورت میں لازماً شریک کیا جائے کیوں کہ سیاستِ افغانستان میں ان کا کردار نہایت اہم رہا ہے۔

حج کے سفر کے دوران ہی میرویس نے اپنے مشن کے لیے خفیہ ملاقاتیں شروع کرتے ہوئے علماء کی طرف رجوع کیا۔ انہیں تحریک آزادی میں اپنا موافق پا کر اسے یقین ہو گیا کے منزل دو چار گام کے فاصلے پر ہے۔ اس نے ہر طبقے کے عوام کی مکمل حمایت حاصل کرنے اور انہیں حکومت کے حامی سرداروں کے اثرات سے نکالنے کے لیے علماء کرام کی وساطت سے ایک استفتاء مرتب کیا۔ اس استفتاء میں پوچھا گیا تھا: (1)...... اگر کسی ملک کے مسلمانوں کو حکومت کی جانب سے مذہبی فرائض کی ادائگی

سے روکا جائے تو کیا عوام کے لیے جائز ہوگا کہ مسلح ہو کر خود کو ایسی حکومت سے آزاد کرائیں۔ (۲)...... اگر ملک کے قبائلی سردار کسی ظالم بادشاہ کے ہاتھ پر بیعت کرلیں تو کیا عوام کے لیے جائز ہوگا کہ از روئے شرع اس بیعت کو فسخ کر دیں؟ حجاز پہنچ کر میرویس یہ استفتاء مقامی اکابر علماء کے پاس لے گیا، انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ جس سے میرویس کا کام بہت آسان ہوگیا۔ تاہم فی الحال وہ دُہرا کھیل کھیل رہا تھا، اس نے اب تک حکومت ایران کے خلاف علی الاعلان کچھ کرنا مناسب نہ سمجھا تھا، وہ ایرانی حکمران سے بظاہر بہت اچھے مراسم قائم کیے ہوئے تھے۔

دوہری چال: فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد وہ واپسی کے سفر میں کچھ دن اصفہان میں رکا رہا۔ اس نے شاہ ایران کو اپنی وفاداری کا یقین دلا کر اس سے ''کلانتری شہر'' کی نظامت کا عہدہ دوبارہ طلب کیا۔ شاہ ایران کو معلوم تھا کہ گرگین اس بات پر برافروختہ ہوگا مگر وہ خود گرگین سے بداعتماد ہو چکا تھا، وجہ یہ تھی کہ کچھ دنوں پہلے روس کے حکمران ''زار'' کی جانب سے ایک سفیر ایران پہنچا تھا۔ اس نے شاہ ایران کو خبردار کیا تھا کہ ''گرگین'' اُفغانستان میں اپنی خودمختار حکومت تشکیل دینا چاہتا ہے۔ اس خبر سے شاہ ایران نہایت مضطرب تھا۔ اس نے میرویس کو اپنا وفادار سمجھ کر اسے اجازت دے دی کہ وہ نہ صرف ''کلانتری شہر'' بلکہ قندھار کا انتظام بھی سنبھال لے۔ تاہم یہ کام اتنا آسان نہ تھا، گرگین کے پاس موجود 20 ہزار سپاہی اس کے ہم قوم ہونے کی حیثیت سے اس کی برطرفی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اور پھر جب کہ گرگین خودمختاری کے لیے پر تول رہا تھا، یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ خود قندھار کی گورنری چھوڑ دیتا۔

ادھر شاہ ایران اس مقصد کے لیے شاہی افواج کو استعمال کرنا نقصان دہ سمجھتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ کسی جانی زیاں کاری کے بغیر اپنا مقصد حاصل کر لے۔ خود میرویس بھی ایرانی فوج سے مدد لینا زہر قاتل تصور کرتا تھا کیوں کہ اس کا اصل مقصد ایرانیوں سے نجات پانا تھا۔ بہر کیف وہ اپنی مہم پر روانہ ہوگیا، اس نے جنوبی اُفغانستان کے کونے کونے کا دورہ کیا اور عوام کو حجاز مقدس کے علماء کا فتویٰ دکھا کر انہیں غیروں سے آزادی کا درس دیا۔ اس فتوے کا ایسا اثر ہوا کہ قندھار، مزار، سیستان، نیمروز اور بست سمیت تمام شہروں اور دیہاتوں کے لوگ ایک صف میں کھڑے ہوگئے، اور انہوں نے میرویس کو اپنا رہنما چن لیا۔

قراردادِ آزادی اور منزلِ مقصود: کچھ دنوں بعد اس نے قندھار سے شمالی مشرق کی جانب 30 میل دور ایک دیہات ''مانجہ'' میں ایک وسیع تر مجلس مشاورت طلب کی جس میں ابدالی اور غلجائی سمیت جملہ پختون قبائل نیز تاجک، ازبک، ہزارہ، اور بلوچ قبیلوں کے رہنما بھی موجود تھے۔ اس مشاورت میں گرگین کا تختہ الٹنے کا حتمی منصوبہ اس قدر خفیہ طور پر طے کرلیا گیا کہ مقامی حکومت کو کانوں کان خبر نہ

ہوسکی۔ 20 ہزار ایرانی اور گرجی سپاہیوں کی موجودگی میں قندھار پر قبضہ نہایت مشکل تھا۔ مگر حریت پسندوں کی ذہانت نے اسے آسان کردکھایا۔

منصوبہ کے مطابق قندھار سے خاصے فاصلے پر آباد ایک بلوچ قبیلے کے سردار نے گرگین کو ٹیکس ادا کرنے سے کھلم کھلا انکار کر دیا۔ گرگین اس خبر سے سیخ پا ہو رہا تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ پختون کاکڑ قبیلے کے افراد بھی جو ''ارغسان'' میں آباد ہیں ٹیکس دینے سے انکار کر رہے ہیں۔ گرگین بے چین ہو کر اپنے لشکر کے ساتھ ان قبائل کی گوشمالی کے لیے نکلا۔

''ارغسان'' پہنچ کر اس نے لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ رات کو وہ ''دہ شیخ'' نامی مقام پر ایک باغ میں آرام پذیر ہوا۔ حریت پسندوں کو ایسے ہی کسی موقع کا انتظار تھا۔ آدھی رات کے وقت میرویس اپنے رضا کاروں کو لے کر اس باغ میں گھس گیا اور سوتے ہوئے سپاہیوں پر ٹوٹ پڑا۔ گرگین کا ایک سپاہی بھی زندہ بچ کر نہ جا سکا۔ حریت پسندوں نے مقتول سپاہیوں کے لباس اسلحے اور سواریوں پر قبضہ کر لیا۔ جب وہ قندھار کے دروازے پر پہنچے تو شہر کے محافظوں نے انہیں گرگین کا فاتح لشکر تصور کر کے بلا تامل دروازے کھول دیے۔ میرویس کے رضا کاروں نے سب سے پہلے شہر میں موجود باقی ماندہ ایرانی اور گرجی سپاہیوں کو ٹھکانے لگایا اور اس کے بعد شہر پر قبضہ کر کے نئی حکومت تشکیل دینے کا اعلان کیا۔ قندھار میں یہ دن ایک تاریخی دن تھا کیوں کہ ایک طویل عرصے کے بعد یہاں اَفغانوں کی اپنی حکومت قائم ہوئی تھی۔ اس حکومت کو اس لحاظ سے اَفغانوں کی پہلی نمائندہ حکومت بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس میں پہلی بار ان تمام قبائل زبانوں اور نسلوں کے نمائندوں کو شامل کیا گیا تھا جو اَفغانستان سے تعلق رکھتے تھے۔

قندھار اَفغانستان کی سیاسی آزادی کا مرکز بن چکا تھا۔ میرویس نے یہاں آزاد حکومت قائم کرنے کے بعد بڑی دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے بادشاہ یا سلطان کا لقب اختیار کرنے سے مکمل احتراز کیا کیونکہ اس طرح دیگر قبائل کے عمائد کے دلوں میں رنجش پیدا ہونا بعید نہ تھا۔ اس نے خود کو اَفغانوں کے ایک ایسے سیاسی رہنما کے طور پر متعارف کرایا جو ملک وقوم کے وسیع تر مفاد میں مشاورت پر یقین رکھتا ہو اور تمام قبائل کو حکومت میں برابر اور نمایاں نمائندگی دیتا ہو۔ اس طرزِ عمل سے اس نے عوام کا ایسا اعتماد حاصل کیا کہ اسے احترام کے طور پر ''حاجی میر خان'' کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔

بیرونی خطرات اور شاہ ایران سے خط وکتابت: 1709ء میں آزادی حاصل کرنے والی قندھار کی حکومت بہرحال خطرات کی زد میں تھی۔ اس کے مغرب میں سیستان کے صحراؤں سے ہرات کی فصیل تک سارا علاقہ بدستور ایران کے صفوی حکمرانوں کے زیرِ نگین تھا جبکہ مشرق میں کابل، غزنی، زابل،

جلال آباد اور ننگر ہار سمیت تمام شہر مغل حکومت کے قبضے میں تھے۔ میرویس ان دونوں حکومتوں سے افغان کو آزاد کرنا چاہتا تھا مگر اس کی چھوٹی سی ریاست بھلا ان دونوں کا ایک ساتھ کیسے مقابلہ کرسکتی تھی۔ میرویس نے اپنی سیاسی بصیرت سے کام لیتے ہوئے سب سے پہلے ہندوستان کی مغل حکومت کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تاکہ ایک مدت تک ان کی دست برد سے محفوظ رہا جاسکے۔ رہا ایران! تو یقینی بات تھی کہ قندھار کا اپنے مقبوضات سے نکل جانا وہ برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ میرویس کو یہ تو یقین تھا کہ ایران قندھار پر حملہ کرے گا مگر وہ اتنا وقت حاصل کرنا چاہتا تھا کہ اس سے مقابلے کی تیاری کرسکے۔

اس نے ایک طرف تو نئی سرکاری فوج کی تیاری زور وشور سے شروع کردی۔ کچھ ہی دنوں میں وہ تمام اَفغان قبائل کے منتخب جوانوں پر مشتمل ایک فوج تشکیل دینے میں کامیاب ہوگیا۔ دوسری طرف اس نے زیادہ سے زیادہ وقت حاصل کرنے اور شاہِ ایران کے اعتماد کو بحال کرنے کے لیے اس کے نام یہ پیغام بھیجا: ''میں آپ کی منشاء کے مطابق اس علاقے میں امن وامان قائم کرنے کے لئے پہنچا تھا۔ عوام چونکہ گرگین کے ظلم سے بے حد تنگ تھے، اس لیے انہوں نے اسے قتل کرکے باتفاقِ رائے مجھے اپنا حاکم منتخب کرلیا ہے۔ بادشاہ سلامت میرے بارے میں حاسدین کی باتوں پر یقین نہ کریں اور مجھے اپنا وفادار سمجھتے ہوئے اس علاقے کی حکمرانی پر برقرار رکھیں۔ میں یہاں امن وامان کے قیام اور شر وفساد کے خاتمے کی ضمانت دیتا ہوں۔''

اس پیغام کے باوجود شاہِ ایران کے نزدیک میرویس کا قندھار پر خودمختار حکومت قائم کرلینا ایک ناقابلِ معافی جسارت تھی۔ اس نے حالات کا صحیح جائزہ لینے کے لیے جانی خان نامی ایک امیر کو قندھار روانہ کیا اور اس کی وساطت سے میرویس کو کہلوایا کہ اگر وہ قندھار میں ایرانی سپاہ کے قیام میں رکاوٹ نہ ڈالے تو اسے وفادار سمجھا جاسکتا ہے۔ بصورتِ دیگر اس کے خلاف کارروائی ہوگی۔

<u>ایران سے تحفظِ آزادی کی جنگیں</u>: میرویس نے اس قاصد کو کئی ہفتوں تک مذاکرات میں الجھائے رکھا اور جب اس نے بات چیت بے نتیجہ دیکھ کر واپسی پر اصرار کیا تو اسے نظر بند کردیا۔ قاصد کی واپسی میں غیر معمولی تاخیر سے شاہِ ایران کی تشویش بڑھتی گئی۔ آخر جب اسے یقین ہوگیا کہ معاملہ گڑبڑ ہے تو اس نے 1710ء میں امیر محمد خان کو 10 ہزار سپاہی دے کر قندھار کی طرف کوچ کا حکم دیا۔ میرویس اس دوران اتنا وقت حاصل کرچکا تھا کہ قندھار کا دفاع مضبوط کرسکے۔ محمد خان نے قندھار سے کچھ دور پڑاؤ ڈال کر میرویس کے پاس ایک سفیر بھیجا جس نے شاہ ایران کی جانب سے اس پیغام کا اعادہ کیا کہ اگر ایرانی فوج کو قندھار میں رہنے دیا جائے تو میرویس کی حکومت تسلیم کی جاسکتی ہے۔ میرویس نے اس

بار بھی پیغام کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ اس سفیر کو بھی نظر بند کر دیا۔
مکمل خاموشی دیکھ کر محمد خان کو اہل قندھار کے تیوروں کا اندازہ ہو گیا۔ اب اس نے سپاہیوں کو قندھار کے محاصرے کا حکم دے دیا۔ اس کے ماتحت 10 ہزار ایرانی آگے بڑھے تو قندھار کے دروازوں سے 5 ہزار افغان صفیں باندھ کر باہر نکل آئے۔ اگرچہ افغان فوج نوآموز تھی اور توپ خانے کا استعمال بھی نہیں جانتی تھی مگر ان کے گھڑ سواروں نے بجلی کی طرح ایرانیوں کے قلب پر دھاوا بول دیا اور انہیں سنبھلنے کا موقع دیے بغیر پسپا کر دیا۔ ایرانی اپنے سالار سمیت ایک ہزار لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اگلے سال 1711ء میں ایران نے ایک بار پھر بڑے پیمانے پر حکومتِ قندھار کے خلاف لشکر کشی کی۔ 30 ہزار ایرانی اور گرجی سپاہی خسرو خان کی قیادت میں حملے کے لیے آئے۔ میرویس نے دریائے بلمند کے ساحل پر ان کا مقابلہ کیا مگر وہ اتنی بڑی فوج کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔
آخر اس نے لڑائی ترک کر کے ایرانی فوج کا راستہ چھوڑ دیا۔ ایرانی میرویس کو ہزیمت خوردہ سمجھ کر تیزی سے قندھار کی طرف بڑھے۔ حالانکہ میرویس نے ایک چال کے طور پر اپنی طاقت بچائی تھی۔ اس نے قندھار سے باہر رہتے ہوئے حالات پر نظر رکھی اور قندھار میں موجود اپنے سپاہیوں کو شہر کے دروازے بند کر کے آخری دم تک لڑنے کا پیغام دیا۔ خسرو خان نے قندھار کا محاصرہ کر لیا اور کشت و خون کے بغیر شہر فتح کرنے کے لیے کئی سیاسی چالیں چلیں۔ ابدالی غلوئی اور دیگر قبائل کے ساتھ جوڑ توڑ کرنے کی کوششیں کیں مگر سب بے سود رہا۔ آخر اس نے شہر پر پے در پے حملے شروع کر دیے۔ اس دوران میرویس قندھار کے اطراف میں عوام کو جمع کر کے ایک نئی فوج تشکیل دے رہا تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد اس نے 16 ہزار رضا کاروں کے ساتھ ایرانی فوج کی چاروں اطراف سے اس طرح ناکہ بندی کر لی کہ ان کی کمک و رسد کا کوئی راستہ باقی نہ بچا۔ خسرو خان اس نئی صورتحال سے بے حد پریشان ہوا۔ اس کے لیے نجات کا واحد راستہ یہی رہ گیا تھا کہ شہر پر قبضہ کر لے۔ اس نے شہر پر یکے بعد دیگرے کئی طوفانی حملے کیے مگر افغان عوام جو کہ آزادی کی دولت کو اپنی جانوں پر کھیل کر بچانے کا جذبہ رکھتے تھے ہراساں نہ ہوئے۔ جب ایرانی فوج تھک کر نڈھال ہو گئی تو میرویس کے ناکہ بند رضا کاروں نے اپنا گھیرا تنگ کرتے ہوئے ان کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ ادھر شہر والوں نے بھی حملے کا آغاز کر دیا۔ ایرانی فوج دوطرفہ حملے کی زد میں آ کر اس طرح تباہ ہوئی کہ اس کے بمشکل چند سو افراد بچ کر نکل سکے۔ اس فتح کے بعد قندھار کی آزاد حکومت پائیدار اور مضبوط بنیادوں پر کھڑی ہو گئی کیونکہ اب وہ بیرونی جارحیتوں سے نمٹنے کا استحکام حاصل کر چکی تھی۔

1713ء میں ایک اور ایرانی سردار محمد زمان ایک لشکر لے کر قندھار کی طرف آیا مگر اسے راستے ہی میں اُفغان رضا کار جنگجوؤں کی اتنی زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا کہ اس کے اکثر سپاہی مارے گئے۔

میرویس کی وفات: قندھار میں آزاد اُفغانستان کی بنیاد رکھنے والا یہ جواں مرد اپنے دیس کو آزاد کرانے کے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہ رہا اور عین جوانی کے ایام میں 1715ء میں وفات پا گیا۔ اس نے زندگی کی صرف 41 بہاریں دیکھیں۔ ایک تاجر کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا اور صرف 15، 20 برس میں ایک قومی رہنما بن کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ امور سیاست میں اس کی حد درجہ مہارت ایک خداداد صلاحیت تھی جس سے کام لیتے ہوئے اس نے آمریت اور بادشاہت کے مروّجہ نظاموں سے ہٹ کر وسیع البنیاد قومی حکومت کے تصور کو اجاگر کیا۔ اس دور میں عوامی نمائندگی کا ایسا خالص تصور یورپ کی ان ریاستوں میں بھی موجود نہ تھا جو آج جمہوریت کی علمبردار اور بزعمِ خود انسانی حقوق کی ٹھیکیدار ہیں۔ میرویس کا طرز جہانبانی اِسلام کے اصول مشاورت اور اُفغانستان کے قبائلی نظام کے ایک فیصلہ کن عنصر ''جرگے'' کی ترقی یافتہ شکل تھا جس میں قوم کے بہترین افراد علمائے کرام کی رہنمائی کے ساتھ شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے قومی مفادات کے بارے میں قومی مسائل کا فیصلہ کرتے تھے اور اسے کسی ''اپوزیشن'' کی مخالفت کے بغیر پوری قوم قبول کرتی تھی۔

میر عبدالعزیز: قندھار کی ''ھوتکی'' سلطنت کے بانی ''میرویس ھوتکی'' کی وفات کے بعد چالیس سرداروں پر مشتمل جرگے نے اس کے بھائی میر عبدالعزیز کو حکمران منتخب کر لیا۔ میر عبدالعزیز امور سیاست میں اپنے بھائی کی طرح مہارت نہیں رکھتا تھا، وہ حکومت میں شامل قبائلی سرداروں کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی کا فن نہ جانتا تھا، چنانچہ وہ ان کے اعتماد کو بحال رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ ہی دنوں بعد ابدالی قبیلہ اس سے کبیدہ خاطر ہو گیا۔ اور قندھار سے ہجرت کر کے مغربی اُفغانستان کی طرف چلا گیا۔ ابدالیوں کے سردار عبداللہ خان ابدالی نے وہاں ہرات کو ایرانی حکومت سے آزاد کرا کے اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی، یوں اُفغانستان میں مقامی سرداروں کی دو آزاد حکومتیں ایک دوسرے کے مدمقابل آ گئیں۔

میر عبدالعزیز سے دوسری سنگین غلطی یہ ہوئی کہ اس نے اپنے ماتحت سرداروں میں خود سپردگی کا جذبہ کم محسوس کرتے ہوئے اپنے شخصی اختیارات کو مضبوط کرنے کی ٹھانی اور اقتدار کو آمریت میں تبدیل کرنے کے لیے خفیہ طور پر شاہ ایران سے تعاون کا طلب گار ہوا۔ جب جرگے کے عمائد کو میر عبدالعزیز کی اس حرکت کا علم ہوا تو وہ بھڑک اٹھے، انہوں نے میر عبدالعزیز پر قوم سے غداری کا الزام عائد کر کے اسے برطرف کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت حکومتِ قندھار کے بانی میرویس کا لڑکا محمود اٹھارہ سال کا تھا۔

جرگے نے اسے متبادل حکمران کے طور پر تجویز کیا۔ چنانچہ میر عبدالعزیز کو ایک مسلح کارروائی میں قتل کر دیا گیا اور نوجوان محمود کو مسندِ اقتدار پر بٹھا دیا گیا۔ میر عبدالعزیز کا زمانہ حکومت ایک سال سے بھی کم رہا۔

شاہ محمود مسندِ اقتدار پر: 19 سال محمود کم عمر مگر اپنے باپ کی طرح نہایت ذہین، حوصلہ مند اور سیاسی سوجھ بوجھ کا حامل تھا۔ اس نے تخت پر براجمان ہونے کے بعد اس چھوٹی سی حکومت کو وسیع کر کے سلطنت کی شکل دے دی اور خود شاہ محمود کہلایا۔ اس کا دور حکومت 1712ء سے شروع ہوتا ہے۔ ابتدائی چار سال تک وہ اندرونی مہمات کی طرف متوجہ رہا۔ اس دوران ہرات کے نئے ابدالی حکمران عبداللہ خان سے بھی اس کی جھڑپیں ہوئیں۔ عبداللہ خان کا بیٹا اسداللہ 1719ء میں ایک بڑی فوج کے ساتھ قندھار کی طرف لپکا، فراہ کے مقام پر شاہ محمود نے اس کا جم کر مقابلہ کیا اور اسے بری طرح شکست دی، اسداللہ خان میدان جنگ میں مارا گیا۔ اس لڑائی نے ہرات کی ابدالی اور قندھار کی ہوتکی سلطنت میں منافرت کا بیج بو دیا۔

ایران سے ٹکر: کئی صدیوں سے ایران اُفغانستان کی سیاست میں اس طرح ملوث تھا کہ اُفغان عوام ایرانیوں کی چیرہ دستیوں کا شکار تھے۔ ایرانی آقا تھے اور اُفغانی گویا ان کے بے دام غلام مگر اب جبکہ اُفغانوں کو آزادی کی نعمت مل چکی تھی، ان کا نوجوان قائد شاہ محمود ایرانیوں سے گزشتہ قرضے چکانے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ وہ پورے ایران پر قبضہ کر کے سابقہ آقاؤں کو اپنی رعایا بنانا چاہتا تھا۔ ایرانی سلطنت کا کھوکھلا پن اس پر عیاں تھا، اس لیے یہ مہم اس کے نزدیک زیادہ دشوار نہ تھی۔ 1720ء میں اس نے اپنی عسکری تیاری مکمل کر کے ایران کی طرف کوچ کیا۔ راستے میں صفوی حکومت سے دل برداشتہ دیہاتی اور چھوٹی چھوٹی بستیوں کے مکین اس کا خوشی سے استقبال کر رہے تھے۔ اس نے بڑی آسانی سے کرمان پہنچ کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ ابھی جنگ جاری تھی کہ اسے قندھار میں شورش کی اطلاع ملی چنانچہ اسے محاصرہ اُٹھا کر واپس جانا پڑا۔

اگلے سال اس نے پہلے سے بہتر تیاریوں کے ساتھ پیش قدمی کی۔ اس کے ہمراہ 28 ہزار جنگجو تھے، توپ خانے میں ایسی عمدہ بڑی توپیں بھی تھیں جو تین سو سے پانچ سو گز تک گولہ باری کر سکتی تھیں۔ شاہ محمود نے کسی بڑے نقصان کے بغیر بام شہر اور کرمان پر قبضہ کر لیا اور پھر ایران کے پایہ تخت اصفہان کی طرف بڑھا، جہاں ایرانی حکمران شاہ حسین صفوی خود موجود تھا۔ اس نے شاہ محمود کی آمد کی خبر سن کر 60 ہزار سپاہیوں اور بھاری بھر کم توپ خانے کے ساتھ مقابلے کی تیاریاں کر لی تھیں۔ جب شاہ محمود اصفہان کے نواح میں پہنچا تو شاہ حسین نے یہ محسوس کیا کہ وہ عوامی حمایت سے محرومی اور افواج کی عیش پسندی کے باعث اُفغانوں کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ چنانچہ اس نے شاہ محمود سے صلح کی درخواست کی اور گراں قدر

ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ شاہ محمود نے جواب میں صلح کے لئے دو شرائط پیش کیں۔ اس نے کہا: "❶ ...... خراسان کا صوبہ قدیم زمانے سے افغانستان کا حصہ ہے جس پر ایران نے ناجائز قبضہ کیا ہوا ہے، یہ علاقے افغانستان کو واپس کر دیا جائے۔ ❷ ...... شاہ حسین اپنی بیٹی میرے نکاح میں دے۔"

اصفہان کا تاریخی معرکہ: یہ شرائط نامہ دربار ایران میں پہنچا تو وہاں پر کھلبلی مچ گئی۔ امراء نے کھل کر اس کی مخالفت کی اور جنگ پر اصرار کیا۔ چنانچہ 50 ہزار ایرانی سپاہی توپ خانے سمیت یکدم شہر کی فصیل سے باہر نکل آئے اور افغانی لشکر پر ٹوٹ پڑے ساتھ ہی ایرانی توپ خانہ بھی آگ اگلنے لگا۔ ایرانی سالار عبداللہ خان نورستانی نے افغان لشکر پر یک بارگی حملہ کر کے بہت سے افراد کو قید کر لیا جن میں شاہ محمود کے اعزہ اقارب بھی شامل تھے۔

اس صورتحال میں افغان سردار امان اللہ خان نے بے مثال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایرانی توپ خانے کی طرف پیش قدمی کی، اس کے سپاہی آتش و آہن کی بوچھاڑ اور بارود کی بارش کو اپنے سینوں میں جذب کرتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ قدم قدم پر ان کی لاشیں گرتی رہیں مگر وہ نہ رکے اور آخر کار ایرانی توپ خانے تک جا پہنچے اور اس پر قابض ہو گئے۔ توپ خانے کا نگران احمد خان مارا گیا۔ اب افغانوں نے ایرانی توپوں کا رخ ایرانی صفوں ہی کی طرف پھیر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میدان جنگ کا نقشہ بدل گیا، حریف کی قوت بھسم ہونے لگی، 25 ہزار ایرانی ڈھیر ہو گئے اور باقی لشکر تتر بتر ہو کر اصفہان کی فصیلوں میں پناہ گزین ہو گیا۔ ایرانی افسران اپنے نقصانات دیکھ کر بے حد برافروختہ تھے، انہوں نے ان افغان قیدیوں کو جن میں شاہ محمود کے رشتہ دار بھی شامل تھے، طیش کے عالم میں قتل کر دیا۔ یہ خبر جب افغانوں کے کیمپ میں پہنچی تو وہاں بھی ایرانی قیدیوں کو مار ڈالا گیا۔ اس طرح فریقین میں نفرت و عداوت کا جوش مزید تیز ہو گیا۔

شاہ محمود نے دشمن کو فصیلوں میں محفوظ دیکھنے کے بعد اندازہ لگا لیا کہ اب وہ اس وقت تک میدان میں نکلنے کی جرأت نہیں کرے گا جب تک کہ اسے کہیں سے بھاری کمک نہ مل جائے۔ اس نے فوراً اپنی فوج کے ایک حصے کو اصفہان کے چاروں طرف پھیلا کر اطراف سے سخت ترین ناکہ بندی کر لی۔ اس طرح اہل اصفہان نہ صرف کمک اور رسد سے محروم ہو گئے بلکہ ان کی پیام رسانی کا نظام بھی معطل ہو گیا۔ محاصرہ کئی ماہ تک جاری رہا، حتیٰ کہ شہر میں فاقوں کی نوبت آ گئی۔ شاہ حسین کو اب بچاؤ کی کوئی امید نہ رہی تھی۔ اس کا بیٹا شہزادہ طہماسپ دار الحکومت سے باہر تھا مگر اس کی کمک کا شہر تک پہنچنا ناممکن تھا۔

ایران میں افغان حکومت: 1722ء میں جب کہ محاصرہ کو 8 ماہ گزر چکے تھے، بوڑھے شاہ حسین نے

شکست تسلیم کر لی اور خود شاہ محمود کے پاس حاضر ہوا۔ 25 سالہ نوجوان شاہ محمود کے ایام زندگی شاہ حسین کے ایام حکومت سے بھی کم تھے جو 30 برس سے ایران پر حکومت کرتا آ رہا تھا۔ مشیتِ خداوندی نے نوجوان کے حوصلے کو بوڑھے کی تدبیر پر فتح عطا کر دی تھی۔

شاہ حسین جب حاضر ہوا تو شاہ محمود نے اسے عزت واحترام سے اپنے برابر جگہ دی اور کہا: ''اس دنیا کی شان وشوکت اور یہاں کا جاہ وجلال ناپائیدار ہے، بے وفا ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے، جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔ میری جانب سے آپ اطمینان رکھیں کہ آپ کی مصلحت اور فائدے کے خلاف کوئی کام نہیں کروں گا۔''

شاہ حسین صفوی جواب میں کچھ نہ کہہ سکا۔ بس کپکپاتے ہاتھوں سے سلطنت ایران کا وہ تاج جو نسل در نسل صفوی شاہوں کے سروں کی زینت بنتا چلا آ رہا تھا، اس قندھاری نوجوان کے سر پر رکھ دیا۔ شاہ محمود اَفغانستان میں جنم لینے والا ایران کا پہلا بادشاہ تھا۔ اس نے اصفہان کو اپنا دارالحکومت قرار دے دیا اور قندھار کی ولایت اپنے بھائی میر حسین کے حوالے کر دی۔ شاہ محمود کا دورِ حکومت نہ صرف اَفغانستان بلکہ ایران کے عوام کے لیے بھی امن، بھائی چارے، عدل وانصاف اور تعمیر وترقی کا روشن دور ثابت ہوا۔

شاہ محمود کا زوال اور روس کے استعماری عزائم: شاہ محمود نے اصفہان کو پایہ تخت بنا کر متحدہ ایران اور اَفغانستان کی تاریخ کا ایک نیا ورق الٹ دیا تھا مگر اس نوجوان حکمران کا ستارہ اقبال زیادہ عرصے نہ چمک سکا اور جلد ہی زوال کی آندھیوں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس دور میں روس دنیا کی ایک نئی طاقت کے طور پر ابھر چکا تھا، صدیوں سے دنیا کے شمال میں پھیلا ہوا یہ یخ بستہ برفانی خطہ ان نیم جنگلی اقوام کا مسکن تھا جن کا بیرونی سیاست سے کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا۔ مگر ایک باقاعدہ سلطنت کی حیثیت اختیار کرنے کے بعد روس نے استعماری عزائم کے ساتھ اپنے پاؤں ہر طرف پھیلانے شروع کر دیے تھے۔ روس کے بادشاہ ''زار'' کہلاتے تھے۔ شاہ محمود کا ہم عصر ''زار'' رومانوف پیٹر اعظم تھا جو 1689ء سے 1725ء تک روس کے تخت پر بیٹھ کر ایشیا کی سیاست پر چھایا رہا۔ وہ روس کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنانے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کی سیاست سے اَفغانستان اور ایران براہ راست متاثر ہو رہے تھے۔ ''زار'' صفوی ایرانی بادشاہوں کا حلیف اور اَفغانوں کا مخالف تھا، اس لیے شاہ محمود کے لیے اسے نظر انداز کرتے ہوئے ایران پر آسانی سے قبضہ جمائے رکھنا ناممکن تھا۔ دوسری طرف اندرونی بغاوتیں بھی شروع ہو چکی تھیں۔

انہی دنوں شمالی ایران کے شہر قزوین کے لوگوں نے اَفغان حکومت کے خلاف بغاوت کر کے علانیہ

میں اَفغانوں کی لاشیں بچھادی تھیں اور شاہ محمود اس صورتحال پر قابو نہ پاسکا تھا جس کے سبب اس کے اپنے معتمد امراء بھی اس سے بددل ہو گئے تھے۔ بغاوتیں فرو کرنے کی مہمات کے باعث ایران میں اَفغان سپاہیوں کی ضرورت روز بروز بڑھ رہی تھی مگر شاہ محمود کی طلب کے باوجود قندھار سے اسے کمک نہیں مل رہی تھی۔ کئی امراء یہ چاہتے تھے کہ پایہ تخت دوبارہ قندھار منتقل کردیا جائے مگر شاہ محمود راضی نہ ہوتا تھا۔ کچھ عرصے بعد شاہ محمود پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ صاحب فراش ہو گیا۔ 1725ء میں یہ نوجوان حکمران دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اسکی عمر صرف 28 برس تھی۔

اَفغان سلطنت کی تقسیم: شاہ محمود کے مرتے ہی اَفغانستان و ایران کی متحد ''اَفغان ہوتکی سلطنت'' دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ اس کے بھائی میر حسین ہوتکی نے قندھار کو پایہ تخت قرار دے کر اَفغانستان کا علاقہ الگ کرلیا۔ جب کہ اصفہان میں شاہ محمود کے چچازاد بھائی سید اشرف نے جو میر عبدالعزیز کا بیٹا تھا، ایران کا تاج وتخت سنبھال لیا۔ میر اشرف نے شاہ اشرف کالقب اختیار کر کے 1725ء سے 1729ء تک حکومت کی۔

اس دور میں ایرانی صفوی بادشاہت کا وارث شہزادہ طہماسپ، روس کی مدد سے اپنے باپ کا کھویا ہوا تاج وتخت حاصل کرنے کی تگ ودو میں لگا ہوا تھا۔ اس کا باپ شاہ حسین صفوی، شاہ اشرف کی قید میں تھا۔ طہماسپ نے زار روس سے معاہدہ کیا کہ اگر وہ اس کے باپ کو ایران کا تخت واپس دلا دے تو وہ آذربائی جان، دربند، گیلان اور بحیرۂ کیپین سے ملحقہ تمام ایرانی اضلاع روس کے حوالے کردے گا۔

طہماسپ کی ان کوششوں سے شاہ اشرف کو سخت خطرہ لاحق تھا۔ طہماسپ نے ترکی کی خلافت عثمانیہ سے بھی سابقہ رقابتیں فراموش کر کے بغاوت کی درخواست کی تھی اور یوں اسے ہمنوا بنالیا تھا۔ ادھر شاہ اشرف نے اپنے ہمسایوں سے سیاسی روابط قائم کرنے کی ضرورت بہت دیر سے محسوس کی جس کا اسے سنگین خمیازہ بھگتنا پڑا۔

خلافتِ عثمانیہ سے چپقلش اور جنگ: اشرف نے ترکی کی خلافت عثمانیہ سے سفارتی تعلقات قائم کیے تو آغاز ہی میں اس سے مطالبہ کیا کہ وہ شمالی ایران کے علاقے خالی کردے۔ اس مطالبے سے ترکی سے اس کے تعلقات مزید خراب ہو گئے۔ خلافتِ عثمانیہ نے جواباً مطالبہ کردیا کہ شاہ اشرف ایران کو خالی کر کے حکومت شاہ حسین صفوی کو واپس کردے۔ شاہ اشرف نے نہ صرف یہ مطالبہ مسترد کردیا بلکہ شاہ حسین صفوی کو بھی قتل کرادیا۔ اپنے مطالبے کے جواب میں اس انتہا پسندانہ حرکت سے خلافتِ عثمانیہ کے تاجدار کا برافروختہ ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ دونوں حکومتوں کے تعلقات بگڑتے چلے گئے حتیٰ کہ

1726ء میں ترک اور افغانستان فوجیں تاریخ میں پہلی بار آمنے سامنے آکھڑی ہوئیں۔ اصفہان اور یزد کے درمیان زوردار معرکہ ہوا جس میں شاہ اشرف نے فتح پائی۔ تاہم اس نے اس موقع پر دوراندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمام مال غنیمت منصب خلافت کے احترام میں ترکی کو واپس کردیا۔ اس کا اچھا اثر ہوا اور دونوں حکومتوں کے تعلقات بحال ہو گئے۔ شاہ اشرف نے ترکی سے شمالی ایران کے علاقوں کی بازیابی کا مطالبہ بھی ترک کردیا۔ ترکی سے تعلقات بحال کرنے کے بعد شاہ اشرف نے روس سے بھی دوستانہ رابطہ قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی اور اس سلسلے میں اس نے کسی احتیاط کے بغیر روس کی بے جابالادستی قبول کی اور اسے حسب دلخواہ مراعات فراہم کیں۔

<u>نادر شاہ افشار کا ظہور، شاہ اشرف کا انجام</u>: بیرونی حکومتوں سے تعلقات بنانے میں شاہ اشرف کی طرف سے بہت دیر ہو چکی تھی، ایشیا کے افق پر بے رحمی کا وہ پیکر نمودار ہو چکا تھا جس نے کسی پر ترس کھانا نہیں سیکھا تھا۔ ''یہ نادر شاہ افشار'' تھا۔ طہماسپ کا سپہ سالار۔ نہ جانے کتنے شاہوں اور نوابوں کے تاج اس کے قدموں تلے کچلے جانے والے تھے۔ شاہ اشرف بھی انہی میں سے ایک تھا۔

نادر شاہ ایک طوفان کی طرح آیا اور دیکھتے دیکھتے اس نے شاہ اشرف سے متعدد علاقے چھین لیے۔ 1727ء میں اس نے ہزاروں افغان سپاہیوں کو تہہ تیغ کر کے خراسان، سیستان اور نیشاپور فتح کر لیے۔ 1729ء میں وہ ہرات پر بھی قابض ہو چکا تھا۔ شاہ اشرف کے لیے اب دوبدو مقابلے کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ ایران اور افغانستان کی سرحدوں پر ''مہماندوست'' نامی قصبے کے قریب دونوں کا تصادم ہوا۔ نادر شاہ کے بھاری بھرکم توپ خانے کی ہولناک آتش باری نے افغانوں کی لاشوں کے ڈھیر لگا دیے۔ شاہ اشرف کی فوج میں شامل ایرانی شروع ہی میں بھاگ نکلے تھے۔ صرف افغان سپاہی قدم جما کر لڑ رہے تھے۔ بارہ ہزار سپاہی گنوانے کے بعد شاہ اشرف بھی پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اصفہان پہنچ کر اس نے ایک بار پھر فوج مرتب کی۔ 24 ہزار کی پیادہ فوج لے کر وہ ایک بار پھر نادر شاہ کے مقابل آیا۔ یہ فیصلہ کن جنگ تھی جس میں افغانوں نے اپنی ساری قوت جھونک دی تھی۔

اس بار بھی شاہ اشرف کی فوج کے کرد اور ایرانی سپاہی جلد ہی ساتھ چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ صرف افغانی جاں توڑ انداز سے لڑتے رہے مگر نادر شاہ کی فوج کے سیلاب کے سامنے ان کا کوئی شمار نہ تھا۔ جلد ہی ایرانیوں نے میدان مار لیا۔ صرف گنتی کے چند افغان زندہ بچے۔ اب نادر شاہ اصفہان میں گھس گیا اور افغانوں کا بے دریغ قتل عام شروع کر دیا۔ شاہ اشرف شکست کھا کر شیراز کے ایک دریائی جزیرے میں قلعہ بند ہو گیا۔ نادر شاہ نے یہاں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اشرف کے ساتھ اس کے خاندان کی عورتیں

بھی تھیں۔ ان خواتین کی عزت بچانے کے لیے اس نے انہیں خواجہ سراؤں کی تحویل میں دے دیا کہ جو نہی دشمن شہر میں داخل ہو، اِنہیں مار ڈالا جائے۔

آخر کار نادر شاہ نے شیراز فتح کر لیا۔ شاہ اشرف حکومت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو کر بلوچستان کے بیابانوں کی طرف نکل گیا۔ نادر شاہ نے شیراز میں ظلم وستم کا بازار گرم کر دیا۔ شاہ اشرف کا معتمد اور پشتو کا مشہور شاعر ''ملا زعفران'' اس ہنگامے میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ ایران اب مکمل طور پر نادر شاہ کی گرفت میں تھا۔ ایران کی اَفغان حکومت جس کی اساس شاہ محمود ہوتکی نے رکھی تھی، صرف آٹھ برس بعد ختم ہو گئی۔

نادر شاہ کی غارتگری: شاہ اشرف کو ایران سے بے دخل کرنے کے بعد نادر شاہ اَفغانستان کی جانب پیش قدمی کرنے اور وہاں سے ہوتکی اور غلجائی قبائل کے اقتدار کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی تیاری کرنے لگا۔ قندھار میں شاہ اشرف کا بھائی، شاہ حسین ہوتکی اور غلجائی قبائل کے معتمدین کے ساتھ اَفغانیوں کے اقتدار وخود مختاری کا آخری محافظ تھا۔ نادر شاہ افشار نے پہلے اپنے سالاروں کے ذریعے اس کے مقبوضات پر پے در پے حملے کیے اور 1737ء میں خود اَفغانستان میں داخل ہو گیا۔ اس کے امراء کلب علی افشار اور امام دیردی جو اس کے ہم رکاب تھے اَفغانستان پہنچ کر ''زمینداور'' اور ''بست'' کی فتح کے لیے الگ ہو گئے۔ دریائے ہلمند عبور کر کے نادر شاہ نے ''شاہ مقصود'' نامی بستی میں پڑاؤ ڈالا۔ فوج کے مختلف حصوں کو وہ الگ الگ خطوط پر دیگر شہروں کی فتح کے لیے روانہ کرتا رہا۔ ان چھوٹے شہروں اور قلعوں کی فتح زیادہ مشکل بھی نہ تھی۔ اصل ھدف قندھار کی سنگین فصیلیں تھیں جس کے پیچھے ہزاروں دلیر اَفغانی اس کے مقابلے پر کمر بستہ تھے۔

قندھاریوں کا طریقِ جنگ: قندھار میں شاہ حسین ہوتکی نے مقابلے کے لیے مقدور بھر تیاری کر لی تھی اور دشمن کی آمد کا منتظر تھا۔ جب نادر شاہ دریائے ارغنداب تک آ پہنچا تو ایک شب شاہ حسین ہوتکی نے رات کو اس کے لشکر پر شب خون مارا۔ ایرانیوں کے سنبھلنے سے پہلے قندھاری انہیں خاصا نقصان پہنچا کر غائب ہو گئے۔ نادر شاہ نے جھلا کر فوج کو اسی وقت دریائے ارغنداب عبور کرنے کا حکم دیا اور بلا کسی وقفے کے پیش قدمی کرتے ہوئے قندھار کا محاصرہ کر لیا۔

محاصرہ شروع ہوتے ہی ایرانی توپیں قندھار کی فصیلوں کا حوصلہ آزمانے لگیں۔ شاہ حسین ہوتکی نے یہ دیکھ کر اپنا توپ خانہ قندھار کے پہاڑ کوہ چہل خانہ کی چوٹیوں پر منتقل کرا دیا۔ یہاں سے پورا ایرانی لشکر ان کی زد میں تھا۔ اب ایرانیوں کو برابر کا جواب ملنے لگا۔ توپوں کے آتشیں گولے فریقین کا بے حساب جانی ومالی نقصان کر رہے تھے۔ چونکہ ایرانی فوج کھلے میدان میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی، اس

لیے افغان جانباز اکثر رات کو شب خون مار کر انہیں سخت زک پہنچا رہے تھے۔ ان کا یہ روایتی طریق جنگ ایرانیوں کے لیے سخت نقصان کا باعث تھا۔ دو ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

نادر شاہ نے تنگ آکر ''مزار شیر سرخ'' نامی مقام کے قریب ایک قلعہ تعمیر کرانا شروع کیا۔ تعمیر مکمل ہوتے ہی وہ فوج کا مستقر (پڑاؤ) وہاں لے گیا۔ اس طرح قلعہ بندی کے ذریعے انہیں قندھاریوں کے شب خون سے نجات ملی۔ یہ نو تعمیر شدہ قلعہ بعد میں ''نادر آباد'' کے نام سے مشہور ہوا۔ نادر شاہ نے محاصرے کو سخت اور محفوظ بنانے کے لیے ایک اور عجیب انتظام کیا۔ اس نے قندھار کے اردگرد تقریباً آدھ آدھ میل کے فاصلے پر مضبوط عسکری برج تیار کرائے اور ہر دو برجوں کے درمیان ڈیڑھ ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر محفوظ فوجی بنکر بنوائے۔ ہر بنکر میں دس دس بندوقچیوں کا پہرہ لگایا اور برجوں پر توپیں نصب کرا دیں۔ اس انوکھے انتظام کے بعد ایرانی فوج نقصانات سے محفوظ ہوگئی جبکہ قندھار کے گرد محاصرہ اب اتنا سخت ہوگیا تھا کہ کوئی فرد شہر سے نہیں نکل سکتا تھا۔ کھانے پینے کا سامان لانا بھی ممکن نہ رہا تھا۔ اس کے باوجود قندھاریوں نے ہتھیار نہ ڈالے۔ قندھار کے اردگرد دیگر چھوٹے شہر اور قلعے یکے بعد دیگرے ایرانیوں کے سامنے سرنگوں ہوتے چلے گئے۔ قلات میں سیدال خان نے ان کا جم کر مقابلہ کیا مگر آخر شکست کھانی پڑی، سیدال خان گرفتار ہوا، نادر شاہ نے اسے اندھا کرا دیا۔

ہوتکی سلطنت کا خاتمہ اور شاہ حسین کا قتل: دس ماہ تک قندھار ایرانیوں کے لیے چیلنج بنا رہا، کوہ چہل زینہ پر نصب قندھار کی توپیں برابر گرجتی رہیں مگر آخر کار ایرانی فوج نے عقب سے حملہ کر کے کوہ چہل زینہ پر قبضہ کر لیا۔ ان توپوں کا رخ اب شہر کی طرف کر دیا گیا جس سے شہر کی عمارتیں اور بازار کھنڈر بن گئے۔ ادھر ایرانیوں کی گولہ باری نے قندھار کی فصیل کا دروازہ توڑ ڈالا اور نادر شاہی افواج طوفان کی طرح شہر میں داخل ہوگئیں۔ یہ 1738ء کا واقعہ ہے۔

شاہ حسین ہوتکی نے خود کو دشمن کے حوالے نہ کیا اور شہر کی سب سے بلند سرکاری عمارت ''نارنج'' میں محصور ہوگیا۔ نادر شاہ نے توپ خانے کے ذریعے اس عمارت کے پرخچے اُڑا دیے۔ شاہ حسین ہوتکی زندہ گرفتار کر لیا گیا۔ اسے اس کے بال بچوں سمیت شمالی ایران کے شہر مازندران کے قید خانے میں ڈال دیا گیا اور کچھ عرصے بعد زہر دے کر اسے قتل کر دیا گیا۔ یہ تو شاہوں کا انجام ہوا جو ہمیشہ سیاسی دشمنی کا نشانہ بنا کرتے ہیں مگر قندھار کی فتح کے بعد نادر شاہ نے بے قصور عوام کو بھی نہ بخشا۔ فوج کو جی بھر کے افغانیوں کے قتل عام کی اجازت دی۔ پورے شہر میں لاشوں کے ڈھیر لگ گئے، شاہراہوں اور بازاروں میں موت ہی موت دکھائی دیتی تھی۔

افغانستان کے وسیع الظرف حکمرانوں شاہ محمود اور شاہ اشرف نے جب ایران پر قبضہ کیا تھا تو کسی ایک شہر یا گاؤں کو بھی انتقام کا نشانہ نہیں بنایا تھا مگر ایرانیوں نے دل کھول کر اپنا غصہ بے گناہ عوام پر نکالا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے علم و حکمت اور اسلامی تہذیب و تمدن کے اس صدیوں پرانے گلشن کو مکمل طور پر اجاڑنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ درسگاہیں، بازار، مکانات، سرکاری عمارتیں اور کتب خانے سب کچھ ملیامیٹ کر دیا گیا۔ غرضیکہ افغانستان کی ہوتکی سلطنت جس کی بنیاد حاجی میر خان نے 1709ء میں رکھی تھی، 30 سال بعد ختم ہو گئی۔

مآخذ و مراجع

- ...... افغانستان در مسیرِ تاریخ، میر غلام محمد غبار
- ...... تاریخ تبصجاۓ ملی ایران، جلد 3، عبدالرفیع حقیقت
- ...... Encyclopedia of Islam.V.1
- ...... اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ناشر: دانش گاہ، پنجاب یونیورسٹی

بارہواں باب

نادِر شاہ سے احمد شاہ اَبدالی تک

قندھار کو اجاڑنے کے بعد بھی نادر شاہ کو اطمینان نہ ہوا۔ اسے خدشہ تھا کہ قندھار کے مضبوط ترین قبائل غلجائی اور ہوتکی سے تعلق رکھنے والے افراد یہاں باقی رہے تو کسی وقت حکومت ایران کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ چنانچہ اس نے ان قبائل کو جلاوطن کر کے مغربی اَفغانستان کی طرف ہجرت پر مجبور کر دیا۔ اس کے ساتھ اس نے مغربی اَفغانستان میں ایک عرصے سے آباد ابدالی قبائل کو قندھار میں لابسایا۔ ابدالی قندھار ہی سے تعلق رکھتے تھے مگر ایران کے صفوی حکمرانوں نے ماضی میں انہیں قندھار سے جلاوطن کر دیا تھا۔ نادر شاہ کی اس مذموم سیاست کے باعث ابدالی اور غلجائی قبائل کے مابین نفرت مزید بڑھ گئی۔ یاد رہے کہ غلجائی اور ہوتکی قبائل کا سلسلہ نسب اوپر جا کر ایک ہو جاتا ہے۔ ہوتکی قبیلہ غلجائی قبیلے کی اہم ترین شاخ ہے جو اپنا الگ تشخص رکھتی ہے۔

<u>نادر شاہ کا ہندوستان پر حملہ</u>: قندھار کی فتح کے بعد نادر شاہ پورے اَفغانستان پر قبضے کے ارادے سے مشرقی اور وسطی اضلاع کی جانب بڑھا جو ہندوستان کی مغل حکومت کے ماتحت تھے۔ کابل میں شیر خان اور مشرقی اضلاع میں ناصر خان حکومتِ ہند کے نائبین تھے۔ نادر شاہ نے کسی سخت مزاحمت کا سامنا کیے بغیر انہیں شکست دے دی اور ان تمام علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ جلال آباد تک پہنچ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ مغل حکومت میں دم خم نہیں ہے، اس لیے وہ بلا روک ٹوک درۂ خیبر عبور کر کے پشاور پہنچ گیا۔ اب وہ فاتح اَفغانستان کے ساتھ ساتھ فاتحِ ہند بھی کہلانا چاہتا تھا۔

ہندوستان میں بابر اور شاہ جہان جیسے بلند کردار حکمران قصہ پارینہ بن چکے تھے۔ مغلوں کی عظمت کے آخری نشان اورنگ زیب عالمگیر کا دور بھی گزر گیا تھا اور اب نااہلوں نے تخت سنبھال لیا تھا۔ اس وقت محمد شاہ دہلی کا حکمران تھا۔ تاریخ میں اسے اس کے عیش و تنعم کے باعث ''رنگیلا'' کہا جاتا ہے۔ اس نے نادر شاہ کی آمد کی خبر سن کر جنبش تک نہ کی۔ اسے ہوش اس وقت آیا جب ایرانی افواج لاہور پہنچ چکی

تھیں۔ نادر شاہ لاہور سے دریائے ستلج عبور کر کے کرنال پہنچا، محمد شاہ نے 1739ء میں یہاں آکر اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی مگر شکست کھائی۔ نادر شاہ نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ دہلی کے عوام پر اس نے بے پناہ ظلم ڈھائے، شہر میں خون کی ندیاں بہا دیں۔

لٹا پٹا محمد شاہ اپنی بیٹی نادر شاہ کے نکاح میں دے کر اسے راضی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ نادر شاہ نے 58 دن تک دہلی پر حکومت کرنے کے بعد اقتدار محمد شاہ کو واپس کر دیا مگر اس دوران وہ ہندوستان کا سارا خزانہ لوٹ چکا تھا۔ مغلوں کا نادر و نایاب کوہ نور ہیرا، شاہ جہاں کا بنوایا ہوا شہرۂ آفاق تختِ طاؤس اور کھربوں روپے کی مالیت کے زر و جواہر وہ اپنے ساتھ لے کر اسی سال درۂ خیبر کے راستے افغانستان واپس آ گیا۔ ہندوستان کی مہم سے نادر شاہ کا اصل مقصد یہ تھا کہ اپنے خالی خزانوں کو بھرا جائے اس لیے کہ افغانستان پر قبضے سے اسے کوئی معاشی فائدہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ ہندوستان کے خزانے اسے بھرپور نظر آئے اور وہ انہیں بآسانی لوٹ لایا۔ ایک اندازے کے مطابق 15 ارب روپے نقد اور 12 کھرب روپے کی مالیت کے زر و جواہر اس کے ہاتھ لگے تھے۔

نادر شاہ کا دورِ عروج: نادر شاہ ابتدا میں صفوی ایرانی حکمران طہماسپ ثانی کا ماتحت امیر تھا۔ مگر جب اس کی قوت بڑھ گئی تو وہ آزادانہ مہمات انجام دینے لگا۔ اس دوران طہماسپ سے بھی اس کا نیاز مندانہ تعلق قائم رہا۔ جب وہ افغانستان فتح کر چکا تو طہماسپ ثانی نے اسے جنوبی و مغربی افغانستان سمیت یزد، کرمان اور مازندران کا ایک حد تک خود مختار حاکم بنا دیا اور اسے بیش قیمت جواہر کا ایک تاج بھی بھجوایا۔ یہ اس کی مجبوری تھی اس لیے کہ طاقت کا سارا توازن نادر شاہ کی طرف تھا۔ کچھ عرصے بعد طہماسپ ثانی نے عثمانی ترکوں سے سابقہ تنازعات فراموش کر کے صلح کر لی جس پر نادر شاہ بپھر گیا اور اس نے جبراً طہماسپ کو معزول کر کے جلاوطن کر دیا۔ اس نے عوام کو مطمئن کرنے کے لیے طہماسپ کے شیر خوار بچے عباس ثانی کو برائے نام بادشاہ مقرر کیا اور اس آڑ میں افغانستان و ایران کا مطلق العنان حکمران بن بیٹھا۔ مزید فتوحات کے بعد 27 جنوری 1736ء کو اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا، اس کے ساتھ ساتھ اس کی مہمات کا دائرہ کار اور ظلم و ستم بھی بڑھتا چلا گیا۔ عوام میں اس کے خلاف نفرت پھیلتی گئی، نظامِ حکومت بگڑ گیا، ملک میں شیعہ اور سنیوں کے درمیان اختلافات بڑھ گئے۔ فرقہ وارانہ جھگڑے معمول بن گئے۔

ہندوستان کی مہم کے بعد نادر شاہ کا مزاج مزید تند ہو گیا اور وہ ہر طرف پاؤں مارنے لگا، اس نے عثمانی ترکوں سے بھی ٹکر لی اور آئے دن ان کے خلاف مہمات میں مصروف رہنے لگا۔ اندرونی شورشوں کو دبانے کی مہمات سے بھی وہ کبھی فارغ نہ ہو سکا اور لاشوں کے ڈھیر لگا کر متنفر عوام کو قابو کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

تشدد اور بد نظمی: اس قسم کے حالات نے اس کی طبیعت میں اس قدر شدت پیدا کر دی تھی کہ الامان والحفیظ۔ اس نے کرمان کی بغاوت فرو کرنے کے بعد وہاں تاتاریوں کی رسم کے مطابق مقتولین کی کھوپڑیوں کے مینار بنوادیے تھے۔ مشہد میں ایسا قتل عام کیا تھا کہ ملک بھر میں صفِ ماتم بچھ گئی تھی۔

مالی نظام اتنا ناکارہ تھا کہ ہندوستان سے لوٹی ہوئی دولت کو وہ ذرا بھی کام میں نہ لا سکا۔ وقتی طور پر اس کے خزانے تو پُر ہو گئے مگر بے اعتدالی، بد نظمی اور بدعنوانیوں کے باعث یہ سب کچھ چند سال میں خرچ ہو گیا۔ خالی خزانے اور بوجھل معیشت امراء سلطنت کا منہ چڑانے لگی۔ اَفغانستان و ایران میں ترقیاتی کام نہ ہونے کی وجہ سے شہر اور دیہات نہایت پسماندہ ہو گئے۔ آخرکار نادر شاہ کا یہ ظلم و ستم رنگ لایا اور اس کا برا انجام دبے پاؤں اس کے سر پر آ پہنچا۔ اپنے آخری دنوں میں اس کا دماغی توازن برقرار نہیں رہا تھا۔ وہ معمولی سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتا تھا اور اپنے معتمد ساتھیوں پر بھی اعتبار نہیں کرتا تھا۔ امراء کے لیے اس کے غصے سے محفوظ رہنا مشکل ہو گیا تھا۔

نادر شاہی احکام، ایک مثال: 15 مئی 1741ء کو مازندران کے قلعہ اولاد کے قریب نادر شاہ پر قاتلانہ حملہ ہوا، گھنی جھاڑیوں سے گولی چلی اور نادر شاہ زخمی ہو گیا۔ نادر شاہ کو اپنے بیٹے شہزادہ رضا قلی پر شبہ ہوا کیونکہ شہزادہ باپ سے بہت نالاں تھا۔ نادر شاہ نے اسے گرفتار کر کے تہران بھیج دیا اور غیظ وغضب کے عالم میں حکم دیا کہ اسے اندھا کر دیا جائے۔ نادر شاہی جلال کا یہ عالم تھا کہ امراء کو دم مارنے کی مجال نہ تھی چنانچہ بادل ناخواستہ حکم کی تعمیل کر دی گئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ شہزادہ بے قصور تھا اور حملہ آور دلاور خان نامی ایک سردار کا غلام تھا۔ نادر شاہ پشیمان ہوا اور ساتھ ہی اسے ان امراء پر بے حد طیش آیا جنہوں نے سزا کا فیصلہ سننے کے بعد اس کے سامنے شہزادے کی معافی کی سفارش نہیں کی تھی۔ اضطراب کے عالم میں اس نے ان امراء کو قتل کر دینے کا حکم دیا جو شہزادے کو اندھا کر دینے کا فیصلہ ہوتے ہوئے دربار میں حاضر تھے۔ اس نادر شاہی فرمان پر بھی حسبِ سابق عمل ہوا، وہ امراء قتل کر دیے گئے۔ بعد میں اتنی بڑی تعداد میں امرائے سلطنت کے قتل کے بعد بادشاہ کی حسرت اور بے چینی مزید بڑھ گئی۔

امرائے افشار کے قتل کا فیصلہ: نادر شاہ کے کیمپ میں اَفغان سپاہیوں کی تعداد چار ہزار تھی اور ان کا سردار احمد خان تھا جس کا تعلق ابدالی قبیلے سے تھا۔ یہی وہ احمد خان ہے جو آگے چل کر اَفغانستان کے مستقبل کا سب سے تابدار ہیرا ثابت ہوا، جسے دنیا احمد شاہ ابدالی کے نام سے یاد کرتی ہے۔

ان دنوں نادر شاہ کو کسی نامعلوم حادثے کا خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اپنے خیمے کے قریب ایک گھوڑا ہر وقت تیار رکھتا تھا جس پر زین کسی ہوتی تھی۔ اس نے 1747ء کا جشن نوروز ایرانی روایات کے مطابق

بڑی دھوم دھام سے کرمان میں منایا۔اس کی اگلی منزل مشہد تھی۔راستے میں جو باغی، شورش پسند اور اجل رسیدہ لوگ اس کے سامنے آئے وہ ان سب کو قتل کرتا چلا گیا۔7 جون 1747ء کو اس نے مشہد سے چھ میل دور فتح آباد کے علاقے میں پڑاؤ ڈال دیا۔

افغان سرداروں سے خفیہ گفتگو: نادرشاہ کی اصل طاقت اس کے اپنے قبیلے ''افشار'' کے جنگجو سرداروں کے مرہونِ منت تھی۔افشار قبیلہ ترکمان قبائل کی ایک شاخ تھا۔اس کے امراء نادرشاہ کے انتہائی وفادار ہونے کے باوجود اس کے جنونی فیصلوں سے بڑے بددل ہو چکے تھے۔بادشاہ کو بھی ان کی ناراضی کی بھنک پڑ چکی تھی۔اس نے خفیہ طور پر طے کر لیا کہ تمام درباری امراء کو جن میں ایرانی، قزلباش اور افشار سردار شامل ہیں قتل کر دیا جائے۔اس نے یہ کام انہی افغان سپاہیوں سے لینے کا فیصلہ کیا جن کی قیادت احمد خان کے پاس تھی۔ان افغان سپاہیوں کی ایرانی اور ترکمانی امراء سے رقابت چلی آ رہی تھی۔اس لیے توقع تھی کہ وہ کسی تذبذب کے بغیر اس حکم کی تعمیل کریں گے۔

19 اور 20 جون کی درمیانی شب نادرشاہ نے افغان سرداروں کو خیمے میں بلایا اور ان سے کہا: ''میں اپنے نگہبانوں سے مطمئن نہیں ہوں۔''

نادرشاہ نے مشکوک امراء میں محمد قلی خان، محمد خان قاچار، موسیٰ خان افشار، خوجہ بیگ اور وصی، صالح خان الیوردی اور دیگر 70 کو شامل کیا تھا اور ان سب کو قتل کرانا چاہتا تھا۔اس نے افغان امرا سے کہا: ''میں تمہاری وفاداری کا قدردان ہوں۔میرا حکم ہے کہ ان امرا کو علی الصبح گرفتار کر لو اور جو مزاحمت کرے اسے بے دریغ قتل کر ڈالو۔یہ میری ذاتی سلامتی کا مسئلہ ہے۔جس میں میں صرف تم پر اعتماد کر سکتا ہوں۔''

احمد خان کا کارنامہ: افغان سپاہیوں کے سردار احمد خان نے حکم کی تعمیل کا وعدہ کیا مگر مشکوک امراء کے ایک جاسوس کو نادرشاہ کے اس ارادے کی بھنک پڑ گئی۔اس نے محمد قلی خان کو جو فوج کا اعلیٰ افسر تھا یہ خبر دے دی۔ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر امرائے فوج جمع ہوئے اور نادرشاہ کے خیمے پر حملہ آور ہو گئے۔

صالح خان نے اندر گھس کر نادرشاہ کے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے اور محمد قلی خان نے اس کا سر قلم کر دیا۔ باغی سپاہی اب نادرشاہ کی مستورات پر حملہ کرنا چاہتے تھے کہ اس موقع پر احمد خان افغان سپاہیوں کے ساتھ آڑے آ گیا اور بڑی سرعت سے شاہی خاندان کی خواتین کو خزانے اور دیگر قیمتی سامان سمیت محفوظ مقام پر لے گیا۔اس سامان میں کوہ نور ہیرا بھی تھا۔نادرشاہ کے خاندان کی خواتین احمد خان کی بے حد مشکور ہوئیں اور اسے کوہ نور ہیرا بطور انعام بخش دیا۔

احمد شاہ ابدالی کا خاندان: یہاں آ کر افغانستان کی تاریخ کا ایک نیا، دلچسپ اور ولولہ انگیز موڑ لیتی

ہے۔ بہتر ہے کہ ہم آگے چلنے سے پہلے ذرا احمد خان ابدالی کے ماضی کا جائزہ لے لیں کہ وہ کہاں سے اور کس طرح نادر شاہ کے دربار میں آن پہنچا اور اس نے یہ مرتبہ کیسے پایا کہ تمام ایرانی اور ترکمانی سرداروں کو چھوڑ کر نادر شاہ نے صرف اس کو قابل اعتماد سمجھا۔ اس مقصد کے لیے ہمیں ایک بار پھر پچاس سال پہلے کی طرف لوٹنا ہوگا۔

احمد شاہ ابدالی افغانوں کے ابدالی قبیلے کی مشہور شاخ ''پوپل زئی'' کے خاندان ''سیدوزئی'' سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے والد کا نام زمان خان تھا جو ابدالی قبیلے کا ایک سردار تھا۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ ہوتکی اور غلجائی قبائل کے مردِ آہن حاجی میر خان (میرویس) کے زمانے میں ابدالی قبیلہ قندھار ہی میں آباد تھا مگر اس کے بعد سید عبدالعزیز کی ناروا پالیسیوں کے باعث ابدالی قبیلے کے لوگ اپنے سردار عبداللہ خان کے ساتھ ہرات کی جانب چلے گئے تھے۔

عبداللہ خان نے 1716ء میں ہرات کو ایرانیوں سے آزاد کرا کے وہاں اپنی حکومت قائم کی۔ اس کے جواں سال بیٹے اسداللہ نے طوفانی مہمات کے ذریعے اس حکومت کا دائرہ مزید پھیلا دیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے 1720ء (1132ھ) میں ہوتکی سلطنت کے اہم علاقے ''فراہ'' پر بھی قبضہ کر لیا، مگر ہوتکیوں کے بادشاہ شاہ محمود نے جلد ہی فراہ واپس لے لیا اور جوابی حملے میں اسداللہ مارا گیا۔ اس حادثے نے ابدالیوں اور ہوتکیوں (غلزائیوں) کے درمیان مستقل منافرت کی آگ بھڑکا دی۔ عبداللہ خان اس سانحے سے ایسا شکستہ دل ہوا کہ بستر سے لگ گیا۔

اس دوران احمد شاہ ابدالی کا باپ زمان خان کرمان میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا، وہ ہرات آیا اور ہرات کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ وہ بمشکل دو اڑھائی سال حکومت کر سکا۔ اس کا پورا دورِ حکومت اندرونی سازشوں اور بیرونی خطرات سے نمٹتے ہوئے گزرا۔

احمد شاہ ابدالی کی ولادت: 1722ء (1135ھ) میں زمان خان کو بارگاہ خداوندی سے ایک سعادت مند بیٹا عطا ہوا جس کا نام احمد خان رکھا گیا۔ اکثر مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ احمد خان (احمد شاہ ابدالی) کی ولادت صوبہ پنجاب کے قدیم ترین شہر ملتان میں ہوئی۔ ملتان کی ایک شاہراہ کا نام اسی مناسبت سے ''ابدالی روڈ'' ہے۔ ان مؤرخین کا خیال ہے کہ غالباً زمان خان نے افغانستان بالخصوص ہرات کے حالات کی ناسازگاری کے باعث اپنی بیوی ''زرغونہ علی کوزی'' کو ملتان بھجوا دیا تھا ورنہ ابدالیوں کا ملتان سے کوئی خاص تعلق معلوم نہیں ہوتا......

دوسری طرف مشہور مؤرخ میر غلام محمد غبار (جو ''احمد شاہ بابائے افغان'' کے مصنف بھی ہیں) کا کہنا

ہے احمد شاہ ابدالی کی ملتان میں پیدائش کی روایت عقلاً مستبعد ہے۔ اس کی ولادت ہرات میں ہی ہوئی تھی جہاں اس کا خاندان مقیم تھا۔ بہرصورت احمد خان کی پیدائش کے چند ماہ بعد زمان خان کا انتقال ہو گیا اور حکومت عبداللہ خان کے بیٹے محمد خان کے ہاتھ میں آئی جو کہ زمان خان کا مخالف تھا۔ ان حالات میں احمد خان کی ماں ''زرغونہ'' اپنے نومولود بچے کے ساتھ ''فراہ'' چلی گئی جہاں ابدالی قبیلے کے اس کے رشتہ دار موجود تھے۔

احمد خان کا بچپن اور لڑکپن کیسے گزرا...... اس کے بارے میں تاریخ خاموش ہے...... اتنا معلوم ہوتا ہے کہ غل زئی قبیلے کے سردار حاجی اسماعیل نے اس کی کفالت اور نگہداشت پر خاصی توجہ دی تھی۔ ''زرغونہ'' نے اپنی بیٹی کی شادی حاجی اسماعیل سے کردی اور یوں ان کے تعلقات مزید پختہ ہو گئے۔

ذوالفقار خان کا عروج: اس دوران ہرات میں ایک اور انقلاب آ چکا تھا۔ ہرات کا حاکم محمد خان نا اہل قرار پا کر برطرف کیا جا چکا تھا اور اس کی جگہ احمد خان کا بڑا بھائی ذوالفقار خان حکومت کا امیدوار تھا۔ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر ابدالیوں کی آنکھ کا تارا بن گیا تھا۔ اکابرِ قوم کے مشورے سے وہ حکومت کے لیے منتخب ہو کر کچھ عرصہ ہرات پر راج بھی کرتا رہا مگر ابدالیوں کی نا اتفاقیوں کے باعث اسے جلد ہی یہ منصب چھوڑ کر ''فراہ'' کی حکومت پر اکتفا کرنا پڑا۔ تاہم وہ افغانستان میں ایک بلند سیاسی مقام حاصل کر چکا تھا اور اسے نظر انداز کرنا کسی کے لیے ممکن نہ تھا۔ ذوالفقار خان ایرانیوں سے اپنے وطن کی آزادی کے لیے سب سے زیادہ سرگرم انسان تھا۔ اس مقصد کے لیے وہ ہر طرح ایثار کے لیے تیار تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب افغانستان کے مغرب سے نادر شاہ ایک سرخ آندھی کی طرح نمودار ہو رہا تھا۔ وہ ایران میں غلبہ حاصل کرنے کے بعد ابدالیوں کو تہس نہس کرنے کے لیے 1729ء (1141ھ) میں ہرات کی طرف بڑھا۔ ذوالفقار خان نے ہرات کے نئے حاکم اللہ یار خان سے شدید سیاسی رقابت کے باوجود اس موقع پر اس کی بھرپور مدد کی اور نادر شاہ سے دفاع کے لیے ابدالیوں کا متحدہ محاذ بنا کر زبردست جدوجہد کی۔ مگر نادر شاہ نے ہر مزاحمت کو کچلتے ہوئے 1731ء میں ہرات پر قبضہ کر لیا۔ کچھ دنوں بعد اگلے اقدام کے طور پر اس نے ذوالفقار خان سے ''فراہ'' بھی چھین لیا۔

قندھار کی جیل سے نادر شاہ کے دربار تک: ذوالفقار خان نے اپنے چھوٹے بھائی احمد خان کو جو اس وقت 11 سال کا تھا، ساتھ لیا اور نادر شاہ کے انتقام سے بچنے کے لیے قندھار کی طرف نکل گیا۔ قندھار میں ابدالیوں کے مخالف غلجائی قبیلے کے سردار میر حسین ہوتکی کی حکومت تھی۔ اس نے دونوں بھائیوں کو پناہ دینے کی بجائے قید خانے میں ڈال دیا۔ ایک طویل عرصے تک یہ دونوں تنگ و تاریک کوٹھریوں میں گھٹتے رہے۔

مارچ 1738ء تک وہ قندھار کے قید خانے میں ہی تھے۔ اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ قندھار کی جیل کا ایک خستہ حال نوعمر قیدی کل کو ایشیا کی تاریخ کا ایک نیا باب الٹے گا اور اپنے دور کا فاتح اعظم کہلائے گا۔

جب 1738ء میں نادر شاہ افشار نے قندھار پر قبضہ کیا تو ان دونوں کو قید خانے سے آزاد کر دیا گیا۔ بادشاہ نے دونوں بھائیوں سے اچھا سلوک کیا، اس لیے کہ احمد خان کا بہنوئی حاجی اسماعیل، نادر شاہ کا خاص آدمی تھا۔

نادر شاہ نے 16 سالہ احمد خان کی صلاحیتوں کو ایک ہی نظر میں بھانپ لیا تھا، ویسے بھی وہ ابدالیوں کی جرأت اور جواں مردی کا قائل تھا۔ اس نے احمد خان کو اپنے معتمدین میں شامل کر لیا اور اسے اپنے ذاتی محافظین کا سالار مقرر کر دیا۔ ایک سولہ سالہ نوجوان کو یکدم اتنا اہم عہدہ مل جانا جس کا تعلق نادر شاہ افشار جیسے مطلق العنان حکمران کے ذاتی تحفظ سے تھا، کچھ معنی رکھتا ہے۔ یقیناً احمد خان غیر معمولی شخصیت تھا جسے جوہر شناس نگاہیں لاکھوں میں پہچان لیتی تھیں۔ احمد خان نے نادر شاہ کا اعتماد مجروح نہ کیا۔ اس نے ایران، افغانستان، ہندوستان اور ایشیائے کوچک کی تمام مہمات میں نادر شاہ کے ذاتی تحفظ کا کام بڑی مستعدی سے انجام دیا...... اس کی وفاداری، بہادری، حاضر دماغی، وسعت ذہنی نے نادر شاہ جیسے پتھر انسان کو گرویدہ بنا لیا تھا۔ احمد خان کے ماتحت چار ہزار ابدالی سپاہی ہر وقت نادر شاہ اور اس کے حرم کی حفاظت پر مامور رہتے تھے جنھیں نادر شاہ اپنے اعزہ و اقارب سے بھی زیادہ قابل اعتماد سمجھتا تھا۔

یہ ضرور بادشاہ بنے گا: جب نادر شاہ نے دہلی کے شاہی قلعے پر قبضہ کیا تو مغل وزیر اعظم نظام الملک کی نظر احمد خان پر پڑی۔ نظام الملک قیافہ شناسی میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا: ''یہ نوجوان ایک دن ضرور بادشاہ بنے گا۔'' یہ بات نادر شاہ کے کانوں تک پہنچ گئی۔ وہ نظام الملک کے فن کا معتقد تھا۔ اس نے فوراً احمد خان کو اپنے پاس بلایا اور اپنے خنجر کی نوک اس کے کان میں چبھو کر سرگوشی کی: ''ایک دن تم بادشاہ بنو گے اور اس دن یہ خنجر کا کچوکا تمھیں میری یاد دلائے گا۔''

احمد خان کی خصوصیات اور صفات دیکھ کر نادر شاہ کا یہ یقین روز بروز بڑھتا گیا کہ یہی لڑکا آیندہ چل کر ایران و افغانستان کا حکمران بنے گا۔ وہ اپنے درباریوں سے کھلے عام کہا کرتا تھا کہ ایسا باصلاحیت نوجوان اس نے ایران، افغانستان اور ہندوستان سمیت کسی ملک میں نہیں دیکھا۔

ایک بار اس نے احمد خان کو تنہائی میں اپنے پاس بلایا۔ بالکل قریب بٹھا کر کہا: ''احمد خان ابدالی! میرے بعد بادشاہت تمھیں ملے گی...... تمھاری ذمہ داری ہے کہ میری اولاد کا خیال رکھنا۔ اس کے ساتھ مہربانی کا سلوک کرنا۔''

احمد خان نے اس وصیت پر پورا پورا عمل کیا۔ جب نادر شاہ کو قتل کیا گیا تو یہ احمد خان ہی تھا جس نے جان پر کھیل کر باغی امراء سے شاہی حرم کی حفاظت کی اور بعد میں بھی عمر بھر نادر شاہ کی بیگمات، اولاد اور رشتہ داروں سے نہایت فراخدلانہ سلوک برقرار رکھا۔

احمد خان سے احمد شاہ تک: نادر شاہ کے مرتے ہی اس کا لشکر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ایک طرف ایرانی تھے اور دوسری طرف اُفغانی۔ ایرانی ہر لحاظ سے غالب تھے، ان کی تعداد بھی زیادہ تھی اور ایران واُفغانستان کے اکثر شہروں پر انہی ایرانی حکام کا قبضہ تھا جنہیں نادر شاہ نے مقرر کیا تھا۔ اُفغانی جو احمد خان کی قیادت میں تھے تعداد میں کم اور وطن سے دور تھے۔ ان کی کمزوری بھانپ کر ایرانیوں نے انہیں ختم کر ڈالنے کا تہیہ کر لیا۔ مگر احمد خان ابدالی نے اس موقع پر ایک اٹل فیصلہ کیا۔ اس نے حتمی طور پر طے کیا کہ وہ اپنے اُفغانی سپاہیوں کے ساتھ قندھار پہنچے گا اور وہاں اُفغانوں کو اپنی آزاد حکومت قائم کرنے کی دعوت دے گا۔ اُفغان فوج کے تمام امراء اس معاملے میں اس کے ہم خیال تھے۔ ہر مشکل میں اپنے رب پر توکّل کرنے والا احمد خان ابدالی اپنے ہم راہیوں کو ساتھ لے کر قندھار کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں ''فراہ'' کے قریب ایرانیوں کے ایک لشکر نے ان پر حملہ کیا مگر احمد خان نے انہیں پسپا کر دیا اور بلاتوقف قندھار پہنچ گیا۔

اُفغانستان کے جنوبی علاقوں میں ان دنوں نور محمد خان علی زئی کی حکومت تھی۔ مگر نادر شاہ کے مرنے کے بعد اُفغان امراء کی نظر میں اس کے مقرر کردہ تمام عہدے دار کالعدم ہو گئے تھے۔ اب وہ نئے سرے سے ایک نئے نظام حکومت کی داغ بیل ڈالنا چاہتے تھے۔ انہیں اس سوچ پر مائل کرنے میں بنیادی کردار احمد خان ابدالی ہی کا تھا۔ گویا اس صورتحال میں نور محمد خان زئی کی سیادت بے حیثیت ہو گئی اور اب اُفغانوں کو اپنے مستقبل کے لائحہ عمل کے لیے خود ہی کچھ اہم فیصلے کرنے تھے۔

یہ جولائی 1747ء کے گرم دن تھے، قندھار کے جنوب مشرق میں 4 میل دور واقع بستی نادر آباد کے ''قلعہ شیخ سرخ'' میں تمام اُفغان قبائل کے سردار جمع تھے۔ نور محمد خان نے اپنے سابقہ عہدے کے کالعدم ہو جانے کے بعد ایک جرگہ طلب کیا ہوا تھا تا کہ نیا بادشاہ منتخب کیا جائے اور نئی حکومت تشکیل دی جا سکے۔ غلجائی، ہوتکی، ابدالی، ہزارہ، بلوچ، تاجک اور ازبکوں سمیت متعدد قبائل کے قائدین آٹھ دن تک سر جوڑ کر بیٹھے رہے۔ بحث و مباحثہ جاری رہا مگر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کئی سردار بادشاہت کے خواہش مند تھے۔ جن میں نور محمد خان غلجائی، موسیٰ خان، اسحاق زئی، محبت خان یوسف زئی، نصر اللہ خان نورزئی اور حاجی جمال خان محمد زئی پیش پیش تھے۔ ان کے قبیلے افرادی قوت کے لحاظ سے بھی بڑے

تھے۔ نور محمد خان کو سابق حاکم اور اجلاس کے میزبان ہونے کے لحاظ سے فوقیت حاصل تھی جب کہ حاجی جمال خان محمد زئی اپنی جوڑ توڑ کی سیاست کے باعث جرگے پر چھایا ہوا تھا۔ تاہم بہت سے سردار ان میں سے کسی کو بھی حکمران ماننے کے حق میں نہیں تھے۔ نویں روز بحث وتمحیص جھگڑے کی شکل اختیار کر گئی اور قریب تھا کہ باقاعدہ کشت وخون شروع ہو جاتا کہ یکایک ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

جرگے میں صابر شاہ نامی ایک درویش بھی شریک تھے اصل میں وہ لاہور کے رہنے والے تھے۔ پنجاب اور افغانستان میں ان کی بڑی شہرت تھی۔ ایک عرصے سے وہ قندھار میں مقیم تھے۔ انہیں احمد خان ابدالی سے بڑی محبت تھی۔ احمد خان ابدالی اب تک جرگے کی تمام کاروائی میں خاموشی سے شریک رہا تھا اور صرف تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس کا قبیلہ سیدوزئی افرادی قوت میں کم تھا اس لیے اس کی طرف کسی کی توجہ نہ تھی۔ افرادی لحاظ سے کثرت کے حامل قبائل ہی جرگے کی کارروائی پر چھائے ہوئے تھے۔ اس دوران اچانک صابر شاہ کھڑے ہوئے اور بلند آواز سے گویا ہوئے: ''اللہ تعالیٰ نے احمد خان کو تم سب سے زیادہ بڑا آدمی بنایا ہے۔ افغان خاندانوں میں اس کا خاندان سب سے اونچا ہے۔ تم اللہ کی مرضی کے آگے سر جھکا دو۔''

ان کے الفاظ نے جرگے کے تمام شرکاء پر سکتہ کاری کر دیا۔ حکمرانی کے خواہش مند امراء بھی دنگ رہ گئے۔ وہ تو احمد خان کو بھول ہی بیٹھے تھے جو واقعی ان سب سے زیادہ قابل تھا، اس کا خاندان سیدوزئی گو کہ مردم شماری میں مختصر تھا مگر اس میں شک نہیں کہ وہ ابدالی قبیلے میں سے سب زیادہ محترم خاندان تھا، اس لیے کہ اسی خاندان میں خواجہ خضر خان جیسے صوفی بزرگ گزرے تھے جنہیں افغان آج بھی عقیدت کے آسمان پر بٹھاتے ہیں۔ اسی احترام کی بناء پر سیدوزئی قبیلے کے افراد کو قبائلی قوانین سے مستثنیٰ رکھا جاتا تھا۔ اس کا باپ ہرات کا حاکم تھا اور وہ خود نادر شاہ کا سب سے معتمد جرنیل تھا۔ نادر شاہ اپنے بعد اسی کو تخت وتاج کا وارث سمجھتا تھا، مگر آفرین ہے احمد خان پر کہ وہ جرگے میں سیادت وحکومت کا امیدوار قطعاً نہیں بنا بلکہ اس انتظار میں رہا کہ افغان سردار اس مسئلے کو کسی بھی طرح خود سلجھالیں۔ مگر اب اس کی امید ختم ہو چکی تھی، یہ بات یقینی تھی کہ مزید بحث جاری رہی تو قتل وقتال کی نوبت آجائے گی۔

اس موقع پر صابر شاہ نے حکمرانی کے لیے جب اس کا نام پیش کیا تو سب کو یہ محسوس ہوا کہ واقعتاً یہی شخص اس منصب کا اہل ہے جو انہیں حالات کے گرداب سے نکال کر نجات کے ساحل تک پہنچا سکتا ہے۔ صابر شاہ نے سب کو خاموش دیکھ کر ایک چھوٹا سا چبوترہ بنایا اور احمد خان کا ہاتھ پکڑ کر اسے اس پر بٹھادیا:

''یہ تمہاری سلطنت کا شاہی تخت ہے اور تم بادشاہ۔''

اس طرح اس تاریخی جرگے میں احمد خان ابدالی کی بادشاہت تسلیم کر لی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایران

کی غلامی یا ماتحتی سے اَفغانستان کی مکمل آزادی کا بھی فیصلہ کرلیا گیا۔اعلان کیا گیا کہ آئندہ سے اَفغانستان ایک الگ اور آزاد ملک کے طور پر جانا پہچانا جائے گا جس کا بادشاہ صرف اَفغانی ہوگا۔احمد خان اب احمد شاہ بن چکا تھا۔کچھ دنوں بعد پشاور کے نزدیک ''چمکنی'' کے علاقے کے ایک بزرگ شیخ عمر نے اسے ''دُرِ دوران'' کا خطاب دیا۔جس کا معنیٰ ہے''زمانے بھر کا یکتا موتی''۔احمد خان شاہ نے اسے تھوڑا سا تبدیلی کر کے اپنا لقب ''دُرِ درّان'' رکھا جس کا مطلب ہے:''موتیوں کا موتی'' اسی مناسبت سے اسے ''احمد شاہ درّانی'' کہا جانے لگا......اس کا خاندان بھی آگے چل کر ''دُرّانی'' کہلایا۔

احمد شاہ دُرّانی کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اسے حکمران بننے کے بعد اقتصادی بحران کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ویسے تو اَفغانستان لٹ پٹ چکا تھا، حکومت کے خزانے خالی تھے اور تمام نظام ابتر تھا مگر احمد شاہ کے قندھار پہنچنے سے ایک دن قبل سندھ اور پنجاب میں نادر شاہ افشار کا مقرر کردہ محصّلِ مالیات تقی خان شیرازی اربوں روپے کی مالیت کے اسباب جس میں نقد روپے کے علاوہ ہیرے جواہرات بھی شامل تھے، ساتھ لے کر قندھار پہنچا تھا۔وہ یہ دولت جو 300 اونٹوں پر لدی ہوئی تھی، نادر شاہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لے جا رہا تھا۔احمد شاہ درانی نے تقی خان شیرازی کو حسن سلوک کے ذریعے اپنے دربار سے وابستہ کرلیا اور خزانے کو سرکاری خزانہ قرار دیا۔

اس نے جملہ اَفغان سرداروں کا خوب اعزاز و اکرام کیا، قابل اور کہنہ مشق سرداروں کو بڑے عہدے دیے۔شاہ ولی خان کو وزارت عظمیٰ کا قلمدان دیا، سردار جان عرف جہان خان کو سپہ سالار اعلیٰ بنایا، شاہ سید خان کو امیر لشکر مقرر کیا۔اس حسن تدبیر سے تمام قبائل کے سردار اپنے جتھوں سمیت اس کے وفادار بن گئے۔تاہم کچھ افراد اب بھی نئے بادشاہ کے مخالف تھے اور اس کے خلاف سازشیں کر رہے تھے۔ احمد خان شاہ نے انہیں ڈھیل نہ دی، سختی سے ان کا محاسبہ کیا، کسی کو تدبیر سے زیر کیا اور کسی کا سر قلم کرا دیا۔

احمد شاہ ابدالی نے تخت نشین ہونے کے بعد اپنے نام کا نیا سکہ رائج کیا جس پر یہ شعر کندہ تھا:

حکم شد از قادر بے چوں بہ احمد بادشاہ سکہ زن برسیم و زر از پشت ماہی تا بہ ماہ

(قادرِ مطلق کی جانب سے احمد شاہ کو حکم دیا گیا ہے کہ سونے چاندی کے سکے ڈھالو جو زمین کی سطح سے چاند تک رائج ہوں۔)

دو اہم ترین مسائل: احمد شاہ ابدالی کے سامنے اس وقت دو مسائل سب سے زیادہ اہم تھے ایک طرف تو وہ بیرونی خطرات سے اپنی مملکت کی حفاظت کا ذمہ دار تھا اور دوسری طرف اَفغان قبائل کو منظم کر کے ایک وسیع تر آزاد و خود مختار اَفغان سلطنت کا قیام اس کے پیش نظر تھا۔بیرونی خطرات میں ایران

کے طالع آزماؤں سے اس کی دشمنی کا آغاز نادرشاہ کی موت اور اُفغانستان کے اعلان خودمختاری کے ساتھ ہی ہوگیا تھا مگر ایرانی امراء نادرشاہ کی موت کے بعد طوائف الملوکی کا شکار ہوتے جارہے تھے، اس لیے ان سے فوری خطرہ نہ تھا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ ہندوستان میں مغل حکومت کے کمزور ہونے کے ساتھ ساتھ وسطی ہند میں مرہٹے اور پنجاب میں سکھ روز بروز قوت پکڑ رہے تھے اور خطرہ تھا کہ ان کا سیلاب کسی وقت اُفغانستان کا رُخ نہ کرلے۔ ان بیرونی خطرات کا مقابلہ اندرونی استحکام اور ملکی وحدت کے بغیر ناممکن تھا اس لیے احمد شاہ ابدالی نے سب سے پہلے اُفغان قبائل کی تنظیم پر توجہ دی۔

اس کے پاس پہلا ہتھیار سخاوت اور اعزاز واکرام کا تھا، جس سے وہ بیسیوں سرکش اور بے لگام قبائلی سرداروں کو مسخر کرتا چلا گیا، اس نے بیرونی جنگ سے اس وقت تک احتراز کیا جب تک ماتحت قبائلی سرداروں کی اطاعت پر اس کا یقین نہ ہوگیا۔ اس نے دادودہش سے سب کے دل جیت لیے۔ کچھ دنوں بعد جب اس کے ماتحت سپاہیوں کی تعداد چالیس ہزار تک پہنچ گئی تو اس نے پہلی بار قندھار سے باہر کسی بڑے شہر پر قبضے کے بارے میں سوچ بچار شروع کی۔ اس کے ماتحت چالیس ہزار سپاہیوں کی فوج اُفغانستان کی سب سے بڑی فوج تھی۔ ایک طویل عرصے سے اس خطے میں اتنی بڑی افرادی قوت کسی ایک سردار کے پاس جمع نہیں ہوئی تھی۔ ان میں ابدالی، غلزئی، ہوتکی اور قزلباش قبائل کے افراد زیادہ نمایاں تھے۔

کابل، غزنی اور پشاور کی فتح: احمد شاہ نے سب سے پہلے کابل کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اگرچہ اس وقت ہرات کا شہر زیادہ قابل توجہ تھا مگر کابل کو ترجیح دینے کی ایک قوی وجہ موجود تھی...... مسئلہ یہ تھا کہ کابل میں نصیر خان کی حکومت تھی، یہ بڑا عیار اور فریبی انسان تھا، مغل بادشاہ محمد شاہ اور پھر نادرشاہ کی جانب سے وہ کابل اور گردونواح کا گورنر رہا تھا۔ نادرشاہ کے بعد جب اُفغان مقبوضات میں احمد شاہ ابدالی کی بادشاہت کا اعلان ہوا تو نصیر خان نے اپنی بیٹی کی شادی احمد شاہ ابدالی سے کر کے اس کی خوشنودی حاصل کی۔ احمد شاہ ابدالی نے بھی اسے سابقہ عہدے پر برقرار رکھا یعنی اسے کابل کا گورنر مقرر کردیا...... مگر کابل پہنچتے ہی نصیر خان نے یہ اعلان کردیا کہ وہ مغل بادشاہ کے ماتحت ہے اس کا احمد شاہ ابدالی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

احمد شاہ ابدالی نے اس فتنے کو بلا تاخیر ختم کرنے کی ٹھان لی اور کابل کی طرف کوچ کیا۔ راستے میں غزنی کا گورنر جو نادرشاہ کے مرنے کے بعد خودمختار ہوگیا تھا، آڑے آیا مگر احمد شاہ نے اسے کسی دشواری کے بغیر شکست دے کر غزنی پر قبضہ کرلیا۔ اب وہ کابل کی طرف بڑھا، فوج کشی کے ساتھ ساتھ وہ سیاسی داؤ پیچ بھی استعمال کرنا خوب جانتا تھا، اس نے کابل کے امراء کے نام خطوط لکھ کر انہیں اپنا ہمنوا بنالیا۔

اس کا اثر یہ ہوا کہ جنگ شروع ہوئی تو نصیر خان کے سپاہی بھاگ بھاگ کر ابدالی کیمپ میں جمع ہونے لگے تھے...... نصیر خان مایوس ہو کر پشاور کی طرف نکل گیا اور کابل جو صدیوں سے خراسان و ہند میں تہذیب و تمدن کا منبع اور ریاستی وحدانیت کا مرکز سمجھا جاتا رہا تھا، ابدالیوں کے قبضے میں آ گیا۔

احمد شاہ نے نصیر خان کا تعاقب جاری رکھا اور پشاور آن پہنچا۔ راستے میں اس کی نجابت، عظمت، شجاعت، عالی ظرفی اور فیاضی کی داستانیں ہر جگہ اس سے پہلے پہنچ کر عوام و خواص کو اس کا گرویدہ بنا رہی تھیں۔ اس کی مقبولیت سورج کی کرنوں کی مانند چہار سو پھیل رہی تھی، پشاور تک ہر جگہ اس کا شاندار استقبال ہوا اور تمام قبائل کے سرداروں نے اس کی اطاعت قبول کی۔ یہ شوال 1160ھ (اکتوبر 1747ء) کا واقعہ ہے۔ اس کا حریف نصیر خان پشاور سے فرار ہو کر دہلی پہنچ گیا تھا۔ احمد شاہ کو اب اس سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔

<u>مغل سلطنت کی زبوں حالی اور غیر ملکیوں کا برصغیر میں عمل دخل:</u> احمد شاہ ابدالی سرزمینِ ہند کے ابتر حالات کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ یہاں مرکزیت مفقود ہے۔ ہر صوبہ آزاد اور ہر گورنر نیم خود مختار ہے۔ ہر امیر خود سر اور ہر حاکم بے لگام ہے۔ قدیم مغلوں کی جفاکشی قصۂ پارینہ بن چکی تھی۔ مغلوں کی نئی نسل ''فنونِ لطیفہ'' کی رسیا اور آدابِ جہانگیری سے ناواقف تھی۔ اس دور کے مغل شہزادوں اور امراء میں سے ہر ایک بیک وقت مصور، شاعر اور ادیب تھا۔ راگ راگنی اور رقص و سرود جیسے عجمی فنون میں ان کی معلومات بے پایاں تھیں۔ قصوں، کہانیوں، داستانوں کی سماعت ان کا من پسند مشغلہ تھا۔ ان کی محفلیں شراب و کباب سے آراستہ ہوتی تھیں اور ایران و ترکستان کا حسن ان کی نگاہوں کا محور تھا۔ سلطنت کی نگہبانی سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ تلوار بازی اور گھڑ سواری جیسے عسکری فنون ان کے لیے محض کرتب اور ورزش کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے سامنے کوئی بلند مقصد نہ تھا جس کے لیے انہیں سنجیدہ غور و خوض کی زحمت کرنا پڑتی۔

دہلی کے ایوان حکومت کی اس بدحالی نے سات سمندر پار سے آتے ہوئے انگریزوں کو یہ موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ کلکتہ اور مدراس جیسے اہم شہروں کو اپنا مرکز بنا کر وہاں بڑے پیمانے پر فوجی قوت جمع کر سکیں۔ جنوبی ہندوستان میں ان کے قدم جم چکے تھے اور اورنگ زیب عالمگیر جیسا حکمران بھی اپنی تمام تر بصیرت اور سطوت کے باوجود انہیں قابو میں نہیں رکھ سکا تھا۔ دوسری طرف پنجاب میں سکھوں کی طاقت روز بروز بڑھ رہی تھی اور وسطی ہندوستان میں مرہٹے مغل حکومت کو آنکھیں دکھا رہے تھے۔ احمد شاہ ابدالی جانتا تھا کہ افغانستان ہندوستان کے حالات سے براہ راست متاثر ہوتا ہے لہٰذا افغانستان کے

دفاع کے لیے ہندوستان کی سیاست کی اصلاح لازمی ہے۔ اس عظیم کام کے لیے ضروری تھا کہ ہندوستان میں اس طور پر عسکری مداخلت کی جائے کہ یہاں افغان امراء کا اثر ورسوخ بڑھ جائے اور وہ اپنے اختیارات کے ذریعے انگریزوں، مرہٹوں اور سکھوں سمیت تمام اسلام دشمن عناصر کو لگام ڈال سکیں۔

احمد شاہ ابدالی کی خوش قسمتی تھی کہ اس وقت ہندوستان میں نجیب الدولہ نجیب خان یوسف زئی، سعد اللہ خان روہیلہ اور حافظ احمد خان بنگش جیسے افغان امراء موجود تھے جن کا سلطنتِ دہلی میں ایک خاص مقام تھا اور انہیں عسکری قوت بھی حاصل تھی۔ احمد شاہ ابدالی وقت آنے پر ان سے کام لے سکتا تھا۔

ابدالی پنجاب میں: ان دنوں پنجاب میں مغل حکومت کی جانب سے شاہ نواز خان کو ملتان کا گورنر بنایا گیا تھا۔ اس کا بھائی یحییٰ خان لاہور کا گورنر تھا، دونوں بھائی باہم دست وگریباں تھے۔ شاہ نواز پورے پنجاب کا گورنر بننا چاہتا تھا، اس مقصد کے لیے اس نے اپنے بھائی کو گرفتار کرلیا تھا۔ ادھر مغل حکومت اسے سزا دینے کے لیے تادیبی کارروائی کے طور پر اس کے خلاف فوج کشی کی تیاری کر رہی تھی۔ شاہ نواز خان نے مغلوں سے بچنے کے لیے احمد شاہ سے مدد چاہی۔ پنجاب کی یہ صورت حال بہر حال احمد شاہ کے حق میں ہی تھی۔ ابھی وہ پشاور ہی میں تھا کہ اچانک اسے شاہ نواز کا پیغام ملا کہ وہ پنجاب پر افغانیوں کا قبضہ کرانے میں پورا تعاون کرے گا بشرطیکہ اسے وزیر اعظم بنا دیا جائے۔

احمد شاہ ابدالی نے موقع ضائع نہ کیا اور دسمبر 1747ء کے وسط میں 18 ہزار سپاہی لے کر پشاور سے لاہور کی طرف کُوچ کیا۔ احمد شاہ ابدالی کی لاہور کی جانب پیش قدمی مغل حکومت سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔ مغل حکومت کے وزیر اعظم میر قمر الدین نے جو اپنی فوج کے ساتھ شاہ نواز خان کو غداری کی سزا دینے دہلی سے روانہ ہونے والا تھا، اس موقع پر عجیب سیاسی چال چلی۔ اس نے شاہ نواز خان کو خط وکتابت کے ذریعے یقین دلایا کہ شاہ دہلی اس کی غلطی سے درگزر کر چکے ہیں اور مغل حکومت اس کی مکمل پشت پناہ ہے اور اس کی وفاداری کو شک وشبے سے بالاتر سمجھتی ہے۔ لٰہذا یہ قطعاً مناسب نہ ہوگا کہ مغلوں کا ایسا وفادار گورنر افغانیوں کی غلامی کرتا نظر آئے۔

شاہ نواز خان پر وزیر اعظم کے خط کا ایسا اثر ہوا کہ اس نے اپنی وفاداریاں ایک بار پھر مغل حکومت سے وابستہ کرلیں اور احمد شاہ ابدالی کے استقبال کی بجائے اس سے مقابلے کی تیاریاں کرنے لگا۔ احمد شاہ ابدالی کو شاہ نواز کے عزائم تبدیل ہوجانے کی اطلاع مل گئی تاہم وہ بالکل نہ گھبرایا۔ اس نے جہلم تک کسی روک ٹوک کے بغیر پیش قدمی کی اور قلعہ روہتاس پر قبضہ کرلیا۔ مجذوب پیر صابر شاہ احمد شاہ ابدالی کے لشکر کے ساتھ ساتھ تھے۔ وہ یہاں پہنچ کر لشکر کی روانگی سے پہلے ہی ایک شخص کے ساتھ لاہور کے

اولیائے کرام کے مزارات کی زیارت کے لیے آگے چل دیے۔ جب لاہور پہنچے تو مشہور ہو گیا کہ ابدالی فوج کے ایک بزرگ اپنے عملیات کے ذریعے مغلوں کے توپ خانے کو بے کار بنانے کے لیے شہر میں آئے ہوئے ہیں۔ شاہ نواز خان کو اس کا علم ہوا تو اس نے پیر صابر شاہ کی طرف تفتیشی افسران بھیجے۔

پیر صابر شاہ نے تفتیشی سوالات کے جواب میں کہا: ''میرے یہاں آنے کی وجہ یہ ہے کہ اس شہر سے مجھے اُنس ہے، یہاں کے باشندوں سے محبت ہے...... تمہیں بس اتنا کہتا ہوں کہ تمہاری تلوار احمد شاہ کی تلوار کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔''

بہر کیف پیر صابر شاہ کو گرفتار کر کے شاہ نواز کے روبرو لے جایا گیا۔ انہوں نے شاہ نواز سے کہا:

''شاہ ہند تمہارا خیر خواہ نہیں، تم میرے ساتھ احمد شاہ ابدالی کے پاس چلو، وہ تمہاری عزت کرے گا، تمہیں اس ملک کی وزارت حسبِ وعدہ عطا کرے گا۔''

مگر شاہ نواز نے پیر صاحب کی باتوں سے برافروختہ ہو کر انہیں قتل کرا دیا۔

احمد شاہ ابدالی لاہور میں: احمد شاہ ابدالی نے پیر صابر شاہ کے قتل کی اطلاع ملتے ہی تیزی سے لاہور کی جانب پیش قدمی شروع کر دی اور گجرات سے ہوتے ہوئے سوہدرہ پہنچا۔ یہاں سے اس نے دریائے چناب کو عبور کیا اور دریائے راوی کی طرف بڑھا۔ راوی کے پار اس نے شاہدرہ کے علاقے میں ڈیرے ڈال دیے اور اپنا خیمہ جہانگیر کے مقبرے میں لگایا۔ شاہ نواز خان احمد شاہ ابدالی کی یلغار روکنے کے لیے لاہور شہر کے باہر پڑاؤ ڈال چکا تھا۔ اس کے پاس بھاری بھرکم توپ خانہ بھی تھا جبکہ احمد شاہ ابدالی کی فوج کے پاس چند چھوٹی توپیں اور صرف ایک بڑی توپ تھی۔ شاہ نواز خان کو اپنی برتری کا یقین تھا مگر 2 محرم 1161ھ (12 جنوری 1748ء) کا دن اس کے لیے حیران کن ثابت ہوا، اس دن احمد شاہ ابدالی کا لشکر بڑی خاموشی سے دریائے راوی کو عبور کر کے شالامار باغ پہنچ گیا تھا۔

21 محرم کو اَفغان فوجیں لاہور شہر کی فصیل کی جانب بڑھنے لگیں۔ شاہ نواز خان کے سالار عصمت اللہ خان نے گولہ باری کے ذریعے ان کی نقل و حرکت روکنے کی بھرپور کوشش کی جس کی وجہ سے اس دن اُفغان آگے نہ بڑھ سکے مگر اگلے روز جب دن بھر کی لڑائی کے بعد دونوں فوجیں واپس ہونے لگیں تو اچانک اُفغان بندوقچیوں نے نمودار ہو کر لاہوری لشکر پر دھاوا بول دیا۔ اس اچانک حملے سے لاہوری افواج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ شاہ نواز خان چونکہ پیر صابر شاہ کے قتل کا ذمہ دار تھا۔ اس لیے اسے جاں بخشی کی امید نہ تھی چنانچہ وہ بھی فرار ہو گیا۔

لاہور کی فتح کے بعد احمد شاہ نے پانچ ہفتے وہاں قیام کیا۔ ان دنوں لاہور میں شیخ محمد سعید نقشبندی

بڑے پائے کے بزرگ تھے، احمد شاہ ابدالی بڑی عقیدت کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور دُعاؤں کی درخواست کی۔

مان پور کا میدان جنگ: اس دوران مغل بادشاہ محمد شاہ دہلی میں احمد شاہ ابدالی سے مقابلے کے لیے ایک بڑی فوج ترتیب دے رہا تھا مگر مغلوں کے شاہی تکلفات اس مہم میں تاخیر کا باعث بن رہے تھے۔ ماہرینِ جنگ کی طویل مشاورتی نشستوں، اخراجات کے حساب کتاب، احکام کے سلسلہ وار اجراء اور متعلقہ اداروں کو ہدایات کی ترسیل جیسے لمبے چوڑے مراحل طے ہونے میں نہیں آرہے تھے۔ احمد شاہ کے پشاور پر قبضے کے ساتھ ہی مغل دربار میں ہلچل مچی ہوئی تھی اور روزانہ مشورے ہو رہے تھے مگر لشکر روانہ ہونے میں نہ آتا تھا۔ آخر 8 جنوری 1748ء کو لشکر روانہ ہوا ہی تھا کہ لاہور پر احمد شاہ کے قبضے کی اطلاع دہلی پہنچی جس سے مغل بادشاہ ہکا بکا رہ گیا۔

دہلی سے چلنے والے مغل لشکر نے سرہند پہنچ کر دریائے ستلج کا رُخ کیا کیوں کہ اطلاعات یہ تھیں کہ احمد شاہ لاہور سے اسی طرف آرہا ہے۔ مغل لشکر نے اسے دریا پار کرنے سے پہلے روکنے کے لیے لدھیانہ سے ستلج جانے والی شاہراہ کو چھوڑ دیا اور غیر معروف راستے سے ستلج کی طرف روانہ ہوا تاکہ کم سے کم وقت میں دریا تک پہنچا جا سکے مگر احمد شاہ ابدالی کو پل پل کی اطلاع مل رہی تھیں۔ اس نے حریف کی تدبیر کو اسی پر اُلٹ دیا۔ 12 ربیع الاول (یکم مارچ) کو اس نے دریا عبور کر لیا۔ آگے دہلی تک شاہراہ بالکل صاف تھی۔ اس نے لدھیانہ سے ہوتے ہوئے سرہند پہنچنے میں دیر نہ لگائی اور جاتے ہی شہر اور قلعے پر قبضہ کر لیا۔

مغل افواج کو ستلج کے قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ اُفغانی لشکر دوسرے راستے سے دریا عبور کرکے سلطنت میں اندر تک داخل ہو چکا ہے۔ لشکر واپس مڑا اور سرہند سے کچھ فاصلے پر مان پور میں کیمپ لگا دیا۔ 22 ربیع الاول (11 مارچ) کو مان پور میں دونوں فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ مغل افواج کی تعداد 60 ہزار تھی اور ان کے پاس سینکڑوں توپیں تھیں جبکہ اُفغانوں کی تعداد 30 ہزار تھی اور ان کے پاس صرف ایک دور مار توپ تھی۔ اس کے باوجود احمد شاہ نے اس توپ کو خوب مہارت سے استعمال کیا۔ اُفغانوں نے اس توپ سے اتنے صحیح نشانے لگائے کہ جنگ کے آغاز ہی میں مغل سالاروں، شہزادوں اور وزراء کے خیمے دھڑا دھڑ جلنے لگے۔ صبح آٹھ بجے جنگ شروع ہوتے ہی اُفغانوں کا پہلا گولہ مغل لشکر کے سپہ سالارِ اعلیٰ قمر الدین کے خیمے میں آکر گرا۔ وزیر زخمی ہو کر راہی عدم ہوا۔ اس سے فوج کے افسران میں ایسی بد دلی پھیلی کہ قریب تھا سب وہیں تتر بتر ہو جاتے۔

تاہم وزیر قمر الدین کے بیٹے معین الدین خان نے جو میر مُنّو کے لقب سے مشہور تھا، اس موقع پر فوج

کو سنبھال لیا اور افغانوں کا بڑی پامردی سے مقابلہ کیا۔ افغانوں نے مغل لشکر کے ہندو امراء اور راجپوتوں کو جو لشکر کا بایاں بازو تھے، بری طرح کاٹ کر پیچھے دھکیل دیا مگر دایاں بازو جو میر منّو کی کمان میں تھا افغانوں کے سامنے ڈٹا رہا۔

اس دوران مغل امیر، خان صفدر جنگ بھاری کمک لے کر آن پہنچا جس سے مغل لشکر کو بہت تقویت ملی اور اس نے ایک سیلاب کی شکل اختیار کر لی۔ افغانوں کی لاشوں پر لاشیں گرنے لگیں اور وہ دباؤ کا شکار ہو کر پیچھے ہٹنے لگے۔ افغان بندوقچی اندھیرا پھیلنے تک فائرنگ کرتے رہے تاکہ مغل افواج ان کا تیزی سے تعاقب نہ کر سکیں۔ رات ہوتے ہی لڑائی تھم گئی اور احمد شاہ سرہند کے قلعے میں محصور ہو گیا۔ اس کا خلافِ توقع بہت زیادہ نقصان ہو چکا تھا جس کی وجہ مغل توپ خانے کی آتش باری، صفدر جنگ کی جنگی مہارت اور میر منو کی بہادری تھی۔

احمد شاہ نے سرہند میں زیادہ دیر قیام کو خلاف مصلحت سمجھا، اسے اپنی کمزوری کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ وطن سے سینکڑوں میل دور اور کمک سے محروم تھا۔ تاہم اس نے بڑی ہوشیاری سے نئے حالات کا سامنا کیا اور اس نے اس مہم کو ملتوی کرتے ہوئے حریف پر اپنی کمزوری ظاہر کئے بغیر اس کو صلح کی پیش کش کی۔

میر منو اور شہزادہ احمد نے پیامِ صلح کو رد کر دیا اور اسے دوبارہ میدانِ جنگ میں للکارا۔ احمد شاہ ابدالی جانتا تھا کہ مزید جنگ کا مطلب خودکشی ہے۔ مگر اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ آسانی سے فرار بھی نہیں ہو سکتا۔ جوں ہی وہ سرہند سے نکلے گا، مغل لشکر اس کا تعاقب شروع کر دے گا۔ 27 ربیع الاوّل کو افغان لشکر سرہند کے قلعے سے باہر آ کر دوبارہ صفیں باندھنے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر مغلوں نے بھی صف آرائی شروع کر دی مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ احمد شاہ ابدالی کی چال ہے۔

ایسی عجیب چال احمد شاہ ابدالی ہی چل سکتا تھا، وہ مغل سالاروں کی نظروں کے سامنے اس طرح افغانستان واپس جا رہا تھا کہ کسی کو فرار کا شک بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ افغان لشکر کی اگلی صفیں تلواریں سونتے کھڑی تھیں اور پچھلی صفیں اپنے مال و متاع، بھاری اسلحے اور خزانے سمیت آہستہ آہستہ افق کے دھندلکے میں غائب ہوتی جا رہی تھیں۔ مغل لشکر نے شام تک افغانوں کی اگلی صفوں پر نظر جمائے رکھی، نگران میں کوئی نقل و حرکت نہ پا کر اپنے خیموں میں لوٹ گئی۔

اگلی صبح انہوں نے دیکھا کہ اگلی صفیں بھی غائب ہیں، میدان خالی ہے، وہ آگے بڑھے تو سرہند کے قلعے میں بھی انہیں کوئی افغانی نظر نہ آیا۔ وہ افغانیوں کے تعاقب میں دوڑے مگر اس وقت تک احمد شاہ ابدالی بحفاظت دریائے ستلج عبور کر کے لاہور پہنچ چکا تھا۔

ہندوستان پر دوسری یلغار: مان پور کی جنگ میں احمد شاہ ابدالی کو شکست دے کر میر منو پنجاب کا ہیرو بن چکا تھا اب احمد شاہ ابدالی کو یہ خطرہ تھا کہ میر منو پشاور پر بھی قبضہ نہ کر لے، اس لئے مان پور کی شکست کا بدلہ لینا اس کے نزدیک انتہائی ضروری تھا۔ اس نے زیادہ انتظار نہ کیا اور ہندوستان پر اگلی یلغار کی تیاریاں شروع کر دیں۔

اس دوران 27 ربیع الثانی 1161ھ (15 اپریل 1748ء) کو ہندوستان کے بادشاہ محمد شاہ کے انتقال سے وہاں کی سیاسی صورتحال مزید ابتر ہو چکی تھی۔ احمد شاہ ابدالی نے موقع غنیمت جانا اور 1748ء کے موسم سرما میں پنجاب کی سرحدوں پر پہنچ گیا، پشاور میں اس نے مشہور صوفی بزرگ شیخ عمر سمرقندی کی زیارت کی اور فتح یابی کی دعاؤں کی درخواست کی۔

راستے میں اکوڑہ خٹک کے خٹک قبائل بھی اس کے ہمراہ ہو گئے۔ دریائے چناب کے کنارے پہنچ کر ابدالیوں نے دیکھا کہ دوسری طرف میر منو اپنی فوج لے کر مستعد کھڑا ہے۔ احمد شاہ ابدالی نے وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ کچھ دنوں تک دونوں فوجوں میں معمولی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ کسی بھرپور معرکے کی نوبت نہ آ سکی۔

اس وقت ہندوستانی خزانہ خالی ہو رہا تھا، میر منو کے سپاہیوں نے تنخواہوں کا مطالبہ کیا تو معلوم ہوا خزانہ تنخواہیں ادا کرنے سے قاصر ہے۔ میر منو بہادر بھی تھا اور سخی بھی۔ اس نے اپنے ذاتی اثاثے سے سپاہیوں کی تنخواہیں ادا کیں۔ دہلی کے نئے مغل بادشاہ اور وزیر اعظم اس دوران بالکل لاتعلق تھے۔ انہوں نے میر منو کو کوئی کمک بھیجی نہ مالی امداد۔ ادھر سکھوں نے پنجاب میں مغل حکومت کے لئے نیا خطرہ پیدا کر دیا تھا، ان کا ایک سردار لاہور کے قریب خیمہ زن ہو چکا تھا...... آخر کار میر منو کو اندازہ ہو گیا کہ جنگ کی صورت میں اس کی افواج زیادہ دیر تک جم نہ سکیں گی، چنانچہ اس نے احمد شاہ ابدالی سے مذاکرات کا فیصلہ کر لیا۔

بات چیت کے نتیجے میں فریقین میں ان شرائط پر صلح ہو گئی کہ دریائے سندھ کے مغرب کا تمام علاقہ ابدالیوں کی افغان سلطنت کا حصہ سمجھا جائے گا۔ اس کے علاوہ اورنگ آباد، سیالکوٹ، گجرات کے اضلاع کا محصول بھی قندھار بھجوایا جائے گا۔ ان شرائط پر صلح درحقیقت ابدالی کی بہت بڑی فتح تھی، اس نے کشت وخون کے بغیر وہ کامیابی حاصل کی تھی جو شاید کئی خون ریز معرکوں سے بھی نہ مل پاتی۔ واپسی میں وہ ملتان، ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ اسماعیل خان سے گزرا، ڈیرہ جات کے قبائلی سرداروں سے بھی افغان بادشاہت قبول کرالی۔ احمد شاہ نے ان جاگیرداروں، سرداروں، نوابوں اور وڈیروں کا اقتدار بحال رکھا اور ان کی وجاہت میں کوئی کمی نہ آنے دی۔

میر نصیر خان نوری: میر نصیر خان کا باپ میر عبداللہ خان بلوچستان کے بروہی قبیلے کا سردار تھا۔ قلات

کا علاقہ اس کے پاس تھا، جب اس علاقے پر نادر شاہ افشار نے قبضہ کیا تو نصیر خان اس وقت کم عمر تھا، نادر شاہ نے نصیر خان کو یرغمالی کے طور پر اپنے پاس رکھ کر ذاتی خدمت گار بنالیا۔ ایک دن اسے پیاس محسوس ہوئی تو نصیر خان سے کہا: ''پانی لانا''۔ پانی کی چھاگل ایک اونچی جگہ پر لٹکی ہوئی تھی۔ کم سن نصیر خان کا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا، قریب میں تخت طاؤس جگمگا رہا تھا جو کہ نادر شاہ ہندوستان سے لوٹ کر ساتھ لے آیا تھا۔ نصیر خان تیزی سے اس تخت پر چڑھا اور ہاتھ بڑھا کر چھاگل اتار لی، پیالے میں پانی ڈالا اور نادر شاہ کی خدمت میں پیش کیا، مگر نادر شاہ تختِ طاؤس کو ایک خادم کے قدموں تلے دیکھ کر شدتِ غضب سے انگارہ ہو رہا تھا۔۔ اس نے گرج کر کہا: ''لڑکے تجھے یہ جرأت کیسے ہوئی کہ تخت طاؤس کو روندے۔''

نصیر خان نے ادب سے کہا: ''نادری حکم کی تعمیل کی خاطر جہاں پناہ!''

قریب تھا کہ نادر شاہ اس کم سن بچے کو وہیں قتل کروا دیتا کہ احمد شاہ ابدالی جوان دنوں نادر شاہ کا محافظ افسر تھا، موقع کی نزاکت کو بھانپ کر آگے بڑھا اور نصیر خان کی سفارش کر کے اس کی جان بچالی۔

نادر شاہ کے مرنے کے بعد نصیر خان آزاد ہو گیا اور اس نے قندھار میں نئے بادشاہ کے انتخاب کے لیے تاریخی مشاورت میں بروہی قبائل کی نمائندگی کرتے ہوئے احمد شاہ ابدالی کے حق میں رائے دی۔ حکمران بننے کے بعد احمد شاہ نے اس کی وفاداری کے پیش نظر اسے مناسب عہدہ دیا اور پھر 1749ء میں اسے قلات کا حاکم بنا دیا۔ میر نصیر خان نوری کو بھی احمد شاہ ابدالی کا احسان یاد تھا۔ اس نے ہندوستان اور ایران کی جنگوں میں احمد شاہ کے ساتھ شجاعت کی یادگار داستانیں رقم کیں۔

ہرات کی فتح: اپنے دارالحکومت قندھار واپس آ کر احمد شاہ نے ہرات کی طرف توجہ دی جو ایران کے حکمران شاہ رخ کے نائب امیر خان کے پاس تھا۔ ہرات ابدالیوں کا پرانا گڑھ تھا اور افغانستان کا قدیم سیاسی و اقتصادی مرکز بھی۔ ایران کی سیاست ان دنوں شدید بحران کی کیفیت سے گزر رہی تھی، کسی حکمران کو اقتدار میں زیادہ دن رہنا نصیب نہیں ہو رہا تھا، تخت کے ایک سے زائد دعوے داروں میں کش مکش جاری تھی۔

احمد شاہ نے 1749ء کے موسم بہار میں 25 ہزار گھڑ سواروں کے ساتھ ہرات کا رخ کیا۔ ہرات پہنچ کر معلوم ہوا کہ شہر والے مقابلے پر آمادہ ہیں۔ قلعہ بڑا مضبوط اور فصیل بے حد مستحکم تھی۔ ابدالی لشکر نے نو ماہ کے محاصرے کے بعد بڑی مشکل سے اسے فتح کیا۔ یہ شہر ابدالیوں کا دوسرا وطن کہلاتا تھا۔ احمد شاہ کو اس کی فتح سے نہایت خوشی ہوئی۔ اب قندھار، ہرات، کابل، پشاور اور ڈیرہ جات سمیت ایک بہت بڑا علاقہ، افغانستان کی ابدالی سلطنت کا حصہ بن چکا تھا۔

ایران کی مہم: ہرات کی فتح کے بعد احمد شاہ ابدالی نے ایران کے ان علاقوں کی طرف توجہ کی جو ماضی میں

اُفغانستان کا حصہ رہے تھے اور انہیں خراسان کے قدیم صوبے میں شامل سمجھا جاتا تھا۔ احمد شاہ نے جہاں خان پوپلزئی کی قیادت میں 15 ہزار سپاہی پہلے مشہد کی طرف روانہ کیے اور جنگ چھڑنے کے بعد خود بھی بڑا لشکر لے کر مشہد کی فصیلوں کے سامنے جا پہنچا۔ مشہد کی فتح کے بعد وہ نیشاپور کی طرف بڑھا اور شہر کا محاصرہ کرلیا، مگر زبردست خونریزی کے باوجود وہ شہر کو فتح نہ کرسکا۔ ابھی وہ محاصرہ اُٹھانے نہ اُٹھانے کے بارے میں متذبذب تھا کہ اسے محصورین کی مدد کے لیے ایک لشکر کی آمد کی اطلاع ملی۔ احمد شاہ نے اپنی تھکی ماندہ فوج کے ساتھ اتنی عجلت میں واپسی اختیار کی کہ توپ خانہ، خیمے اور گولہ و بارود سمیت اکثر سامان وہیں چھوڑنا پڑا۔ راستے میں برف باری کی وجہ سے اس کی فوج کو شدید جانی نقصان برداشت کرنا پڑا اور ایک ہی رات میں 18 ہزار سپاہی موت کا نوالہ بن گئے۔ احمد شاہ ابدالی بچی کھچی فوج کے ساتھ ہرات واپس پہنچا تو اس کے سپاہی کمزوری اور فاقوں کی وجہ سے قبروں سے نکلے ہوئے مردے معلوم ہو رہے تھے۔

تاہم احمد شاہ ابدالی کسی کام کو ادھورا چھوڑنے کا عادی نہ تھا۔ وہ جس ہدف کا تہیہ کرلیتا اسے حاصل کیے بغیر چین نہ لیتا تھا۔ چنانچہ 1751ء میں اس نے دوبارہ نیشاپور پر حملہ کیا اور نہ صرف اسے فتح کرلیا بلکہ ایران کے دیگر کئی اہم علاقے بھی زیرِ نگین کر لیے جن میں خاص طور پر سبزوار قابل ذکر ہے۔

شاہ رخ سے صلح: ایران میں احمد شاہ ابدالی کی فتوحات کا دائرہ پھیلتا جا رہا تھا جبکہ خود ایران کے بادشاہ شاہ رخ کا اقتدار برائے نام رہ گیا تھا۔ ان حالات میں شاہ رخ نے محسوس کرلیا کہ احمد شاہ کا مقابلہ ناممکن ہے لہٰذا اس نے احمد شاہ ابدالی سے صلح کی درخواست کی اور اس کی بالادستی تسلیم کر کے امن کا طلب گار ہوا۔ احمد شاہ ابدالی نے یہ درخواست قبول کرلی، طے یہ ہوا کہ اب ایران میں احمد شاہ ابدالی کا سکہ چلے گا اور سرکاری دستاویزات اور احکام بھی اس کی مہر کے بغیر نافذ نہیں ہوں گے۔ احمد شاہ ابدالی بزورِ شمشیر پورے ایران کو فتح کرسکتا تھا اور صدیوں سے ایرانیوں کے ہاتھوں اُفغانوں پر توڑے جانے والے مظالم کا بدلہ بھی لے سکتا تھا مگر اس نے ایرانیوں سے نرم سلوک کیا۔ اس لیے کہ وہ بلاوجہ خونریزی کا قائل نہ تھا۔ ایرانیوں پر ہاتھ ڈالنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ ان کی جانب سے کسی فتنے کا خطرہ نہ رہے اور اب یہ خطرہ ختم ہو چکا تھا۔

ہندوستان پر تیسرا حملہ: ابدالی کو اصل خطرہ مغل حکمرانوں کے علاوہ ہندوستان میں اُبھرنے والی نئی طاقتوں سے تھا جن میں ہندو، سکھ اور فرنگی تینوں شامل تھے۔ ایران کی مہم سے فراغت پاتے ہی اسے ہندوستان کا رُخ کرنا پڑا اس لیے کہ پنجاب میں مغل حکومت کی طرف سے متعین وزیر ''کوڑا مل'' نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پنجاب کا خراج اُفغانستان کو دینے سے انکار کر دیا تھا۔ احمد شاہ

19 نومبر 1751ء کو پشاور پہنچا۔ جنوری 1752ء میں اس نے دریائے راوی کو بڑے خاموشی سے پار کر کے لاہور کی طرف پیش قدمی کی۔ لاہور میں میر منو (میر معین الملک) اور دوسرے مغل امرا نے اس کی راہ روکنے کی کوشش کی۔ یکم جمادی الاولیٰ 1165ھ (6 مارچ 1752ء) کو مغل اور افغان افواج کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ سکھ بھی مغل فوج کے ساتھ مل کر افغانوں کا مقابلہ کر رہے تھے مگر انجام کار احمد شاہ ابدالی فتح مند ہوا۔

میر منو نے شکست کھانے کے بعد قلعہ بند ہو کر مقابلہ کرنا چاہا مگر اس دوران اسے احمد شاہ ابدالی کا خط ملا جس میں لکھا تھا: ''چار ماہ سے مسلمان مسلمانوں کو قتل کر رہے ہیں کیا میدانِ جنگ کے بعد اب تم نے قلعہ بند ہو کر لڑنے کی ٹھان لی ہے؟! کیا آپس کی یہ خونریزی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو پسند ہو سکتی ہے؟ میری رائے یہ ہے کہ شرائطِ صلح طے کرنے کے لیے کوئی قاصد بھیج دو۔ شرائط طے ہونے پر تم خود خوشی خوشی میرے پاس چلے آؤ گے۔ مجھے صرف کوڑا مل (پنجاب کی مغل حکومت کا ہندو وزیر) سے حساب لینا تھا۔ تم اطمینان سے قلعے میں رہو، مجھے تمہارے شہر یا تمہاری جانوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔''

یہ خط پڑھ کر میر منو سیدھا احمد شاہ ابدالی کے پاس چلا آیا۔ احمد شاہ ابدالی بہادروں کا قدردان تھا اسے گزشتہ دو جنگوں میں میر منو کی جرأت کا خوب اندازہ ہو چکا تھا۔ اس نے میر منو کی خوب تعریف کی۔ اس موقع پر افغان فاتح اور مفتوح مغل سالار میں بڑی دلچسپ گفتگو ہوئی۔ احمد شاہ نے پوچھا: ''تم پہلے ہی کیوں نہ اطاعت پر آمادہ ہوئے؟''

''اس وقت مالک کوئی اور تھا۔'' میر منو نے برجستہ جواب دیا۔

''اس مالک نے دہلی سے تمہیں کمک تک نہ بھیجی، آخر کیوں؟'' احمد شاہ نے دریافت کیا۔

''میرے مالک کو مجھ پر اعتماد تھا، اس کا خیال تھا کہ میر منو اتنا مضبوط ہے کہ اسے کمک کی حاجت نہیں۔''

''سچ سچ بتاؤ جوان! اگر میں گرفتار ہو کر تمہارے سامنے آتا تو تم کیا کرتے؟''

''میں آپ کا سر کاٹ کر مغل بادشاہ کے پاس بھیج دیتا۔''

میر منو نے بے خوفی سے کہا۔ احمد شاہ ابدالی کو اس بے باکی پر بڑا تعجب ہوا تاہم اس نے مزید پوچھا: ''اچھا! اب تم میری گرفت میں ہو تو کس سلوک کی توقع کرتے ہو؟''

''اگر تم تاجر ہو تو فدیہ لے کر رہا کر دو اور اگر فیاض بادشاہ ہو تو معاف کرنا بھی تمہارے اختیار میں ہے۔''

میر منو نے صاف گوئی سے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

احمد شاہ نے خوشی سے دو قدم آگے بڑھ کر سرزمینِ ہند کے اس جواں مرد سے معانقہ کیا، اسے خلعت

سے نوازا اور فرزند بہادر خان کا لقب عنایت کیا۔ شرائطِ صلح میں طے یہ پایا کہ میر منو حسبِ سابق پنجاب کا صوبیدار رہے گا اور یہ صوبہ افغانستان کا حصہ مانا جائے گا۔ افغان حکومت اس کے اندرونی معاملات میں دخل نہیں دے گی تاہم اہم معاملات کا حتمی فیصلہ قندھار ہی سے ہوگا۔

کشمیر کی فتح: کشمیر ان دنوں فتنہ وفساد کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مغل حکومت کا وہاں کوئی بس نہیں چلتا تھا۔ جگہ جگہ سرداروں نے آزاد ریاستیں قائم کر کے خانہ جنگی کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے پنجاب کے بعد کشمیر کا رُخ کیا اور اس پورے خطے کو افغانستان میں شامل کر کے واپس ہوا۔ تخت نشین ہونے کے بعد پہلی مرتبہ وہ مسلسل جنگوں کے بعد ایک طویل وقفہ چاہتا تھا۔ اگلے چار برس احمد شاہ ابدالی نے نہایت امن وسکون سے بسر کیے، اس کی مملکت کی حدود بحیرۂ کیسپین کے نواح سے لے کر ہمالیہ کے پہاڑوں تک پھیل چکی تھیں۔ اتنے بڑے ملک میں تعمیری وترقیاتی کاموں کے لیے بھرپور توجہ اور خاصا وقت درکار تھا۔ احمد شاہ نے ان کاموں کو اپنی توجہات کا مرکز بنالیا۔

ہندوستان کا چوتھا سفر: 1753ء کے اواخر میں میر منو کا انتقال ہو گیا، اس کے بعد احمد شاہ ابدالی نے اس کے لڑکے محمد امین کو پنجاب کا حاکم مقرر کر دیا۔ چوں کہ محمد امین کم سن تھا اس لیے اس کی ماں "مغلانی بیگم" نے امورِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ مگر وہ رموزِ سیاست سے واقف نہ تھی اس لیے مخالفین نے پر پرزے نکال لیے اور پنجاب کے انتظامی کی معاملات ابتری کا شکار ہو گئے۔ ان دنوں دہلی میں غازی الدین صدرِ اعظم امورِ حکومت پر چھایا ہوا تھا۔ اس نے محمد شاہ کے بیٹے احمد شاہ کو تختِ دہلی سے ہٹا کر عالمگیر ثانی کو بٹھا دیا اور احمد شاہ ابدالی سے کیے گئے معاہدوں کو پس پشت ڈال دیا۔ 1756ء میں اس نے لاہور پر قبضہ کر کے مغلانی بیگم کو گرفتار کر لیا اور اس کی جگہ اپنے افغان حکومت کے ایک غدار آدینہ بیگ کو حاکم بنا دیا۔ ادھر کشمیر میں سکھ جیون اٹھ کھڑا ہوا اور ابدالی کے مقرر کردہ حاکمِ کشمیر، عبداللہ کو قتل کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا۔

ابدالی کے لیے اب پنجاب کے معاملات کی اصلاح کرنا اور شر پسند عناصر کا قلع قمع کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ 1756ء کے اواخر میں ابدالی لشکر قندھار سے چلا اور بلوچستان وسندھ سے ہوتے ہوئے پنجاب میں داخل ہو گیا۔ آدینہ بیگ خوفزدہ ہو کر فرار ہو گیا اور ابدالی فوج لاہور میں داخل ہو گئی۔ ابدالی کا ایک امیر نور الدین خان یلغار کرتا ہوا کشمیر پہنچ گیا اور سکھ جیون کو حراست میں لے کر وہاں افغان حکومت کا قبضہ بحال کر دیا۔ اس کے بعد لشکر نے دہلی کی طرف کوچ کیا۔ 1757ء کے آغاز کے ساتھ ہی ابدالی فوجیں دریائے جمنا کے پار اُتر چکی تھیں۔

شاہ دہلی عالمگیر ثانی نے اسے روکنے کے لیے نجیب الدولہ کی قیادت میں ایک لشکر بھیجا مگر نجیب الدولہ نے ''کرنال'' پہنچ کر احمد شاہ ابدالی سے ملاقات کی اور اس کی بالادستی قبول کر لی۔ ابدالی لشکر دہلی سے تیس میل دور تھا کہ صدر اعظم غازی الدین جو اس تمام فتنہ بازی کا محور تھا، حاضر ہوا اور نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ پھر خود عالمگیر ثانی نے پایہ تخت سے پندرہ میل باہر آ کر ابدالی کا استقبال کیا۔

28 جنوری کو جمعہ کے دن احمد شاہ ابدالی دہلی کے لال قلعے میں داخل ہوا، اسے معاہدے کے مطابق خراج موصول نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے جبراً مغل وزراء سے یہ رقم وصول کی۔ مغل بادشاہ خوفزدہ تھا کہ اُفغان اسے محکوم بنالیں گے مگر احمد شاہ ابدالی نے اس کے ساتھ عزت وتوقیر کا معاملہ کیا اور اس کے تاج وتخت سے کوئی تعرض نہ کیا۔ احمد شاہ کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر عالمگیر ثانی نے محمد شاہ کی ایک بیٹی اس کے عقد میں، اور اپنی ایک بھتیجی، اس کے بیٹے تیمور شاہ کے نکاح میں دے دی۔ واپس جانے سے پہلے ابدالی لشکر نے متھرا اور بندر بن کے علاقے میں ہندوؤں کی سرکشی کچل ڈالی اور بلب گڑھ میں جاٹوں کی بغاوت کو بھی روند کر انہیں آگرہ تک پسپا کر دیا۔ ہندوستان کے حالات کو پُرامن بنا کر موسم گرما کے آغاز میں ابدالی لشکر واپس قندھار روانہ ہوا۔

پنجاب میں اُفغانوں کو شکست: شمال سے جنوبی ایشیا پر یلغار کرنے والے ہر ترک واُفغان فاتح کے لیے ہندوستان کو اُفغانستان کے ساتھ ایک لڑی میں پرو کر ایک ہی ہیئتِ منتظمہ کے تحت چلانے کا مسئلہ ہمیشہ مشکل ترین ثابت ہوا ہے۔ چوں کہ اُفغانستان سے تعلق رکھنے والے فاتحین اپنے وطن کی محبت سے دستبردار نہیں ہو سکتے تھے، اس لیے وہ اپنا مرکز غور، غزنی یا قندھار ہی میں رکھتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُفغانستان کی سرزمین بڑی شورش زدہ ثابت ہوئی ہے اور کسی حکمران کا وہاں سے قدم باہر نکالنا ہمیشہ بغاوت کے طوفانوں کو دعوت دینے کے مترادف ثابت ہوتا آیا ہے۔ یہ اس ملک کی شورش زدگی ہی تو تھی جس کی وجہ سے محمود غزنوی اپنے سترہ حملوں کے دوران ہندوستان میں کبھی ایک برس بھی مکمل قیام نہ کر سکا کیوں کہ ہر حملے کے بعد شمال مشرق میں کوئی نہ کوئی مہم اس کی منتظر ہوتی تھی جس کے باعث اسے جلد واپس جانا پڑتا تھا۔ شہاب الدین غوری کو بھی اسی قسم کی صورتحال سے دوچار رہنا پڑا۔ بابر نے کوشش کی ہندوستان میں رہ کر اُفغانستان کو زیر نگین رکھا جائے، اس کے جانشین مغل بادشاہ اسی پر عمل پیرا رہے مگر یہ پالیسی بھی کامیاب نہ رہی اور آخر کار اُفغانستان مغل حکمرانوں کے قبضے سے نکل گیا۔

احمد شاہ ابدالی کو بھی اس قسم کی مجبوریاں دامن گیر تھیں، ہندوستان پر متعدد حملے کرنے اور بادشاہ دہلی تک سے خراج وصول کرنے کے باوجود اسے بہر حال اُفغانستان واپس جانا پڑتا تھا اور اس کے جاتے ہی حالات

قابو سے باہر ہونے لگتے تھے۔ چوتھے حملے کے بعد احمد شاہ نے پنجاب میں اپنے بیٹے تیمور شاہ کو نائب اور جہاں خان کو سپہ سالار مقرر کیا۔ اس کی واپسی کے بعد شاہ دہلی کے فتنہ پرور وزیر غازی الدین نے نت نئی سازشیں شروع کر دیں۔ اس نے حد درجے نمک حرامی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مرہٹہ سرداروں رگھوناتھ راؤ اور ملہار راؤ ہولکر کو دہلی پر حملے کی دعوت دے دی تاکہ شاہ عالمگیر ثانی کو ابدالی سے صلح کی سزا دی جائے۔

مرہٹے ایک طوفان کی طرح دہلی پہنچے اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ متواتر 27 دن تک محصورانہ جنگ ہوتی رہی۔ آخر عالمگیر ثانی نے ہولکر راؤ کو بھاری مقدار میں سیم وزر دے کر وقتی طور پر محاصرہ ختم کرایا۔ ادھر غازی الدین سکھوں کو افغانوں کے خلاف بغاوت پر برانگیختہ کر رہا تھا جو پہلے ہی شمال کے مسلم غازیوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ انہوں نے اشارہ پاتے ہی امرتسر کے چک گرد میں بہت بڑے پیمانے پر جتھے بندی شروع کر دی اور گرد و نواح میں اودھم مچانے لگے۔ ابدالی کے نائب جہاں خان نے لاہور میں یہ خبر سنی تو اعلان کرا دیا کہ ہر وہ شخص جس کے پاس گھوڑا ہے، چاہے وہ سرکاری ملازم ہو یا نہ ہو، سکھوں سے جہاد کے لیے اس کے ساتھ چلے۔ اس طرح جہاں خان دو ہزار گھڑ سوار مجاہدین کا لشکر لے کر صرف چھتیس گھنٹوں میں لاہور سے امرتسر جا پہنچا...... مگر یہاں پر سکھوں کی تعداد ان کے اندازے سے بہت زیادہ تھی، گھمسان کی جنگ شروع ہوگئی، مسلمان سکھوں کے گھیرے میں آگئے، قریب تھا کہ انہیں شکست ہو جاتی کہ عطائی خان نامی ایک امیر توپ خانے اور تازہ دم سپاہ کے ساتھ پہنچ گیا، چنانچہ میدان جنگ کا پانسا پلٹ گیا اور سکھ بھاگ نکلے۔ اس لڑائی کے بعد سکھوں نے پنجاب سے افغانوں کو نکالنے کے لیے مضبوط منصوبہ بندی کی۔ غازی الدین کا پرانا نمک خوار آدینہ بیگ اس موقع پر اپنی فوج سمیت ان کے ساتھ تھا۔ یہ غدار سردار سکھوں کو لے کر ضلع ہشیار پور کے قریب افغان فوج سے نبرد آزما ہوا، اس خون ریز لڑائی میں افغانوں کو شکست فاش ہوئی۔ بڑے بڑے افغان امراء شہید ہوگئے، لشکر کا تمام ساز و سامان سکھوں نے لوٹ لیا، اب انہیں کوئی روکنے والا نہ تھا چنانچہ انہوں نے پورے پنجاب اور دوآبہ میں لوٹ مار شروع کر دی، جالندھر کو بالکل تاراج کر دیا، اور لاہور کے نواحی دیہاتوں پر آئے دن حملے کرنے لگے۔

ربیع الثانی 1171ء (جنوری 1758ء) میں صوبائی مرکز لاہور کا ایک اور افغان سردار عبیداللہ خان پچیس ہزار سواروں کا لشکر لے کر سکھوں سے مقابلے کے لیے نکلا مگر اسے بھی بری طرح شکست ہوئی۔ پنجاب کے سپہ سالار اعلیٰ جہان خان نے اس صورتحال سے سخت خفت محسوس کی، احمد شاہ ابدالی کے بیٹے تیمور شاہ کو بھی باپ کے سامنے ان مسلسل شکستوں کا حساب دینے کا خوف تھا، یہ دونوں اس صورتحال سے نمٹنا چاہتے تھے مگر ابھی تو انہیں اس سے زیادہ مصائب کا سامنا کرنا تھا۔ غدار آدینہ بیگ نے پونا

کے مرہٹے راجا بالا جی راؤ پیشوا کے بھائی رگھوناتھ راؤ سے رابطہ کر کے اسے پنجاب پر حملے کی دعوت دی، رگھوناتھ اپنا لشکر لے کر آیا تو پنجاب کے سکھ بھی اس کے ساتھ مل گئے۔ ان سب کا مقصد ایک ہی تھا یعنی پہلے افغانوں کو پنجاب سے پھر مغلوں کو دہلی سے نکالنا۔ اس طرح وہ ہندوستان سے اسلامی سلطنت کی ہر علامت کو ختم کر کے مرہٹہ اور خالصہ راج قائم کرنا چاہتے تھے۔

مارچ 1758ء میں مرہٹوں اور سکھوں نے پنجاب کے اہم شہر سرہند پر قبضہ کر کے مسلمانون کا قتل عام شروع کر دیا۔ عبدالصمد مہمن زئی سمیت کئی افغان امراء گرفتار ہو گئے، سکھوں، مرہٹوں اور دیہاتی ہندوؤں نے تین تین دن تک باریاں مقرر کر کے سرہند کے مسلمانوں کو جی بھر کے لوٹا۔ ان کے گھروں کے دروازے تک اکھاڑ لیے گئے اور گھروں کے فرش تک کھود ڈالے۔ شہر میں کوئی شے باقی نہ رہنے دی۔ سب کچھ لیٹروں کے ہاتھ لگ گیا۔

احمد شاہ ابدالی کا بیٹا تیمور شاہ سرہند کے محاصرے کی خبر پاتے ہی جہان خان کے ساتھ ادھر روانہ ہو چکا تھا۔ مگر راستے ہی میں انہیں سرہند کے سقوط کی خبر ملی اور یہ بھی پتا چلا کہ حریف افواج اب لاہور کی طرف بڑھ رہی ہیں۔

لاہور میں کافی سامان رسد موجود نہ تھا، قلعہ اور فصیل بھی شکستہ تھے۔ چاروناچار تیمور شاہ اور جہان خان نے 18 اپریل کو لاہور خالی کر دیا اور اپنے تمام اہل خاندان متعلقین اور سپاہیوں کے ساتھ دریائے راوی عبور کر کے اٹک کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس کے فوراً بعد مرہٹے اور سکھ لاہور پہنچ گئے، شہر پر قبضہ کر کے انہوں نے پسپا ہوتے ہوئے افغانوں کا تعاقب شروع کر دیا۔ وہ افغان سپاہی جو کشتیاں نہ ہونے کے سبب دریائے راوی پار نہ کر سکے تھے۔ سکھوں کے ہتھے چڑھ گئے۔

میر نصیر خان کی بغاوت: سکھوں اور مرہٹوں کے پنجاب پر قبضے نے احمد شاہ ابدالی کے ستارہ سعادت کو گہنا دیا تھا۔ اس صورتحال میں اس کے کچھ قریبی دوست بھی اس سے دشمنی پر اتر آئے۔ ان میں میر نصیر خان نوری بھی شامل تھا۔ نصیر خان نے احمد شاہ ابدالی کے دائرہ اقتدار کو دوبارہ افغانستان میں سمٹتا دیکھ کر قلات میں اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ احمد شاہ نے اسے سمجھانے بجھانے کی متعدد بے سود کوششوں کے بعد شاہ ولی خان کو ایک لشکر دے کر قلات بھیجا۔ نصیر خان نے مستونگ کے میدان میں اس کا مقابل کر کے اسے تیس میل پیچھے دھکیل دیا۔

اس ہزیمت کی خبر سن کر احمد شاہ ابدالی خود مستونگ پہنچ گیا۔ اس بار نصیر خان قلات کے قلعے میں محصور ہو گیا آخر کار اس کو شکست ہوئی۔ اس نے جان بخشی کی درخواست کرتے ہوئے ہتھیار ڈال دیے۔

احمد شاہ نے اسے معاف کر دیا۔ نصیر خان نے اس موقع پر عرض کیا ''بہتر معلوم ہوتا ہے کہ خادم آپ کی خدمت میں قندھار میں رہے اور قلات آپ جسے چاہیں عنایت کر دیں۔'' احمد شاہ نے کہا: ''قلات اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا کیا تھا، یہ تمہارے پاس ہی رہے گا۔'' یہی نہیں بلکہ ابدالی نے اپنے خاندان کی ایک لڑکی نصیر خان نوری کے نکاح میں دے کر اس کی عزت میں اور اضافہ کر دیا۔ تاریخ کا طالب علم احمد شاہ کی اس قدر فراخ دلی پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ حد یہ ہے کہ اس جنگ کے دوران ایک بار احمد شاہ ابدالی خیمے کے باہر نماز پڑھ رہا تھا، نصیر خان نے قلعے سے توپ کی سیدھ باندھ کر ایسا گولہ پھینکا کہ احمد شاہ ابدالی کے عین مصلے پر آ گرا۔ یہ دلیر بادشاہ بال بال بچا۔ اب نصیر خان دست بستہ اس کے سامنے حاضر ہوا تو احمد شاہ نے جہاں اس پر دیگر عنایات کیں وہاں اس بہترین نشانہ بازی پر اس کی تعریف بھی کی۔

<u>ہندوستان میں مرہٹوں کا فساد</u>: احمد شاہ بلوچستان کی مہم سے نمٹا تو ایک بار پھر ہندوستان کا محاذ اس کا منتظر تھا اور اس بار اس کا نقشہ پہلے سے کہیں زیادہ گھمبیر تھا۔ اب اس کے مقابلے میں مغل نہ تھے بلکہ سکھوں اور مرہٹوں کی وہ بے لگام قوت تھی جو بادِ صرصر کی طرح اسلامی تہذیب کے گلشنوں کو اجاڑتی چلی جا رہی تھی۔ پنجاب کی دولتِ اَفغانی کے بعد اب دہلی میں مغل بادشاہت کا دم لبوں پر تھا۔

1758ء کے موسم گرما میں مرہٹہ سردار رگھوناتھ دہلی کے نمک حرام سابق وزیر غازی الدین کے اکسانے پر ہندوستان کی بچی کھچی اسلامی ریاستوں کو فتح کرنے نکل کھڑا ہوا تھا۔ اس لشکر میں ہولکر اور دیتا جی سندھیا کی افواج بھی شامل ہو گئیں۔ یہ فوج دیکھتے ہی دیکھتے دہلی جا پہنچی اور اسے محاصرے میں لے لیا۔ اس کے بعد فوج کا ایک حصہ سندھیا کی قیادت میں روہیل کھنڈ کو نواب نجیب الدولہ سے اور اودھ کو نواب شجاع الدولہ سے چھیننے کے لیے روانہ ہوا۔ غازی الدین کی فوج بھی اس کے ساتھ تھی۔ نجیب الدولہ نے سکرتال کے مقام پر سندھیا اور غازی الدین کی مشترکہ افواج کا بڑی پامردی سے مقابلہ کیا مگر مرہٹے پسپا ہونے میں نہ آئے۔

اس دوران سندھیا، غازی الدین اور اپنے نائب گوبند رام کو روہیل کھنڈ کے محاصرے میں مشغول چھوڑ کر خود لشکر کے ایک حصے کے ساتھ پنجاب کی طرف بڑھا جہاں آدینہ بیگ اور سکھوں کی فوجیں اس سے آملیں اور یہ سیلِ بے اماں دریائے ستلج عبور کر کے پشاور تک مار دھاڑ کرتا چلا گیا۔ پھر یہ لشکر مشرق کی طرف مڑا اور دریائے ستلج عبور کر کے سہارنپور، اودھ اور روہیل کھنڈ کی طرف بڑھنے لگا جہاں مرہٹے نجیب الدولہ سے جنگ جاری رکھے ہوئے تھے۔ سندھیا کی آمد سے یہ محاذ گرم تر ہو گیا۔ تاہم نواب سعداللہ خان اور حافظ رحمت خان کی امدادی افواج کی آمد سے نجیب الدولہ کی کمر مضبوط ہو گئی اور مرہٹے روہیل

کھنڈ کو فتح نہ کر سکے۔ ادھر مرہٹوں کے عمومی کمانداز، رگھوناتھ نے پنجاب کو مسخر اور دہلی کو قدموں پر جھکتا دیکھ کر ہولکر کو امدادی لشکر کے طور پر دریائے جمنا کے مغربی کنارے پر ٹھہرادیا اور خود اپنی فتوحات کی خوشخبری دینے اور آئندہ کی منصوبہ بندی کرنے اپنے مرکز ''پونا'' چلا گیا۔ اس دوران ہولکر نے نومبر 1758ء میں پشاور پر بھی قبضہ کرلیا۔ افغانوں کے پنجاب سے مکمل انخلاء اور پشاور پر ہولکر کے قبضے کے بعد مرہٹوں کی ہمت بہت بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے اپنے مرکز ''پونا'' میں ایک بہت بڑی مشاورت کا اہتمام کیا جس میں تمام مرہٹے سردار جمع ہوئے۔ مرہٹوں کے سربراہ بالاجی پیشوا نے سب سے دریافت کیا کہ اپنے اقتدار کو عروج تک لے جانے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے اور زوال پذیر مغل سلطنت سے جلد از جلد کیسے نجات حاصل کرجائے؟ نیز احمد شاہ ابدالی کا زور کیسے توڑا جائے۔

سپہ سالار سداشیو پنڈت بھاؤ نے پر جوش لہجے میں کہا: ''محمود غزنوی کے حملوں سے ہمارے دلوں پر جو زخم لگے وہ صدیاں گزر جانے کے باوجود اب تک مٹے نہیں۔ ہم سومنات کی مورتی کی بے عزتی نہیں بھولے۔ آج ہمارے پاس اتنی قوت ہے کہ ہم مسلمانوں سے بدلہ لے سکیں۔ سومنات کی مورتی ہم شاہ جہاں کی تعمیر کردہ جامع مسجد دہلی کے منبر پر نصب کریں گے اور افغانستان میں گھس کر محمود غزنوی کا مقبرہ مسمار کردیں گے۔''

بالاجی پیشوا نے اس کے جذبات کو سراہتے ہوئے کہا: ''میرا ارادہ تو اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ میں ہندوستان کو مسلمانوں سے صاف کر دینے کے بعد ایسا انتظام کر دینا چاہتا ہوں کہ آئندہ کوئی مسلمان قوت ہمارے ملک پر حملے کا تصور بھی نہ کر سکے۔''

بالاجی کی رانی نے جنگی حکمت عملی کے بارے میں رائے دیتے ہوئے کہا: ''ہمارا بڑا بیٹا بسواس راؤ فوج کے ساتھ پہلے دہلی جا کر مغل بادشاہ کی جگہ خود تخت نشین ہو جائے اور فوج کی کمان سداشیو بھاؤ کے ہاتھ میں دے کر اسے پنجاب روانہ کر دیا جائے، وہ پنجاب کو روندتے ہوئے افغانستان میں داخل ہو جائے۔ ہم پونا سے اسے کمک بھیجتے رہیں گے۔''

رانی کی اس تجویز سے سب نے اتفاق کرلیا، کیوں کہ سب کے دلی جذبات یہی تھے کہ مسلمانوں کا افغانستان تک تعاقب کیا جائے اور ہندوستان ہی نہیں گردونواح کے ممالک میں بھی ان کی طاقت باقی نہ رہنے دی جائے۔

اس تاریخی مشاورت کے فیصلے نے ہندوؤں میں جوش اور امنگوں کی ایک لہر دوڑا دی اور ہر طرف سے مرہٹے سردار اپنی اپنی فوجیں لے کر پونا میں جمع ہونے لگے۔ ہندوؤں کو یقین تھا کہ عن قریب پوری

دنیا کے مالک وہی ہوں گے، ہر طرف ان کے بتوں کی خدائی تسلیم کی جائے گی اور مسلمانوں کا نام ونشان تک باقی نہیں رہے گا۔ مرہٹوں کے مرد وزن جوق در جوق اس مذہبی جنگ میں حصہ لینے کے لیے اپنی خدمات پیش کر رہے تھے۔ مالدار ہندو سیٹھ لاکھوں روپیہ نچھاور کر رہے تھے، عورتیں مندروں میں دیوتاؤں کے سامنے گڑگڑا رہی تھیں، ہر نوجوان فوج میں بھرتی کے لیے بے چین تھا تا کہ کابل اور قندھار کی لوٹ مار میں اسے بھی حصہ مل سکے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دھلوی رحمہ اللہ کا مکتوب: وسطی ہندوستان میں مرہٹوں اور پنجاب میں سکھوں کی فتنہ سامانی کے باعث احمد شاہ ابدالی کی ایک بار پھر اس ملک میں مداخلت ناگزیر ہو چکی تھی۔ اس سے قبل وہ یہاں چار بڑی مہمات سر کر چکا تھا۔ مگر اب حالات بتا رہے تھے کہ جب تک بت پرستوں کی سرزمین کے قلب میں گھس کر مرہٹوں کی کمر نہ توڑ دی جائے یہاں مسلمانوں کا مستقبل ہرگز محفوظ نہیں رہ سکتا۔ ان دنوں دہلی کے عظیم محدث حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ جنہوں نے برصغیر میں حدیث کی اشاعت میں سب سے بنیادی کردار ادا کیا تھا، مرہٹوں کے طوفان سے بڑا اندیشہ محسوس کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ احمد شاہ ابدالی ایک بار پھر ہندوستان آکر یہاں کے مسلمانوں کا نجات دہندہ ثابت ہو۔ ہندوستان کی سیاست کا اہم رکن نواب نجیب الدولہ بھی ان کا ہم فکر تھا۔ اس نے زوال پذیر سلطنت دہلی کا سارا انتظام سنبھالا ہوا تھا اور احمد شاہ ابدالی سے بڑی عقیدت مندی رکھتا تھا۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے نواب نجیب الدولہ کی معرفت احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان کے مشرکین کے خلاف بھرپور حملے کی دعوت دی اور اپنے خط میں تحریر فرمایا:

> ”ہم اللہ بزرگ و برتر کے نام پر آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ اس طرف توجہ فرما کر دشمنانِ اسلام سے جہاد کریں تا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ کے نامۂ اعمال میں اجرِ عظیم لکھا جائے اور آپ کا شمار اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں میں ہو جائے۔ آپ کو دنیا میں بے اندازہ غنیمتیں حاصل ہوں اور مسلمانوں کو کفار کے چنگل سے نجات حاصل ہو۔“

احمد شاہ ابدالی کو مرہٹوں کے اس سیلاب کا علم ہو چکا تھا جو پونا سے پنجاب کی طرف اُمڈ رہا تھا۔ اب تک اسے اتنے بڑے لشکر سے مقابلے کا کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا اس لیے اپنے وطن سے سینکڑوں میل دور کمک کے بغیر ایک بہت بڑی اور غیر یقینی جنگ لڑنے کا تصور اس کے لیے پریشان کن تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے احمد شاہ ابدالی کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے اسے تحریر فرمایا: ”مرہٹوں کو شکست دینا آسان کام ہے، شرط یہ ہے کہ مجاہدینِ اسلام کمر کس لیں...... درحقیقت مرہٹے تعداد میں

زیادہ نہیں مگر دوسرے بہت سے گروہ ان کے ساتھ شامل ہو چکے ہیں۔ ان میں سے اگر ایک گروہ کی صف کو بھی تتر بتر کر دیا جائے تو مرہٹے اس شکست سے کمزور ہو جائیں گے۔ مرہٹہ قوم طاقت ور نہیں ہے۔ ان کی توجہ بس اپنی افواج جمع کرنے پر ہے جو تعداد میں چیونٹیوں اور ٹڈیوں سے بھی زیادہ ہو۔ جہاں تک شجاعت اور عسکری ساز وسامان کا تعلق ہے وہ ان کے پاس زیادہ نہیں ہے۔''

ہندوستان کی پانچویں مہم: حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے ان پُرسوز، بصیرت افروز اور حوصلہ انگیز خطوط نے احمد شاہ ابدالی کی ہمت کو مہمیز دی اور ملتِ اِسلامیہ کا یہ شمشیر زن ہر خوف وخطر سے بے پروا ہو کر ہندوستان پر اس یادگار حملے کے لیے تیار ہو گیا جس نے تاریخ میں اس کا نام ہمیشہ کے لیے نقش کر دیا۔ انہی دنوں دہلی کے مغل بادشاہ عالمگیر ثانی کی جانب سے بھی احمد شاہ کو مرہٹوں کے خلاف فوج کشی اور سلطنت دہلی کی گرتی ہوئی ساکھ کی حفاظت کے لیے باضابطہ دعوت نامہ موصول ہوا جس کے بعد احمد شاہ کے لیے رکنے کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔

وہ 1173ھ (ستمبر 1759ء) میں قندھار سے 15 ہزار سواروں کے ساتھ ہندوستان روانہ ہوا۔ درّہ بولان عبور کر کے وہ بلوچستان سے ہوتے ہوئے 3 ربیع الاول 1173ھ (25 اکتوبر 1759ء) کو 40 ہزار سپاہیوں کے ساتھ سندھ پہنچا اور پنجاب سے کنی کتراتے ہوئے پشاور کا رخ کیا۔ اٹک میں شہزادہ تیمور شاہ اور سابق حاکم لاہور جہان خان اپنی نفری کے ساتھ اس سے آملے۔ پنجاب کے نئے مرہٹہ حاکم سانبھا نے اَفغان لشکر کی آمد کی خبر سنی تو لاہور خالی کر دیا اور اپنے جتھے سمیت بھاگ کر سہارنپور میں سندھیا کے کیمپ میں پناہ لی۔ احمد شاہ کا لشکر پنجاب میں داخل ہوا تو سکھوں کو بھی سانپ سونگھ گیا اور وہ اپنے گھروں میں دبک گئے۔

لشکرِ ابدالی دریائے چناب کے کنارے پہنچا تو وزیر آباد کا سابق اَفغان حاکم نورالدین بھی اپنے ساتھیوں سمیت آن پہنچا۔ قطب درّہ کے مقام سے ابدالی نے دریا عبور کیا اور سہارنپور کی طرف پیش قدمی شروع کر دی جہاں سندھیا کا کیمپ تھا۔ سندھیا جی اور غازی الدین کو اَفغان لشکر کے قریب تر آنے کا پتا چلا تو روہیل کھنڈ اور اودھ کی فتح کا نشہ ہرن ہو گیا۔ انہوں نے فوراً نجیب الدولہ اور شجاع الدولہ سے صلح کی اور دہلی کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے تاکہ اَفغانوں کی آمد سے پہلے پہلے وہاں اپنی مرضی کا سیاسی نظام قائم کر دیں۔

شاہ عالمگیر ثانی کا قتل اور ابدالی کی یلغار: احمد شاہ مرہٹوں سے فیصلہ کن جنگ میں تاخیر نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے اسے دہلی پہنچ کر مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کے اس قدیم مرکز کو مرہٹوں کی لوٹ

مار اور غازی الدین جیسے غدار ملت کی سازشوں سے بچانا تھا۔ وہ شاہ عالمگیر ثانی کے اقتدار کو بھی مضبوط کرنا چاہتا تھا مگر راستے میں اسے اطلاع ملی کہ دہلی کی سیاست میں نئی اُکھاڑ پچھاڑ شروع ہو چکی ہے۔ مغل بادشاہ، غازی الدین کی سازش کا شکار ہو کر مارا گیا ہے۔ اگرچہ بعض امراء نے عالمگیر ثانی کے ولی عہد شاہ عالم ثانی (عالی گوہر) کی بادشاہت کا اعلان کر دیا ہے مگر یہ نیا بادشاہ دہلی سے باہر پناہ گزین ہے اور تختِ سلطنت مغلیہ بالکل خالی ہے۔ یہ صورت حال احمد شاہ ابدالی کے لیے غیر متوقع بھی تھی اور ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی حیات کے لیے خطرناک ترین بھی۔ ایک ایسی حالت میں جبکہ مرہٹے تمام مسلمانوں کو کچلنے کے لیے بڑھے چلے آ رہے تھے، اہلِ ایمان کا اقتدار کی رسہ کشی میں مشغول رہنا خودکشی کے مترادف تھا۔

اس وقت دشمن تین سمت سے احمد شاہ ابدالی کی افواج کے گرد موجود تھا۔ دہلی میں غازی الدین اور مرہٹہ سردار جنکو راؤ جی لڑنے کے لیے تیار تھے۔ دیتا جی سندھیا کا لشکر دہلی کے راستے میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ ہولکر دریائے جمنا کے مغربی ساحل پر اپنی فوج لیے کھڑا تھا۔ ابدالی اپنی 30 ہزار فوج کے ساتھ سہارنپور پہنچا تو نواب نجیب الدولہ، حافظ رحمت خان، سعد اللہ خان، عنایت خان، دوندے خا ن، قطب خان اور دیگر روہیلہ امراء نے دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ یہ چالیس ہزار کا لشکر اب دہلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ شہزادہ تیمور شاہ اور جہان خان ہراول کے دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ سب سے آگے تھے۔

ادھر سندھیا ان سے لڑنے کے لیے تیاری کر چکا تھا۔ 24 دسمبر 1759ء کو اس کے ہراول دستے نے ابدالی کے ہراول کے ایک پہلو پر اچانک حملہ کر دیا۔ گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ آن کی آن میں احمد شاہ ابدالی دوسرے دستوں سمیت آ پہنچا اور سندھیا کے ہراول کو پسپا ہونا پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لڑائی تراوڑی کے اسی میدان میں ہوئی تھی جہاں شہاب الدین غوری نے پرتھوی کو شکست دی تھی۔ گھمسان کی جنگ کے بعد مرہٹے تتر بتر ہو گئے اور احمد شاہ ابدالی نے دہلی سے قریب تر ہو کر شہر کے شمال مشرق میں پڑاؤ ڈال دیا تھا۔

6 جنوری 1760ء (21 جمادی الاولیٰ 1173ھ) کو "دیتا جی سندھیا" اپنی تمام قوت جمع کر کے ابدالی کے مقابلے پر نکل آیا۔ دہلی شہر میں موجود دوسرے مرہٹہ سردار جنکو جی راؤ نے بھی اپنی فوج اس کی مدد کے لیے بھیج دی تھی۔ مرہٹوں کا یہ لشکر بیس ہزار افراد پر مشتمل تھا۔ جنگ شروع ہوئی تو نواب نجیب الدولہ نے اپنے روہیلہ جوانوں کے ساتھ ہراوّل کا کردار ادا کرتے ہوئے سب سے پہلے دیتا جی کے لشکر کا سامنا کیا۔

ایک خونریز معرکے کے بعد مسلمان فتح یاب ہوئے۔ دیتاجی سندھیا گھوڑے سے گر کر پیادہ لڑتا رہا اور اسی حالت میں مارا گیا۔ نجیب الدولہ کے سالار قطب شاہ نے اس کا سر کاٹ کر احمد شاہ ابدالی کی خدمت میں پیش کر دیا۔ بیس ہزار مرہٹوں میں سے اکثر مارے گئے۔ مفرورین کا 25 میل تک تعاقب کیا گیا۔ اس شکست کی خبر سے دہلی پر قابض جنکوجی راؤ اور غازی الدین کے ہوش اڑ گئے اور وہ اسی وقت دہلی خالی کر کے فرار ہو گئے۔ اس طرح دوآبہ مرہٹوں سے پاک ہو گیا۔ اس شاندار فتح کے بعد ابدالی نے 21 جنوری 1760ء کو دہلی سے پانچ میل دور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ کے مزار پر حاضری دی۔ دہلی کی حفاظت کے لیے چند دن وہاں قیام کے بعد احمد شاہ نے سرکش جاٹوں کے رہنما راجہ سورج مَل کو سزا دینے کے لیے جنوب کا رُخ کیا۔

6 فروری کو جاٹوں کے مضبوط مرکز ڈگ پر شاہ کے بھرپور حملے شروع ہوئے جس سے جاٹوں میں بددلی پھیل گئی۔ احمد شاہ ابدالی کا مقصد صرف یہ تھا کہ جاٹوں کو مرہٹوں کے ساتھ ملنے سے روکے اور اپنی جانب اُلجھائے رکھے۔

یہ مقصد پورا ہوتے ہی اس نے مرہٹوں کے اُس لشکر کی جانب کُوچ کیا جو دہلی کے آس پاس جمنا کے پار منڈلا رہا تھا اور اس کی قیادت مرہٹہ سردار ہولکر کے پاس تھی۔ احمد شاہ اسے دہلی پر قبضہ سے روکنا چاہتا تھا مگر ہولکر نے احمد شاہ کا سامنا نہ کیا۔ وہ کبھی ریگستانوں میں غائب ہو جاتا، کبھی کسی جنگل میں اور پھر اچانک دہلی کے قریب کسی بستی میں نمودار ہو کر احمد شاہ کو پریشان کر دیتا۔ فروری کا مہینہ بھی اسی طرح دوآبے کے علاقے میں گزر گیا۔ ایک دن اس نے شاہ پسند خان اسحٰق زئی اور شاہ قلندر خان کو کچھ ہدایات دے کر پندرہ ہزار گھڑسواروں کے ساتھ دہلی شہر بھیج دیا۔ اس فوج نے ایک شب دہلی میں بسر کی۔ اگلی رات، گھپ اندھیرے میں یہ فوج چپکے سے باہر نکلی اور دریائے جمنا عبور کر لیا۔ یہ 4 مارچ 1760ء کا واقعہ ہے۔

شاہ پسند خان اور شاہ قلندر خان معلوم کر چکے تھے کہ ہولکر کا لشکر کہاں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ رات کی تاریکی میں انہوں نے ہولکر کے کیمپ پر اس قدر بھرپور شب خون مارا کہ مرہٹوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ ہولکر نے جم کر لڑنے کی بڑی کوشش کی مگر تین گھنٹے کی زوردار لڑائی میں مرہٹوں کے کئی بڑے بڑے سردار اور اکثر سپاہی مارے گئے۔ ہولکر صرف تین سو آدمیوں کے ساتھ جان بچا کر بھاگ سکا۔ دہلی پر قبضے کا خیال ترک کر کے اب وہ آگرہ کی طرف دوڑ رہا تھا۔ دہلی کے گردونواح کو مرہٹوں سے پاک کرنے کے بعد احمد شاہ ابدالی مغلوں کے اس پایہ تخت میں داخل ہوا۔ اس نے شہر کے نظم و نسق کو درست کیا اور قلعے سمیت تمام دفاعی انتظامات کے استحکام کا کام شروع کرایا۔ اس دوران غازی الدین

اور سورج مل جاٹ نے حافظ رحمت خان روہیلہ کی وساطت سے معافی کی درخواست کی۔ اگرچہ ان کے جرائم سے چشم پوشی ممکن نہ تھی مگر ابدالی نے مصلحتِ وقت کا لحاظ کر کے انہیں بڑی کشادہ دلی سے معاف کر دیا۔ کچھ دنوں بعد ابدالی نے یعقوب علی خان اور محسن الملک کو دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ دہلی کی حفاظت کے لیے چھوڑا اور 72 میل دور جمنا کے مشرقی کنارے پر انوپ شہر کو اپنی چھاؤنی بنالیا۔ اب اسے مرہٹوں کے ردّعمل کا انتظار تھا۔

1760ء کا تقریباً پورا سال احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کی جھڑپوں میں گزرا۔ مرہٹے کسی میدان میں اپنی پوری طاقت سامنے نہ لائے۔ دراصل ان کا روایتی طریقۂ جنگ جس سے وہ مغل حکومت کو ہمیشہ زچ کرتے رہے، یہ تھا کہ چھوٹے چھوٹے گھڑسوار دستوں کے ساتھ دشمن پر متعدد اطراف سے یکے بعد دیگرے حملے کیے جائیں اور اس کی توجہ مختلف محاذوں کی طرف مبذول کر کے اس کی طاقت منتشر کر دی جائے۔ بھاری بھر کم مغل افواج کے خلاف مرہٹوں کی یہ چال ہمیشہ کامیاب رہی مگر افغان جانبازوں نے اس صورت حال کا بڑی ذہانت اور پامردی سے سامنا کیا۔ احمد شاہ نے مرہٹوں کے روایتی طریقۂ جنگ کو اچھی طرح سمجھ کر ان کا اس مہارت سے مقابلہ کیا کہ ان تمام جھڑپوں اور معرکوں میں مرہٹے ہمیشہ شکست کھا کر پسپا ہوتے رہے۔

نئے اتحادیوں کی تلاش اور فوج کی بے اعتدالیوں کا سدباب: اس کے ساتھ ساتھ احمد شاہ نے ہندوستان میں نئے اتحادیوں کی تلاش جاری رکھی اور اپنی طاقت کو مقامی سرداروں اور نوابوں کی مدد سے بڑھانے میں خاصی کامیابی حاصل کی۔ اس نے روہیلہ سردار احمد خان بنگش کو بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنا ہم نوا بنالیا۔ 31 مارچ 1760ء کو احمد خان بنگش نے احمد شاہ ابدالی کے پڑاؤ میں حاضری دی اور ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا۔ اس سال جولائی کے مہینے میں شاہ نے علی گڑھ میں قیام کے دوران اودھ کے نواب شجاع الدولہ کی حمایت بھی حاصل کر لی۔

یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی اس لیے کہ نواب شجاع الدولہ ہندوستان کے طاقت ور ترین امراء میں سے ایک تھا اور اسے مرہٹے اپنے ساتھ ملانے کی سرتوڑ کوششیں کر رہے تھے۔ قریب تھا کہ وہ مرہٹوں کے ساتھ مل جاتا مگر نواب نجیب الدولہ کی سفارتی کوششوں اور اپنی ماں کی سفارش سے متاثر ہو کر آخر کار اس نے احمد شاہ ابدالی سے اتحاد کر لیا۔

احمد خان بنگش اور شجاع الدولہ نے دس ہزار سپاہی پیش کیے تھے۔ کچھ دنوں بعد قندھار سے دس ہزار مزید تازہ دم سپاہیوں کی کمک آ گئی۔ اس طرح احمد شاہ ابدالی کی مجموعی قوت 60 ہزار سپاہیوں تک پہنچ

گئی۔ یہی نہیں بلکہ احمد شاہ ابدالی کی فراست کا یہ عالم تھا کہ اس نے ہندوؤں کی راجپوت قوم کو، جو کہ شمشیر زنی اور سپاہیانہ فنون میں سب سے زیادہ مشہور تھی اپنا حامی بنا کر یہ وعدہ لے لیا کہ وہ مرہٹوں کے ساتھ جنگوں میں غیر جانبدار رہے گی۔ اگر راجپوت مرہٹوں اور جاٹوں کے ساتھ مل جاتے تو دشمن کی طاقت بہت بڑھ جاتی مگر احمد شاہ ابدالی کی سفارتی کوششیں کامیاب رہیں۔ اس نے راجپوت راجاؤں کے ساتھ ایسا شریفانہ برتاؤ کیا کہ انہوں نے اس کے خلاف کسی صف آرائی میں شامل نہ ہونے کا وعدہ کر لیا۔

احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان کی گزشتہ مہمات میں ایک عام فاتح جیسے تمام اطوار روا رکھے تھے اور اس کی فوج سے عوام کے حق میں بے اعتدالیاں بھی صادر ہوئی تھیں مگر اس بار وہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگ کی دعوت پر محض جذبۂ جہاد کی نیت سے آیا تھا، اس لیے اس نے جہاد کے مقدس نام پر دھبہ نہ آنے دیا اور لشکر کو سختی سے اس بات کا پابند کیا کہ کوئی افغانی کسی مقامی شخص کے بارے میں تعصب کا مظاہرہ نہ کرے، نہ ان پر ظلم کرے اور نہ ان کے کسی رسم ورواج میں دخل دے۔

مرہٹہ راجاؤں کی بے چینی اور مرہٹہ لشکر کی روانگی: وہ مرہٹہ سردار جواب تک احمد شاہ سے بے سود مزاحمت کرتے رہے تھے، اس کی کامیابیوں سے سخت پریشان تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ پونا میں جمع ہونے والی مرہٹوں کی اصل طاقت، جو کئی لاکھ بپھرے ہوئے جوانوں پر مشتمل ہے، جلد از جلد ظاہر ہو اور احمد شاہ سے فیصلہ کن ٹکر لے۔

ایک پریشان حال راجہ نے اس صورت حال کی عکاسی اپنے اس خط میں کی ہے جو اس نے پیشوا بالاجی راؤ کو لکھا تھا۔ اپنے خط میں اس نے تحریر کیا: ''افغانی اور روہیلہ سردار باہم متحد ہو گئے ہیں، ان کے پاس ایک بہت بڑا لشکر اور بہت بڑی مقدار میں گولہ بارود ہے۔ ان سے کامیاب مدافعت ممکن نہیں......ہم انہیں شکست نہیں دے سکتے، البتہ ہم تاخیری حربے استعمال کرتے ہوئے جنوب سے کمک پہنچنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اگر کمک آ گئی تو ہم متحد ہو کر حریف کو شکست دے دیں گے......اس وقت نجیب خان روہیلہ کے علاوہ مراد آباد اور بریلی کے تمام روہیلہ قبائل ابدالی سے مل چکے ہیں۔ یہ لوگ ''دتاجی سندھیا'' جیسے جنگجو سالار کو قتل کر کے بہت مغرور ہو گئے ہیں۔ ملہار راؤ کی فوجیں انہیں ڈرانے کی کوشش کر رہی ہیں مگر یہ افغان مغلوں کی مانند نہیں۔ یہ بڑے خوں خوار لڑاکے ہیں، یلغار کرنے اور لڑنے دونوں کاموں میں بڑے تیز ہیں۔''

یہ خط مارچ 1760ء میں لکھا گیا تھا اس کے علاوہ دیگر راجاؤں کی فریادیں بھی بلند ہو رہی تھیں۔ ہندو راجاؤں کی ان اپیلوں کا پونا کے دربار میں اثر کیوں نہ ہوتا جہاں گائے ماتا کے لاکھوں پجاری مسلمانوں

کا نام ونشان مٹا دینے کے عزم کا اعادہ کر رہے تھے۔ چنانچہ اپریل یا مئی کے دنوں میں پونا سے وہ لشکر جرار چل پڑا جس سے ہندو فسطائیت کو بنارس سے کابل تک مرہٹہ راج کے قیام کی امیدیں وابستہ تھیں۔

لشکر کی عمومی کمان، پیشوا کے بھائی، سداشیو بھاؤ کی کمان میں دی گئی تھی۔ پیشوا کا بیٹا راج کمار سواس راؤ، اکھنڈ ہندوستان کے مجوزہ مہاراجہ کے طور پر ساتھ جا رہا تھا۔ اس لشکر کے ہمراہ وہ عظیم الشان تخت بھی جا رہا تھا جس سے ہندوؤں کی قدیم بادشاہت کا از سرِ نو آغاز ہونا تھا۔ ساڑھے تین لاکھ مرہٹوں کا یہ سیلاب پونا سے نکل کر 30 مئی کو گوالیار پہنچا۔ مرہٹوں کے تیسرے پیشوا بالاجی نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ میں تمہارے پیچھے مزید 5 لاکھ افراد کی فوج تیار کر کے خود بھی پہنچ رہا ہوں۔ 14 جولائی کو یہ لشکر آگرہ پہنچا جہاں مرہٹہ سالار ملہار راؤ ہولکر اور جاٹوں کا سردار سورج مَل بھی اپنی فوجوں کے ساتھ ان سے آملے۔

آگرہ سے دہلی تک: یہ وہ دن تھے جبکہ احمد شاہ ابدالی بلند شہر کے قریب انوپ شہر میں پڑاؤ ڈال کر اودھ کے نواب شجاع الدولہ سے مذاکرات کر رہا تھا۔ برسات کا موسم تھا، دریائے جمنا طغیانی پر تھا اور ابدالی فوج مرہٹہ فوجوں کو دہلی کی جانب پیش قدمی سے روکنے کے لیے دریا عبور نہیں کر سکتی تھیں۔ چنانچہ مرہٹہ سرداروں نے آگرہ پہنچ کر بڑی عجلت کے عالم میں یہ فیصلہ کیا کہ موقع سے فائدہ اُٹھا کر اسی وقت دہلی پر قبضہ کر لیا جائے۔ دہلی کے انتظامی معاملات کے بارے میں طے یہ ہوا کہ عالمگیر ثانی کے بیٹے شاہ عالم ثانی کو کٹھ پتلی بادشاہ کی حیثیت دے کر تخت دہلی پر لا بٹھایا جائے اور اس کی آڑ میں مرہٹے پورے ہندوستان کے سیاسی اُمور اپنے ہاتھ میں لے لیں۔

مرہٹہ لشکر آگرہ سے دہلی پر حملے کے لیے چلا تو ہندوؤں کے جوش وخروش سے زمین سہمی جاتی تھی۔ قدم قدم پر مسلمانوں کی بستیاں لوٹی جا رہی تھیں، دیہات اُجڑ رہے تھے۔ ہزاروں مسلمانوں نے اپنے گھر بار چھوڑ کر جنگلوں میں پناہ لے لی تاکہ مرہٹوں کی غارت گری سے محفوظ رہیں۔

اس وقت ہندوستان کے مورخ کا قلم تھرا رہا تھا کہ آئندہ صفحے پر شاید مسلمانوں کی مکمل تباہی کے سوا کچھ تحریر نہ ہوگا...... یقیناً ایسا ہی ہوتا۔ اگر اس وقت اللہ تعالیٰ کی تایید غیبی سے مسلمانوں کا محافظ احمد شاہ ابدالی میدان میں موجود نہ ہوتا۔ راستے میں متھرا سے گزرتے ہوئے ہندو لشکر کی راہ میں ایک عظیم الشان مسجد آئی...... اسے دیکھ کر لشکر کے کمانڈر سداشیو بھاؤ کی آنکھیں غصے سے سُرخ ہو گئیں۔ یہ علاقہ سورج مل جاٹ کے قبضے میں تھا...... اس لیے اس نے سورج مل کو ڈانٹ کر کہا: ''تمہارے علاقے میں اتنی شاندار مسجد!! تم نے اسے باقی کیوں رہنے دیا؟''

سورج مل جاٹ نے جواب دیا: ''اگر آپ آنے والے خطرے (احمد شاہ ابدالی) سے حفاظت کی

ضمانت دے دیں تو میں ابھی اسے جڑ سے ختم کر دوں۔" یہ سن کر سداشیوا بھاؤ خاموش ہو گیا کیونکہ جوش کے باوجود اسے اتنا ہوش ضرور تھا کہ احمد شاہ ابدالی سے ٹکر لینا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے اور اس کی زندگی میں مسلمانوں کے شعائر کی توہین اپنے لیے کانٹے بونے کے مترادف ہے۔ مرہٹوں کے لیے دہلی پر قبضے کا یہ نادر موقع تھا۔ ان کے کئی سردار اپنی افواج لے کر دہلی پر حملے کے لیے پر تول رہے تھے۔ اگرچہ ابدالی سے ہزیمت کے کئی تازہ اور تلخ تجربے ان کی نگاہ میں تھے مگر اب حالات ذرا مختلف تھے۔ اِس وقت دریائے جمنا کی طغیانی کے باعث اَفغانی افواج دہلی کی حفاظت کے لیے آگے نہیں بڑھ سکتی تھیں، اس لیے مرہٹوں کے حوصلے بہت بلند تھے۔ چند دنوں کے سفر کے بعد مرہٹے دہلی کے گرد جمع ہو گئے۔ یہاں احمد شاہ ابدالی کی طرف سے یعقوب علی خان شہر کی حفاظت پر مامور تھا۔ اس نے فصیل بند ہو کر مقابلہ شروع کیا مگر تین لاکھ کے سیلاب کے آگے وہ کب تک بند باندھ سکتا تھا۔

22 جولائی 1760ء (9 ذی الحجہ، 1173ھ) کو مرہٹوں نے شہر پر قبضہ کر لیا، شاہی خزانے میں انہیں کوئی خاص دولت ہاتھ نہ لگی اس لیے کہ مغل حکومت کا دیوالیہ نکل چکا تھا۔ البتہ انہوں نے لال قلعے کے دیوان خاص کی چھت سے سونے کے پترے اُتار لیے اور ان سے اشرفیاں ڈھال کر فتح کے تمغے کے طور پر پونا میں پیشوا کے لیے روانہ کیں۔ یہ اشرفیاں سات لاکھ سے کم نہ تھیں۔ اس موقع پر مرہٹہ سپہ سالار بھاؤ نے پیشوا کو خط میں فخریہ انداز سے لکھا: "ہم نے اورنگ زیب کے باپ کا قلعہ فتح کر لیا ہے اور اپنے وطن کا لوٹا ہوا سونا مسلمانوں سے چھین لیا ہے۔ دہلی کے جن مسلمانوں نے ہمارا مقابلہ کیا انہیں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا ہے...... دہلی کا مغل بادشاہ اب ایک کھلونا ہے جو ایک طاق میں رکھا ہے اور مجھے پورا قابو حاصل ہے کہ جب چاہوں اس کھلونے کو دریائے جمنا میں ڈبو کر تختِ دہلی پر آپ کے بیٹے راج کمار بسواس راؤ کو بٹھا دوں مگر احمد شاہ ابدالی جمنا کے پار موجود ہے، اس کے خاتمے تک میں راج کمار کی تخت نشینی کی رسم ادا کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔"

فوج کے پُرجوش مرہٹوں نے اس موقع پر بھاؤ پر زور دیا کہ وہ کمار بسواس کو تخت پر بٹھا کر اپنا وعدہ پورا کرے مگر بھاؤ نے انہیں یہی جواب دیا کہ احمد شاہ ابدالی کا قصہ پاک ہونے تک ایسا کرنا سخت خطرناک ہوگا۔ قارئین اس سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت گویا احمد شاہ ابدالی ہی ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کا ضامن تھا اور اگر وہ نہ ہوتا تو ہندوستان میں مکمل طور پر دیومالائی ازم کی بالادستی کے ساتھ اِسلام اور مسلمانوں کا جنازہ نکال دیا جاتا۔

گنج پورہ میں مسلمانوں کا قتلِ عام: بھاؤ کے ساتھ تین لاکھ افراد کا لشکر دہلی میں ایک ماہ کے قیام

کے دوران خوراک و رسد کی کمی کا شکار ہو گیا۔ اتنے بڑے مجمع کے لیے جس پیمانے پر انتظامات ہونے چاہیے تھے۔ مرہٹہ سرداروں کو اس کا کچھ تجربہ نہ تھا۔ جب فوج میں شوروغوغا عام ہوا تو بھاؤ نے 12 اگست کو دہلی سے نکل کر باؤلی کے قریب پڑاؤ کیا۔ وہ گنج پورہ پر حملے کا منصوبہ ترتیب دے رہا تھا جو کرنال کے قریب ایک اہم بستی تھی۔ یہاں اَفغان افواج کے لیے خوراک و رسد کے ذخائر کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ یہیں سے اَفغانوں کو غلہ اور مویشیوں کا چارہ سپلائی کیا جاتا تھا۔ اس جگہ مرہٹوں کے قبضے کا صاف مطلب یہ تھا کہ ابدالی لشکر جو دریائے جمنا کے پار تھا، فاقہ کشی پر مجبور ہو جائے۔

احمد شاہ ابدالی نے دہلی پر مرہٹوں کے قبضے کی خبر بڑے صبر و تحمل کے ساتھ سنی تھی کیوں کہ وہ جانتا تھا، مرہٹوں سے عن قریب کھلے میدان میں بدلہ لے لیا جائے گا مگر گنج پورہ کے مرکزِ خوراک پر قبضہ اس کے لیے ناقابل برداشت تھا، جوں ہی اسے خبر ملی کہ مرہٹے گنج پورہ کی جانب بڑھ رہے ہیں وہ دریا پار کرنے کی کوشش کرنے لگا مگر اب بھی دریا میں سیلاب کی کیفیت تھی۔ اَفغان دریا عبور نہ کر سکے اور مرہٹے گنج پورہ کی حفاظتی فوج کو تہ تیغ کرتے ہوئے وہاں کے خوراک و رسد کے تمام دفاتر پر قابض ہو گئے۔ یہاں کے مسلمانوں کا اس بری طرح قتل عام کیا گیا کہ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں میں سے کسی کو نہ چھوڑا گیا۔ ہر طرف لاشوں کے ڈھیر اور خون کے تالاب دکھائی دیتے تھے۔ گنج پورہ میں جو سامان مرہٹوں کے ہاتھ لگا اس میں دو لاکھ من اناج، تین ہزار گھوڑے، دس لاکھ روپے کی مالیت کا جنگی سامان، ساڑھے چھ لاکھ روپے نقد، توپیں اور بے شمار اونٹ شامل تھے۔ یہاں پر مرہٹے سردار داتا جی کا سر کاٹنے والے اَفغان افسر قطب شاہ اور اَفغانوں کے اعلیٰ عہدیدار عبدالصمد خان کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا اور ان کے سر نیزوں پر چڑھا کر گھمائے گئے۔

دریائے جمنا کی لہروں میں: احمد شاہ ابدالی یہ خبریں سن سن کر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس نے عہد کیا کہ مرہٹوں کو اس بری طرح کچلے گا کہ ان کی نسلیں یاد کریں گی۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ''میں نے زندگی بھر اپنی قوم کی ایسی تذلیل نہیں دیکھی، میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔''

اس نے دریا کی طغیانی کو نظر انداز کرتے ہوئے فوج کو پار اُترنے کا حکم دیا۔ اس سے قبل اس نے دو دن تک روزہ رکھا اور اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر فتح و نصرت کی دُعائیں کرتا رہا۔ 25 اکتوبر کو اَفغان جانباز دریائے جمنا کے ٹھاٹھیں مارتے پانی کو دیکھ رہے تھے...... شاہ نے فوری طور پر پار جانے کا حکم دیا تھا مگر پانی کی مستی انہیں آگے بڑھنے سے روک رہی تھی۔ احمد شاہ ابدالی نے ایک تیر لیا، قرآن مجید کی چند آیات تلاوت کر کے اس پر دم کیں اور تیر دریا کے بپھرے ہوئے سینے میں پیوست کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دریا

کا جوش تھمنے لگا، مجاہدین کی مسرت کا عالم دیدنی تھا، وہ تکبیر کے نعرے لگاتے ہوئے ایک ترتیب سے اپنے گھوڑے جمنا کی لہروں میں ڈالتے گئے۔ احمد شاہ ابدالی خود بھی دریا کی موجوں میں اتر گیا۔ دوسرے کناروں پر موجود مرہٹے یہ منظر دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ دریا کا جوش کم ہونے کے باوجود اس کی لہروں سے گزرنا آسان کام نہ تھا، ادھر مرہٹوں نے مسلمانوں کو روکنے کے لیے تیروں کا مینہہ برسانا شروع کر دیا، احمد خان قوماندان سمیت دو ہزار مسلمان تیروں کی بارش کا نشانہ بننے یا دریا کی موجوں کے آگے بے بس ہو جانے کی وجہ سے ڈوب گئے۔ مگر یہ لشکر رکے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا۔ شام سے پہلے پہلے احمد شاہ ابدالی اپنے 58 ہزار جانبازوں سمیت باغپت کے مقام سے دریا کے پار اُتر چکا تھا۔

سداشیو بھاؤ دہلی واپس آکر فتح کا جشن منا رہا تھا، اچانک اسے اطلاع ملی کہ احمد شاہ ابدالی نے دریا عبور کر لیا ہے...... بھاؤ ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے فوری طور پر دہلی سے کوچ کیا اور پانی پت کی طرف ہٹنے لگا کیوں کہ اس کے لاکھوں سپاہیوں کی صف بندی پانی پت کے وسیع میدان کے سوا کہیں اور نہیں ہو سکتی تھی۔

<u>پانی پت کے میدان میں</u>: سداشیو بھاؤ اپنے لشکر کے ساتھ 29 اکتوبر کو پانی پت کے میدان میں پہنچا۔ احمد شاہ ابدالی دریائے جمنا عبور کر کے تقریباً 16 میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بھاؤ کے لشکر کے بالمقابل آ گیا۔

یہ پانی پت کا وہی تاریخی میدان تھا جہاں 1526ء میں بابر اور ابراہیم لودھی کے درمیان معرکے نے ہندوستان کی تاریخ بدل دی تھی۔ پانی پت کا یہ میدان ایک بار پھر تاریخِ ہند کا ایک نیا باب دیکھنے والا تھا۔ ہندوستان کی تمام باطل قوتیں اب یہاں جمع تھیں۔ سداشیو بھاؤ کے ساتھ ایک لاکھ گھڑسوار اور دو لاکھ سے زائد پیادہ فوج تھی۔ مہاجی سندھیا، جن کو جی راؤ، بلونت سنگھ، شمشیر بہادر اور راجہ گائیکواڑ بھی اپنی اپنی جمعیتوں سمیت اس کے ہم رکاب تھے۔ سورج مَل جاٹ اور غدار ملت غازی الدین بھی ابدالی سے کی گئی معذرت اور عہدِ اطاعت کو پس پشت ڈال کر لشکر میں شامل ہو گئے تھے۔ حیدر آباد دکن کے دو ملت فروش امیر، ابراہیم خان گادری اور فتح خان گادری بھی چالیس ہزار گھڑسواروں اور پیادوں کے ساتھ، اِسلام کے مقابلے میں کفر کی کالی گھٹاؤں کا ساتھ دینے آچکے تھے۔ ابراہیم خان گاردی توپ خانے کا ماہر تھا۔ اس کے دستے میں دو ہزار گھڑسوار، نو ہزار بندوق بردار اور دو سو توپیں تھیں۔ وہ ایک تجربہ کار افسر تھا مگر اس نے اپنی صلاحیتیں بھاری معاوضے اور شرکتِ اقتدار کے لالچ میں مرہٹوں کو فروخت کر دی تھیں۔ لڑائی سے قبل احمد شاہ ابدالی نے اسے پیغام بھیج کر سمجھایا کہ یہ لڑائی ملک اور وطن کی نہیں، نظریاتی ہے، یہ اِسلام اور کفر کا معرکہ ہے اس لیے تم اپنے مرہٹے آقاؤں کا ساتھ دینے کی بجائے

اپنے مذہب کی تعظیم میں ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ یا کم از کم غیر جانبدار رہ کر اپنے ایمان و اسلام کو بچاؤ۔ مگر گادری پر کوئی اثر نہ ہوا۔

نسلی لحاظ سے یہ دونوں اَفغان امراء تھے مگر اس موقع پر ان کی بصیرت سلب ہو چکی تھی۔ کفر و اِسلام کے اس فیصلہ کن معرکے میں ان اَفغان سرداروں کا مرہٹوں کے ساتھ نظر آنا کتنا عجیب ہے مگر...... اَفغانوں کی تاریخ اور نفسیات سے واقف ہر شخص اس بات کی تائید کرے گا کہ جہاں اس قوم میں بہترین قائد اور مجاہد پیدا ہوئے ہیں وہاں اس میں غداروں کی بھی کمی نہیں رہی۔ ایک ہندو مورخ کاشی رائے کے مطابق پانی پت کے میدان میں ابدالی کے مقابلے میں آنے والی مجموعی قوت پانچ لاکھ افراد تک پہنچ گئی تھی۔ میر غلام محمد غبار کے بقول، اس فوج میں بیس بڑی توپیں، دو سو چھوٹی توپیں، اڑھائی ہزار جنگی ہاتھی، دو لاکھ گائے بیل اور بار برداری کے ہزاروں اونٹ شامل تھے۔ اس کے علاوہ تاجروں اور پھیری والوں کا ایک پورا بازار تھا جو لشکر کے ساتھ ساتھ نقل و حرکت کرتا آیا تھا۔

پانی پت کے میدان میں دونوں فریق تقریباً پانچ میل کا فاصلہ رکھ کر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ پہلے دن اِسلامی لشکر کے پیادہ دستوں اور مرہٹہ ہراول میں جھڑپ ہوئی، مرہٹے پسپا ہو گئے۔ انہوں نے یہ محسوس کر کے کہ ان کے عظیم لشکر کو کھل کر ہاتھ پاؤں چلانے کے لیے جگہ کی تنگی نہ ہو، اپنا پڑاؤ تین میل پیچھے کر لیا۔

اگلے دن اَفغان پیادوں اور مرہٹہ لشکر میں ایک بار پھر جھڑپ ہوئی اور احمد شاہ ابدالی نے تازہ صورتِ حال دیکھ کر اپنے لشکر کو تین میل آگے بڑھا کر پڑاؤ ڈال دیا۔ تیسرے دن مرہٹوں اور اَفغان فوج میں ایک اور جھڑپ ہوئی۔ مرہٹوں نے جگہ تنگ محسوس کرتے ہوئے ایک بار پھر پسپائی اختیار کی اور 3 میل پیچھے جا کر ڈیرے ڈال دیے۔ احمد شاہ ابدالی کے حکم پر اِسلامی لشکر مزید 3 میل آگے آ گیا۔ چوتھے دن ایک بار پھر یہی عمل دہرایا گیا۔ حتیٰ کہ پانچویں دن مرہٹہ لشکر پیچھے ہٹتے ہٹتے پانی پت کے میدان کے آخری سرے پر جا پہنچا۔ اب پورا میدان احمد شاہ ابدالی کے گھڑسواروں کے لیے خالی تھا۔ شاہ نے حکم دیا کہ اسی جگہ کو دشمن کے شب خون سے محفوظ بنا کر یہاں مستقل پڑاؤ ڈالا جائے...... پڑاؤ کو محفوظ بنانے کے لیے لشکر گاہ کے چاروں طرف بیس گز چوڑی خندق کی کھدائی شروع کی گئی۔ لشکر کے ہر سپاہی، افسر اور غلام نے اس میں بھرپور حصہ لیا۔ خود احمد شاہ ابدالی نے خندق کھودنے میں شرکت کی۔ اس کے بعد خندق کے چاروں طرف جنگل کے درختوں کے تنے کاٹ کاٹ کر ایک مورچہ نما چار دیواری بنا دی گئی جس پر توپیں نصب کر دی گئیں۔ خندق کی کھدائی کے وقت مجاہدین غزوہ خندق کے واقعات یاد کر رہے تھے۔

گشتی دستوں کا کمال: مرہٹے اس طریقہ جنگ سے ناواقف تھے، مگر مسلمانوں کی دیکھا دیکھی انہوں

نے بھی اپنے پڑاؤ کے اردگرد خندق کھدوالی اور درختوں کے تنوں سے مورچے بنا کر توپیں لگادیں۔اب احمد شاہ ابدالی نے ایک نیا کام کیا۔اس نے جہان خان اور شاہ پسند خان کو پانچ پانچ ہزار گھڑسوار دے کر مرہٹوں کے پڑاؤ کے چاروں طرف چکر لگاتے رہنے کا حکم دیا تا کہ انہیں کوئی کمک یا رسد نہ پہنچ سکے۔اس حکم کے مطابق شاہ پسند خان اور جہان خان کے سپاہی دن رات باری باری مرہٹوں کے پڑاؤ کے اطراف میں آتشیں بگولوں کی طرح گھومتے رہے۔رسد کا ہر قافلہ ان کے ہاتھوں لٹ جاتا...... چند ہی دنوں میں مرہٹہ لشکر خوراک کی کمی کا شکار ہوگیا، کئی ہفتے اس طرح گزر گئے۔یہ مصیبت دیکھ کر بھاؤ نے اپنے ایک سردار گوبند کو دس ہزار گھڑسوار دے کر اسے حکم دیا کہ وہ کسی طرح مسلمانوں کو خوراک ورسد پہنچانے والے دیہاتوں اور قصبوں پر حملہ کرے اور انہیں لوٹ کر اس طرح تاراج کردے کہ اُفغان لشکر کے لیے گندم کا ایک دانہ تک نہ آسکے۔

دسمبر کا سرد موسم شروع ہو چکا تھا۔بھاؤ کے حکم کے مطابق گوبند دس ہزار سپاہی لے کر رات کی تاریکی میں بڑی خاموشی سے اس علاقے سے دور نکل گیا۔گنگا جمنا کے درمیانی علاقے میں پہنچ کر اس نے ان تمام شہروں، قصبوں اور دیہاتوں کو لوٹنا شروع کردیا جہاں سے اِسلامی لشکر کے لیے خوراک ورسد ملنے کا امکان تھا۔بھاؤ کی اس دہشت گردی سے آگاہ ہوتے ہی احمد شاہ ابدالی نے عطائی خان کو دو ہزار سوار دے کر گوبند کی گوشمالی کے لیے روانہ کیا۔

عطائی خان ایک ہی رات میں 60 میل کا فاصلہ طے کر کے گوبند کے لشکر پر ٹوٹ پڑا جو دیہاتوں کو لوٹنے میں مصروف تھا۔گوبند کا لشکر شکست کھا کر تتر بتر ہوگیا اور وہ خود اِسلامی لشکر کے ایک رضا کار کے ہاتھوں مارا گیا...... یہ واقعہ 16 دسمبر 1760ء کا ہے۔

مرہٹوں کی بوکھلاہٹ اور بھاؤ کی آخری چال: اِسلامی لشکر کی اس نئی فتح یابی کے بعد مرہٹوں کے لیے اپنے چار لاکھ سے زائد افراد کی خوراک ورسد کا انتظام کرنا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا۔احمد شاہ ابدالی کے گشتی دستوں نے ان کے پڑاؤ کو بہت مشکلات سے دوچار کردیا تھا۔یہ دیکھ کر بھاؤ نے ایک مرہٹہ سردار کو دو ہزار محافظوں کے ہمراہ دہلی بھیجا تا کہ وہاں سے جس قدر ممکن ہو، اشرفیاں لے آئے تا کہ فوج مزید کچھ دن قیام کی متحمل ہوسکے۔یہ سردار دہلی گیا اور وہاں سے اشرفیوں کی بھاری مقدار حاصل کر کے واپس لوٹا مگر اللہ کا فیصلہ کچھ اور تھا۔

مسلمانوں کے گشتی سپاہیوں سے بچ کر پانی پت پہنچنے کے لیے مرہٹہ سردار نے رات کا وقت بہتر سمجھا۔جنوری 1761ء کی ایک رات جب وہ اپنے دو ہزار محافظوں کے ساتھ پانی پت کے میدان میں پہنچا

توسمت کے تعین میں اندازے کی غلطی کر بیٹھا اور اس کا رُخ مسلمانوں کے لشکر کی طرف ہو گیا۔ مسلمانوں نے مرہٹہ سردار اور اس کے ساتھیوں کو پہچان لیا مگر ان کا راستہ نہ روکا۔ جب یہ دو ہزار مرہٹے پڑاؤ کے اندر پہنچ گئے تو انہیں گھیر کر مار ڈالا اور ان کی اشرفیاں شاہی خزانے میں جمع کرا دیں۔ بھاؤ کے پاس اب سپاہیوں کی تنخواہ کے لیے بھی رقم نہ رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اگر لڑائی میں مزید تاخیر کی گئی تو فوج میں بغاوت پھیل جائے گی اور یہ نہ ہوا تو وہ اپنے سپاہیوں سمیت وہیں فاقوں سے مر جائے گا۔ بھاؤ کے سالار بھی چیخ رہے تھے کہ بھوکوں مرنے سے لڑ کر مر جانا بہتر ہے۔ اس نے آخری حربے کے طور پر احمد شاہ ابدالی کو صلح کی پیش کش کی اور مسلم امراء میں سے شجاع الدولہ کو جو ایک عرصے تک مرہٹوں کا حلیف رہا تھا، اپنا آلہ کار بنانے کی کوشش کی۔ شجاع الدولہ مان گیا اور اس کے سمجھانے بجھانے سے افغان لشکر کے تقریباً سبھی امراء نے سخت ترین شرائط منظور کرا کے صلح کر لینے کے پہلو کو ترجیح دی مگر دہلی کے نواب نجیب الدولہ نے اس سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا: ”مرہٹے دہلی کے لال قلعے پر قبضہ کر چکے ہیں، گنج پورہ کے 20 ہزار افغانوں کے خون میں ہاتھ رنگ چکے ہیں، آج اگر ہم نے صلح کر لی تو کل کو بادشاہ سلامت کی افغانستان واپسی کے بعد یہ تازہ دم افواج کے ساتھ مسلمانوں پر یلغار کر دیں گے اور ہندوستان کے مسلمانوں کو ختم کر ڈالیں گے۔“

یہ اہم مشاورت پانی پت کے میدان میں 13 اور 14 جنوری کی درمیانی شب ہو رہی تھی۔ گفتگو رات کے 12 بجے تک جاری رہی۔ نجیب الدولہ کی حقیقت کشا تقریر نے سب کی آنکھیں کھول دیں اور شجاع الدولہ کے سوا سب نے لڑائی پر آمادگی ظاہر کی۔ احمد شاہ ابدالی کو بھی اطمینان ہو گیا کہ فیصلہ میدانِ جنگ میں تلوار کی دھار ہی سے ہو گا تاہم انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ بھاؤ کا پیغامِ صلح بدنیتی پر مبنی ہے۔

پانی پت کا فیصلہ کن معرکہ، جنگ کا آغاز: ادھر بھاؤ اِسلامی لشکر کو صلح کا پیغام دینے کے بعد خود خفیہ طور پر لشکر کو حملے کا حکم دے چکا تھا۔ اس کا لشکر رات بھر لڑائی کی تیاری کرتا رہا۔ رات کے آخری پہر مرہٹہ لشکر نے صف آرا ہو کر اِسلامی لشکر کے پڑاؤ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ احمد شاہ ابدالی اور تمام افغان امراء یہ سمجھ کر بے فکری سے سو رہے تھے کہ مرہٹے صلح کا پیغام بھیج چکے ہیں اس لیے ان کی طرف سے حملے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

جب بوقت سحر احمد شاہ ابدالی کو اطلاع دی گئی کہ مرہٹوں کی فوج حرکت کر رہی ہے تو وہ چونک کر بیدار ہوا۔ دیگر امراء کو بھی جھنجھوڑ کر نیند سے اُٹھایا گیا۔ احمد شاہ ابدالی تیزی سے اپنے خیمے سے باہر نکلا۔ اُفق کی جانب دیکھا تو صبح صادق کے جھٹپٹے میں مرہٹہ لشکر صفیں باندھے چلا آ رہا تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے فوری طور پر فوج کو فوراً تیار ہونے کا حکم دیا۔ افغان سپاہی جو بے خبر سو رہے تھے، یکدم بیدار ہوئے اور حیرت

انگیز طور پر چند لمحوں کے اندر اندر اسلحہ سنبھال کر گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں ان کی صفیں تیار ہو گئیں۔ مرہٹے یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ بے خبر مسلمانوں کو اچانک جالیں گے مگر ان کی یہ چال ناکام رہی۔ انہوں نے مسلمانوں کو مقابلے کے لیے تیار پایا۔

احمد شاہ ابدالی کے افغان لشکر کی تعداد 26 ہزار گھڑسواروں پر مشتمل تھی، ان کے ساتھ ہندوستان کے مسلمان امراء کے 40 ہزار پیادہ اور سوار سپاہی تھے۔ شاہ نے ان 66 ہزار سپاہیوں کی صف بندی اس طرح کی کہ دائیں اور بائیں بازو پر حافظ رحمت خان اور نواب احمد خان بنگش کو متعین کیا۔ پشت پر نواب نجیب الدولہ کے دستے تھے۔ قلب میں شاہ کی اپنی افغان فوج، اس کے وزیر اعظم شاہ ولی خان کی کمان میں تیار کھڑی تھی۔ اِدھر مرہٹوں کے لشکر کے دائیں بازو میں ملہار راؤ ہولکر اور جنکو جی سندھیا کی فوجیں تھیں۔ میسرہ میں گاردی اور راجہ گائیکواڑ کے دستے تھے، قلب میں بھاؤ اور بسواس راؤ تھے۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا کہ میدانِ کارزار گرم ہو گیا۔ افغان پوری طرح جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر لڑ رہے تھے۔ ان کے نزدیک یہ فنا و بقا کا معرکہ تھا، وہ جانتے تھے کہ اس میدان میں شکست کھانے کے بعد افغانستان میں بھی انہیں پناہ نہیں مل سکتی اور مرہٹے وہاں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔

جنگ کے آغاز کے ساتھ مرہٹوں کے توپ خانے نے گولہ باری شروع کر دی۔ ابراہیم خان گاردی بڑی مہارت کے ساتھ مسلمانوں کی صفوں پر آتش باری کر رہا تھا۔ افغان جرنیل حافظ رحمت خان اور نواب احمد خان بنگش کے دستے اس ہولناک گولہ باری سے بری طرح متاثر ہو کر پسپا ہونے لگے۔ چونکہ یہ دستے لشکر کے دائیں اور بائیں بازو تھے، اس لیے ان کے پسپا ہوتے ہی مرہٹوں نے افغان لشکر کے قلب پر ایک زوردار حملہ کر دیا جس سے افغانوں کی صفیں درہم برہم ہونے لگیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ شکست کھا کر پسپا ہونے کو ہیں۔

احمد شاہ ابدالی کا سرخ خیمہ ایک بلند ٹیلے پر نصب تھا جہاں سے وہ میدان جنگ کا جائزہ لے کر سالاروں کو ہدایات دے رہا تھا۔ اپنی افواج میں پسپائی کے اثرات دیکھ کر اس نے شاہ پسند خان کو قلب کی امداد کے لیے بھیج دیا۔ اس سے قلب لشکر کے سپاہیوں کے قدم جم گئے اور مرہٹوں کی پیش قدمی رُک گئی۔

نجیب الدولہ کی حکمتِ عملی: اِسلامی لشکر کی پشت پر نواب نجیب الدولہ کے دستے تھے، جو مورچے لگا کر اپنا دفاع کر رہے تھے۔ مرہٹوں کو سب سے زیادہ غصہ نواب نجیب الدولہ پر ہی تھا اس لیے کہ احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان بلانے میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اصل کردار اسی کا تھا۔ امرائے ہند کو احمد شاہ ابدالی سے تعاون پر آمادہ کرنا بھی اسی کا کارنامہ تھا۔ علاوہ ازیں دہلی کی مغل سلطنت کو مرہٹوں سے

نجات دلانے میں اس نے اہم ترین کردار ادا کیا تھا۔ مرہٹوں کے سامنے جہاں دوسرے امراء بھیگی بلی بن جاتے تھے نجیب الدولہ شمشیر برہنہ بن کر سامنے آتا تھا۔

چنانچہ افغانوں کے قلب کے بعد مرہٹوں کا سب سے زیادہ زور نجیب الدولہ کے خلاف استعمال ہو رہا تھا۔ احمد شاہ ابدالی کو بھی اس کا اندازہ تھا کہ مرہٹے نجیب الدولہ کو روندنے کی بھرپور کوشش کریں گے اس لیے اس نے نجیب الدولہ کی کمک کے لیے شاہ پسند خان کو خصوصی ہدایات دے دی تھیں۔ نجیب الدولہ نے خود بھی اپنا دفاعی انتظام نہایت عمدہ کیا تھا۔ اس کا کمال یہ تھا کہ اس نے اب تک کی جنگ میں کم سے کم نقصان اُٹھا کر مرہٹوں کو سب سے زیادہ پریشان کیا۔

جنگ کی شدت: دوپہر تک اِسلامی لشکر کے روہیلہ جانبازوں نے مرہٹوں کو دائیں اور بائیں سے گھیر لیا تھا جبکہ ان کے سامنے احمد شاہ ابدالی کے افغان سپاہی تھے۔ ایسے میں نجیب الدولہ نے چکر کاٹ کر مرہٹوں کے عقب کو بھی گھیر لیا۔ اب مرہٹوں کے لیے بھاگ نکلنے کا راستہ بڑی حد تک بند ہو گیا تھا۔ تاہم وہ مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ تھے اس لیے ان کے حملوں میں مزید شدت آ گئی۔ ان کا جوش وخروش دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی بپھرا ہوا دریا بند توڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ بسواس راؤ نے نجیب الدولہ کے تند و تیز حملے دیکھ کر اپنے لشکر کو حکم دیا کہ توپ خانے کا رخ اس طرف کر دیا جائے۔ ساتھ ہی اس نے دو ہزار ہاتھیوں اور چالیس ہزار گھڑسواروں کی فوج کو نجیب الدولہ کے دستوں پر ٹوٹ پڑنے کا اشارہ دیا۔ آن کی آن میں یہ سیلاب نجیب الدولہ اور اس کے مصاحب عنایت خان کی صفوں پر امنڈ آیا۔ یہ دس ہزار روہیلہ مجاہد اس دریائے آتش و آہن میں ڈوب کر رہ گئے۔ احمد شاہ ابدالی کی طرف سے عطا محمد خان قندھاری پانچ ہزار جانبازوں کا امدادی دستہ لے کر ادھر دوڑا مگر وہ بھی اس ہجوم میں گم ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر اودھ کا نواب شجاع الدولہ اپنے دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ آگے بڑھا مگر وہ بھی دشمن کا زور نہ توڑ سکا۔

ہاتھیوں کی فوج اب شجاع الدولہ کی صفوں پر امنڈتی آ رہی تھی اور مقابلے میں اودھ کے سپاہی بددلی کا شکار نظر آ رہے تھے۔ بھاؤ اور بسواس راؤ کے سپاہی پورے جوش وخروش سے حملے کر رہے ہیں۔ بسواس راؤ کا ہاتھی ایک دیو کی طرح چنگھاڑ رہا تھا، رگھوناتھ، راؤ شمشیر بہادر اور جن کوراؤجی جو کہ سپہ سالار سداشیو بھاؤ کے اردگرد جمع تھے، اپنی اپنی فوجوں کی ہمت بڑھا رہے تھے۔ اِسلامی قلبِ لشکر کا سالار شاہ ولی خان جان ہتھیلی پر رکھ کر بمشکل دشمن کا حملہ روک رہا تھا۔ یہ زوال کا وقت تھا اور دونوں فریق اپنی پوری طاقت میدان کارزار میں جھونک چکے تھے۔ جنگ کی شدت کی وجہ سے کسی کو اندازہ نہیں تھا کون جیتے گا۔ ابدالی نے یہ صورتحال دیکھی تو سمجھ لیا کہ اب فیصلہ کن لمحہ آ چکا ہے اور اگلی

چند گھڑیوں میں کوئی ایک فوج الٹے قدموں بھاگنے پر مجبور ہوگی۔ تب اس نے اپنا آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے اپنے جانباز دستے کے بارہ ہزار زرہ پوش سپاہیوں اور غلاموں کو طلب کر کے کہا: ''ایک ایک ہزار کی ٹولیاں بنا کر پشت سے دشمن پر یکے بعد دیگرے بھرپور حملے کرو۔ بھاؤ کے گرد جمع مرہٹہ سرداروں پر ایک ساتھ ٹوٹ پڑو۔''

ساتھ ہی توپچیوں کو حکم دیا: ''توپ لے کر شجاع الدولہ کی صفوں سے گزر جاؤ، دشمن کے قلب اور دائیں بازو کو زد میں لے لو، خاص کر بسواس راؤ کے ہاتھی کو نشانہ بناؤ۔'' یہ ہدایات دے کر اس مردِ مجاہد نے ایک عاجز درویش کی طرح مصلیٰ سنبھال لیا اور سجدے میں گر کر نہایت الحاح وزاری کے ساتھ ربّ العزّت سے فتح ونصرت کی دعا مانگنے لگا۔

مرہٹوں کی عبرتناک شکست: دعا اور تدبیر کا اشتراک تیر بہدف ثابت ہوا۔ ابدالی سجدے میں گرا ہوا تھا کہ توپ کی ہولناک آواز گونجی۔ سجدے سے سر اٹھا کر میدانِ جنگ کی طرف نگاہ ڈالی تو نقشہ بدل رہا تھا۔ جانباز دستے کی توپ کا نشانہ بالکل درست بیٹھا تھا۔ مرہٹوں کا شاہی ہاتھی، گولے کی زد میں آ کر خاک وخون میں لوٹ رہا تھا اور بسواس راؤ نیم مردہ حالت میں زمین پر پڑا ہوا تھا۔ مرہٹوں کا جہاں دیدہ سپہ سالار سداشیو بھاؤ، اپنے بھتیجے اور اکھنڈ ہندوستان کے مجوزہ مہاراجہ کی یہ حالت دیکھ کر حواس باختہ ہوگیا۔ اس نے فوراً اسے دوسرے ہاتھی کے ہودج میں لٹا دیا مگر خون میں لت پت بسواس راؤ کی سانسیں گنی جا چکی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا دم نکل گیا۔

بھاؤ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور اسے اپنی قوم کی شکست سامنے نظر آنے لگی۔ وہ فوراً ایک تازہ دم گھوڑے پر سوار ہوا اور مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا۔ ادھر سے روہیلہ سردار نواب عنایت خان نیزہ تانے ہوئے سامنے آگیا، دونوں میں نیزہ بازی کا مقابلہ ہوا اور پھر نواب عنایت کا نیزہ بھاؤ کے سینے میں اتر گیا۔ بھاؤ گھوڑے سے گرا اور نواب عنایت نے شمشیر کھینچ کر اس کا سر قلم کر دیا۔ اس دوران افغان توپ خانہ دشمن کے قلب اور دائیں بازو کو گولوں کی زد میں لے چکا تھا اور دشمن کی فوج میں بھگدڑ مچنے لگی تھی، سینکڑوں جنگی ہاتھی اپنے ہی سپاہیوں کو کچلتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ اس عالم میں جب انہوں نے اپنے سرداروں کو موت کے گھاٹ اترتے دیکھا تو وہ بالکل بدحواس ہوگئے۔ حالانکہ تعداد اور قوت میں وہ اب بھی اس قدر تھے کہ منظم ہو کر لڑائی کا پانسا پلٹ سکتے تھے مگر ان پر اتنی دہشت طاری ہو چکی تھی کہ وہ بڑی افراتفری کے عالم میں یک بیک میدان سے بھاگنے لگے، روہیلہ اور افغان سواروں نے نہایت جوش وخروش سے یلغار کرتے ہوئے ان کی لاشوں کے ڈھیر لگانا شروع کر دیے۔

سہ پہر کے وقت پانی پت کا میدان جنگ اس بزدل قوم کے سورماؤں کی عبرتناک پسپائی کا منظر دیکھ رہا تھا جو بنارس سے کابل تک دیو مالائی روایات کے جھنڈے گاڑنے کے خواب دیکھتی آئی تھی۔ پانی پت کی خاک میں مرہٹوں کا غرور ہمیشہ کے لیے دفن ہو گیا تھا۔ میدانِ جنگ میں دور دور تک مرہٹوں کی لاشوں کے ڈھیر لگ چکے تھے۔ مسلمان شہداء کی تعداد پندرہ سے بیس ہزار کے درمیان تھی۔

مرہٹوں کے پڑاؤ سے جو مالِ غنیمت ہاتھ لگا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ 22 ہزار دشمن قیدی بنائے گئے تھے۔ پانچ سو ہاتھی، پچاس ہزار گھوڑے، ہزاروں اونٹ اور دو لاکھ گائے بیل غنیمت میں حاصل ہوئے تھے۔

کاشی رائے کے بقول:

”ایک ایک افغان سپاہی قیمتی سامان سے لدے ہوئے آٹھ آٹھ، دس دس اونٹ لاتا تھا۔ گھوڑوں کو بکریوں کے ریوڑ کی طرح ہانکا جا رہا تھا۔ ہاتھیوں کی بھی بہت بڑی تعداد ان کے ہاتھ لگی تھی۔“

افغان سپاہیوں نے فرار ہونے والوں کو بھی نہ چھوڑا اور دور تک ان کا تعاقب کر کے انہیں چن چن کر مارا۔ بالاجی پیشوا کا بیٹا بسواس راؤ اور مرہٹوں کا چیف کمانڈر سداشیو بھاؤ، تو میدانِ جنگ ہی میں مارے گئے تھے۔ ابراہیم خان گاردی سخت زخمی حالت میں گرفتار ہوا۔ ابدالی نے اس کے علاج معالجے کے لیے طبیب کو بلوایا مگر وہ جانبر نہ ہو سکا اور تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ بچ جانے والے ہزاروں مرہٹے پانی پت شہر پہنچ کر محصور ہو گئے۔ افغانوں نے بھی رات کو وہاں پہنچ کر محاصرہ کر لیا اور صبح سویرے شہر پر قبضہ کر لیا۔

سید مدد علی تپش کے بقول پانی پت کی جنگ میں اڑھائی لاکھ مرہٹے تہہ تیغ ہوئے تھے جبکہ پچاس ہزار کو دیہات کے مظلوم باشندوں نے فرار ہوتے ہوئے گھیر گھار کر قتل کیا کیوں کہ اس لشکر نے ان کے گھر بار لوٹے اور جلائے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دیہاتوں کے یہ باشندے مسلمان نہیں، ہندو تھے مگر مرہٹہ افواج کے مظالم سے یہ بھی تنگ تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹوں کی فوجی مہمات کسی قسم کے مذہبی خلوص سے بھی خالی تھیں۔ یہ صرف ناموری اور ہوسِ مال و زر کی مہمات تھیں۔ اگر انہیں مذہب کا پاس ہوتا تو کم از کم اپنے ہم مذہبوں کو تختۂ ستم نہ بناتے۔

پیشوا کا دوسرا بیٹا شمشیر راؤ بھی زخمی حالت میں فرار ہوتے ہوئے راستے میں مر گیا۔ جنکو جی سندھیا بھی زندہ نہ بچ سکا۔ صرف ایک لاکھ افراد بڑی بری حالت میں واپس آ سکے۔ ان میں ملہار راؤ ہولکر، گائیکواڑ اور بھاؤ کی بیوی پاربتی بائی شامل تھے۔ مہاجی سندھیا بھی بچ نکلا مگر ایک پاؤں سے معذور ہو گیا تھا۔ مرہٹوں کی عبرتناک شکست پونا پہنچی تو بالاجی پیشوا پر سکتہ طاری ہو گیا اور مسلمانوں کا نام و نشان مٹا ڈالنے کی قسمیں کھانے والے غم و حسرت سے اپنے سروں پر خاک ڈالنے لگے۔

احمد شاہ ابدالی کا اہلِ ہند سے خیر خواہانہ رویہ: اس شاندار فتح کے بعد احمد شاہ ابدالی پانی پت میں شاہ بوعلی قلندر رحمۃ اللہ کے مزار پر حاضری دے کر 29 جنوری 1761ء کو دہلی پہنچا۔ مرہٹہ گورنر اور دیگر مرہٹے سپاہی پہلے ہی وہاں سے کھسک چکے تھے۔ شاہ کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ اس نے اتنی زبردست فتح کے باوجود مغل سلطنت ہی کو ہندوستان کے مسلمانوں کی سطوت وشوکت کا وارث قرار دیا اور خود کوئی سیاسی فائدہ حاصل کرنے سے گریز کیا۔ حالاں کہ اگر وہ چاہتا تو ہرات سے دہلی تک اپنا سکہ جاری کر سکتا تھا اور یوں تاریخِ عالم میں اس کا شمار تیمور اور سکندر اعظم جیسے فاتحین میں ہو سکتا تھا جو روئے زمین کے بہت بڑے رقبے پر قابض رہے...... مگر اس نے تیمور یا سکندر بننے کی بجائے مسلمانوں کا خیر خواہ بننا پسند کیا اور ان کے قومی مفاد کو عزیز تر رکھا۔ شاہ نے تمام ہندوستانی امراء اور سرداروں کو ہدایت کی کہ مغل سلطنت کے وارث شاہ عالم ثانی کو ہندوستان کا فرماں روا تسلیم کریں۔ سلطنت دہلی کے اس انتظام کے بعد احمد شاہ ابدالی 20 مارچ 1761ء کو دہلی سے واپس اَفغانستان روانہ ہو گیا۔

قندھار کی ازسرِ نو تعمیر اور سکھوں کی سرکوبی: احمد شاہ ابدالی کی ایک عرصے سے یہ خواہش تھی کہ قندھار کو ازسرِ نو تعمیر کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے اس نے قندھار کی قدیم آبادی کے مغرب میں پوپلزئی قبائل کی زمینیں ان کی رضامندی سے حاصل کر کے وہاں ایک نیا شہر بسانا شروع کر دیا۔ ہزاروں مزدور، معمار اور انجینئرز اس کام میں شریک تھے۔ شہر کے چاروں طرف مضبوط فصیل بنوانے کے لیے خاص طور پر ہندوستانی معمار بلوائے گئے۔ اندرونِ شہر سرکاری عمارات تعمیر کی گئیں، اس شہر کو آباد کرنے کے لیے شاہ نے عوام میں اعلان کرایا کہ دارالحکومت میں گھر تعمیر کرنے والے کو مفت زمین فراہم کی جائے گی۔ یہ سن کر لوگ جوق در جوق وہاں آبسے۔ شہر کی خوبصورتی کے لیے آبادی کے درمیان سے ایک نہر نکالی گئی۔ اس نئے شہر کا سنگِ بنیاد پانی پت کی جنگ کے پانچ ماہ بعد جون 1761ء میں رکھا گیا تھا۔

احمد شاہ ابدالی نے اس کے بعد فروری 1762ء اور اکتوبر 1764ء میں پنجاب پر دو بڑے حملے کیے، جن کا مقصد وہاں سکھوں کی شورش کا قلع قمع کرنا تھا۔ ان حملوں میں درجنوں معرکے پیش آئے، سکھوں کا بے اندازہ جانی نقصان ہوا مگر ان کی طاقت پھر بھی فنا نہ ہوئی۔ احمد شاہ کے واپس جاتے ہی وہ پھر سرکشی پر اُتر آتے تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف مہم: اس دوران بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طاقت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ انگریز نواب سراج الدولہ کو پلاسی کی جنگ میں شکست دے کر پورے ہندوستان پر قبضے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کو اَفغانستان میں رہ کر بھی اس خطرے کا پوری شدت سے

احساس تھا جبکہ ہندوستان کے مغل حکمران اور تمام نواب اور راجے سر پر آئی بلائے بے اماں سے بے خبر، باہم اُکھاڑ پچھاڑ میں مصروف تھے۔

احمد شاہ ابدالی نے 1767ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال سے بے دخل کرنے کے لیے ایک طویل سفر کا آغاز کیا۔ پنجاب میں سکھوں کی مزاحمت کو کچلتا ہوا وہ دہلی کے قریب جا پہنچا مگر افسوس کہ اس موقع پر مسلمان امراء انگریزوں کی چالبازی کے دام میں آ گئے۔ انگریزوں نے انہیں باور کرایا کہ احمد شاہ ابدالی پورے ہندوستان کو اپنا غلام بنانا چاہتا ہے۔ چنانچہ ہندوستانی امراء نے سخت حماقت کا ثبوت دیتے ہوئے شاہ کی مہم کو اپنے خلاف تصور کر لیا اور شاہ سے بار بار استدعا کی کہ وہ واپس چلا جائے۔ انہوں نے کہا کہ اگر شاہ نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی تو ہندوستان کے لوگ گھر بار چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔

پھر کوئی فاتح نہ آیا: احمد شاہ ابدالی نے ہندوستانی امراء کے اس رویئے کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ یہ خوابِ غفلت میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ حالات کا کوئی نقارہ انہیں بیدار نہیں کر سکتا۔ شاہ کو پنجاب کے سکھوں کی یورش سے بھی پریشانی لاحق تھی اور خود اس کی فوج میں ایک چھوٹا سا گروہ باغی ہو رہا تھا۔ ایسے حالات میں بنگال تک پیش قدمی کے منصوبے پر عمل پیرا ہونا ویسے بھی سخت خطرناک تھا۔ شاہ کو سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ ہندوستانی امراء کی درخواست نہ مانی گئی تو یہ لوگ انگریزوں کے ساتھ مل کر اس کے خلاف جنگ سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔

چنانچہ اُفغان فاتح واپس چلا گیا: یہ مئی 1767ء کا واقعہ ہے، اس کے بعد اڑھائی سو سال ہونے کو آئے، محمود غزنوی، شہاب الدین غوری اور احمد شاہ ابدالی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اہلِ ہندوستان کی سوئی ہوئی قسمت جگانے والا کوئی اُفغان شہ سوار دوبارہ اس راستے سے نہیں گزرا...... احمد شاہ ابدالی کے بعد ہندوستان کا انگریزوں کے ہاتھوں جو حال ہوا وہ سب جانتے ہیں مگر احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان سے یکسوئی اختیار کر لی تھی۔ وہ اُفغانستان کی تعمیر و ترقی کی طرف متوجہ رہا۔ ہندوستان انگریزوں کے ہاتھوں لٹتا رہا اور اُفغانستان میں احمد شاہ ابدالی ایک نیا جہان آباد کرتا رہا۔ یہ دور اُفغانستان کی خوشحالی اور ترقی کا سنہرا دور تھا۔ ہندوستان کی علمی و ادبی اور تعمیری رونقیں مشیتِ ایزدی نے اس کوہستانی خطے کو منتقل کر دیں...... اپنے آخری ایام میں احمد شاہ ابدالی نے اپنے بیٹے تیمور شاہ کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا۔ خود 50 سال کی عمر میں رجب 1187 (جون 1771ء) میں دارِ فانی سے کوچ کیا۔ قندھار میں اس کی قبر پر آج بھی زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔ اُفغان اپنے اس محسن کو "احمد شاہ بابا" کہہ کر یاد کرتے ہیں۔

مآخذ و مراجع

- ...... اَفغانستان در مسیرِ تاریخ، میر غلام محمد غبار
- ...... عمادالسعادات، غلام علی نقوی
- ...... احمد شاہ بابا، میر غلام محمد غبار
- ...... احمد شاہ ابدالی، گنڈا سنگھ
- ...... منتخب اللباب، نظام الملک ہاشم علی خان
- ...... تاریخ ملت، ج: سوئم، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، مفتی انتظام اللہ شہابی

تیرھواں باب

ابدالی کے جانشین اور فرنگیوں کی سازشیں

احمد شاہ ابدالی کا دور نہ صرف افغانستان بلکہ ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی عزت وخودمختاری کا ضامن تھا۔ ربع صدی تک اس کے دور کے اثرات اس کے جانشینوں میں بھی برقرار رہے۔

علمی واقتصادی ترقی، دارالحکومت کی تبدیلی: احمد شاہ ابدالی کے بیٹے تیمور شاہ نے جون 1773ء (رجب 1187ھ) میں باپ کا تاج وتخت سنبھالا۔ اس وقت اس کی عمر 25 سال تھی، وہ اپنے باپ کی سیرت پر چلتا رہا۔ اس کی سیاسی سوجھ بوجھ اور حسن انتظام سے ملکی حالات بہتری کی طرف گامزن رہے۔ احمد شاہ ابدالی نے اپنے دور حکومت میں سلطنت کی حدود کی وسعت اور اسے بیرونی خطرات سے بچانے پر زیادہ توجہ دی تھی اور حالات کے لحاظ سے اس وقت انہی کاموں کو ترجیح حاصل تھی۔ تاہم تیمور شاہ کے سامنے حالات مختلف تھے۔ اس کے دور میں فتوحات سے زیادہ تعمیر وترقی کا کام ہوا۔ دراصل اتنی بڑی سلطنت کو ایک مثالی مملکت کی شکل دینے کے لیے مکمل توجہ درکار تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تیمورشاہ نے مزید فتوحات سے تقریباً یکسوئی اختیار کیے رکھی۔ اس کے دور میں افغانستان نے علم وادب، صنعت وحرفت اور تجارت واقتصادیات میں بے پناہ ترقی کی۔ عوام خوشحالی کے ایک نئے دور سے روشناس ہوئے۔ افغانستان کی مصنوعات دور دراز کے دیگر ممالک کو برآمد ہونے لگیں۔ یہاں تعلیم گاہوں اور مدارس میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ نامی گرامی علماء پیدا ہوئے۔ افغانستان کے نامور شعراء عاجز، راسخ، عیدی اور وصفی اسی دور سے تعلق رکھتے تھے۔

اس کے دور حکومت میں کئی اندرونی بغاوتیں اور شورشیں بھی ہوئیں مگر اس نے نہایت حکمت وتدبر سے ان کا سر کچل دیا۔ اس کا باپ ملتان اور لاہور سے ہرات اور بلخ تک جو عظیم سلطنت دے کر گیا تھا، تیمور شاہ نے اس کی خوب حفاظت کی۔ سلطنت کے دونوں حصوں پر گرفت مضبوط رکھنے کے لیے وہ ہر سال موسم سرما کے چار ماہ پشاور میں گزارتا تھا اور اس دوران پنجاب کے انتظامات کو بہتر بنانے اور شورشوں کو رفع

کرنے میں مصروف رہتا۔ اس نے افغانستان میں اپنا دارالحکومت قندھار کی جگہ کابل کو بنالیا تھا جو کہ ملک کے وسط میں واقع ہے۔ اس طرح پنجاب کے معاملات کو سنبھالنا اور سکھوں پر قابو پانا آسان ہوگیا۔

انگریز اور فرانسیسی: ہندوستانی سرحدوں پر خاص توجہ رکھنے کی سخت ضرورت اس لیے بھی تھی کہ اب ہندوستان کے ساحلوں پر قدم جمانے والی فرنگی اقوام پورے برصغیر کے لیے ایک بھیانک خطرہ بن چکی تھیں۔ انگریز اور فرانسیسی جنوبی ہندوستان پر قبضے کے لیے باہم دست وگریباں تھے اور ان کی منظم افواج اور بحری بیڑے آپس میں فیصلہ کرنے کے بعد وسطی ہند و افغانستان کی طرف بڑھنے کے عزائم رکھتے تھے۔ تیمور شاہ کے آخری ایام میں برصغیر کے ساحلوں پر انگریزوں کی برتری واضح ہوگئی۔ وہ پورے بنگال پر قابض ہونے کے بعد اب میسور کے حکمران نواب حیدر علی رحمہ اللہ سے ٹکر لے رہے تھے۔ تیمور شاہ کو مغل بادشاہ اور ہندوستانی نوابوں کی غیر جانبداری کے باعث اس دور دراز لڑائی میں شرکت کی گنجائش محسوس نہ ہوئی ورنہ وہ جانتا تھا کہ اگر انگریزوں نے ہندوستان پر تسلط حاصل کرلیا تو ان کا قدم ایک نہ ایک دن افغانستان کی طرف ضرور بڑھے گا۔ 1793ء میں تیمور شاہ پشاور میں قیام کے دوران بیمار پڑ گیا۔ اسے کابل لایا گیا جہاں وہ کچھ دنوں کے بعد وفات پا گیا۔ کابل کے چہار باغ میں اس کی تدفین ہوئی۔ ایک قول کے مطابق اس کی موت طبعی نہیں تھی بلکہ اسے زہر دیا گیا تھا۔

زمان شاہ کا دور اور عالمی سیاست میں تبدیلیاں: تیمور شاہ خود اپنا کوئی ولی عہد نامزد نہیں کرسکا تھا لہٰذا اس کی موت کے وقت سلطنت کا کوئی متعین وارث نہ تھا۔ حکومت میں اس کی آل اولاد اور رشتہ دار کثرت سے تھے۔ ان میں اقتدار کی کھینچا تانی کے باعث کشت وخون کی نوبت آسکتی تھی، اس لیے عوام بے حد پریشان تھے۔ آخر جو خطرہ محسوس کیا جارہا تھا وہ واقع ہوکر رہا۔ افغانستان میں جگہ جگہ تیمور شاہ کے بیٹے، امراء اور نائبین بادشاہی کا دعویٰ کرنے لگے۔ ایسی حالت میں تیمور شاہ کا سب سے لائق بیٹا زمان شاہ اس خانہ جنگی کے خاتمے اور قومی وحدت رائے کا سبب بنا۔ زمان شاہ، تیمور شاہ کا پانچواں بیٹا تھا۔ قبائل کے زعماء نے ایک جرگے میں اسے پورے افغانستان کا حاکم قرار دیا اور یوں افغانستان طوائف الملوکی کا شکار ہوتے ہوتے رہ گیا۔

زمان شاہ ایک ذہین، بہادر، بصیرت مند، متحرک اور ہوشیار انسان تھا۔ علم وفضل، سیاست دانی اور معاملہ فہمی میں وہ اپنے دادا کے اوصاف کا وارث تھا۔ اس کے دور حکومت میں دنیا نئے انقلابات کے مناظر دیکھ رہی تھی۔ اس کی تخت نشینی کے دو سال بعد 1795ء میں ایران کی بساط سیاست پلٹ گئی اور آقا محمد خان نے وہاں قاچاری سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔ برصغیر کے جنوبی علاقوں میں ٹیپو سلطان اور

ایسٹ انڈیا کمپنی کے معرکے جاری تھے۔ یورپ میں بھی انقلابات جنم لے رہے تھے۔ برطانوی جو دنیا پر چھاتے جا رہے تھے، فرانس کے انقلابی رہنما نپولین کے ظہور سے گھبرا رہے تھے جس نے دیکھتے ہی دیکھتے یورپ کے کئی ممالک فتح کر کے ''عظیم تر فرانس'' کے خواب کو حقیقت میں بدل دیا تھا۔ دنیا اب علاقائیت کی حدود سے نکل کر بین الاقوامیت کے دور میں داخل ہو رہی تھی۔ ایک ملک کے انقلاب کے اثرات دنیا کے آخری سرے تک محسوس کیے جانے لگے تھے۔ برطانیہ امریکا پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے میں ناکام ہونے کے بعد پوری توجہ ہندوستان پر دے رہا تھا اور دہلی کے مغل حکمران سمیت ہندوستان کے تمام راجے، نواب اور امراء انگریزوں کی سازشوں کے توڑ سے عاجز اور اس کی پیش قدمی روکنے میں ناکام تھے۔ ٹیپو سلطان رحمہ اللہ جو میسور میں ایک مضبوط مورچہ بنا کر انگریزوں سے مصروف پیکار تھے، بری طرح گھر چکے تھے۔ ایسی حالت میں ہندوستان کے عوام ایک بار پھر افغانستان کی طرف اُمید بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور افغانستان کے اس نئے حکمران کو اپنا نجات دہندہ تصور کر رہے تھے۔

<u>ہندوستان پر فوج کشی اور اس کے محرکات:</u> تخت نشینی کے فوراً بعد زمان شاہ کو ٹیپو سلطان کی جانب سے ہندوستان پر حملے کا باقاعدہ دعوت نامہ ملا کیوں کہ میسور کی تیسری جنگ میں شکست کے بعد ٹیپو کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنے بل بوتے پر ہندوستان سے نکال باہر کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ پھر لاہور کے نواب غلام محمد خان روہیلہ نے خود کابل کے دربار میں حاضری دی اور انگریزوں کے مظالم سے نجات کے لیے جھولی پھیلائی۔ انہی دنوں اسے فرانس کے فاتح نپولین کا پیغام ملا۔ نپولین چاہتا تھا کہ مسلم ممالک اس کا ساتھ دیں اور وہ ترکی، ایران اور افغانستان سے ہوتا ہوا ہندوستان میں گھس کر انگریزوں کو نکال باہر کرے۔ مگر زمان شاہ نے اپنے ارکان سلطنت سے مشورے کے بعد اس پیش کش کو مسترد کر دیا۔ دراصل افغانستان کے مسلمانوں کی دینی غیرت یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ اپنی قوم کی نجات کے لیے عیسائیوں سے مدد لیں۔ نیز اس صورت میں یہ خطرہ موجود تھا کہ انگریزوں کے بعد اس خطے پر فرانسیسیوں کا راج نہ ہو جائے، جو کسی بھی طرح مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ خاصی سوچ بچار کے بعد زمان شاہ نے خود انگریزوں سے مقابلے کا فیصلہ کیا اور زبردست تیاریوں کے ساتھ ایک لاکھ 50 ہزار سپاہی تیار کر لیے۔

اپنی تخت نشینی کے کچھ ہی دنوں بعد وہ دسمبر 1793ء میں ہندوستان کی طرف روانہ ہو گیا مگر ابھی وہ پشاور پہنچا تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ باغی عناصر نے سندھ کے تالپوروں کی مدد سے قندھار پر حملہ کر دیا ہے جس میں زمان شاہ کا سات سالہ بیٹا بھی زخمی ہو گیا ہے۔ زمان شاہ کو مجبوراً واپس جا کر یہ فتنہ فرد کرنا پڑا۔ اگلے سال 1794ء میں وہ ایک بار پھر ہندوستان کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ پنجاب میں پڑاؤ ڈالے

ہوئے تھا کہ اسے ہرات میں بغاوت کی خبر ملی جس میں قندھار کا ایک سردار عطا محمد خان بھی پانچ ہزار افراد کے ساتھ شریک تھا۔ زمان شاہ کو ایک بار پھر واپس جانا پڑا۔

1795ء میں وہ 30 ہزار سپاہی لے کر دریائے سندھ کے پار اُترا اور حسن ابدال میں کیمپ لگایا۔ اس کی سپاہ کے ایک حصے نے آگے بڑھ کر جہلم کے قریب ''رہتاس'' کے تاریخی قلعے پر قبضہ کر لیا۔ زمان شاہ اس بار مضبوط عزم لے کر آیا تھا اور اس کا ارادہ بہت جلد جنوبی ہندوستان تک پہنچنے کا تھا مگر اچانک خبر آئی کہ ایران کے حکمران آقا محمد خان نے اُفغانستان کی مغربی سرحدوں پر حملہ کر کے اہم ترین مغربی شہر مشہد پر قبضہ کر لیا ہے، اُفغان گورنر شاہ رُخ کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا ہے اور بہت بڑا علاقہ ایرانی افواج کے ہاتھوں تاراج ہو چکا ہے۔ ان اطلاعات کے بعد زمان شاہ کے لیے اپنے ملک سے باہر کسی مہم میں مشغول رہنا ممکن نہیں تھا اس لیے وہ واپس اُفغانستان چلا گیا۔

زمان شاہ بہر حال دھن کا پکا تھا، جنوری 1797ء میں وہ ایک بار پھر ہندوستان آیا اور لاہور تک بلا روک ٹوک بڑھتا گیا۔ اس بار دہلی کے مغل بادشاہ شاہ عالم نے جو کہ انگریزوں سے بری طرح خائف تھا زمان شاہ کو دہلی آنے کی دعوت دی تھی۔ زمان شاہ کی آمد سے انگریز سخت پریشان تھے اور کسی بھی طرح اس کی یلغار کو روکنا چاہتے تھے۔ انہوں نے زمان شاہ سے خط و کتابت شروع کر دی۔ اس دوران زمان شاہ کو ہرات میں بغاوت کی اطلاع ملی اور اسے واپس جانا پڑا۔ ہندوستان کے عوام زمان شاہ کے بار بار آنے اور مہم ادھوری چھوڑ کر واپس جانے سے حیران و پریشان تھے اور سوچ میں تھے کہ نامعلوم تقدیرِ الٰہی میں ان کے لیے کیا لکھا ہے؟

سکھوں سے مصالحت اور آخری یلغار: زمان شاہ نے کابل کے راستے سے ہرات پہنچ کر بغاوت کی سرکوبی کی۔ اب اس نے ایک نئے انداز سے انگریزوں کا سر کچلنے کا منصوبہ بنایا۔ ہر فوج کشی میں اس کا بیشتر وقت پنجاب میں ضائع ہو جاتا تھا جس کی بڑی وجہ وہاں سکھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت تھی جو کسی طرح اُفغانوں کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ ان کا سربراہ رنجیت سنگھ اُفغانستان کے لیے ایک بڑا خطرہ بن چکا تھا۔ زمان شاہ نے رنجیت سنگھ سے صلح کر لی اور اسے پنجاب کا حکمران تسلیم کر لیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح انگریزوں کے خلاف مہم کے دوران اسے سکھوں کا تعاون حاصل رہے گا اور پشت سے کسی خطرے کا امکان بھی نہیں ہو گا۔

پنجاب میں سکھوں کی حکومت تسلیم کر لیے جانے کے بعد رنجیت سنگھ نے بہت بڑے نامور فاتح کا روپ دھار لیا مگر اس فاتح کی تلوار مسلمانوں کے خون سے رنگین ہوتی رہی۔ اس نے اُفغانستان کا احسان

مان کر اس سے دوستانہ تعلقات رکھنے کی بجائے انگریزوں سے دوستی کو ترجیح دی، جواباً انگریزوں نے اسے شیرِ پنجاب کا لقب دے کر اپنے استعماری مقاصد کے لیے بے دام غلام بنالیا۔ بہر حال رنجیت سنگھ سے تعلقات بنا کر زمان شاہ نے اکتوبر 1798ء میں زبردست تیاری اور تازہ عزائم کے ساتھ ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس بار اس کی پیش قدمی اس لیے تیز تر تھی کہ جنوبی ہندوستان کا مردِ مجاہد ٹیپو سلطان بری طرح انگریزوں کے نرغے میں تھا اور اس نے زمان شاہ سے مدد طلب کی تھی۔

زمان شاہ بہت تیزی سے چلا اور لاہور سے گزر کر دریائے ستلج کے قریب آن پہنچا۔ انگریزوں پر اضطراب کی کیفیت طاری تھی جبکہ مسلمان اس بار نہایت پُرامید تھے کہ زمان شاہ کی مہم کامیاب ہوگی۔ خود زمان شاہ کو بھی اپنی کامیابی کا یقین تھا۔ مگر اسی دوران اسے معلوم ہوا کہ ایران کے نئے حکمران فتح علی شاہ قاچار نے افغان باغی عناصر کے ساتھ مل کر افغانستان پر حملہ کر دیا ہے اور افغان صوبے خراسان پر قبضہ کر لیا ہے۔

زمان شاہ ان دشمنوں سے نمٹنے کے لیے ایک بار پھر واپس جانے پر مجبور ہو گیا...... یہ جنوری 1799ء کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد اس شہسوار کو دوبارہ ہندوستان آنا نصیب نہ ہوا۔ اس کی زندگی کے بقیہ تیس سال افغانستان کی اندرونی شورشوں کو دور کرنے میں اس قدر مصروف گزرے کہ اسے دوبارہ ہندوستان کا رُخ کرنے کا وقت نہ مل سکا۔

زمان شاہ کے عزائم بہت بلند تھے مگر افسوس کہ وہ انہیں پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکا۔ ابدالی کے اس جانشین نے ہندوستان اور افغانستان کے مسلمانوں کو انگریزوں کے فتنے سے نجات دلانے کے لیے متعدد بار سرزمینِ ہند کا رُخ کیا تھا مگر ہر بار اسے ناکام واپس آنا پڑا جس کی وجہ یہی تھی کہ اس کے افغانستان سے نکلتے ہی اندرونی دشمن سر اُٹھا لیتے اور حریف ہمسایہ طاقتیں دست درازی کرنے لگتیں۔ شاید ان پے در پے تلخ تجربات اور ناکام مہمات کے بعد زمان شاہ یہ جان گیا تھا کہ حالات کا دھارا اس کے خلاف ہے۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ اس وقت افغانستان کے اندرونی دشمن بکثرت تھے اور اس کی بدنیت ہمسایہ ریاستیں اتنی طاقتور ہو چکی تھیں کہ افغانستان ان سے محفوظ نہیں رہا تھا۔ چنانچہ ایسے میں افغان افواج کے لیے جنوبی ہندوستان تک کی طویل تر مہم انجام دینا از حد مشکل تھا۔

انگریزوں اور ایرانیوں کی سازشیں: اس کے علاوہ افغانستان میں اتنے تواتر سے اندرونی و بیرونی خطرات کے ابھرنے میں اور زمان شاہ کی مہمات کے ناکام رہنے کی سب سے بڑی وجہ انگریزوں کی خفیہ سازشیں تھیں۔ اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی ابھی تک جنوبی ہندوستان کے ساحلوں پر ہی قابض ہو سکی تھی

مگر اس کی سیاسی چالوں کا دائرہ نہایت وسیع تھا اور انگریزوں کی سازشیں ابھی سے دور دراز کے ممالک پر اثر انداز ہو رہی تھیں۔ زمان شاہ کو بار بار واپسی پر مجبور کرنے والی شورشوں اور بیرونی حملوں کے پیچھے انگریزوں کی پالیسیاں کام کر رہی تھیں۔

1798ء میں جب زمان شاہ ٹیپو سلطان کی دعوت پر آخری بار ہندوستان آیا تو اس وقت ایرانی حکمرانوں کو اَفغانستان پر حملے کے لیے باقاعدہ اُبھارا گیا تھا۔ یہ کام سرانجام دینے والا شخص مہدی علی خان درحقیقت ایران میں انگریزوں کا ریزیڈنٹ تھا۔ پہلے یہ ٹیپو سلطان کا درباری تھا بعد میں غداری کر کے انگریزوں سے مل گیا۔ انہوں نے اسے ایران میں اپنا ایجنٹ مقرر کر دیا۔ اس بدبخت نے انگریزوں کے اشارے پر عین ایسے وقت میں ایرانی حکمران کو اَفغانستان پر حملے کے لیے اُکسایا جب زمان شاہ اور ٹیپو سلطان کی افواج کے اتحاد کے ذریعے انگریزوں کے ہندوستان سے بے دخل کیے جانے کی اُمید بندھ چلی تھی مگر دشمنانِ اِسلام کی سازش کامیاب ہوئی اور زمان شاہ ٹیپو سلطان کی مدد کے لیے نہ پہنچ سکا۔ زمان شاہ کی واپسی کے کچھ عرصے بعد 2 مئی 1799ء کو انگریزوں نے میسور پر قبضہ کر کے ''اب ہندوستان ہمارا ہے'' کا نعرہ لگایا اور جلد ہی وہ پورے ہندوستان پر قابض ہو گئے۔

اس دور کے حالات کے تجزیے سے صاف پتا چلتا ہے کہ ایرانی حکومت ابتداء ہی میں انگریزی استعمار سے مغلوب ہو کر اس کی آلہ کار بن گئی تھی اور اَفغانستان و ہندوستان کے خلاف انگریزوں کی سازش میں برابر کی شریک تھی۔ انگریز کیپٹن میلکم نے دربار ایران میں رسائی حاصل کر کے ایرانی حکمرانوں کو اَفغانستان کے خلاف خوب استعمال کیا۔ اَفغانستان کی اندرونی بغاوتوں میں بھی اس کا پورا پورا ہاتھ تھا۔ اس برطانوی افسر نے ایرانی دربار میں اثر و رسوخ حاصل کر کے اَفغانستان کے خلاف سازشوں کا جال بچھانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس نے گراں قدر تحائف پیش کر کے اور سیاسی دباؤ ڈال کر حکومتِ ایران سے اس معاہدے کو منظور کرا لیا کہ:

(ا) جب کبھی اَفغانستان ہندوستان پر حملہ کرنے کی تیاری کرے گا، ایران اپنی پوری طاقت کے ساتھ اَفغانستان پر حملہ کر دے گا اور اس موقع پر اَفغانستان سے کبھی سابقہ معاہدے کا لحاظ نہیں کرے گا۔

(ب) اگر حکومت برطانیہ اور اَفغانستان میں جنگ چھڑ جائے تو ایران برطانیہ سے مکمل عسکری تعاون کرے گا۔ اس موقع پر ایران کے تمام جنگی اخراجات برطانیہ کے ذمہ ہوں گے۔

(ج) فرانس کو ایران یہ موقع نہیں دے گا کہ وہ ان بری یا بحری راستوں سے جو ایران کے ماتحت ہیں، گزر کر ہندوستان تک پہنچ سکے۔

یہ وہ معاہدہ تھا جس کے بعد اُفغانستان ایک طویل عرصے تک برطانوی سامراج کی سازشوں کا براہِ راست نشانہ بنا رہا جس میں ایران پوری طرح شریک تھا۔

افغانستان سے دشمنی کی وجوہ: یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر برطانیہ کو ہندوستان پر تسلط حاصل کر لینے سے بھی پہلے اُفغانستان کے بارے میں اس قدر سنجیدہ ہونے کی ضرورت کیوں پیش آئی کہ اس کی توانائیوں کا ایک بڑا حصہ شروع سے اس سرزمین کے خلاف سازشوں کے لیے مخصوص ہو گیا تھا۔ اس نہایت اہم سوال کے جواب میں دو بڑی وجوہ سامنے آتی ہیں جو درج ذیل ہیں:

❶ ...... مغربی دنیا اُفغانستان کے جری اور غیرت مند مسلمانوں کی نفسیات سے بخوبی واقف تھی۔ اقوامِ مغرب خصوصاً انگریزوں کی یہ عادت ہے کہ وہ کسی قوم سے معاملہ کرنے سے پہلے اس کی مذہبی وثقافتی تاریخ، عادات ونفسیات اور اخلاقیات کے بارے میں خوب گہرا مطالعہ کر کے ہر ممکن معلومات حاصل کر لیتے ہیں۔ مستشرقین کی خدمات ایسے ہی کاموں کے لیے وقف ہوتی ہیں۔

ہمیں یاد رکھنا ہوگا کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں بنگال پر تسلط کے لیے مکروفریب میں مصروف تھی تو اس وقت احمد شاہ ابدالی کے عروج کا زمانہ تھا۔ ہندوستان پر اس کے پے درپے حملوں سے انہیں احساس ہو چکا تھا کہ مسلمانانِ ہند سے بھی زیادہ خطرناک حریف درۂ خیبر کے پار ہے جو برصغیر پر ان کے تسلط کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ انگریزوں نے سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کے بعد اُفغانستان کے زمان شاہ کو اپنا سب سے بڑا حریف سمجھا اور اس کے خلاف سازشوں کا دائرہ اس طرح پھیلا دیا کہ اس کی کوئی مہم کامیاب نہ ہو سکی۔

❷ ...... دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ انگریز مال ودولت کے حریص تھے۔ اُفغانستان اس زمانے میں ایسا دولت مند خطہ تھا جسے نہ صرف ہمسایہ ممالک بلکہ دور دراز کی قوموں کے نزدیک بھی قابلِ رشک حیثیت حاصل تھی۔ انگریز جو کہ ہندوستان کو ''سونے کی چڑیا'' سمجھ کر کلکتہ کے ساحل پر اُترے تھے۔ اُفغانستان کو ''چاندی کی کان'' کی حیثیت سے پہچانتے تھے۔ اس ملک کے بے شمار معدنی وسائل ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھے۔ ان عوامل کی بنا پر برطانوی سیاست ہندوستان کے ساتھ ساتھ پوری طاقت کے ساتھ اُفغانستان کے خلاف بھی مصروفِ کار رہی اور اس نے اس مملکت کو کمزور کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

کیپٹن میلکم نے زمان شاہ کے ہندوستان پر حملوں کے دوران ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل ویلزلی کو جو خط لکھا اس کے ایک اقتباس سے انگریزوں کی اُفغانستان کے بارے میں مذموم سوچ کی بخوبی عکاسی ہوتی ہے۔ کیپٹن میلکم نے لکھا: ''زمان شاہ کو ہندوستان پر قبضے سے کوئی چیز نہیں روک سکتی سوائے

اس کے کہ اس کی مملکت میں خانہ جنگی برپا کر دی جائے۔''

جب وہ اس مہم میں کامیاب ہوگیا تو اس نے لکھا: ''مطمئن رہیے! زمان شاہ اگرچہ ہندوستان میں مداخلت کی قوت رکھتا ہے مگر وہ اس کی فرصت نہیں پا سکے گا...... اور خداوند کی مدد سے چند سال تک وہ اپنے مسائل میں اس طرح اُلجھا رہے گا کہ اسے کسی چیز کے بارے میں سوچنے کا ہوش نہیں رہے گا۔''

اُفغانستان کو بدامنی سے دوچار کر کے وہ اپنے دوسرے خط میں لکھتا ہے: ''انگریزوں کا مفاد اس میں ہے کہ صوبہ خراسان (جو اُفغانستان کا حصہ تھا) کو خودمختار حیثیت دلا دی جائے اور اگر اس کا ایران واُفغانستان میں سے کسی ایک کا صوبہ بن کر رہنا ضروری ہو تو پھر (اُفغانستان کی بجائے) اسے ایران کا صوبہ بنا دیا جائے اس لیے کہ ایران کی طاقت اُفغانستان کے مقابلے میں کم ہے۔''

<u>زیرِ زمین سازشیں اور شہزادہ محمود کی بغاوت:</u> اُفغانستان میں خانہ جنگی کی آگ بھڑک چکی تھی، جس کے باعث زمان شاہ کے بقیہ تمام ایام اندرونی مہمات ہی میں کٹ گئے۔ بہرکیف اس نے اپنی قوت وسیاست دانی کی بدولت ان تمام سازشوں کو ناکام بنا کر مخالفین کی سرکوبی کی اور اُفغانستان کی وحدت کو برقرار رکھا اور ایرانی حکمران فتح علی شاہ قاچار کو، جو بار بار انگریزوں کے اشارے پر اُفغانستان کی سرحد یں پامال کرتا تھا، ہر بار منہ توڑ جواب دے کر مار بھگایا، لیکن تابکے...... آخر میں خود اس کا بھائی شہزادہ محمود باغی ہوگیا۔ زمان شاہ کو اس کی سرکشی کا زور توڑنے کے لیے اپنی تمام قوتیں بروئے کار لانا پڑیں...... اس کے باوجود باغی عناصر قابو نہ آ سکے۔

اس زمانے میں وحدتِ اُفغانستان کے خلاف سازشیں کس کس طرح میں جاری تھیں، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان دنوں ہندوستان سے ''میاں غلام محمد'' نامی ایک درویش قندھار میں آبسا تھا۔ اس کی بزرگی کا چرچا دور دور تک ہوگیا۔ امراء، خان، قبائلی سردار اور حکومتی افسران تک اس کے حلقہ بگوش ہونے لگے۔ میاں غلام محمد نے ان میں سے خاص خاص بااثر افراد کو اپنے قریب تر کر کے زمان شاہ کے خلاف ایک زیرِ زمین خفیہ جماعت تشکیل دی جس کے بنیادی مقاصد یہ تھے کہ زمان شاہ سے اقتدار چھین کر شہزادہ محمود کو بادشاہ بنا دیا جائے۔

اس جماعت کی سرگرمیوں کے باعث ملک میں بڑے پیمانے پر حکومت کے خلاف ذہن سازی ہوئی۔ باغی شہزادے محمود کو بے پناہ قوت حاصل ہوگئی اور ملک کا امن خطرے میں پڑ گیا۔ بارک زئی قبیلے کے ایک موقع شناس سردار، فتح علی خان نے شہزادہ محمود کا ساتھ دے کر اس خانہ جنگی کو مزید ہوا دی۔ فتح علی خان کے اٹھارہ بھائی تھے جن میں سے سلطان محمد خان، یار محمد خان، دوست محمد

خان، رحمدل خان، پُردِل خان، عظیم خان، شیر دل خان، کہن دل خان، عبدالجبار خان اور نواب اسد اللہ خان کے نام مشہور ہیں جو شہزادہ محمود کے حامی تھے۔ ایران کی قاچاری حکومت بھی شہزادہ محمود کی پوری پشت پناہی کر رہی تھی اور انگریزوں کی پالیسی بھی یہی تھی کہ زمان شاہ کے مخالفین کو تقویت دی جائے۔ آخر 1801ء میں شہزادہ محمود ایران کی امداد اور باغیوں کی بہت بڑی تعداد کے ساتھ دو بدو مقابلے پر اتر آیا۔ زمان شاہ کابل میں تھا کہ شہزادہ محمود نے بڑی تیزی سے فراہ، قندھار اور غزنی پر قبضہ کر لیا اور پھر کابل کی طرف بڑھا۔ زمان شاہ اس سے مقابلے کی ہمت نہ کر سکا اور پشاور کی طرف فرار ہو گیا۔ راستے میں شنوار کے ملا عاشق نامی ایک قلعہ دار کے ہاں تھوڑی دیر دم لینے کے لیے رکا۔ اس وقت اس کے ساتھ صرف پندرہ افراد تھے۔ کچھ ہی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ قلعہ دار کے تیور بدلے ہوئے ہیں اور وہ ان کا محافظ نہیں، داروغہ زنداں معلوم ہو رہا ہے۔ شاہ زمان نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح ملا عاشق کو منا کر وہاں سے نکل جائے مگر اب وہ دو سو مسلح باغیوں کی حراست میں تھا۔ ملا عاشق نے کابل میں شاہ محمود کو پیغام بھیج دیا کہ زمان شاہ میری گرفت میں ہے۔ سپاہی بھیج کر اسے منگوا لیں۔ شاہ محمود نے اٹھارہ بھائیوں میں سے اسد اللہ خان بارک زئی کو برق رفتار گھڑ سواروں اور ایک جراح کے ساتھ فوراً اُدھر روانہ کر دیا اور حکم دیا کہ جاتے ہی شاہ زمان کی آنکھیں نکال لے۔

شاہ زمان نوشتہ تقدیر پڑھ چکا تھا۔ اب اس کے مقدر میں مصائب ہی مصائب تھے۔ اسد اللہ کے آنے سے قبل اس نے "کوہِ نور ہیرا" دیوار کے ایک خفیہ سوراخ میں چھپا دیا۔ اسد اللہ نے آتے ہی اسے گرفتار کر لیا۔ سپاہیوں نے سابق بادشاہ کو پکڑ کر زمین پر گرا دیا، جراح نشتر لے کر آگے بڑھا اور بڑی بے رحمی سے اس کی دونوں آنکھیں نکال لیں۔

وہ بادشاہ جس کی آن بان سے فرنگیوں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا، اب تادمِ مرگ اندھیروں کا قیدی بن چکا تھا۔ اسے بیل گاڑی میں ڈال کر کابل لایا گیا اور بالا حصار کے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ زنداں کی بلند دیواروں کے پیچھے ابدالی کے اس نامور جانشین کا اس گمنامی میں انتقال ہوا کہ مؤرخین اس کے سن وفات تک کی صحیح تعیین نہیں کر پاتے۔

زمان شاہ سے اقتدار کا چھننا درحقیقت افغانستان کے زوال کا آغاز تھا۔ اسے تخت سے اترے ابھی دو برس بھی نہیں ہوئے تھے کہ خراسان کا پورا صوبہ ایران کے قاچاری بادشاہوں نے دبا لیا، مرو کا انتہائی اہم شہر روس کے قبضے میں چلا گیا اور پورا پنجاب افغانستان کی ذیلی حکومت کی جگہ سکھوں کی مکمل خود مختار ریاست کی شکل اختیار کر گیا۔ جب تک زمان شاہ حکمران تھا، افغانستان کی سرحدیں انہی

حدود میں برقرار تھیں جہاں تک احمد شاہ ابدالی انہیں وسیع کر کے گیا تھا مگر جب وہ تخت وتاج سے محروم ہوا تو صرف 20 سالوں میں پشاور، اٹک، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسماعیل خان، ملتان اور کشمیر تک کے تمام علاقے افغانستان سے الگ ہو گئے۔ اور ہم زمان شاہ کے 20 سال بعد افغانستان کی جگہ ایک چھوٹا سا ملک دیکھتے ہیں جو سامراجی طاقتوں کے لیے کھلونا بن چکا تھا۔

شاہ محمود کا دورِ اول اور ابتر حالات: شاہ محمود ابدالی 1801ء سے 1804ء تک اقتدار پر قابض رہا۔ اس کا چار سالہ دور افغانستان کے انحطاط کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ بارک زئی قبیلے کا سردار فتح علی خان جس نے اس کے اقتدار کا راستہ ہموار کیا تھا، ملکی امور پر چھایا ہوا تھا۔ اس دور میں انگریزوں کی سیاست نے ایک طرف حکومتِ ایران کو مغربی افغانستان پر حملوں کے لیے اُکسایا اور دوسری طرف سکھوں کو پنجاب پر مکمل قبضے کا موقع فراہم کیا۔

یہ قبضہ در حقیقت خود انگریزوں کی فتح تھی اس لیے کہ سکھا شاہی اور ایرانی حکومت میں ان کا پورا عمل دخل تھا اور وہ ان سے اپنی ہر بات منوانے کی طاقت رکھتے تھے۔ اگر سکھ اور ایرانی انگریزوں کا ساتھ نہ دیتے تو پنجاب یا خراسان کی افغانستان سے علیحدگی اتنی آسانی سے ممکن نہ تھی۔

شاہ محمود کی اُمورِ حکومت سے لاپرواہی عوام کے لیے سخت ایذا کا باعث تھی، اس لیے اندرونِ ملک بار بار بغاوتیں سر اُٹھاتی رہیں۔ اس کا دوسرا بھائی شجاع الملک بھی اس سے حکومت چھیننے کے لیے بے قرار تھا۔ حکومت کے کئی امراء اس کے ساتھ مل گئے تھے۔ 1803ء میں غلجائی قبیلے کے 40 ہزار افراد نے مسلح بغاوت کی اور عبدالرحیم خان نامی سردار کی قیادت میں کابل اور قندھار پر حملہ کیا مگر یہ بغاوت فرو کر دی گئی۔ مگر اسی دوران موقع سے فائدہ اُٹھا کر حکومت ایران نے مغربی افغانستان کے شہروں مشہد اور نیشاپور پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح خراسان افغانستان کے قبضے سے نکل گیا۔

افغانستان کے دشمنوں نے جب یہ دیکھا کہ بغاوتوں، سازشوں اور قبائلی جھگڑوں کے باوجود اس ملک تنزل کی رفتار ان کی خواہش کے مطابق نہیں ہے تو انہوں نے اسے فرقہ وارانہ فسادات کی آگ میں دھکیلنے سازش کی۔ کابل اور اس کے گرد ونواح میں اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کو ایک دوسرے کے خلاف خوب بھڑکا دیا گیا چنانچہ فرقہ ورانہ لڑائیاں شروع ہو گئیں...... ہر طرف بدامنی پھیل گئی۔ افغانستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ سنی اور شیعہ اس طرح مدِ مقابل آئے ہوں۔ یہ سازش کس کی تھی؟ تاریخ اس معاملے میں خاموش ہے مگر غالب امکان یہ ہے کہ اس کے پسِ پردہ بھی انگریزوں کا ہاتھ ہو گا جو "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی ہر جگہ کامیابی سے استعمال کرتے آئے ہیں۔

شاہ محمود قید، شاہ شجاع مسند نشین: اگر شاہ محمود بیدار مغزی سے کام لیتا تو فسادات پر قابو پانا مشکل نہ تھا مگر وہ بخود اُمورِ سلطنت سے غافل اور عیش و نشاط میں منہمک تھا، ملک کا سارا انتظام وزیر فتح علی خان کے سپرد تھا، یا اس کا بیٹا شہزادہ کامران ملکی معاملات کو دیکھتا بھالتا تھا۔ مگر وزیر فتح علی خان اور شہزادہ کامران دونوں اِن دنوں کابل سے بہت دور اپنے مشاغل میں مگن تھے، اس لیے کسی نے اس موقع پر عوام کی کوئی خبر نہیں لی۔ فرقہ ورانہ فسادات کی آگ تھمی تو کابل کے شہریوں نے حکومت کے خلاف احتجاج شروع کر دیا۔ یہ احتجاج مسلح مزاحمت کی شکل اختیار کر گیا اور شاہ محمود کو جو بالا حصار کے قلعے میں قیام پذیر تھا چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔

شاہ محمود نے قلعے کے توپچیوں کو عوام پر گولہ باری کا حکم دے دیا اور محاصرین کی لاشیں گرنے لگیں۔ شاہ محمود کے بھائی شجاع الملک کو اس موقع پر اقتدار کی سیڑھی سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ وہ فوراً کابل پہنچا اور ''باغ بابر'' میں پڑاؤ ڈال دیا۔ ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ مزاحمت کار اس کے گرد جمع ہو گئے، ان کی مشترکہ قوت سے کام لے کر اس نے بالا حصار پر قبضہ کر لیا اور شاہ محمود کو گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ شجاع الملک، شاہ شجاع کے لقب سے 1804ء میں تخت نشین ہوا...... اس کا دورِ حکومت اَفغانستان کے مسلمانوں کی بدقسمتی میں مزید اضافے کا باعث بنا۔ پورے ملک میں افراتفری پھیل گئی۔ جگہ جگہ امراء نے خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ سابق حکمران شاہ محمود کا بیٹا شہزادہ کامران اور وزیر فتح علی خان جگہ جگہ بغاوت کی چنگاریاں سلگا رہے تھے۔

دراصل شاہ شجاع عوامی مقبولیت اور عسکری طاقت سے محروم ایک کمزور حکمران تھا۔ کابل کے جو لوگ وقتی طور پر شاہ محمود کو برطرف کرنے کے لیے اس کے گرد جمع ہو گئے تھے وہ بھی جلد ہی اس سے تنگ آ گئے تھے۔ انگریزوں کو اَفغانستان میں اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے ایسے ہی کمزور حکمران کی تلاش تھی۔ چنانچہ وہ خفیہ سازشوں کے ذریعے شاہ شجاع سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش بھی کرنے لگے۔

برطانیہ کا اَفغانستان سے اوّلین معاہدہ: اس دور میں روس کے زار حکمران ایشیائی ممالک کی سلامتی کے لیے شدید خطرہ بن چکے تھے اور وہ فرانس کے انقلابی لیڈر نپولین سے دفاعی و عسکری معاہدہ بھی کر چکے تھے۔ انگریزوں نے دو بڑی طاقتوں کے خطرے سے پیش بندی کے لیے 12 مارچ 1809ء کو ایران کی قاچاری حکومت سے یہ معاہدہ کیا کہ ایران کسی یورپی طاقت کو راہداری کی سہولت مہیا نہیں کرے گا۔ بدلے میں برطانیہ ایران پر یورپی ممالک کے حملے کی صورت میں ایران کی پوری مدد کرے گا۔ انگریز اس قسم کا معاہدہ اَفغانستان سے بھی کرنا چاہتے تھے...... چنانچہ انگریز نمائندہ ''سٹیوارٹ

الفنسٹن'' برطانوی بادشاہ کی جانب سے قیمتی تحائف لے کر شاہ شجاع کے دربار میں حاضر ہوا۔ شاہ شجاع ان دنوں پشاور میں مقیم تھا۔ وہ اگرچہ اُفغانستان کے دورِ زوال کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھا مگر پھر بھی اپنی آبائی روایات اور اِسلامی تہذیب وثقافت کا پابند تھا۔ شاہ زمان کا چھپایا ہوا ''کوہِ نور ہیرا'' کسی طرح اسے مل گیا تھا جسے وہ اپنی جان کی طرح عزیز رکھتا تھا۔

''سٹیوارٹ الفنسٹن'' اس سے ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''شاہ کے سامنے کسی کو لب کشائی کی ہمت نہیں تھی۔ ہم شاہ کے سامنے آکر دور ہی سے تعظیم بجالائے اور ہاتھ پھیلا کر اس کے لیے دُعا کی۔ نقیب نے تعریفی وتوصیفی القاب وآداب کے بغیر صرف میرا نام لے کر کہا: 'حضور والا! یہ لوگ یورپ کے سفیر کی حیثیت سے حاضر ہوئے ہیں۔' شاہ نے صاف اور گونج دار آواز میں کہا: 'خوش آمدید!' ہم دوبارہ سہ بارہ تعظیم بجالائے اور دُعا کی۔ شاہ نے حکم دیا کہ انہیں خلعت عطا ہو۔ دربار کے دونوں اطراف میں موجودہ افسران اور امراء کی دو قطاریں ایک قطار میں تبدیل ہوکر دربار سے نکل گئیں۔ معسکر میں فوجی پریڈ ہوئی...... شاہ شجاع نہایت خوبصورت ہے۔ وہ سیاہ ڈاڑھی والا خوش اخلاق انسان ہے۔ اس کی عمر اندازاً تیس سال ہے۔''

اس طرح شاہ شجاع سے انگریزوں کے مراسم کا آغاز ہوا۔ اس سے پہلے احمد شاہ ابدالی سے لے کر شاہ محمود تک ہر حکمران انگریزوں کی اِسلام دشمنی کے باعث انہیں اپنا حریف سمجھتا آیا تھا مگر شاہ شجاع وہ پہلا حکمران تھا جس نے انہیں دوست کی حیثیت سے قبول کیا۔ پشاور میں 7 جون 1809ء کو اس نے انگریز سفیر اسٹیوارٹ الفنسٹن کے ساتھ خصوصی ملاقات میں یہ معاہدہ کرلیا کہ اُفغانستان اپنی سرزمین کو انگریزوں کے خلاف کسی بیرونی طاقت کے حق میں استعمال نہیں ہونے دے گا اور انگریزوں کے حریفوں کو راہ داری کی سہولت نہیں دے گا۔ بدلے میں انگریزوں نے شاہ شجاع کو بھی اپنے تعاون کی یقین دہانی کرائی۔

شجاع کے خلاف بغاوت، شاہ محمود تخت نشین: اس معاہدے سے اگرچہ شاہ شجاع کو اپنی کرسی مضبوط محسوس ہونے لگی مگر درحقیقت عوامی سطح پر اس کی رہی سہی ساکھ بھی یکسر ختم ہوگئی۔ برطانوی وفد کے پشاور سے روانہ ہونے کے فوراً بعد کابل میں بغاوت ہوگئی۔ اس کا گرفتار شدہ بھائی، سابق حکمران محمود آزاد ہوگیا اور اس نے اپنے وزیر فتح علی خان کی مدد سے دوبارہ اُفغانستان کا اقتدار حاصل کرلیا۔ شاہ محمود کے دورِاوّل میں بھی فتح علی خان حکومت کے سیاہ وسپید پر حاوی تھا۔ اب دوبارہ اسے اقتدار دلا کر فتح علی خان اس کا محسن بن گیا تھا اس لیے شاہ محمود نے اسے پہلے سے بھی زیادہ اختیارات دے دیے۔ یہ شاہ محمود کی بہت بڑی غلطی تھی جس کا نتیجہ ابدالی خاندان کے اقتدار سے محرومی کی صورت میں ظاہر ہوا۔

بارک زئیوں کی اجارہ داری، سکھوں کی فتوحات: فتح علی خان کہنے کو تو وزیر تھا مگر در حقیقت "بادشاہ گر" تھا، بارک زئی قبیلے کے اس سردار نے اپنے اختیارات سے فائدہ اٹھا کر اپنے اٹھارہ (18) بھائیوں کو ملک کے کلیدی عہدوں پر فائزہ کر دیا۔ بڑے بڑے شہر اور صوبے ان کی تحویل میں دے دیے۔ اُفغانستان کی حکومت اب فتح علی خان کے بھائیوں کے ہاتھوں میں تھی۔ شاہ محمود کو اس کے باوجود ہوش نہ آیا، وہ بدستور عیش و عشرت میں منہمک رہا۔

1812ء میں فتح علی خان نے ذاتی رنجش کی بناء پر سردار عطا محمد خان کو جو اُفغانستان کی ابدالی حکومت کی جانب سے کشمیر کا حاکم مقرر کیا گیا تھا، معزول کرنا چاہا...... فتح خان چاہتا تھا کہ کشمیر کی حکومت اپنے بھائی عظیم خان کو دے دے، مگر عطا محمد خان اس فیصلے کے خلاف سراپا احتجاج بن گیا اور مسلح مدافعت کے لیے تیار ہو گیا۔

فتح خان نے یہ دیکھ کر پنجاب کے مطلق العنان آمر رنجیت سنگھ سے درخواست کی کہ وہ کشمیر کو عطا محمد خان سے چھیننے میں حکومتِ اُفغانستان کی مدد کرے۔ رنجیت سنگھ کے لیے یہ کشمیر میں مداخلت کا سنہرا موقع تھا۔ اس نے فوراً دس ہزار سپاہی کشمیر روانہ کر دیے۔ اس طرح کشمیر کی حکومت عطا محمد خان سے چھین کر عظیم خان کو دلوا دی گئی مگر اس کے ساتھ ساتھ سکھوں کا عمل دخل کشمیر کی سیاست میں مستحکم ہو گیا۔

اُفغان حکومت کی کمزوری بھانپ کر سکھوں کی جرأت مزید بڑھ گئی، انہیں پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ ابدالی حکومت اپنے داخلی معاملات سدھارنے میں بھی ان کی محتاج ہے۔ فتح خان کے اس اقدام کے نتائج مستقبل میں ظاہر ہوئے، سکھوں کا اثر و رسوخ کشمیر میں اتنا بڑھا کہ آخر کار پورا کشمیر ان کے قبضے میں آ گیا۔

کشمیر کی حکومت فتح خان کے بھائی کو دلوانے کے بعد رنجیت سنگھ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ دریائے سندھ کے کنارے ابدالیوں کے اہم ترین مورچے اُٹک قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح سکھوں نے اُفغان سپاہ کے کشمیر تک پہنچنے کا راستہ مسدود کر دیا۔ ملتان اب تک ابدالی عملداری میں شامل تھا مگر 1818ء میں رنجیت سنگھ نے اس پر حملہ کر دیا، حاکم ملتان مظفر خان بہادری سے لڑتا ہوا شہید ہو گیا اور ملتان بھی سکھوں کے قبضے میں آ گیا۔

18 بھائیوں کی ابدالی خاندان سے بغاوت: ادھر ایران نے بھی اُفغانستان کو مزید زک پہنچانے کے لیے پیش قدمی کی۔ اس بار ایرانی فوج کا نشانہ اُفغانستان کا اہم ترین مغربی شہر ہرات تھا۔ وہاں شہزادہ فیروز الدین مقابلے پر ڈٹ گیا مگر اس کے پاس فوج کم تھی، اس نے دربار کابل سے اعانت کی درخواست کی۔ شاہ محمود نے وزیر فتح علی خان کو اس مہم کے لیے روانہ کیا۔ فتح علی خان اپنے چار بھائیوں

سمیت فوج لے کر وہاں پہنچا۔ انہوں نے ہرات کو ایرانیوں سے تو بچالیا مگر خود ہرات میں فساد کھڑا کر دیا۔ فتح علی خان کے بھائی اپنی قوت کے نشے میں شہزادہ فیروز کی حیثیت بھی بھول گئے۔ وہ محل کے زنان خانے میں گھس گئے اور عورتوں کے زیورات تک نوچ ڈالے۔ گویا یہ ابدالی خاندان کے خلاف بارک زئی قبیلے کا اعلانِ بغاوت تھا۔ ہرات پر قبضے کے بعد فتح علی خان نے شہزادہ فیروز الدین کو اس کے کنبے سمیت گرفتار کر کے اپنے بھائی پردل خان کے پاس بھیج دیا، جو قندھار کا حاکم تھا۔

کابل میں شاہ محمود کو ہرات کے المیے کی اطلاع ملی تو وہ بھونچکا رہ گیا۔ 18 بھائیوں کے اقتدار کا جال کاٹنا اتنا آسان نہیں تھا تاہم اپنے خاندان کی یہ بے عزتی بھی قابل برداشت نہ تھی۔ شاہ محمود کا بیٹا شہزادہ کامران پہلے ہی فتح خان اور اس کے بھائیوں کا مخالف تھا اور ان کے اختیارات کے خلاف احتجاج کرتا رہتا تھا، مگر اس کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ اب لوہا گرم دیکھ کر اس نے اپنے باپ سے فوج کشی کی اجازت لی اور ہرات روانہ ہوا۔ ہرات میں ابدالیوں کو عام مقبولیت حاصل تھی لہٰذا انجامِ کار فتح علی خان گرفتار ہوا۔ شہزادہ کامران نے اس کی آنکھیں نکلوا دیں اور اسے قید خانے میں ڈال دیا۔ یہ 1817ء کے موسمِ سرما کا واقعہ ہے۔ اس خبر نے فتح خان کے بھائیوں کو غضب ناک کر دیا اور وہ کھلم کھلا جنگ پر آمادہ ہو گئے۔ افغانستان کے ایوانِ اقتدار میں اب ابدالیوں اور بارک زئیوں میں سے کوئی ایک ہی رہ سکتا تھا۔ یہ دونوں قبائل جو کل تک ہم نوالہ و ہم پیالہ ہو کر اقتدار میں شریک تھے، اب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو چکے تھے۔ تاہم یہ بات واضح تھی کہ بارک زئیوں کا پلہ بھاری تھا جبکہ ابدالی اپنی خاندانی شجاعت کے باوجود کمزور تھے۔

ابدالیوں کی سرکوبی کے لیے عظیم خان نے کشمیر میں لشکر تیار کیا اور دوست محمد خان کو اس کا سالار بنا کر کابل روانہ کر دیا تا کہ شاہ محمود کو تاج و تخت سے محروم کر دیا جائے۔ شاہ محمود بازی ہاتھ سے نکلتی دیکھ کر بدحواس ہو گیا اور غزنی کو محفوظ سمجھ کر وہاں پہنچ گیا۔ شہزادہ کامران جو ہرات میں تھا، نوشتۂ دیوار پڑھ چکا تھا، بہر کیف خاندانی آن کو بچانے کے لیے وہ بھی غزنی میں اپنے باپ سے آملا۔

<u>ابدالی حکومت کا خاتمہ</u>: ادھر سردار دوست محمد خان نے اپنے بھائی یار محمد خان کے ساتھ کابل پہنچ کر شہر پر قبضہ کر لیا۔ عوام کو مطمئن رکھنے کے لیے وقتی طور پر انہوں نے شاہ شجاع کے بھائی شہزادہ ایوب کو تخت پر بٹھا دیا مگر عملاً اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ یوں 1818ء میں اس عظیم الشان ابدالی حکومت کا خاتمہ ہو گیا جس کی بنیاد احمد شاہ ابدالی جیسے مردِ مجاہد نے رکھی تھی۔ کچھ دنوں بعد شاہ محمود اور شہزادہ کامران، جو غزنی میں پناہ لیے ہوئے تھے، آخری کوشش کے طور پر اپنی فوج کے ساتھ کابل روانہ ہوئے۔ وزیر فتح علی

خان اب تک ان کا قیدی تھا، راستے میں انہوں نے سید آباد کے مقام پر اسے قتل کرادیا۔ کابل کے قریب پہنچ کر ان بدقسمت باپ بیٹے کو اطلاع ملی کہ قندھار پر قابض پردل خان اب ہرات کی جانب بڑھنا چاہتا ہے۔ یہ سن کر یہ دونوں وہیں سے ہرات کی طرف چلے گئے جو ماضی میں بھی ابدالیوں کی آخری پناہ گاہ ثابت ہوا تھا۔ ہرات میں اُن کا اقتدار نسبتاً محفوظ تھا، اس لیے ایک عرصے تک دونوں اس شہر میں آرام سے رہے۔ مگر یہاں یہ باپ بیٹا آپس میں بھی متحد نہ رہ سکے اور ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ 1820ء اور 1821ء میں شاہ محمود اور شہزادہ کامران میں ہرات کے اقتدار کے لیے باقاعدہ دو معرکے ہوئے۔ آخر کار طے یہ پایا کہ شاہ محمود بادشاہ اور کامران وزیر اعظم رہے گا۔ شاہ محمود 1829ء تک خود کو شاہی القاب کے ساتھ بہلانے اور شراب و کباب میں ڈوب کر اپنی ناکامیوں کا غم بھلانے کی کوششیں کرتا رہا۔ ایک دن غسل خانے سے ابدالی خاندان کے اس آخری حکمران کی لاش برآمد ہوئی اور یوں ایک نامور خاندان کے نااہل حکمران کی موت کے ساتھ تاریخ اُفغانستان کا ایک باب بند ہو گیا۔

مآخذ و مراجع

- ...... اُفغانستان در مسیرِ تاریخ، میر غلام محمد غبار
- ...... Encyclopedia of Islam.V.1
- ...... اردو دائرہ معارف اِسلامیہ، ناشر: دانش گاہ، پنجاب یونی ورسٹی
- ...... اِسلامی انسائکلو پیڈیا، سید قاسم محمود
- ...... دریائے کابل سے دریائے یرموک تک، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ
- ...... سیرِ اُفغانستان، علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ

چودھواں باب

طوائف الملوکی، سکھوں کی غلامی اور سید احمد شہید کی تحریکِ جہاد

اُفغانستان کی سیاست پر اٹھارہ بھائیوں کی اجارہ داری نے اس ملک کی تاریخ کو اندھیروں میں گم کردیا تھا۔ طوائف الملوکی کا ایسا بھیانک دور اس سے قبل اُفغانستان میں کبھی دیکھا نہیں گیا تھا۔ ایک تختِ کابل تھا اور اس پر قبضے کے لیے ایک درجن سے زائد طالع آزما ہر وقت سازشوں میں مصروف تھے۔ تختِ کابل پر حکمران تیزی سے بدل رہے تھے۔ سابق حکمران شاہ شجاع جلاوطن ہو کر سندھ کے علاقے شکار پور میں مقیم تھا، وہ اب بھی خود کو اُفغانستان کا حکمران کہتا تھا۔ جبکہ بارک زئی خاندان کے جھگڑالو بھائی آپس کے تنازعات میں شاہ شجاع کے ابدالی خاندان کے اثر ورسوخ کو بھی نہایت مکاری کے ساتھ استعمال کررہے تھے۔

کابل کے کٹھ پتلی حکمران: دوست محمد خان نے 1818ء میں شاہ شجاع کے بھائی شہزادہ ایوب کو تختِ کابل کا کٹھ پتلی حکمران بنایا تھا مگر یہ حکومت چند دن ہی چل سکی۔ اب شاہ شجاع کے دوسرے بھائی سلطان علی کو تخت پر بٹھادیا گیا...... مگر اگلے برس (1819ء) میں سردار محمد عظیم خان نے اس کے خلاف بغاوت کردی کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ علامتی ابدالی حکمرانوں کی آڑ لے کر دوست محمد خان وزارت کا قلمدان سنبھالے تمام سیاہ وسپید پر قابض ہو چکا ہے۔ سردار عظیم خان نے بغاوت کرکے کٹھ پتلی حکمران سلطان علی کو قتل کردیا اور دوست محمد خان کو وزارت سے برطرف کردیا۔ اب کابل عظیم خان کے ہاتھ میں تھا۔

سکھ حکمران رنجیت سنگھ نے بھائیوں کی اس لڑائی سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ ملتان کے بعد ڈیرہ اسماعیل خان اور ڈیرہ غازی خان پر قبضہ میں بھی اسے کوئی دشواری نہ ہوئی۔ اُفغانستان کے کرتا دھرتا اٹھارہ بھائی اس نوخیز طاقت کے خلاف متحد نہ ہو سکے۔ وہ بدستور خانہ جنگی میں مصروف رہے اور ملک کی

سرحدیں پامال ہوتی رہیں۔
افغانستان کی حدود روز بروز سکڑ رہی تھیں۔ اندرون ملک یہ عالم تھا کہ گراں فروشی، غربت، علمی انحطاط، صنعتی زوال اور لاقانونیت کا دور دورہ تھا۔ بھائیوں کی نااتفاقی نے افغانستان کو مستقل طور پر تین بڑے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ پشاور، کابل اور قندھار گویا تین مستقل ملکوں کے دارالحکومت تھے جہاں ہر وقت ایک دوسرے کے خلاف منصوبے بنائے جاتے تھے۔ بیرونی طور پر ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی غیر ملکی طاقت سے مرعوب اور اس کا حلیف تھا۔ پشاور کے سرداروں نے رنجیت سنگھ کے عتاب سے بچنے کے لیے اس کا اتحادی بننا پسند کر لیا تھا۔ قندھار کے سردار ایران کے تابع دار تھے اور کابل برطانوی اور روسی سازشوں کی آماجگاہ تھا۔ اگر کبھی ان بھائیوں کو اپنی خود مختاری کے تحفظ کا خیال آتا بھی، تو وہ فقط وقتی جوش ہوتا تھا۔

معرکہ مایار، بارک زئیوں کی شرمناک پسپائی: 1821ء میں سردار عظیم خان نے ڈیرہ جات اور سرحد کو سکھوں کے تسلط سے آزاد کرانے کا منصوبہ بنایا۔ اس نے جہاد کا اعلان کیا اور درۂ خیبر کے پار کا علاقہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس نے اپنے بھائی عبدالصمد خان کو جہاد کی دعوت کے لیے یوسف زئی قبائل کی جانب روانہ کیا۔ اس کے علاوہ بونیر، اکوڑہ خٹک اور سوات کے علاقوں سے بھی ہزاروں پُرجوش مسلمان جہاد کی آواز پر جمع ہو گئے۔ اکوڑہ خٹک کے میدان میں 20 ہزار یوسف زئی، کوہستانی اور خٹک مجاہدین، سکھوں سے مقابلے کے لیے اکٹھے ہوئے۔ ان کے ساتھ علمائے کرام، مشائخ اور پیرزادوں کی بڑی تعداد بھی تھی۔ انہوں نے نوشہرہ کی بلندی پر دریائے سندھ کے بائیں طرف میدان کے ساتھ ڈیرے ڈال دیے تھے۔

سردار محمد عظیم خان اور دوست محمد خان کی افواج دریا کے دائیں طرف تھیں۔ افغانوں کی اتنی بڑی طاقت اور پُرجوش جمعیت پہلی بار سکھوں کے مقابلے میں آئی تھی اس لیے رنجیت سنگھ نے بھی ان سے لڑنے کے لیے زبردست منصوبہ بندی کی۔ وہ خود مقابلے کے لیے آیا اور اٹک کے قلعے کو معسکر بنا کر سردار کھڑک سنگھ اور فرانسیسی جنرل وینٹورا کو دریا کے پار بھیج دیا۔ انہیں حکم دیا کہ دوست محمد خان اور محمد عظیم خان کی مشترکہ افواج کو کچل دیں۔

خود رنجیت سنگھ دریا کی بائیں جانب نوشہرہ میں خیمہ زن قبائلی لشکر کی طرف بڑھا جو اپنے جوش وجذبے اور جہادی ولولے کے باعث اسے زیادہ خطرناک محسوس ہو رہا تھا۔ جنگ شروع ہوئی تو ہر طرف گرد وغبار کا طوفان اُمڈ آیا، کشتوں کے پشتے لگنے لگے۔ یہ لڑائی رنجیت سنگھ اور قبائلی مجاہدین کے درمیان ہو رہی تھی۔ مجاہدین نے سکھوں کا ایسی بے جگری سے مقابلہ کیا کہ اس کی مثال اُس دور میں ملنا مشکل ہے۔ وہ مذہبی جوش وجذبے سے سرشار تھے اور سکھوں پر بڑھ چڑھ کر حملے کر رہے تھے۔

پٹھانوں کے ولولے کا یہ عالم تھا کہ بارہ بارہ سال کے لڑکے بھی لڑائی میں شامل تھے جو صرف چھریوں اور خنجروں سے لڑ رہے تھے۔ وہ چھریاں لہراتے ہوئے شہد کی مکھیوں کی طرح سکھوں کی گھڑسوار اور پیدل صفوں میں جا گھستے اور ان کے نیزوں اور سنگینوں سے چھلنی ہو جانے کے باوجود ان میں سے بہت سوں کو مار ڈالتے۔ سورج چڑھنے کے ساتھ ساتھ جنگ میں شدت آتی جا رہی تھی، قبائلی مجاہدین کا رُعب سکھوں پر چھا چکا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ مسلمان جیت جائیں گے۔ رنجیت سنگھ کے افسران اور بڑے بڑے سرداروں سمیت ہزاروں سکھ جہنم رسید ہو چکے تھے جن میں مشہور اکالی سردار پھولا سنگھ بھی شامل تھا جس کی سفاکی کے قصے مشہور تھے۔

ادھر نوشہرہ کے محاذ پر تو یہ شدت کی جنگ جاری تھی مگر دوسری طرف سردار محمد عظیم خان اپنے بالمقابل کھڑک سنگھ اور جنرل وینٹورا کی افواج سے نہ ٹکرایا۔ دراصل اس نے عبدالصمد خان کو فوج کے ایک حصے کے ساتھ پہلے روانہ کر دیا تھا۔ یہ سپاہی سکھوں سے مقابلے میں شریک ہو گئے تھے۔ مگر ان کے پیچھے پیچھے جب محمد عظیم خان روانہ ہوا تو راستہ تبدیل کر لیا۔ اس دوسرے راستے سے جب فوج میدانِ جنگ کے قریب پہنچی تو عظیم خان نے دیکھا کہ میدانِ جنگ اور اس کے درمیان ایک گہرا چشمہ حائل ہے...... عظیم خان نے اسے عبور کرنے کی کوشش کی تو اس کے کئی آدمی ڈوب گئے۔ اب وہ اپنی فوج سمیت وہیں کھڑا رہ گیا۔

دن بھر اس کے سامنے گھمسان کی جنگ جاری رہی مگر اس نے تماشا دیکھنے کے سوا کچھ نہ کیا۔ اگر وہ خطرہ مول لے کر کسی اور راہ سے میدانِ جنگ میں اترنے کی کوشش کرتا تو یہ کوئی ناممکن کام نہیں تھا...... مگر عظیم خان کی ایک بہت بڑی کمزوری اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ یہ اس کا بھاری بھرکم خزانہ تھا جسے وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ اس کے ہر سفر میں یہ خزانہ اس کے ساتھ ساتھ رہتا تھا، کسی لمحے وہ اس کروڑوں کی دولت کو خود سے جدا نہیں کرتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کے سفر کی نقل و حرکت بڑی سست اور محتاط ہوا کرتی تھی۔ اب اس خزانے سمیت میدانِ جنگ میں کودنا اس کے لیے ایک مشکل سوال بن گیا۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں رہا اور ادھر سہ پہر کے وقت مجاہدین کی عددی کمی اور انہیں تازہ دم افراد کی کمک میسر نہ ہونے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے رنجیت سنگھ نے میدانِ جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ اس نے بذاتِ خود قبائلیوں کے ایک اہم مورچے پر زبردست حملہ کر کے اسے روند ڈالا اور مجاہدین کو پسپا کرتا چلا گیا۔ سکھوں کے توپ خانے اور ان کے ماتحت فرانسیسی سپاہیوں نے مجاہدین کو شدید نقصان پہنچایا۔ شام کو جنگ رُکنے تک دس ہزار افغان شہید اور زخمی ہو چکے تھے۔

اس زبردست نقصان کے باوجود قبائلی زعماء اور سرداروں نے ہار نہ مانی۔ اگلے دن وہ پیرزادہ محمد اکبر

کو قائد بنا کر دوبارہ مقابلے کی تیاری کرنے لگے۔ اس دن کی جنگ میں عظیم خان کی محفوظ فوجوں کا شامل ہونا از حد ضروری تھا ورنہ شکست یقینی تھی مگر صد افسوس! عظیم خان گزشتہ روز افغانوں کے نقصانات دیکھ کر بدحواس ہو چکا تھا۔ اسے خطرہ محسوس ہوا کہ آج لڑائی میں شرکت کے بعد اگر پھر شکست ہوئی تو اس کا خزانہ سکھوں کے ہاتھ لگ جائے گا۔ چنانچہ وہ شرمناک بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میدانِ جنگ سے واپس ہو گیا اور مہمند کے پہاڑوں سے ہوتا ہوا پشاور کی طرف نکل گیا۔ اب زخم خوردہ قبائلی مجاہدین سکھوں سے تنہا نہیں لڑ سکتے تھے اس لیے انہیں بھی پسپا ہونا پڑا۔

عظیم خان خوف، شرم اور بدحواسی کے عالم میں پشاور میں بھی نہ ٹھہر سکا اور جلد ہی جلال آباد کے راستے کابل پہنچ گیا۔ اس شکست نے افغانوں کی آن بان خاک میں ملا کر انہیں خفت، ذلت اور پشیمانی کے اندھیرے میں دھکیل دیا تھا۔ عظیم خان کو ہر کوئی ملامت کر رہا تھا۔ وہ اس بے عزتی کو برداشت نہ کر پایا اور رنج واندوہ کی حالت میں کچھ ہی دنوں بعد دنیا سے رخصت ہو گیا۔

یہ 1822ء کا واقعہ ہے۔ ادھر رنجیت سنگھ نے مارچ 1823ء میں ہشت نگر اور پشاور پر باقاعدہ قبضہ کر لیا۔ اس نے فتح کا زبردست جشن منایا۔ گزشتہ ایک ہزار سال میں یہ پہلا موقع تھا کہ یہ اسلامی شہر کفار کے قبضے میں آیا تھا۔

سردارانِ پشاور سکھوں کے باج گزار: رنجیت سنگھ نے عظیم خان کے بھائیوں یار محمد خان اور سلطان محمد خان کو اطاعت کی دعوت دی، جو انہوں نے قبول کر لی۔ رنجیت سنگھ نے انہیں اپنے باج گزار کی حیثیت سے پشاور کا پروانہ حکومت دے دیا۔ یہ عاقبت نااندیش افغان سردار، رنجیت سنگھ کی سرپرستی حاصل ہو جانے پر خوش تھے حالانکہ یہ مسلمانوں کی غلامی کے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

اس قدر ذلت اور مصیبت کے باوجود اٹھارہ بھائیوں کے باہمی اختلافات اور جھگڑے جاری تھے۔ اس نہ ختم ہونے والے سلسلے نے عوام کو احتجاج پر مجبور کر دیا، چنانچہ قوم کے بزرگ جمع ہوئے اور انہوں نے اسلام اور وطن کی حرمت کا واسطہ دے کر انہیں ایک مصالحتی معاہدے پر آمادہ کر لیا۔

ربیع الثانی 1224ھ (1826ء) میں انہوں نے قرآن مجید کی قسم کھا کر قوم کے اکابر، بزرگوں اور عوامی نمائندوں کے سامنے طے کیا کہ اب وہ آپس میں نہیں جھگڑیں گے۔ اس معاہدے کے تحت کابل پر دوست محمد خان اور امیر محمد خان کا جبکہ پشاور پر یار محمد خان، سلطان محمد خان اور پیر محمد خان کا مشترکہ اقتدار تسلیم کر لیا گیا۔ دیگر علاقے بھی مختلف بھائیوں کی مشترکہ حکومتوں میں تقسیم کر دیے گئے۔ درحقیقت یہ معاہدہ عہدوں کی ایک بندر بانٹ یا ایک ناٹک تھا، جو صرف عوامی دباؤ پر لوگوں کو خوش کرنے کے لیے

رچایا گیا تھا۔ ورنہ دلوں کی کدورتیں اسی طرح باقی تھیں۔ چنانچہ کچھ ہی عرصے بعد خانہ جنگی دوبارہ شروع ہوگئی۔ جہاں ہر سردار پورے ملک کو ہڑپ کر کے مطلق العنان بننے کا خواہش مند ہو وہاں کسی معاہدے سے اتفاق اور اتحاد کس طرح پیدا کیا جاسکتا ہے!۔

سید احمد شہید رحمہ اللہ کی تحریکِ جہاد: ہندوستان اور افغانستان کے خلاف انگریزوں کی بڑھتی ہوئی ریشہ دوانیاں ملت کے ہر صاحبِ فکر و نظر کو حد درجے تشویش میں مبتلا کر چکی تھیں۔ صدیوں سے یہ روایت چلی آرہی تھی کہ ایسے مواقع پر افغانستان سے کوئی مردِ مجاہد کھڑا ہوتا اور حالات کا رُخ بدل دیتا تھا...... مگر اس بار مشیتِ الٰہیہ ہندوستان کے میدانوں میں مجاہدوں کی وہ جماعت تشکیل دے رہی تھی جو آیندہ صدیوں کی ہر جہادی تحریک کے لیے روشنی کا مینار بننے والی تھی۔ یہ سید احمد شہید رحمہ اللہ کی ''جماعتِ مجاہدین'' تھی جس کا مقصد اللہ کی زمین پر اللہ کے نظام کا قیام اور خلافتِ اسلامیہ کا ازسرِ نو احیا تھا۔ سید صاحب 6 صفر 1201ھ (29 نومبر 1786ء) کو ہندوستان کے شہر رائے بریلی کے نواحی دیہات دائرہ شاہ علم اللہ میں پیدا ہوئے، آپ ایک علمی و روحانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بزرگانِ دین کی صحبت نے آپ کی طبیعت میں خدا ترسی، ذوقِ عبادت اور خدمتِ خلق کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھر دیے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ عسکری فنون کے دلدادہ تھے اور جہاد کو مسلمانوں کی سربلندی کا واحد ذریعہ قرار دیتے تھے۔ اُمتِ مسلمہ کی تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے اور اپنے دور کے تمام فتنوں سے پوری طرح باخبر تھے۔

ہندوستان کے نامور عالمِ دین اور بزرگ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے انہیں خلافت عطا کر کے اصلاحِ معاشرہ کا کام سپرد کر دیا۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کے فرزندِ ارجمند شاہ محمد اسماعیل شہید بھی ان کے ہم خیال و ہم فکر تھے...... ان کی کوششوں سے ہزاروں لوگوں نے اپنے عقائد و اعمال کی اصلاح کی اور نیک زندگی گزارنے لگے۔ تاہم سید احمد شہید رحمہ اللہ اس کے باوجود مطمئن نہ تھے۔ وہ ایک انقلابی تحریک کی ضرورت محسوس کر رہے تھے جس کے لیے بے پناہ قربانیوں کی ضرورت تھی۔

انہوں نے اپنے عقیدت مندوں کی سخت تربیت کا آغاز کیا اور انہیں لے کر انتہائی نامساعد حالات میں حج کا سفر کیا اور اس دوران انہیں جہاد کی ترغیب دیتے رہے۔ حج سے واپس آکر انہوں نے اپنی تحریکِ جہاد کا باقاعدہ آغاز کر دیا۔ تحریکِ جہاد کے لیے ایک مرکز کی سخت ضرورت تھی، سید صاحب نے طویل غور و فکر کے بعد یہ طے کیا کہ اس کے لیے افغانستان کو جہادی سرگرمیوں کا مرکز بنا کر پہلے پنجاب کو سکھوں سے، پھر وسطی ہندوستان کو ہندوؤں سے اور آخر میں جنوبی ہندوستان کو انگریزوں کے اقتدار سے آزاد کیا جائے۔

افغانستان کی جانب ہجرت: سید صاحب 7 جمادی الثانیہ 1241ھ (17 جنوری 1826ء) کو

مجاہدین کے ایک قافلے کے ہمراہ اپنے وطن رائے بریلی سے ہجرت کر کے افغانستان کی جانب روانہ ہوئے۔ گوالیار، اجمیر اور ٹونک سے ہوتے ہوئے مارواڑ کے وسیع وعریض ریگستان میں داخل ہوئے۔ صحرا کے پُر مشقت سفر کے اختتام پر سندھ کے بلوچ امراء کا علاقہ شروع ہوا۔ ان دنوں حیدر آباد، سندھ، یہاں کا دارالحکومت اور سب سے بڑا شہر تھا۔ سید صاحب میر پور، ٹنڈو الہ یار اور ٹنڈو جام سے گزر کر حیدر آباد سندھ میں امیرانِ سندھ کے مہمان ہوئے۔ ہر جگہ آپ کا پُر جوش استقبال ہوا اور ہزاروں لوگ بیعت ہوئے۔

رانی پور میں آپ نے سید صبغت اللہ شاہ راشدی رحمہ اللہ کے ہاں قیام کیا۔ سید صبغت اللہ شاہ راشدی حُر تحریک کے بانی ہونے کے باعث برصغیر کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ وہ سید احمد شہید کے ہم مزاج و ہم خیال تھے اور انہی کی طرح اس تحریک کے داعی تھے کہ مشائخ تصوف کو حالات کے تقاضے کے تحت اپنے مریدین کی تربیت اس انداز سے کرنی چاہیے کہ وہ ذاکر شاغل اور عبادت گزار ہونے کے ساتھ ساتھ جذبۂ جہاد اور خدمتِ خلق کی تڑپ سے بھی آراستہ ہوں۔

افغانستان کا سابق حکمران شاہ شجاع جلاوطنی کی زندگی گزارتے ہوئے سندھ کے شہر شکار پور اور اس کے گرد ونواح پر حکومت کرتا رہا تھا، مگر 1823ء میں حیدر آباد کے سندھی بلوچ امراء نے اسے شکار پور سے بے دخل کر دیا تھا، اس کے بعد سے وہ انگریزوں کی پناہ لے کر لدھیانہ میں مقیم تھا اور ان سے ساز باز کر کے اپنی آبائی سلطنت واپس لینے کی تگ ودو میں تھا۔ سید احمد شہید رحمہ اللہ جب مجاہدین کے ساتھ شکار پور کے قریب پہنچے تو افواہ پھیل گئی کہ شاہ شجاع شکار پور پر حملے کے لیے آرہا ہے۔ تاہم بعد میں یہ غلط فہمی دور ہو گئی اور لوگوں نے آپ کا بھرپور استقبال کیا۔

14 ذی الحجہ 1241ھ (20 جولائی 1826ء) کو سید صاحب کا قافلہ شکار پور سے کوئٹہ کی طرف روانہ ہوا جسے اس زمانے میں ''شال کوٹ'' کہا جاتا تھا۔ یہ تین سو ساٹھ میل کا دشوار گزار راستہ تقریباً ایک ماہ میں طے کیا گیا۔ سید صاحب کا قافلہ درہ بولان سے گزر کر کوئٹہ پہنچا تو وہاں کے حاکم محراب خان نے ان کا پُرتپاک خیر مقدم کیا، لشکرِ مجاہدین کی تمام ضروریات کا خیال رکھا اور حضرت کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی۔

افغانستان میں داخلہ، قندھاریوں کا جذبۂ جہاد: چند روز بعد مجاہدین کا یہ قافلہ ''کوہ توبہ'' میں قدرتی طور پر تراشیدہ درہ کوزک (موجودہ کھوجک سرنگ) کو عبور کر کے افغانستان کی حدود میں قدم رکھ رہا تھا۔ 28 محرم الحرام 1242ھ کو سید احمد شہید قندھار کے تاریخی شہر میں داخل ہوئے۔ اٹھارہ بھائیوں میں سے پُردل خان یہاں کا حاکم تھا۔ اس نے سید صاحب کی بے سروسامانی کے باوجود ان کے اس قدر بلند عزائم پر حیرت کا اظہار کیا اور عقیدت واحترام کے ساتھ خاطر تواضع کی۔ صدیوں سے قندھار مجاہدین کا شہر رہا ہے۔ یہ

احمد شہید کے قافلے نے یہاں ڈیرہ ڈالا تو قندھاریوں کو جہاد کا بھولا ہوا سبق ازسرِ نو یاد آگیا۔ ہزاروں نوجوان، بچے اور بوڑھے اسلحہ سنبھال کر مجاہدین کے قافلے میں شرکت کے لیے آن پہنچے۔ سید صاحب کی طرف سے ابھی انہیں سفر کی اجازت نہیں دی گئی تھی مگر وہ لوگ مصر تھے کہ انہیں ساتھ لے جایا جائے۔

ادھر حاکمِ قندھار پردل خان عوام میں ایک پردیسی درویش کی اس قدر مقبولیت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اس نے اسے اپنے اقتدار اور حکومتی نظام کے لیے خطرہ محسوس کیا اور شہر کے دربانوں کو حکم دیا کہ کسی شخص کو مجاہدین کے قافلے کے ساتھ نہ جانے دیا جائے۔ اس حکم کے باوجود عوام کا ہجوم کسی کے قابو نہ آسکا۔ لگتا تھا کہ سارا قندھار خالی ہو جائے گا اور سید صاحب کی محبت ان سب کو ساتھ کھینچ لے جائے گی۔ آخرکار قندھار کی انتظامیہ نے سید صاحب سے درخواست کی کہ آپ کے یہاں قیام سے نظامِ حکومت تلپٹ ہو رہا ہے، لہٰذا آپ جلد از جلد کابل تشریف لے جائیے اور عوام میں سے کسی کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت نہ دیجیے۔

<u>قندھار سے کوچ:</u> یہ بارک زئی خاندان کے حکمرانوں کی جانب سے سید احمد شہید کی تحریک کے لیے پہلا کنکر تھا۔ عوام کی بے پناہ عقیدت کے باوجود حکام کو اپنی سیاسی مصلحتیں عزیز تھیں، اس لیے وہ اس تحریک جہاد کو اپنی سیاست کی بھینٹ چڑھانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کر رہے تھے۔ سید صاحب نے حکام کا رویہ دیکھ کر قندھار سے جلد ہی کوچ کر دیا۔ قندھار کی حکومت کی جانب سے پابندی کے باوجود عوام وخواص سید احمد شہید کے ساتھ جانے کے لیے بے تاب تھے۔ انہیں جب قافلۂ مجاہدین کی اچانک روانگی کی اطلاع ملی تو وہ ششدر رہ گئے۔ شہر کے متعدد جید علماء کرام، مشائخ، صوفیہ اور دینی مدارس کے سینکڑوں پرجوش طلبہ سید صاحب کا ساتھ دینے کے لیے ان کی تلاش میں دوڑے۔

ان میں سے بہت سے حکومت کی جانب سے راستوں کی ناکہ بندی کے باعث سید صاحب تک نہ پہنچ سکے مگر چار سو کے لگ بھگ افراد شہر سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور سید صاحب کے پیچھے چل پڑے۔ سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اپنے قافلے کے ہمراہ قلعہ اعظم خان میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے کہ علماء ومشائخ اور طلبہ دینیہ اور عوام کا یہ وفد آن پہنچا۔ سب جہاد فی سبیل اللہ کے لیے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر آئے تھے۔

سید احمد شہید افغانستان میں بدامنی اور خانہ جنگی کی آگ بجھانا چاہتے تھے۔ وہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی وجہ سے یہاں کے عوام وحکام باہم دست وگریباں ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے معتمد ساتھی خواجہ ظہور اللہ کو پُردِل خان کے پاس بھیج کر یہ اطلاع دی کہ علماء ومشائخ اور طلبہ کا یہ قافلہ اپنی خوشی سے ہمارے پاس آیا ہے، ہم تمہارے شہریوں کو ساتھ نہیں لے جا رہے مگر وہ ساتھ چلنے پر مصر ہیں۔

افغانستان میں علماء ومشائخ کا مرتبہ ہمیشہ نہایت بلند تسلیم کیا جاتا رہا ہے اور ان کے فیصلوں کے

سامنے حکام بھی سر جھکانے کے عادی رہے ہیں۔ ان پر دست درازی کا تصور وہاں ہمیشہ ہولناک نتائج کا حامل رہا ہے۔ اس لیے پُردل خان نے موقع کی نزاکت بھانپتے ہوئے جوابی پیغام بھجوایا کہ علماء ومشائخ اور طلبہ میں سے جواب تک آپ کے پاس پہنچ چکے ہیں، انہیں آپ ساتھ لے جاسکتے ہیں۔ مگر ان کے علاوہ کسی اور کو ساتھ نہ لے جائیں۔ سید احمد شہید نے اس وفد میں سے دو سو ستر افراد کو ساتھ لے جانے کے لیے چن لیا۔ باقی علماء ومشائخ اور طلبہ یہ دیکھ کر بے قرار ہو گئے۔

سید صاحب نے انہیں تسلّی دیتے ہوئے فرمایا: ''جس وقت جہاد شروع ہو جائے تم اس وقت آ جانا، ہمیں کوئی انکار نہ ہوگا۔''

<u>غلزئی قبیلے کا ذوق وشوق:</u> قلعہ اعظم خان سے قافلہ مجاہدین قلعہ رمضان پہنچا۔ یہ غلزئی قبیلے کے سرداروں کا علاقہ ہے۔ غلزئی قبیلہ اس نسل سے تعلق رکھتا ہے جس سے عیسیٰ خیل اور لودھی قبائل کا تعلق ہے۔ اس کا علاقہ جنوبی اَفغانستان کے علاقے قلات غلزئی سے لے کر شمال میں دریائے کابل، مغرب میں گل کوہ اور مشرق میں موجودہ پاک اَفغان سرحد تک پھیلا ہوا ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں یہی قبیلہ اَفغانستان کا حکمران تھا۔ اسی کے ایک فرد میر اویس نے آزاد اَفغان سلطنت کی بنیاد رکھی تھی جو آخری غلزئی حکمران شاہ حسین کے نادر شاہ افشار کے ہاتھوں شکست پر ختم ہوئی تھی۔ ایک صدی قبل اَفغانستان کا یہ حکمران قبیلہ اب بھی بڑے دم خم کا مالک تھا تاہم ابدالی حکمرانوں کے دور میں یہ تمام حکومتی عہدوں سے اس شک وشبہے کی بناء پر محروم رہا کہ مبادا اس کے طاقتور سردار دوبارہ تختِ شاہی حاصل کرنے کی کوشش نہ کر گزریں۔ موجودہ بارک زئی حکمرانوں کے دور میں غلزئیوں کا یہ استحصال زیادہ شدت کے ساتھ ظاہر ہو رہا تھا۔ غلزئی قبیلے کے یہ سردار اب گوشہ عزلت میں رہ کر صرف زمین داری کیا کرتے تھے۔ سید احمد شہید کے قافلے کی آمد کی خبر سن کر یہ سب لپکتے ہوئے آئے اور ان کی تحریک میں حصہ لینے کے لیے بے تابی ظاہر کی۔

سید صاحب نے ان سب کی حوصلہ افزائی اور ان کے جذبات کی قدردانی کی، مگر فی الحال انہیں ساتھ لے کر چلنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کی وجہ ظاہر تھی کہ برسرِ اقتدار بارک زئی قبیلہ اسے اپنی حکومت کے خلاف سازش تصور کر سکتا ہے اور یوں تحریک جہاد ابتداء ہی میں غلط فہمیوں کا شکار ہو کر خانہ جنگی کا باعث بن سکتی ہے۔

<u>اَفغان حکام کے نام پیغام:</u> سید صاحب کا رخ غزنی اور کابل کی طرف تھا، راستے ہی میں آپ نے حاکم غزنی میر محمد خان اور اس کے بھائی حاکم کابل سلطان محمد خان کو یہ پیغام بھجوایا: ''ہم ہندوستانی مسلمانوں اور اہل حمیت کا ایک گروہ کفرستان سے تنگ آکر جہاد وہجرت کے عزم سے اپنے وطن سے نکلا ہے اور مسلمانوں کو دین کے اس ''رُکنِ رکین'' کو قائم کرنے کی دعوت دینے کے لیے محض لوجہ اللہ اس

قدر مسافت طے کر کے تمہارے ملک میں پہنچا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ ہم اس طرح یوسف زئی کے علاقے میں جو پشاور کے اطراف میں ہے، پہنچ جائیں۔ ہم آپ کے شہروں سے گزریں گے، دانائی و مروت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ متوحش نہ ہوں اور ہمارے پہنچنے سے پہلے ہم کو تحریری اجازت دے دیں تا کہ ہم اطمینان کے ساتھ ان حدود سے گزر کر اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں۔''

حاکم غزنی میر محمد خان نے اس خط کے جواب میں اپنی مہر کے ساتھ لکھا کہ ہم آپ کی ہر ممکن خدمت کریں گے۔ سید صاحب کا قافلہ غزنی پہنچا تو شہر کے تمام علماء و مشائخ، امراء، سرداروں اور عوام کے جم غفیر نے آپ کا استقبال کیا۔ مجاہدین کا یہ قافلہ فاتح ہند سلطان محمود غزنوی رحمہ اللہ کے مقبرے کے قریب خیمہ زن ہوا۔ حاکم غزنی کے کم عمر لڑکے نے تیس سواروں کے ساتھ آ کر آپ کی زیارت کی اور کچھ دیر خدمت میں رہا۔

غزنی کے کئی سردار اس سے قبل ہندوستان آ کر سید صاحب کی بزرگی اور ان کی تحریک سے متعارف ہو چکے تھے اس لیے یہاں مجاہدین کا غیر معمولی احترام اور سید صاحب سے بے مثال محبت کے مناظر دیکھنے میں آئے۔

اَفغانستان میں ایک طویل عرصے بعد اس طرح کی ایمان افروز اور روح پرور ہوائیں چلی تھیں۔ قافلہ مجاہدین جہاں جہاں سے گزرتا جاتا لوگوں کے دل بدلتے جاتے، شریعت کا احترام اور سنتوں پر عمل زندہ ہو رہا تھا۔ گناہوں سے نفرت اور جہاد میں جان و مال لٹا دینے کے جذبات ابھر رہے تھے۔ سید صاحب نے دو دن بعد 25 صفر 1242ھ (1826ء) کو غزنی سے کابل کے لیے رختِ سفر باندھا۔

<u>بارک زئیوں میں صلح وصفائی کی کوششیں:</u> کابل کے قریب آپ کو امیر کابل سلطان محمد خان کا خط ملا جس نے آپ کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ کابل کے داخلی راستے پر شاہی سواروں اور افسران کے علاوہ عوام کے بے پناہ سیلاب نے آپ کو خوش آمدید کہا۔ مجمع اتنا زیادہ تھا کہ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ کچھ آگے سلطان محمد خان پچاس سواروں کے ہمراہ خود استقبال کے لیے موجود تھا۔ آپ کو سابق وزیر فتح خان کی حویلی میں ٹھہرایا گیا۔

سید احمد شہید اَفغانستان کے حکمران بھائیوں کی نہ صرف فوجی قوت کا اندازہ لگا چکے تھے بلکہ اس سفر میں جو تقریباً پورے جنوبی، وسطی اور مشرقی اَفغانستان کو محیط رہا، ان کے باہمی تنازعات، حرصِ اقتدار، جذبۂ انانیت اور قومی انتشار کا بھی اچھی طرح جائزہ لے چکے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اَفغانستان جس نے ابدالی حکمرانوں کے دورِ عروج میں ہندوستان کا نقشہ پلٹ دیا تھا آج اغیار کی سازشوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے اور اپنی حفاظت سے بھی قاصر ہے۔ ان حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سید صاحب

نے فیصلہ کرلیا کہ وہ بارک زئی حکمران بھائیوں کے درمیان صلح صفائی کرانے کی حتی الامکان کوشش کریں گے تاکہ ان کی متحدہ طاقت کو اِسلام کے دفاع اور دشمنانِ اِسلام کی سرکوبی کے لیے استعمال کیا جاسکے۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلی چیز یہ تھی کہ مقتدر سردارانِ اُفغانستان سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت جہاد کریں یا کم از کم تعاون کا مخلصانہ وعدہ کریں۔ اس میں شک نہیں کہ اُفغانستان کے علماء و مشائخ اور عوام کے ساتھ سابق حکمران خانوادوں کے بڑے بڑے سرداروں نے سید صاحب کا زبردست استقبال کیا تھا اور ان کی مہم میں شرکت کا بے مثال ذوق وشوق ظاہر کیا تھا مگر اس کے باوجود حکومتی طبقے کا رویہ عجیب بلکہ عجیب تر تھا۔ ان میں سے کئی ایک نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد بھی کرلی تھی اور ان کی خاطر مدارات میں کوئی کمی نہیں کی تھی تاہم سید صاحب کے بار بار سمجھانے کے باوجود وہ آپس میں مل بیٹھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ بلکہ ان میں سے امورِ سلطنت پر زیادہ حاوی سرداروں کو سید صاحب کا اُفغانستان میں زیادہ دن تک ٹھہرے رہنا اپنے اقتدار کے لیے خطرناک محسوس ہورہا تھا۔

پشاور روانگی اور بدھ سنگھ سے معرکہ: سید صاحب نے تقریباً ڈیڑھ ماہ تک کابل میں مقیم رہ کر بارک زئی برادران کو پرچم جہاد تلے جمع کرنے اور باہمی جنگ وجدال ترک کرنے کی تلقین کی۔ جب اصلاحِ احوال کی تمام کوششیں رائیگاں دکھائی دیں تو آپ پشاور روانہ ہوگئے۔ پشاور میں تین دن قیام کے بعد آپ لنڈے دریا (دریائے کابل) کو عبور کرکے چارسدہ کے علاقے ہشت نگر میں آ ٹھہرے۔ یہاں بارک زئی برادران میں سے سب سے چھوٹا بھائی سردار سید محمد خان ایک بڑے مجمعے کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیعت کی۔

ابھی سید صاحب جہاد کے لیے مجاہدین اور اسباب جنگ کا پورا انتظام نہیں کرپائے تھے کہ آپ کو سکھ سردار بدھ سنگھ کی اکوڑہ کی جانب پیش قدمی کی اطلاع ملی۔ سرحد کے سردار اس خبر سے سراسیمہ تھے۔ انہوں نے سید صاحب سے درخواست کی کہ کسی طرح بدھ سنگھ کو دریائے کابل کے پار ہی روک لیا جائے ورنہ وہ اکوڑہ سے لے کر پشاور تک تمام شہروں اور بستیوں کو تاراج کردے گا۔ اب وقت آچکا تھا کہ سید صاحب جہاد فی سبیل اللہ کی اس مہم کا آغاز کرتے جس کے لیے انہوں نے ہجرت کی تھی اور ہزاروں میل کا سفر کرکے غریب الوطنی اختیار کی تھی۔

سید صاحب لشکرِ مجاہدین کے ساتھ نوشہرہ آگئے، یہاں سے آپ نے رنجیت سنگھ کو ایک تاریخی مکتوب روانہ کیا۔ جس کے مندرجات یہ تھے: ❶ ...... اِسلام قبول کرلو (ہمارے بھائی اور ہمارے برابر ہوجاؤ گے مگر اس میں کوئی جبر نہیں۔) ❷ ...... یا ہماری اطاعت اختیار کرکے جزیہ دینا قبول کرلو۔ ہم اپنے جان

ومال کی طرح تمہارے جان ومال کی حفاظت کریں گے۔ ...... اگر تمہیں ان دونوں باتوں میں سے کوئی بھی منظور نہیں تو لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ مگر یاد رکھو تمہیں شراب سے ایسی محبت نہیں ہوگی جیسی ہمیں شہادت سے ہے۔

یہ خط 18 جمادی الاولیٰ 1242ھ (18 دسمبر 1826ء) کو روانہ کیا گیا تھا۔ اگلے دن بدھ سنگھ کا لشکر جو تیزی سے منزلیں مارتا آ رہا تھا، اکوڑہ میں داخل ہو گیا۔ سید صاحب کو اطلاع ملی تو شب خون کے لیے ایک دستہ تیار کر کے روانہ فرمایا۔ اس میں ڈیڑھ سو کے قریب ہندوستانی اور 80 کے لگ بھگ قندھاری مجاہدین جبکہ باقی سرحدی قبائل کے جانباز تھے۔

اس دستے نے دریائے کابل عبور کر کے اکوڑہ میں پڑاؤ ڈالے سکھ لشکر پر حملہ کیا، یہ آخر شب کا وقت تھا۔ سکھوں نے پہلے تو مقابلہ کیا مگر پھر ان میں ایسی ہڑبونگ مچی کہ کسی کو سر پیر کا ہوش نہ رہا۔ تقریباً سات سو سکھ جہنم رسید ہوئے جبکہ مجاہدین میں سے 80 کے لگ بھگ شہید ہوئے۔ اس معرکے میں قندھاری مجاہدین نے جس بہادری کا مظاہرہ کیا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ شہداء میں نصف سے زیادہ افراد انہی کے تھے۔

اکوڑہ کے شب خون کی خبر سے دربار لاہور میں ہل چل مچ گئی، سکھوں کے منہ پر یہ زوردار طمانچہ تھا جسے وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ سکھ کمانڈر بدھ سنگھ اس غیر متوقع نقصان کے بعد گھبرا کر واپس جانا چاہتا تھا مگر اٹک کے سکھ قلعہ دار نے یہ کہہ کر اسے روک لیا کہ تمہاری واپسی سے مجاہدین کی ہمت مزید بڑھ جائے گی اور وہ اٹک تک سارے علاقے پر قبضہ کر لیں گے۔ چند دن بعد سید صاحب نے دریائے سندھ کے پار حضرو پر حملے کا منصوبہ بنایا جو سکھوں کا ایک مضبوط مورچہ تھا۔ اس حملے میں سید صاحب نے اپنے لشکر کے صرف قندھاری مجاہدین کو مقامی افراد کے ساتھ بھیجنے کے لیے چنا۔ حضرو کا معرکہ بھی مجاہدین نے جیتا اور سکھوں کو غیر معمولی نقصان پہنچا کر مال غنیمت کے ساتھ واپس لوٹے۔

سید صاحب کی خلافت کا اعلان: ان دو فتوحات کے بعد سید صاحب کی مقبولیت مزید بڑھتی چلی گئی۔ سرحد کے تین باہم حریف سرداروں خادے خان، اشرف خان اور فتح خان پنجتاری نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے بھرپور ساتھ کا وعدہ کیا۔ خادے خان نے آپ کو ہنڈ کے قلعے میں جو اس کے علاقے کا جنگی مرکز تھا، لا ٹھہرایا۔

12 جمادی الثانیہ 1242ھ (10 جنوری 1827ء) کو یہاں علماء ومشائخ اور مقامی برداروں سمیت عوام کی بڑی تعداد کی موجودگی میں سید صاحب کو باقاعدہ شرعی امام اور خلیفہ تسلیم کر لیا گیا، آپ

کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کی گئی اور علاقے کی مساجد میں خطبہ جمعہ میں آپ کا نام شامل کر لیا گیا۔

کچھ دنوں بعد سید صاحب کو سکھ کمانڈر بدھ سنگھ کا ایک خط موصول ہوا۔ بدھ سنگھ حضرو اور اکوڑہ میں مجاہدین کی کامیاب کارروائیوں سے سخت جھنجھلایا ہوا تھا۔ اس نے سید صاحب کو کھلے میدان میں لڑنے کی دعوت دیتے ہوئے اس خط میں لکھا کہ آپ اصل سید اور بڑے سردار ہیں تو باہر نکل کر صاف صاف مقابلہ کیجیے۔ سید صاحب نے اس خط کے جواب میں جو کچھ تحریر فرمایا اس کا ایک ایک جملہ ان کے اخلاص، فنائیت، جذبۂ جہاد اور سوز دروں کا عکاس ہے۔ اس خط کا ایک اقتباس پیشِ خدمت ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

''دینِ محمدی کی نصرت میں جو کوشش بھی ممکن ہوگی بجا لاؤں گا...... جو تدبیر بھی مفید ہوگی عمل میں لاؤں گا...... ان شاء اللہ زندگی کی آخری سانس تک اسی کوشش میں مشغول رہوں گا، پوری عمر اس کام میں صرف کر دوں گا...... جب تک زندہ ہوں اس راستے پر چلتا رہوں گا...... اور جب تک دم میں دم ہے، اس کا دم بھرتا رہوں گا...... جب تک پاؤں ہیں اس وقت تک یہی راستہ ہے اور جب تک سر ہے اس وقت تک یہی سودا، خواہ مفلس ہوں خواہ دولت مند ہوں، خواہ منصبِ سلطنت سے سرفراز ہوں خواہ کسی کی رعیت بنوں...... خواہ بزدلی کا الزام سہوں خواہ بہادری کی تعریف سنوں...... خواہ میدان جہاد سے زندہ واپس ہوں خواہ شہادت سے سُرخ رو ہوں...... ہاں! اگر میں دیکھوں گا کہ میرے مولیٰ کی خوشی اس میں ہے کہ میں میدانِ جنگ میں تنہا سربکف آؤں تو خدا کی قسم! سو جان سے سینہ سپر ہوں گا اور لشکر کے نرغے میں بے کھٹکے گھس آؤں گا...... مختصر یہ کہ مجھے نہ اپنی شجاعت کا اظہار مقصود ہے نہ ریاست کا حصول......''

(اس اقتباس میں سید صاحب نے آخری جملوں میں جو قسم کھائی تھی، تاریخ گواہ ہے کہ اسے حرف بحرف پورا کر دکھایا، بالاکوٹ کے پہاڑوں کو ہو بہو اس طرح اپنے خون سے لالہ زار بنایا کہ دشمن کے نرغے میں بے خوف و خطر تنہا گھس گئے اور جان جاں آفریں پر قربان کر دی۔)

<u>بارک زئی حکمرانوں کو دعوتِ جہاد:</u> بدھ سنگھ کے خط کے بعد سکھوں سے کھلے میدان میں معرکہ آزمائی ناگزیر ہو چکی تھی۔ پشاور، نوشہرہ، اکوڑہ اور دیگر علاقوں کے یوسف زئی سرداروں نے اس موقع پر افغانستان کے بارک زئی سرداروں کی عسکری قوت کو ساتھ لینے کی ضرورت محسوس کی اور انہیں دعوت دی کہ وہ اپنے لاؤ لشکر سمیت سید صاحب سے آملیں تا کہ عنقریب متوقع جنگ میں سکھوں کو عبرت ناک شکست دی جا سکے۔

سردارانِ بارک زئی افغانستان میں سید احمد شہید کی تحریک جہاد کی اثر انگیزی، خداداد مقبولیت اور اس تحریک کے بانی اور کارکنوں کی بے غرض و بے لوثی کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے...... وہ صحیح

معنوں میں یہ محسوس کرتے تھے کہ مجاہدانہ جذبے پر مشتمل ایسی تحریک گزشتہ کئی صدیوں میں دیکھنے میں نہیں آئی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر اس تحریک کا ساتھ دیا جائے تو افغانستان اور ہندوستان کو غاصب کفریہ طاقتوں کی دست برد سے نجات دلائی جاسکتی ہے مگر ان کے لیے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ تحریکِ جہاد کی کامیابی کے بعد خود ان کا سیاسی مستقبل کیا ہوگا؟ کیا ان کی وہ حکومت پھر بھی قائم رہ سکے گی جو مکمل طور پر شرعی اُمور کی پاسداری نہیں کرتی بلکہ اس کے مختلف احکام کو اپنی اغراض کے لیے روندتی رہتی ہے۔ بارک زئی خاندان کے سردار کئی دنوں تک اس مخمصے میں رہے۔ انہیں یہ بھی خطرہ تھا کہ اگر سید صاحب کا ساتھ دیتے ہوئے انہیں شکست ہوئی تو سکھ ان سے بری طرح انتقام لیں گے لیکن دوسری طرف یہ بھی خطرہ تھا کہ اگر سید صاحب ان کی امداد کے بغیر ہی کامیاب ہوجاتے ہیں تو سکھوں سے بازیاب کرائے گئے تمام علاقے یوسف زئی سرداروں کے قبضے میں آجائیں گے جو اس وقت تمام عسکری طاقت سید صاحب کو پیش کرچکے تھے...... یوسف زئی اور بارک زئی قبائل ان دنوں باہم اچھے تعلقات کے باوجود ایک دوسرے کے پرانے رقیب تھے۔ یوسف زئی قبائل نے کبھی بھی بارک زئی حکمرانوں کے اقتدار کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ ادھر بارک زئی حکمران کسی بھی طریقے سے یوسف زئی قبائل سمیت اکوڑہ خٹک تک کے تمام قبائل کو مکمل طور پر رام کرنے کے لیے عرصے سے تگ ودو میں تھے۔

شیدو کا معرکہ اور یار محمد خان کی سازش: آخر کافی سوچ بچار کے بعد بارک زئی سرداروں میں سے یار محمد خان، سلطان محمد خان اور پیر محمد خان ایک بڑے لشکر کے ساتھ نوشہرہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اس دوران یار محمد خان کے ذہن میں ایک گھناؤنا منصوبہ ترتیب پا رہا تھا۔ اس کے دوسرے دو بھائی اس منصوبے میں اس کے ساتھ شریک تھے یا نہیں...... تاریخ اس بارے میں خاموش ہے۔ بظاہر انہیں یار محمد خان کی بدنیتی کا علم نہیں تھا۔

سید صاحب اپنے ساتھیوں اور یوسف زئی قبائل کے جوانوں کے ہمراہ نوشہرہ پہنچے۔ دریائے کابل کے پار بارک زئی سردار 20 ہزار سپاہیوں کے ساتھ موجود تھے۔ یہاں سے دونوں لشکر مل کر شیدو کی طرف روانہ ہوئے۔ یار محمد خان نے جاسوسوں کے ذریعے سکھ کمانڈر بدھ سنگھ سے یہ معاملہ طے کرلیا تھا کہ وہ جنگ سے پہلے ہی سید صاحب کو قتل کرادے گا اور اگر سید صاحب پھر بھی بچ گئے تو میدانِ جنگ میں عین موقع پر اپنی فوج لے کر اس طرح پسپا ہوجائے گا کہ سکھ سید صاحب کو گرفتار کرلیں۔ یوں یہ تحریک ختم ہوجائے گی۔

یار محمد خان نے اس گھناؤنی سازش کے عوض سکھوں سے کیا کچھ مانگا ہوگا، اس کا کچھ پتا نہیں چلتا لیکن یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ وہ سید صاحب کی مقبولیت کو اپنے اقتدار کے لیے خطرہ سمجھ کر ان سے اسے

ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا اور ساتھ میں سکھوں کو اپنی وفاداری کا یقین دلا کر ان سے تعلقات مزید بہتر بنانے کا خواہش مند تھا۔ اس نے یہی کچھ کیا، شیدو کی جنگ سے پہلی رات اس نے سید صاحب کے کھانے میں زہر ملوا دیا، سید صاحب کی جان تو بچ گئی مگر زہریلے کھانے کے ایک دو لقمے کھانے کے باعث ان کی حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ اگلے دن میدانِ جنگ میں بھی وہ غشی کی کیفیت میں رہے۔ اس وقت تک کسی کو اندازہ نہ تھا کہ یہ کس کی سازش ہے۔

جنگ سے پہلے ہی یار محمد خان نے سید صاحب کو ایک ہاتھی پر سوار کرا دیا تھا۔ بظاہر مقصد یہ تھا کہ سید صاحب کو آرام ملے گا، مگر اصل میں اس بلند قامت سواری پر وہ سید صاحب کو سکھوں کی بندوقوں اور گولوں کے عین نشانے پر لانا چاہتا تھا...... اس کے علاوہ اس طرح وہ آسانی سے سکھ گھڑ سواروں کے نرغے میں آ سکتے تھے اور تیزی سے بچ نکلنا ان کے لیے ناممکن ہو سکتا تھا۔ چونکہ ان سازشوں کا کسی کو علم نہیں تھا، اس لیے کسی کا ذہن ان نتائج کی جانب نہ جا سکا۔ سید صاحب جنگ کے دوران بدستور ہاتھی پر ہی سوار تھے۔

شیدو کے میدان میں جنگ شروع ہوئی تو مجاہدین نے ابتدا ہی میں سکھوں پر زبردست دباؤ ڈال دیا، شیدو کا ایک مقامی سردار گوڈری شہزادہ سب سے زیادہ جانثاری کے ساتھ لڑا اور سکھوں کے مورچوں میں جا گھسا۔ اُدھر سید صاحب پر زہر خورانی کا اثر بدستور باقی تھا۔ وہ اس دوران کبھی ہوش میں آتے اور کبھی دوبارہ بے ہوش ہو جاتے۔ میدان میں مجاہدین کی کامیابی سامنے نظر آ رہی تھی، سکھ پسپا ہو رہے تھے۔ اس دوران کسی شخص نے آ کر سید صاحب کو فتح کی خوشخبری بھی دے دی۔ اب تک یار محمد خان نے جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا اور اپنے سپاہیوں سمیت ایک طرف کھڑا تھا، سکھوں کی طرف سے ایک گولہ اس طرف آ گرا، اس کے ساتھ ہی یار محمد اپنے سپاہیوں سمیت میدان جنگ سے واپس ہو گیا۔ سکھوں نے مسلمانوں کی صفوں کو ٹوٹتا دیکھ کر منصوبے کے مطابق اسی طرف حملہ کر کے مجاہدین کو روندنا شروع کر دیا۔ سید صاحب اب کسی بھی وقت ان کے نرغے میں آ سکتے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر گوڈری شہزادہ ایک چٹان کی طرح اپنے جانبازوں سمیت ان کے راستے میں جم گیا اور آخری سانس تک پروانہ وار لڑتا رہا۔

شاہ اسماعیل شہید لشکر کے ایک اور حصے کی کمان کر رہے تھے۔ انہیں اطلاع ملی کہ یار محمد خان نے بھاگ کر سکھوں کو غلبے کا کھلا موقع دے دیا ہے اور سید صاحب کی جان خطرے میں ہے۔ وہ فوراً واپس پلٹے، سید صاحب کو اپنی حفاظت میں لیا اور میدان جنگ سے باہر نکلتے چلے گئے۔ تاہم ہاتھی پر سوار سید صاحب سکھوں کی بندوقوں کے نشانے پر تھے۔ یہ دیکھ کر مولانا اسماعیل شہید نے آپ کو ایک گھوڑے پر سوار کر دیا اور خود اسی ہاتھی پر سوار ہو گئے، سید صاحب کے محافظ انہیں لے کر پہاڑی علاقے کی طرف

روانہ ہو گئے۔ شاہ اسماعیل بھی سکھوں کو جل دیتے ہوئے دور نکل گئے۔

شیدو کی جنگ میں مجاہدین کی شکست تاریخِ افغانستان کا ایک دردناک باب ہے۔ اس لڑائی میں یوسف زئی قبائل کے تقریباً 80 ہزار اور سردارانِ افغانستان کے 20 ہزار سپاہیوں کو ملا کر ایک لاکھ کے لگ بھگ افراد جمع ہوئے تھے جن سے سکھوں کو عبرتناک شکست دے کر اس خطے کا نقشہ بدلا جا سکتا تھا۔ مگر یار محمد خان کی غداری نے اس تمام محنت پر پانی پھیر دیا جو سید صاحب اور ان کے رفقا سالہا سال سے کرتے چلے آ رہے تھے۔

اس کے بعد افغانستان اور ہندوستان کو تباہ کرنے والی کفریہ طاقتوں کے خلاف اتنی بڑی تعداد میں مجاہدین کہیں ایک جگہ جمع نہ ہو سکے۔ رنجیت سنگھ جسے اس معرکے کے نتیجے میں ایک شرمناک شکست کی خبر کا دھڑکا تھا، فتح کی اطلاع سن کر خوشی سے بے حال ہو گیا۔ اس نے لاہور سمیت اپنی تمام راجدھانی میں جشن منایا اور چراغاں کیا۔

<u>پنج تار میں جہادی مرکز، یار محمد کا انجام:</u> سید احمد شہید شیدو کی جنگ میں بارک زئی سپاہ کی غداری کے باوجود دلبرداشتہ نہ ہوئے۔ انہوں نے مقامی سرداروں کے تعاون سے پنج تار کو اپنا مرکز بنا لیا اور اردگرد کے علاقوں میں شریعتِ اسلامیہ کے احکام نافذ کر دیے۔ لوگوں کو قبائل کے ان غیر شرعی ظالمانہ طور طریقوں اور رواجوں سے نجات دلائی جو عوام کے لیے ایک عذاب سے کم نہ تھے۔

نسل در نسل رائج رہنے والے ان طور طریقوں کے خلاف سید صاحب کی اصلاحی مہم کو شروع شروع میں مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا مگر آہستہ آہستہ لوگوں کا دینی شعور ترقی کرتا گیا، ان کے عقائد واعمال، معاشرت و معاملات اور رہن سہن کی اصلاح ہوتی گئی۔ ادھر سید صاحب کی مخلصانہ جدوجہد اور جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر انتھک محنت جاری تھی اور ادھر بارک زئی سردار اس سرفروشانہ تحریک کا قلع قمع کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ یار محمد خان جو پہلے خفیہ سازشوں میں مصروف تھا، اب کھلم کھلا دشمن بن چکا تھا۔ اس نے ایک لشکر تیار کیا اور پشاور سے ہنڈ کی طرف روانہ ہوا جہاں سید صاحب قیام پذیر تھے۔ قریب پہنچ کر اس نے علاقے کے لوگوں کو مرعوب کرنے کی خاطر توپوں کے دہانے کھول دیے، دھماکوں سے علاقے کے عوام میں خوف وہراس پھیل گیا۔ ان میں سے بہت سے یار محمد خان کے ساتھ مل گئے اور باقی ماندہ جو سید صاحب کا احترام کرتے تھے، مجاہدین کا ساتھ دینے سے رک گئے۔

سید صاحب نے سفیر کے ذریعے یار محمد خان کو یہ کہہ کر صلح پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کے درمیان کشت وخون کی کوئی ضرورت نہیں، اگر شرعی نظام کے اجرا میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے تو ہمارا

کوئی اور مطالبہ نہیں ہے۔ یار محمد خان نے صلح کے پیغام کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اس کے ساتھیوں نے سید صاحب کے سفیر کو دھتکار کر کہا: ''اگر آیندہ سید صاحب کی طرف سے کوئی شخص پیام صلح لے کر آیا تو ہم اس کا سر اڑا دیں گے۔'' اب جنگ ناگزیر ہو چکی تھی، سید صاحب نے مجاہدین کو حریف پر شب خون کا حکم دیا۔ اجازت ملتے ہی چند سو مجاہدین نے یار محمد خان کے لشکر پر حملہ کر دیا اور اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت سے حیرت انگیز طور پر یار محمد خان کے لشکر جرار کو تتر بتر کر کے رکھ دیا۔ یار محمد خان خود بے سروسامانی کے عالم میں زخمی ہو کر پشاور کی طرف بھاگا مگر راستے ہی میں ''ہریانہ'' اور ''دوڈھیرو'' کے درمیان مر گیا۔

بارک زئیوں کا طیش، سلطان خان کا حملہ: یار محمد خان کی ہلاکت نے افغانستان کے حکمران خاندان میں یکدم کھلبلی مچا دی اور سب کے سب اس حقیقت کو نظر انداز کر کے کہ اس حادثے میں یار محمد خان خود قصوروار تھا، سید صاحب کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھنے لگے، علاوہ ازیں انہی دنوں ہندوستان کے چند بدعتی علماء و مشائخ نے، جو سید صاحب کی حق گوئی سے نالاں اور سرحدی علاقوں میں ان کی تحریک کی کامیابی پر چیں بجبیں تھے، بارک زئی حکمرانوں کو ورغلانا شروع کر دیا۔ وہ اپنے جاہ و مراتب اور دنیوی مقاصد کے لیے سید صاحب کی تحریک کو خطرناک سمجھتے تھے، چنانچہ انہوں نے ایسے فتاویٰ مشتہر کیے جن میں سید صاحب کو انبیاء و اولیاء کا گستاخ اور اہل سنت والجماعت کے عقائد سے برگشتہ ظاہر کیا گیا تھا۔ بارک زئی حکمرانوں کو یہ فتاویٰ اپنی اغراض کے عین مطابق نظر آئے، اس لیے انہوں نے سید صاحب سے کوئی صفائی لیے بغیر یک طرفہ طور پر انہیں بدعقیدہ و بے دین مان لیا اور ان کے خلاف بڑے پیمانے پر جنگ کی تیاری شروع کر دی۔

کچھ عرصے بعد سلطان محمد خان اپنے بھائیوں پیر محمد خان، سید محمد خان اور اپنے بھتیجے حبیب اللہ خان کے ساتھ ایک بڑا لشکر لے کر چارسدہ آن پہنچا۔ ان کا مقصد یہی تھا کہ سید صاحب اور ان کے ساتھیوں کو بالکل ختم کر دیا جائے۔ سید صاحب نے قاصد کے ذریعے بارک زئی حکمرانوں کی اس عہد شکنی پر سلطان محمد خان کو یہ زبانی پیغام بھجوایا:

''ہم نے تمہیں جہاد کی دعوت دی، تم نے، تمہارے بھائی پیر محمد خان نے اور بہت سے صاحبان سے ہمارے ہاتھ پر بیعت کی اور اس بات کا عہد و پیمان کیا کہ ہم جان و مال سے اس کار خیر میں شریک ہوں گے۔ تمہارے بھائی دوست محمد خان (حاکم کابل) نے ہمیں کہا تھا کہ میرے یہ بھائی منافق اور دغاباز ہیں، یہ کبھی آپ سے وفا نہیں کریں گے، مگر ہم نے اس کے کہنے کا کچھ خیال نہیں کیا، مگر جب بدھ سنگھ سے مقابلہ ہوا تو وہی ہوا جو دوست محمد خان نے کہا تھا۔ تمہارے بھائی یار محمد

خان نے سکھوں سے مل کر ہمیں زہر دیا اور مقابلے کے وقت دھوکہ دے کر بھاگ گیا۔ پھر کچھ دنوں بعد وہ خود فوج لے کر ہم پر حملہ آور ہوا، ہم نے اسے بہت سمجھایا مگر وہ شامتِ نفس سے نہ سمجھا اور آخر مارا گیا۔ اس میں ہماری کیا خطا ہے؟ ہم تو کفار سے لڑنے کے لیے آئے ہیں، اگر تم خود زیادتی کر کے ہمارے مقابلے میں آؤ گے تو ہم مجبور ہوں گے، اپنے بچاؤ کے لیے جو کچھ ہو سکا کریں گے۔ تم خدا سے ڈرو اور ناحق پر اصرار نہ کرو، برائی کا انجام برا ہی ہوتا ہے۔'' سلطان محمد خان نے سید صاحب کے اس زبانی پیغام اور تحریر شدہ خط کو کوئی اہمیت نہ دی اور کہا: ''ہم نے اس بات پر کمر باندھ لی ہے کہ تم جیسے لوگوں کو ختم کر کے اس سرزمین کو پاک کر دیں گے۔''

اب سید صاحب کے لشکرِ مجاہدین کو ایک بار پھر ان کلمہ گو افراد کے مقابلے پر آنا پڑا جو کفار کے مقابلے سے گریزاں مگر مجاہدین کے خون میں ہاتھ رنگنے کے لیے بے چین تھے۔ لڑائی سے قبل سلطان محمد خان، پیر محمد خان، سید محمد خان اور حبیب اللہ خان نے قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی کہ وہ سید صاحب کے مقابلے سے پیٹھ پھیر کر ہرگز نہیں بھاگیں گے۔ یہی قسم تمام افسرانِ فوج اور وزیروں و مشیروں سے لی گئی۔ تمام سپاہیوں کو بھی یہی قسم دی گئی اور اس کو پختہ کرنے کے لیے میدانِ جنگ کی راہ میں دو نیزے گاڑ کر ان کے بیچ میں قرآن مجید کو لٹکا دیا گیا۔ لشکر کا ہر سپاہی ان نیزوں کے درمیان سے گزر کر میدان روانہ ہوا۔ بارک زئیوں نے لشکر کے چار حصے کیے تھے۔ تین حصے گھڑسواروں کے اور ایک پیدل سپاہ کا تھا۔ پیدل حصے کا کمانڈر ایک انگریز تھا جس کے پاس دو توپیں بھی تھیں۔

مایار کے مقام پر دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا۔ سید صاحب کے ساتھ مقامی پختون سرداروں کی بھی خاصی تعداد تھی جن کے پاس اپنے اپنے قبائل کے جتھے تھے مگر جب حریف کے لشکر سے گولہ باری ہونے لگی اور گولے لشکرِ مجاہدین کے آس پاس پھٹنے لگے تو اکثر مقامی جنگجو اِدھر اُدھر ہو کر چھپنے لگے۔ سید صاحب کے ساتھ صرف دو ہزار کے لگ بھگ مجاہدین رہ گئے۔ اتنے میں بارک زئیوں کے لشکر کا ایک گھڑسوار طوفانی دستہ تیزی سے مجاہدین کی اگلی صف کی جانب آیا۔ وہ ننگی تلواریں سونتے چلا رہے تھے:

''سید کہاں ہے؟ سید کہاں ہے؟''

سید صاحب اگلی صف میں موجود تھے، انہوں نے دشمن کو نزدیک آنے دیا۔ جب چالیس پچاس قدم کا فاصلہ رہ گیا تو سید صاحب نے رائفل سنبھال کر نعرہ تکبیر بلند کر کے ان پر فائر کیا، ساتھ ہی دیگر مجاہدین نے بھی بندوقیں چلائیں۔ اس کے باوجود دشمن کا طوفانی دستہ نہ رُکا اور مجاہدین کی صفوں میں آن گھسا۔ کچھ دیر دست بدست لڑائی ہوتی رہی۔

سید صاحب کے آس پاس پانچ سو کے لگ بھگ افراد تھے، سید صاحب ایک ساتھ دو دو بندوقیں سنبھالے دائیں اور بائیں کندھے پر رکھ کر پے در پے فائر کر رہے تھے۔ چند ہی لمحوں میں دشمنوں کا یہ دستہ پسپا ہو گیا۔ حریف کے لشکر سے یکے بعد دیگرے کئی گھڑ سوار دستے اسی تیزی سے حملہ آور ہوئے مگر مٹھی بھر مجاہدین نے گھمسان کی جنگ لڑ کر انہیں ہر بار پسپا کر دیا۔ بارک زئیوں کے کئی دستے اس طرح حملے کر کے پسپا ہو گئے اور مجاہدین پچاس پچاس، ساٹھ ساٹھ کی ٹولیوں میں بٹ کر ان کے تعاقب میں دوڑے۔ مٹھی بھر مجاہدین کے ساتھ افغانستان کی منظم اور پیشہ ور افواج کو کھلے میدان میں یوں پسپا کر دینا درحقیقت اس کھلی نصرتِ الٰہیہ کا کرشمہ تھا جو ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہے۔

بارک زئیوں کے تعاقب کے دوران مجاہدین کی بہادری کے عجیب و غریب واقعات سامنے آئے۔ مجاہدین میں مقامی قبائل کے نو عمر لڑکے بھی شامل تھے۔ ایک تیرہ چودہ سال کا بچہ گنڈاسہ لیے لڑ رہا تھا، گنڈاسے کو مقامی زبان میں ''کفر چٹ'' کہا جاتا ہے۔ افغان فوج کا ایک زرہ پوش گھڑ سوار سپاہی اس بچے کے سامنے آیا تو بچے نے گنڈاسے پر گرفت مضبوط کی اور اُچھل کر اس پر پوری قوت سے وار کر دیا۔ گنڈاسے کی نوک ہلال کی طرح خمدار تھی، لہٰذا آہن پوش سوار کی زرہ میں پھنس کر رہ گئی...... سوار اس اچانک حملے سے اتنا خوفزدہ ہوا کہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر میدانِ جنگ سے بھاگنے لگا...... مگر عجیب تر بات یہ ہوئی کہ اس بچے نے 'گنڈاسے' کو سوار کی زرہ میں پھنسا دیکھ کر اس پر اپنی گرفت اور مضبوط کر دی کہ کہیں میرا ''واحد اسلحہ'' ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بچہ گھوڑے کے ساتھ ساتھ گھسٹتا چلا گیا۔ اس کے باوجود اسے اپنی فکر نہیں تھی وہ چلّا رہا تھا: ''زما کُفر چٹ ئے یوڑو'' (یہ ہمارا گنڈاسہ لیے جا رہا ہے۔) مجاہدین نے یہ عجیب صورت حال دیکھی تو اس گھڑ سوار کے پیچھے دوڑ کر اسے نیچے گرا لیا۔ سوار کے گرتے ہی گنڈاسے کی نوک زرہ سے باہر نکل آئی، ننھا مجاہد اپنا اسلحہ سنبھالے اس پر ٹوٹ پڑا اور اسے قتل کر دیا۔

سلطان محمد خان، پیر محمد خان اور سید محمد خان کو بارک زئی حکمران بھائیوں میں بڑی قوت کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ ان کی شکست سے دور دور تک سید احمد شہید کے مجاہدین کی شجاعت، ہمت اور عسکری مہارت کی دھاک بیٹھ گئی۔ سید احمد شہید کے مخلص رفقاء نے اس فتح سے پیدا ہونے والی ہموار فضا سے پورا پورا فائدہ اُٹھانے اور دشمن کو مزید دست درازیوں کا موقع نہ دینے کے لیے انہیں مشورہ دیا کہ آگے بڑھ کر پشاور کو فتح کر لیا جائے اور سلطان محمد خان کی سیادت کا خاتمہ کر دیا جائے۔

<u>لشکرِ مجاہدین پشاور میں</u>: سید صاحب دو دن مردان میں مقیم رہ کر اپنے لشکر کے ہمراہ پشاور کی طرف بڑھے۔ سلطان محمد خان، جو شکست کے بعد فرار ہو کر پشاور آ گیا تھا، یہ خبر سن کر حد درجہ دہشت زدہ

ہوگیا۔ اسے احساس ہوگیا کہ اب مجاہدین کی پیش قدمی روکنا اس کے لیے ناممکن ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی جان اور عہدہ بچانے کے لیے سید صاحب کو خط میں لکھا:

"سلطان محمد خان توبہ کے لیے حاضر ہے۔ اگر کوئی کافر بھی آپ کی خدمت میں آکر ایمان لائے تو آپ اسے ضرور مسلمان بنائیں گے، میں تو مسلمان اور مسلمان زادہ ہوں۔ اپنی غلطی کا اقرار کرتا ہوں، اب کبھی مجھ سے ایسی تقصیر نہ ہوگی۔ عمر بھر آپ کا تابع رہوں گا۔"

اگرچہ سلطان محمد خان کے جرائم قابل معافی نہ تھے مگر سید صاحب کا سینہ عفو ودرگزر کا سمندر تھا۔ انہوں نے اسے معاف کردیا تاہم مجاہدین نے پشاور پہنچ کر ہی دم لیا۔ ان کی آمد کی خبر سن کر پشاور کے لوگ استقبال کے لیے جمع ہوگئے۔ لشکر پشاور شہر میں داخل ہوا مگر اس مجاہدانہ شان کے ساتھ کہ نگاہوں میں قہر وانتقام کی جگہ محبت واخوت کے دیے جل رہے تھے۔ کوئی دکان لوٹی گئی نہ کسی کا گھر جلایا گیا۔ سرداروں کے غلط پروپیگنڈے کے باعث جو عام لوگ سید صاحب سے دہشت زدہ تھے وہ ان کے حسن سلوک کے قائل ہوگئے۔ مجاہدین پشاور پہنچے تو بھوک سے ان کا برا حال تھا۔ لشکر کے پاس خوراک تقریباً ختم ہوچکی تھی۔ ادھر شہر کے تمام بازار سید صاحب کے حکم کے مطابق حفاظتی نقطہ نظر سے بند تھے۔ سید صاحب نے دکانوں اور گوداموں کو لوٹنے کی بھی سختی سے ممانعت فرمادی تھی۔ ان کا حکم تھا کہ کوئی مجاہد کسی باغ سے پھل تک نہ توڑے۔ ایسی حالت میں مجاہدین دو دن شہر میں بھوکے پیٹ قیام پذیر رہے۔

اس دوران سید صاحب نے امن وامان کی صورت حال قابو میں دیکھ کر بازار کھلوادیے تھے اور شہر میں چہل پہل ہوگئی تھی مگر مجاہدین کی خوراک کا کوئی انتظام نہ ہوسکا تھا۔ آخر کار تیسرے دن ارباب بہرام خان نے اناج کی کئی بڑی دکانوں سے آٹا خریدنے کا انتظام کرکے روٹیاں پکوائیں اور یوں تین دن بعد مجاہدین کے حلق سے روٹی نیچے اُتری۔ یہ فاتح لشکر کے نظم وضبط، امیر کی اطاعت اور مفتوحین پر شفقت کی حیرت ناک مثال ہے۔

<u>پشاور سلطان محمد خان کے حوالے</u>: چند دن پشاور میں قیام کے بعد سید صاحب نے سلطان محمد خان کی جانب سے معافی اور اطاعت کے وعدے پر اعتبار کرتے ہوئے پشاور اس کے حوالے کرکے واپسی کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے سے سید صاحب کے اکثر مخلص ساتھی متفق نہ تھے۔ انہوں نے سید صاحب کو بارک زئی سرداروں پر اعتماد کرنے سے منع کیا اور کہا کہ یہ لوگ دغابازی کے عادی ہیں، آپ کے ساتھ دوبارہ غداری کریں گے مگر سید صاحب نے غیر معمولی مروت اور وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پشاور سلطان محمد خان کے حوالے کرنے کا فیصلہ اس شرط پر برقرار رکھا کہ وہ شرعی احکام کی پابندی اور جہاد میں

مجاہدین کا معاون رہے گا۔ سید صاحب چند دنوں بعد واپس پنجتار آ گئے اور اپنی عملداری میں شرعی احکام کے اجرا، جاہلانہ رسوم کے خاتمے اور سنتوں کے احیا کا کام پوری سرگرمی سے کرنے لگے۔ وہ آگے بڑھنے اور دشمنوں سے مزید علاقے آزاد کرانے سے قبل موجودہ مفتوحہ علاقوں کو ایک مثالی اسلامی معاشرے میں ڈھالنا چاہتے تھے تاکہ اسلامی نظام کے احیا کا کام مضبوط تر بنیادوں پر ترقی پذیر ہو۔

تحریک کے خلاف گھناؤنی سازش: سید صاحب کی یہ اصلاحی و جہادی تحریک اپنی راہ میں کامیابی سے آگے بڑھ رہی تھی مگر جو قوم خود اپنے مصلحین کی قدر نہ کرے، وہ کبھی اصلاح کی منزل تک نہیں پہنچ سکتی اور کوئی اصلاحی تحریک اسے ہلاکت کے گڑھوں میں گرنے سے نہیں بچا سکتی۔ سید احمد شہید کی تحریک کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ وہ اغیار سے زیادہ اپنوں کی بے اعتنائی بلکہ غداری کا نشانہ بنے۔ ان کی جانب سے خالص توحید کا پیغام بہت سے دنیا پرستوں کو ناگوار گزر رہا تھا۔ ادھر ہندوستان کے علمائے سوء کی جانب سے سید صاحب کے خلاف جاری کردہ اعلامیہ بھی بہت سے افراد کو ان کے خلاف بھڑکا رہا تھا۔ اس اعلامیے میں تحریر تھا: ''تمام سرداروں اور خوانین کو اطلاعاً لکھا جاتا ہے کہ سید احمد نامی ایک آدمی چند علمائے ہند کو متفق کر کے اس قدر جمعیت کے ساتھ تمہارے ملک میں گئے ہیں، وہ بظاہر جہاد فی سبیل اللہ کا دعویٰ کر رہے ہیں، یہ ان کا مکر و فریب ہے۔ وہ ہمارے اور تمہارے دین و مذہب کے مخالف ہیں۔ انہوں نے ایک نیا دین و مذہب نکالا ہوا ہے۔ وہ کسی ولی بزرگ کو نہیں مانتے، سب کو برا کہتے ہیں۔ وہ انگریزوں کے بھیجے ہوئے تمہارے ملک کا حال معلوم کرنے گئے ہیں۔ تم کسی طرح ان کے وعظ و نصیحت اور دام میں نہ آنا۔ عجب نہیں کہ وہ تمہارا ملک چھنوا دیں۔ جس طرح تم سے ہو سکے ان کو تباہ کرا دو اور اپنے ملک میں جگہ نہ دو۔ اگر اس معاملے میں سستی اور غفلت سے کام لو گے تو پچھتانا پڑے گا اور ندامت کے سوا کچھ اور ہاتھ نہ آئے گا۔''

اس فتوے پر ہندوستان کے بہت سے رسوم پرست علماء اور دنیا دار پیروں کی مُہریں ثبت تھیں۔ سید صاحب کے مخالفین نے اس سے خوب فائدہ اُٹھایا۔ اسے زیادہ سے زیادہ مشتہر کر کے سرداروں اور عوام کو ان کے خلاف برانگیختہ کیا۔ سرداروں کی سید صاحب سے ناراضی کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ پہلے یہ خوانین عوام کے مال و دولت اور کھیتوں کی پیداوار میں سے اپنی مرضی کے مطابق جو چاہتے، لے لیتے تھے مگر اب شرعی احکام کے نفاذ کے بعد زکوٰۃ و عشر کا فریضہ ادا ہو رہا تھا اور ان کی دست درازیاں روک دی گئی تھیں۔

عام لوگ خصوصاً غریب طبقہ اس سے بے حد خوش تھا مگر سرداروں اور امرا کی ناجائز آمدن کی راہیں مسدود ہو گئی تھیں جس کی وجہ سے وہ برافروختہ تھے۔ وہ محض نام کی مسلمانی پر جینے کے خواہش مند تھے اور شرعی احکام کی پابندی کے باعث اپنے مفادات پر زد پڑنا ان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اس

سلسلے میں ایک مقامی سردار عنایت اللہ خان کے خط کی چند سطریں اس طبقے کی ذہنیت واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اس نے مولانا اسماعیل شہید کو اپنے خط میں لکھا تھا: ''قرآن وسنت اور علماء سب تمہاری طرف ہیں لیکن وہی احکام جو کتاب وسنت سے ثابت ہیں ہمارے اوپر شاق اور بار ہیں...... اس سلسلے میں ہم جنگ کے لیے تیار ہیں، پھر جو فیصلہ ہو سو ہو۔ اگر ہم غالب آ گئے تو اپنی رسوم افغانی پر قائم رہیں گے اور اگر تم غالب آئے اور اس ملک میں تمہارا عمل دخل ہوا تو ہم اس ملک کو چھوڑ کر کسی کافر کی عملداری میں چلے جائیں گے تاکہ وہاں اطمینان سے اپنے باپ دادا کے طریقے پر عمل کر سکیں۔''

<u>مجاہدین کا قتلِ عام</u>: اس خط میں باپ دادا کی رسوم کو جس طرح بے باکانہ انداز سے شریعت پر ترجیح دیتے ہوئے ان کے تحفظ کے لیے شریعت کے خلاف تلوار اُٹھانے کے عزم کا اظہار کیا گیا ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں کے دلوں پر جاہلیت کا زنگ کس قدر چڑھ چکا تھا۔ یہ وہ فضا تھی جس میں سید صاحب کی تحریک کے خلاف ایک خفیہ سازش تیار کی گئی جس کے مطابق دور دراز علاقوں میں پھیلے ہوئے مجاہدین کے اہلکاروں اور عملے کو بیک وقت قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ سازشیوں نے حملے کے دن کی علامت یہ طے کی تھی کہ اس دن بستیوں میں نقارے بجائے جائیں گے۔ یہ اشارہ ہوگا کہ مجاہدین پر اچانک حملے کے لیے تیاری کر لی جائے۔ منصوبے کے مطابق مقررہ دن نقارے بجائے گئے اور سازشیوں نے ہتھیار تیار کر لیے، مجاہدین نے نقارے بجنے کی وجہ پوچھی تو مقامی لوگوں نے کہا: ''یہ جوار کی کٹائی شروع کرنے کا اعلان کیا جا رہا ہے۔''

رات کا اندھیرا پھیلتے ہی قتلِ عام شروع ہو گیا۔ بہت سے مجاہدین کو ان کی رہائش گاہوں پر گھیر کر قتل کر دیا گیا۔ بہت سے نمازِ عشاء کے لیے وضو کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ ایسے بھی تھے جنہیں نماز پڑھتے ہوئے خاک وخون میں تڑپا دیا گیا۔ مساجد میں بھی انہیں پناہ نہیں دی گئی بلکہ گھیر گھار کر باہر نکالا گیا اور بے دردی سے شہید کر دیا گیا۔

سید صاحب کے ایک معتمد ساتھی حاجی بہادر شاہ رامپوری بڑے صاحب نسبت بزرگ تھے، وہ سید صاحب کی طرف سے گڑھی امان زئی کی جانب جا رہے تھے۔ راستے میں ایک گاؤں 'اسماعیلہ' کے لوگوں نے انہیں پہچان کر روک لیا۔ حاجی صاحب بھی انہیں جانتے تھے، ان لوگوں نے ان کا خوب اعزاز واکرام کیا۔ پُرتکلف ضیافت کی، عشا کا وقت ہوا تو کہنے لگے: ''حضرت! آپ تشریف لے آئے ہیں، آپ ہی امامت فرمائیے۔''

حاجی صاحب نماز پڑھانے لگے، انہیں کیا خبر تھی کہ یہ لوگ دوست کے روپ میں جانی دشمن ہیں اور

یہ ان کی آخری نماز ہے۔ حاجی صاحب جوں ہی پہلی رکعت کے سجدے میں گئے، ظالم مقتدیوں نے تلواریں سونت لیں، بستی کے خان، اسماعیل خان نے تلوار کا ایسا زوردار وار کیا کہ حاجی صاحب کا سر کٹ کر الگ ہو گیا۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخوں غلطیدن خدا رحمت کندا ایں عاشقانِ پاک طینت را

پشاور میں سید صاحب کے انتہائی قریبی ساتھی مولانا مظہر علی، ارباب فیض اللہ خان اور چند مجاہدین شہر میں شرعی احکام کے نفاذ کے لیے ٹھہرے ہوئے تھے۔ پشاور کو فتح کرنے کے بعد سید صاحب نے اسے اس شرط پر سلطان محمد خان کے پاس رہنے دیا تھا کہ وہ شریعت کی پابندی کرے گا اور اسلامی نظام کے نفاذ میں معاون رہے گا۔ مگر اب سلطان محمد خان خود مجاہدین کے خلاف اس سازش میں پیش پیش تھا۔ اس کے بھائی پیر محمد خان نے مولانا مظہر علی، ارباب فیض اللہ خان اور دیگر مجاہدین کو دعوت کے بہانے اپنی حویلی میں بلایا اور وہیں شہید کر ڈالا۔

کچھ مجاہدین سید صاحب کے حکم سے عُشر وصول کرنے ''سُدُم'' کے علاقے میں مقیم تھے۔ انہیں دوسری بستیوں میں مجاہدین کے قتلِ عام کی اطلاع مل گئی۔ وہ فوراً اپنے ہتھیار لے کر آبادی سے باہر نکل گئے اور کسی ندی کے کنارے پناہ لی۔ اتنے میں قبیلے کا ایک سردار جس کا نام مبین خان تھا، ادھر آنکلا۔ یہ شخص مجاہدین کے قتلِ عام میں شریک تھا اور گاؤں اسماعیلہ میں مجاہدین کے افسر حاجی بہادر خان کو نماز کی حالت میں شہید کرنے والوں میں بھی شامل تھا۔ ان مجاہدین کو یہاں دیکھ کر وہ حیران ہوا کہ یہ قتل عام سے کیسے بچ نکلے۔ چونکہ مجاہدین مسلح اور چوکنے تھے اس لیے مبین خان نے ان سے بڑی ہمدردانہ باتیں کیں اور انہیں اطمینان دلایا کہ وہ انہیں اپنی پناہ میں لے کر بحفاظت ان کے مرکز پنجتار پہنچا دے گا۔ جب مجاہدین اس کی پُرفریب باتوں میں آکر اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے تو اس نے کہا: ''میں اپنی بدنامی سے ڈرتا ہوں اس لیے تمہیں مسلح حالت میں نہیں لے جایا جا سکتا۔ تم اپنے ہتھیار میرے گھر میں امانت کے طور پر رکھوادو، میں تیسرے روز پنجتار میں تمہیں پہنچا دوں گا۔''

اس خوف ودہشت کی فضا میں مجاہدین اس بدبخت کو اپنا نجات دہندہ سمجھ کر اس پر مکمل اعتماد کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنے ہتھیار اس کے حوالے کر دیے، وہ انہیں لدوا کر گاؤں لے گیا۔ اب مجاہدین نہتے رہ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد گاؤں کی طرف سے قاتلوں کا ایک مسلح گروہ آیا اور مجاہدین پر پل پڑا۔ ایک ایک مجاہد کو نیچے گرا کر خنجروں، چھریوں اور تلواروں سے جانوروں کی طرح ذبح کیا گیا۔ ان میں سے عظیم اللہ خان نامی ایک مجاہد نے اس گاؤں کی ایک خاتون سے نکاح کیا تھا۔ بلوائیوں میں اس کا سسر بھی

شامل تھا۔ مجاہدین سے ان کی نفرت کا اندازہ لگائیے کہ سسر نے خود اپنے مجاہد داماد کو پچھاڑ کر اپنے ہاتھوں سے اس کے گلے پر چھری چلائی۔

علاقہ مینئی میں غازی پیر خان جماعت دار کئی مجاہدین کے ساتھ رہائش پذیر تھے، قتل عام شروع ہوتے ہی وہ بندوقیں لے کر ایک مسجد میں چلے گئے اور دروازے بند کر کے محصور ہو گئے۔ سازشیوں نے آکر چاروں طرف سے مسجد کو گھیر لیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ مجاہدین کو مسجد سے اتنی جلدی نکالنا ممکن نہیں ہے تو مسجد کو آگ لگانے کے لیے تیار ہو گئے تا کہ مجاہدین اندر جل کر راکھ ہو جائیں۔ یہ شقاوت، سنگ دلی اور مردہ دلی کی انتہا تھی کہ یہ لوگ اللہ کے گھر کی حرمت بھی فراموش کر چکے تھے اور اسے جلانے پر آمادہ تھے۔ اس صورتِ حال میں علاقے کے علماء، پیرزادے اور سید حضرات وہاں آگئے اور بلوائیوں کی منت سماجت کر کے انہیں مجاہدین کی جاں بخشی پر آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر ان ظالموں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ یہ دیکھ کر بستی کی خواتین گھروں سے نکل آئیں اور اپنے اپنے گھر کے مردوں سے ہتھیار چھین کر انہیں اس ظلم سے منع کرنے لگیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔

جب ہر کوشش ناکام ہو گئی تو علاقے کے اقلیتی افراد جو زیادہ تر ہندو بنیے تھے، ایک وفد بنا کر محاصرہ کرنے والوں سے ملے۔ دراصل شرعی نظام کے نفاذ سے اقلیتی گروہوں کو وہ تحفظ ملا تھا جس سے وہ پہلے محروم تھے، انہیں ذمیوں کے لیے متعین کردہ تمام شرعی حقوق مل رہے تھے اور سرداروں کی ظالمانہ لوٹ مار سے انہیں پہلی بار نجات ملی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے لیے مجاہدین کا وجود غنیمت سمجھتے تھے۔ وہ آگے آئے اور فریاد کرنے لگے: ''تم ان بے قصوروں کو مت مارو، انہیں ہمارے حوالے کر دو، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ انہیں سید بادشاہ کے پاس نہیں بھیجیں گے، انہیں دریائے سندھ کے پار اُتار دیں گے کہ یہ کہیں اور چلے جائیں۔''

ظالموں پر اس درخواست کا بھی کوئی اثر نہ ہوا بلکہ وہ مسجد کو آگ لگانے کی تیاری کرنے لگے۔ مجاہدین خانۂ خدا کو آتش زدگی سے بچانے کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر باہر نکل آئے۔ بلوائیوں نے پہلے تو ان کا وہ مال و اسباب لوٹا جو وہ مسجد میں چھوڑ گئے تھے، پھر ان کا تعاقب کر کے بستی کے باہر انہیں گھیر لیا اور کسی ایک کو بھی زندہ نہ جانے دیا۔

سببِ مرض...... جاہلیت کا کبر و نخوت اور حبِ جاہ: سید صاحب کے رفقاء کے ساتھ قبائلی سرداروں کے اس بے رحمانہ سلوک کو واقعاتی تفصیل کے ساتھ بیان کرنا شاید بعض قارئین کو بے جا طویل محسوس ہو مگر اس صورتِ حال کو واضح طور پر سامنے لانا اس لیے ضروری سمجھا گیا تا کہ قارئین کو اندازہ ہو کہ افغانستان و ہندوستان میں ایک عظیم سیاسی اور دینی تبدیلی پیدا کرنے کی اہلیت رکھنے والی یہ زبردست

تحریک آخر اتنی جلد اور یکدم کیسے ناکام ہوگئی۔

گزشتہ صفحات میں بیان کردہ تفصیل سے یہ عیاں ہو چکا ہے کہ سید صاحب اور ان کے رفقاء کو سکھوں یا انگریزوں کی بجائے اصل نقصان اپنے ہی مسلمان بھائیوں سے پہنچا جو بظاہر ان سے بیعتِ جہاد اور نفاذِ شریعت کے لیے جان و مال سے قربانی دینے کا عہد بھی کر چکے تھے مگر سردارانہ نخوت، حبِ جاہ، حسد و رقابت اور قبائلی رسم و رواج کو شریعت پر فوقیت دینے کے جذبات نے انہیں کسی اصلاحی تحریک کو قبول کرنے اور اس کا ساتھ دینے پر دل سے آمادہ نہ ہونے دیا۔ بالآخر یہ جذبہ جاہلیت، عاقبت نااندیشی اور کبر و نخوت انہیں مجاہدین کے قتل عام پر ابھارنے کا باعث بنا، یوں اس سرزمین میں جہاد کا وہ کیمپ جو ترقی کر کے پورے خطے کی قسمت بدل سکتا تھا، نیست و نابود ہو گیا۔

<u>شہدائے بالاکوٹ</u>: سید احمد شہید اپنے غازیوں کے قتل عام کے بعد اس علاقے کی اصلاحِ احوال سے مایوس ہو گئے۔ وہ جان گئے کہ افغانستان سے کلکتہ کے ساحل تک مسلمان گہری نیند میں مبتلا ہیں اور شاید کفریہ طاقتوں کی مکمل اجارہ داری کے بعد ان کا ظلم و تشدد ہی انہیں اس خوابِ گراں سے جگا پائے گا۔ انہوں نے کشمیر کا رُخ کیا اور راستے میں بالاکوٹ میں پڑاؤ کے دوران سکھوں کے نرغے میں آ گئے۔ 24 ذی قعدہ 1246ھ (سن 1831ء) کو سید احمد شہید اپنے رفقاء سمیت بڑی جانبازی سے سکھوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جام شہادت نوش کر گئے۔ یوں کفریہ طاقتوں سے ارضِ ہند و افغانستان کو بچانے کے لیے شروع کی جانے والی ایک زبردست تحریک کامیابی کی منزل تک پہنچنے سے بہت پہلے ختم ہو گئی۔

مآخذ و مراجع

- ...... تاریخ دعوت و عزیمت، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
- ...... سید احمد شہید، مولانا غلام رسول مہر
- ...... سید بادشاہ کا قافلہ، آبادشاہ پوری مرحوم

پندرھواں باب

کٹھ پتلی حکمرانوں کا دور

سید احمد شہید رحمہ اللہ کی شہادت کے بعد تحریک مجاہدین آب وتاب سے نہ چل سکی۔ اگر چہ ان کے خلفاء نے ''ستھانہ'' میں متبادل مرکز بنا کر جہادی تربیت اور کفار سے آزادی کی ذہن سازی کا کام کسی نہ کسی صورت میں برقرار رکھا مگر اب وہ اغیار کی راہ میں کوئی ایسی مضبوط دیوار کھڑی نہیں کر سکتے تھے جس سے اس خطے میں اِسلام دشمنوں کی بالادستی کی رفتار رُک سکے۔ بہر صورت ان کو کوششوں کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ ہندستان واَفغانستان میں انگریزوں سے ٹکر لینے والے مستقبل کے مجاہدین تیار ہوتے رہے۔

انگریزوں کی واپسی: انگریز اس زمانے کی سب سے بڑی استعماری قوت تھے۔ ہندوستان کے اکثر وبیشتر رقبے پر وہ غالب آچکے تھے۔ صرف سندھ اور پنجاب اب تک ان کے قبضے سے باہر تھے۔ تاہم ان کی سازشیں یہاں بھی برابر کام کررہی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی نگاہیں اَفغانستان پر بھی لگی ہوئی تھیں جہاں بارک زئی حکمران سر پھٹول میں مصروف تھے۔ انگریزوں کے لیے بظاہر یہاں قبضے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے یہاں فوج کشی میں جلدی نہیں کی۔ ان کے نزدیک کسی ملک پر قبضے میں زمین کا حصول ثانوی شے تھی۔ اصل مقصد وہاں کی دولت اور پیداوار کو لوٹنا تھا۔ اس کے لیے دوطریقے ہوسکتے تھے۔ پہلا عسکری اور دوسرا سیاسی۔

اَفغانستان کے حالات سے واقفیت کی بنا پر وہ جانتے تھے کہ یہاں عسکری کارروائی اتنی آسان نہیں ہے۔ حریت پسند اَفغان عوام ان کے مقابلے میں خم ٹھونک کر کھڑے ہوجائیں گے اور یوں انہیں لینے کے دینے پڑسکتے ہیں۔ دوسری صورت سیاسی غلبے کی تھی جو نہایت محفوظ تھی۔ انگریزوں نے اسی کو ترجیح دی اور اس کے تحت اپنے من پسند امراء کو اَفغانستان پر اس طرح مسلط کرنے کی کوشش شروع کردی کہ اَفغان عوام ان کے ذریعے برطانوی حکومت کے محکوم ہوجائیں اور اس ملک کی ساری دولت برطانیہ کے خزانوں میں جمع ہوتی رہے۔ اس طرح اگر اَفغان عوام مجبور ہوکر بغاوت بھی کرتے تو انہیں اپنے ہی ہم قوموں سے لڑنا پڑتا

اور انگریز کسی بھی نقصان سے محفوظ رہتے۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریز کی مشہور پالیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' بھی کارفرما رہی۔ انگریزوں کا مطمح نظر یہ تھا کہ ہندوستان کی طرح افغانستان کو بھی چھوٹے چھوٹے صوبوں، ریاستوں اور ٹکڑوں میں اس طرح بانٹ دیا جائے کہ ہر حصے پر ان کے حلیف حکومت کر رہے ہوں جو باہم لڑتے جھگڑتے رہیں اور یوں کمزور سے کمزور تر ہو کر اس کے آگے اپنے مفادات کے لیے سرنگوں رہیں۔

ملک کو کمزوری اور انتشار کی اس حد تک پہنچانے کے بعد آخری مرحلے میں زمین پر قبضہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ کمزور، لٹے پٹے اور ٹکڑوں میں بٹے افغانستان پر آسانی سے قبضہ کر سکتے تھے۔ کسی ملک پر عسکری لحاظ سے قابض ہونے کے بعد انگریزوں نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے ''نظامِ تعلیم'' کی تبدیلی کو بھی اپنی پالیسی کا حصہ بنایا ہوا تھا جس کے تحت تمام نوآبادیات میں نسلِ نو کو اپنا مستقل ذہنی غلام بنانا مقصود تھا۔ اس منصوبے کے پہلے مرحلے پر عمل کے لیے انگریزوں کو شاہ شجاع سب سے بہتر آلۂ کار معلوم ہوا۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ شاہ شجاع ابدالی خاندان کا فرد تھا جو اپنے آباءواجداد کی غیرت وخودداری کے برعکس پرلے درجے کا مفاد پرست اور کم حوصلہ انسان تھا۔ وہ پہلا افغان حکمران تھا جس نے انگریزوں کو دشمن کی بجائے دوست کی حیثیت دی تھی۔ برسرِ اقتدار آنے کے بعد اس نے 7 جون 1809ء کو پشاور میں انگریز سفیر کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کیا تھا۔ یہ شاہ شجاع کی جوانی کا زمانہ تھا۔ اس وقت اس کی عمر کوئی 30 برس کے لگ بھگ تھی۔ اس کا انگریزوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا افغان عوام کو سخت ناگوار گزرا تھا اور انہوں نے فوری طور پر بغاوت کر کے شاہ محمود کو بادشاہ بنا لیا تھا۔ شاہ شجاع اُس وقت بغاوت پر قابو نہ پا سکا تھا، حصولِ اقتدار کی کئی ناکام مہمات کے بعد آخر کار وہ دل شکستہ ہو گیا تھا اور ادھر سے ادھر مارا مارا پھرتا رہا تھا۔ اس دوران ابدالیوں کا مشہور زمانہ ''کوہ نور ہیرا'' اسی کے پاس محفوظ تھا۔

1813ء میں وہ پشاور میں پناہ لیے ہوئے تھا کہ شہر کے حاکم عطا محمد خان نے اسے گرفتار کر کے سکھوں کے حوالے کر دیا۔ حاکمِ پنجاب رنجیت سنگھ نے اسے دو سال تک اپنے پاس نظر بند رکھا تا کہ اس سے کسی طرح کوہ نور ہیرا حاصل کر سکے مگر شاہ شجاع نے اس ہیرے کا پتہ کسی کو نہ بتایا۔

انگریزوں کی پناہ میں: 1815ء میں وہ سکھوں کو جُل دے کر اپنے اہلِ خانہ سمیت سکھوں کی قید سے نکل بھاگا اور انگریزوں سے پناہ اور تعاون کا طالب ہوا۔ انگریزوں نے اسے کوہ نور ہیرے کی قیمت پر افغانستان کی حکومت واپس دلا دینے کی یقین دہانی کرائی۔ تب سے شاہ شجاع انگریزوں کی عملداری میں رہتا آ رہا تھا۔ درمیان میں کچھ عرصہ اس نے شکار پور (سندھ) میں بھی گزارا مگر سندھی بلوچ امراء

نے آخر اسے وہاں سے بھی نکال دیا۔ شاہ شجاع نے تقریباً 20 برس لدھیانہ (پنجاب) میں گزارے اور انگریز کے اشارے پر افغانستان کا جلاوطن بادشاہ ہونے کا دعوے دار رہا۔ اس دوران افغانستان سے ابدالی خاندان کی حکومت ناپید ہو کر اقتدار اٹھارہ بھائیوں کے ہاتھ آ گیا تھا۔ سید احمد شہید کی تحریک اس دوران اُٹھی اور افغانستان کی سیاست پر کوئی غیر معمولی اثر ڈالے بغیر ختم ہو گئی۔

شاہ شجاع کی مہمِ اقتدار: اب حد درجے انتشار اور خانہ جنگی کا دور شروع ہو چکا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھانے کے لیے شاہ شجاع نے انگریزوں کو ان کا وعدہ یاد دلایا۔ یہ وہ وقت تھا کہ افغانوں کی کمزوری سے حوصلہ پا کر سکھوں نے کابل پر چڑھائی کی منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ انگریزوں نے انہیں بھی ساتھ ملانا مناسب سمجھا۔ چنانچہ طے یہ ہوا کہ انگریزوں اور سکھوں کی مشترکہ افواج افغانستان پر حملہ کریں گی اور شاہ شجاع کو افغانستان کا بادشاہ بنایا جائے گا۔ ظاہر ہے اس صورت میں افغانستان کی حکومت درحقیقت انگریزوں ہی کے ماتحت ہوتی اور انہیں افغانستان کی دولت لوٹنے کا پورا پورا اختیار رہتا۔ سکھوں کی خوشنودی کے لیے شاہ شجاع نے رنجیت سنگھ سے یہ معاہدہ کر لیا کہ حصولِ اقتدار کے بعد وہ پشاور، ڈیرہ اسماعیل خان اور ڈیرہ غازی خان سمیت ملحقہ علاقوں کا مالیاتی نظام سکھوں ہی کے پاس رہنے دے گا۔

لدھیانہ سے قندھار: اس معاہدے کے بعد 1833ء میں شاہ شجاع اپنے حمایتیوں کی فوج لے کر لدھیانہ سے قندھار کی طرف روانہ ہوا۔ دریائے سندھ عبور کر کے وہ شکارپور جا ٹھہرا۔ فوج کے بل بوتے پر اس نے ان علاقوں سے سندھ کے میروں کو بے دخل کر کے اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ 1834ء کے آغاز میں وہ قندھار کے قریب پہنچا، اس کے ساتھ افغانی اور ہندوستانی سپاہیوں کے علاوہ انگریز فوجیوں کو بھی دیکھ کر لوگ حیران رہ گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انگریزی فوج کے قدم اس سرزمین پر پڑے تھے۔ انگریز سپاہیوں کا کمانڈر مسٹر کیمپل تھا۔ قندھاریوں کے لیے اتنے بھاری بھرکم لشکر سے مقابلہ آسان نہیں تھا چنانچہ انہوں نے کابل کے حاکم دوست محمد خان سے امداد طلب کی۔

شاہ شجاع کی شکست: حاکمِ کابل دوست محمد خان کو قندھار پر شاہ شجاع کے حملے کی خبر پہنچی تو بہت پریشان ہوا۔ وہ ایک لشکر لے کر فوراً قندھار کی طرف روانہ ہو گیا۔ قندھار میں کہندل خان، شاہ شجاع سے اپنا دفاع کر رہا تھا کہ اتنے میں دوست محمد خان کی افواج آن پہنچیں۔ شاہ شجاع کی فوج قندھاری اور کابلی لشکروں کے درمیان گھر گئی۔ اب گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں شاہ شجاع کے لشکر کو بری طرح شکست ہوئی۔ وہ آدھے سپاہیوں کو گنوا کر میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا۔ اس کے ساتھ شریک انگریزی فوج کا دستہ بھی سخت نقصانات اُٹھا کر بھاگا۔ انگریز افسر جنرل کیمپبل زخمی حالت میں قندھاریوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔

جنرل کیمپبل نے کچھ دن افغان فوج کی قید میں گزارے۔ مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کی سادگی اور ان کی شجاعت و خودداری سے اسے اسلام میں دل چسپی محسوس ہونے لگی اور وہ اسلامی تعلیمات سے آگاہی حاصل کرنے لگا۔ کچھ ہی عرصے میں اس کے دل کی دنیا بدل گئی اور اس نے بخوشی اسلام قبول کرلیا۔ اس کے بعد وہ رہائی پا کر واپس چلا گیا۔ ادھر شاہ شجاع شکست کے بعد بڑی ردی حالت میں گرتا پڑتا بلوچستان پہنچا جہاں قلات کے والی میر نصیر خان نے اسے پناہ دی اور پھر بحفاظت لدھیانہ پہنچانے کا بندوبست کردیا۔

انگریزوں کا تلخ تجربہ: انگریزوں کی سرپرستی میں ایک افغان ایجنٹ کے ذریعے مسلمانانِ افغانستان کے خلاف چھیڑی جانے والی یہ پہلی جنگ تھی۔ اس جنگ میں افغانوں نے اپنے تمام تر اختلافات بھلا دیے تھے، انہوں نے جہاد اور قومی لڑائی سمجھ کر اسے پورے اتحاد و اتفاق سے لڑا اور کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ یہ انگریزوں کی افغانستان میں پہلی مہم تھی جس سے انہیں پوری طرح اندازہ ہوگیا کہ اپنے کسی ایجنٹ کو یہاں کے مسلمانوں کے لیے قابل قبول بنانا کس قدر مشکل کام ہے۔ جب دوست محمد خان قندھار کی مہم میں مصروف تھا تو شاہ شجاع کا مددگار سکھ سردار ہری سنگھ دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ پشاور پہنچ گیا تھا اور پشاور کا حاکم سلطان محمد خان اس سے خوفزدہ ہو کر جلال آباد آگیا تھا۔ ہری سنگھ نے پشاور پر قبضہ کر کے ہر طرف خوف و ہراس پھیلا دیا تھا۔

دوست محمد خان قندھار میں شاہ شجاع کو شکست دے کر کابل پہنچا تو ہر طرف اس کی فتح کا ڈنکا بج گیا۔ طوائف الملوکی کے اس دور میں ایک درجن کے لگ بھگ نااہل خودمختار حاکموں کے درمیان اس نے ایک ''قومی ہیرو'' کی سی حیثیت اختیار کرلی۔ عوام و خواص سب کو اُمید بندھنے لگی کہ شاید وہ ملک و قوم کو انتشار اور زوال کی دلدل سے نکالنے میں کامیاب ہوجائے گا۔ دوست محمد خان نے بھی اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنا سیاسی قد بلند کرنے اور افغانستان کو ایک حکمران کے ماتحت لانے کی منصوبہ بندی شروع کردی۔ اس نے عوام کو ایک مشترکہ مقصد پر لا کھڑا کرنے کے لیے انہیں کفار سے جہاد کی تیاری کا حکم دیا اور اعلان کیا کہ وہ پشاور پر حملہ کر کے تمام افغان مقبوضات کو سکھوں سے آزاد کرائے گا۔ قوم نے اس عزم کی بھرپور تائید کی۔ ایک بڑے اجتماع میں افغان علمائے کرام، مشائخ اور قوم کے عمائد اکٹھے ہوئے۔ انہوں نے جہاد سے قبل ایک قومی امیر منتخب کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لیے دوست محمد خان سب سے موزوں آدمی معلوم ہوا۔ ویسے بھی اس تحریک کا محرک وہی تھا جب کہ اس کے دوسرے بھائی قومی مفادات اور ذمہ داریوں سے غافل تھے۔ دوست محمد خان ان سے بہرحال بہتر تھا۔

دوست محمد خان امیرِ افغانستان: یوں 1834ء میں دوست محمد خان کو افغانستان کا امیر تسلیم کرلیا

گیا۔ اَفغان قبائل کے سرداروں نے اس حکومت کا خیر مقدم کیا۔ ملک کے دفاع کو مضبوط بنانے اور کفار سے جہاد کے لیے فوری طور پر چندہ مہم اور رضا کار مجاہدین کی بھرتی شروع کی گئی۔ ملک کی بدحالی اور طوائف الملوکی سے پریشان حال عوام نے اس موقع کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتے ہوئے پیٹ کاٹ کر چندہ دیا اور نوجوانوں نے بڑھ چڑھ کر خود کو وطن کی حفاظت کے لیے پیش کیا۔ اَفغانوں کے جوش وجذبے کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف مشرقی اَفغانستان کے شہروں اور دیہاتوں سے دس ہزار گھڑ سوار اور پچاس ہزار پیدل مجاہدین دوست محمد خان کے پرچم تلے جمع ہو گئے۔

دوست محمد خان اَفغانستان کا پہلا حکمران تھا جو ''امیر'' کے لقب سے مشہور ہوا۔ دراصل اس کی حکمرانی کی ابتدا بادشاہ کی نہیں، امیرِ جہاد کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ اس موقع پر اس کے ڈھالے ہوئے ایک سکے پر یہ شعر کندہ کیا گیا تھا ؎

امیر دوست محمد بعزم جنگ و جہاد کمر بست و بزد سکہ ناصرش حق باد

(امیر دوست محمد نے جنگ و جہاد کے لیے کمر باندھ کر یہ سکہ ڈھلوایا ہے، حق تعالیٰ اس کا مددگار ہو)

آخر کار امیر دوست محمد خان نے افواج تیار کرنے کے بعد 1835ء میں اعلانِ جہاد کے ساتھ پشاور کی طرف کوچ کیا۔ پچاس ہزار پیادوں اور دس ہزار شہ سواروں کا یہ لشکر درۂ خیبر کے دیہات ''شیخان'' میں فروکش تھا کہ سلطان محمد خان بھی دس ہزار سپاہیوں سمیت ان سے آملا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اَفغانوں کی سوئی ہوئی قسمت جاگ اُٹھی ہے اور مال واقتدار کے لیے ایک دوسرے سے دست وگریبان رہنے والے بھائی دین ومذہب کے نام پر شیر وشکر ہو چکے ہیں۔ یہ صورتِ حال جہاں مسلمانانِ ہندواَفغانستان کے دلوں میں اُمیدوں کی نئی جُوت جگا رہی تھی وہاں رنجیت سنگھ، شاہ شجاع اور انگریزوں کے لیے تشوِیش کے دروازے کھول چکی تھی۔ رنجیت سنگھ نے انگریز افسران کے مشورے سے اس جنگ کو ہر قیمت پر رکوانے کی کوشش کی اور اس کے لیے ایک سازش تیار کی۔ سکھ اور انگریز دونوں اِسلامی لشکر میں شامل سلطان محمد خان کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھے جو پہلے بھی بارہا اپنوں سے غداری کر چکا تھا۔ چنانچہ سکھوں کی طرف سے ایک وفد جنرل ہارلین کی قیادت میں پشاور سے درۂ خیبر پہنچا اور دوست محمد خان کی لشکر گاہ میں حاضری دی۔

یہ وفد ایک طرف تو امیرِ اَفغانستان دوست محمد خان سے ملاقات کر کے اسے جنگ سے رُک جانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ دوسری طرف یہ سلطان محمد خان سے بھی خفیہ گفت وشنید کرتا رہا۔ دوست محمد خان قومی رہنما کی حیثیت اختیار کر جانے کے سبب جہاد کی راہ سے منہ موڑنے کو حد درجے باعثِ عار سمجھتا تھا اس لیے وہ مصالحت پر آمادہ نہ ہوا...... مگر حسبِ توقع سلطان محمد خان پر اس فریب کار وفد کا

جادو چل گیا۔ انہوں نے سلطان محمد خان کو دوست محمد خان کے خلاف بھڑکا دیا اور ساتھ ہی اسے پشاور کا خود مختار حاکم تسلیم کر لینے کا سنہرا سپنا دکھایا۔ سلطان محمد خان پھسل گیا، مگر اس نے کہا کہ رہتاس کا قلعہ بھی اس کے حوالے کیا جائے۔ سکھ اور انگریز بہر صورت یہ بازی جیتنا اور جہاد کو روکنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے اس کا بھی وعدہ کر لیا۔

خواب بکھر گیا: دوست محمد خان چند دنوں کے اندر اندر سکھوں پر بھرپور حملہ کر کے پشاور کو آزاد کرانے کا خواب دیکھ رہا تھا مگر ایک صبح اسے اپنی لشکر گاہ کا ایک حصہ بالکل خالی نظر آیا۔ اسے بتایا گیا کہ سلطان محمد خان اپنی فوج کے ساتھ راتوں رات پہاڑوں کے پار جا کر سکھوں کے لشکر سے مل گیا ہے۔ دوست محمد خان کا خواب بکھر گیا۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ اس پر ایسی مایوسی طاری ہوئی کہ باقی سپاہیوں کے ساتھ اسی وقت کابل کی طرف لوٹ گیا۔ اس طرح سلطان محمد خان جیسے غدار ملت کی کارستانیوں نے اس تحریکِ جہاد کو بھی سبوتاژ کر ڈالا۔

انگریزوں سے مراسم: اس ناکام مہم کے بعد امیر دوست محمد خان پر اتنی مایوسی طاری ہوئی کہ وہ اپنی قوت کو مستحکم کرنے کے لیے انگریزوں سے مدد لینے یا کم از کم ان سے سیاسی و تجارتی روابط بڑھانے پر غور و فکر کرنے لگا۔ اپنے بھائیوں سے تعاون و حمایت کے بارے میں وہ بالکل نا اُمید ہو گیا۔ اب تک انگریزوں سے اس کے تعلقات حریفانہ تھے، انہیں تبدیل کرنے کے لیے اس نے ایک خط انگریز گورنر جنرل لارڈ آکلینڈ کے نام لکھا گویا یہ مراسمِ دوستی کی ابتدا تھی۔

ایران اور روس کی مداخلت: اس دوران جبکہ دوست محمد خان انگریزوں سے بہتر تعلقات بنانے کے لیے فکر مند تھا۔ اس کا بھائی حاکم قندھار کہن دل خان ایران اور روس کی مدد سے اپنا اقتدار مضبوط کرنے کی کوشش شروع کر چکا تھا اور ان ممالک کے سفیر قندھار پہنچ چکے تھے۔ اُفغانستان کی تاریخ کا یہ دور انگریزوں کے ساتھ ساتھ روسیوں کو بھی اس ملک میں مداخلت کیلئے سرگرم دیکھ رہا تھا اور اس بیرونی مداخلت کی راہ خود اُفغانستان کے عاقبت نا اندیش حکمران ہموار کر رہے تھے۔

ایک بار پھر سکھوں کے خلاف مہم: امیر دوست محمد خان کو سب سے زیادہ خطرہ سکھوں سے تھا جو پشاور پر قابض ہونے پر قناعت نہیں کر رہے تھے بلکہ آگے بڑھ کر جلال آباد اور کابل تک اپنی سلطنت وسیع کرنا چاہتے تھے۔ ان کی تیاریاں بھرپور اور فوج تیار تھی۔ ان حالات کے پیش نظر دوست محمد خان کو ضروری محسوس ہوا کہ جہاد کا وہ پرچم جو کچھ عرصے پہلے بلند کیا گیا تھا ایک بار پھر اُٹھایا جائے تا کہ سکھوں کے حوصلے حد سے زیادہ بلند نہ ہونے پائیں۔

چنانچہ اس نے 1837ء میں اَفغانی سپاہیوں اور قبائلی مجاہدین کا ایک لشکر اپنے اعلیٰ افسران کے ساتھ پشاور روانہ کیا۔ لشکر کی قیادت نواب عبدالجبار خان کے ہاتھ میں تھی۔ دیگر بڑے افسران میں سردار محمد اکبر خان اور سردار شمس الدین نمایاں تھے۔ علمائے کرام میں ملا اسماعیل پیش پیش تھے۔ سرکاری افواج کے ایک دستے کی قیادت انہی کے پاس تھی۔ ہری سنگھ کو افغانوں کے اس ریلے کی اطلاع ملی تو وہ پشاور سے اَفغانستان کی سرحدوں کی طرف چل دیا۔ جمرود کے قلعے کے قریب جہاں اَفغان لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ دونوں فوجوں میں گھمسان کی جنگ چھڑ گئی۔ روزانہ معرکہ برپا ہوتا مگر کوئی فریق میدان جنگ سے پیٹھ نہ پھیرتا۔ حیرت انگیز طور پر یہ لڑائی بارہ دن تک جاری رہی۔ بارھویں روز ہری سنگھ کے پے در پے حملوں نے اَفغان لشکر کی صفوں کو اُلٹ دیا۔ لشکرِ اَفغان کا عمومی سپہ سالار عبدالجبار خان اپنے دیگر افسران اور سپاہیوں کے ساتھ پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلا۔ صرف ملا اسماعیل اپنے ساتھیوں سمیت میدان میں ڈٹے رہے۔ انہوں نے فرار ہوتے ہوئے نواب عبدالجبار کو پکار کر کہا: ''اے سردار! کیا اِسلام کو برباد کر کے بھاگ رہے ہو...... واپس آجاؤ اور مقابلہ کرو۔''

اس پکار کو سن کر بہت سے فرار ہونے والے سپاہی اپنے افسران کے ماتحت واپس میدانِ جنگ کا رُخ کرنے لگے۔ اس دوران سردار محمد اکبر خان نے جو شروع سے جنگ میں غیر معمولی دلیری کا مظاہرہ کرتا رہا تھا، ایک عجیب کارنامہ انجام دیا۔ وہ میدانِ جنگ کا چکر کاٹ کر سکھ افواج کی پشت پر ٹوٹ پڑا اور انہیں چیر کر رکھ دیا۔ سکھوں کا قلبِ لشکر تتر بتر ہو گیا۔ ان کے کمانڈر ہری سنگھ نے فوج کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر اتنے میں سردار اکبر خان اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے بڑھ کر تلوار کا ایسا وار کیا کہ ہری سنگھ اپنے غرور و پندار سمیت گھوڑے کی زین سے کٹ کر زمین پر آ گرا۔ یہ منظر دیکھ کر سکھ ایسے دہشت زدہ ہوئے کہ پھر پشاور کی فصیل میں داخل ہو کر ہی سانس لیا۔

عبدالجبار خان کی حماقت: شکست کے دہانے پر پہنچ کر حاصل ہونے والی یہ حیرت انگیز فتح خداوندی نصرت ہی کا کرشمہ تھی۔ اب اَفغان لشکر نہ صرف بڑی آسانی سے آگے بڑھ کر شکست خوردہ دشمن کو پشاور سے بھگا سکتا تھا بلکہ تمام مقبوضہ علاقے سکھا شاہی سے آزاد کرا سکتا تھا مگر اس موقع پر لشکر کے سپہ سالار عبدالجبار خان نے تمام افسران کے جذبات اور مشوروں کو نظر انداز کرتے ہوئے پیش قدمی روک دی اور کابل میں امیر دوست محمد خان کو اس فتح کی اطلاع دیتے ہوئے آگے کا لائحہ عمل دریافت کیا۔ دوست محمد خان نے اس کامیابی کو کافی سمجھ کر لشکر کو واپسی کا حکم دے دیا اور یوں سکھوں کو ایک بار پھر تیاری کا موقع مل گیا۔

انگریز سفیر دربارِ کابل میں: اِدھر یہ کشمکش جاری تھی اور اُدھر روس اور ایران کے سفیر جنوبی و مغربی

افغانستان میں اپنا اثر ورسوخ بڑھا رہے تھے۔ یہ صورت حال انگریزوں سے پوشیدہ نہیں تھی۔ وہ افغانستان میں کسی اور طاقت کو غالب ہوتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ افغانستان میں صرف انگریزوں کا سیاسی غلبہ ہو اور وہ اپنے ایجنٹوں کے ذریعے یہاں کی ساری دولت سمیٹ سکیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے نمایندے جنرل برنس کو امیر دوست محمد خان کے پاس بھیجا جس نے تجارتی وسیاسی اُمور پر انگریزوں اور حکومتِ کابل کے اتحاد کو دونوں کے لیے ضروری قرار دیتے ہوئے امیر کابل سے معاہدہ دوستی پر دستخط کرانے کی کوشش کی۔ امیر دوست محمد خان خود بھی چاہتا تھا کہ انگریزوں سے اچھے تعلقات رکھے، مگر اس کا مقصد اس طرح افغانستان میں اپنی حکومت کو مضبوط بنانا تھا۔ وہ انگریزوں کی ان من مانی شرائط پر راضی نہ ہوا جن سے افغان عوام اور ملک کو سخت نقصانات کا اندیشہ تھا۔ اس کے برعکس اس نے انگریزوں کو اپنی شرائط پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے انگریز سفیر سے کہا کہ وہ افغانستان سے تجارتی فوائد اُٹھانا چاہتے ہیں تو انہیں سکھوں پر دباؤ ڈال کر پشاور کو حکومتِ کابل کی عملداری میں دینے کی کوشش کرنا ہوگی۔ برنس نے سکھوں کی دوستی کا حوالہ دیتے ہوئے اس مطالبے کو مسترد کر دیا بلکہ اس نے امیر پر احسان جتلاتے ہوئے کہا:

''سکھوں نے اگر اب تک آپ سے جمرود کی لڑائی میں شکست کا انتقام نہیں لیا اور اب تک افغانستان پر حملہ نہیں کیا تو یہ انگریزوں ہی کی دوستی اور نصیحتوں کا اثر ہے۔ ویسے پشاور کا حاکم اب بھی آپ کا بھائی سلطان محمد خان ہی تو ہے۔''

امیر دوست محمد خان نے یہ سن کر کہا: ''سلطان محمد خان ہمارے لیے سکھوں سے بھی زیادہ خطرناک ہے جو مسلمانوں کے بھیس میں سکھاشاہی کے لیے کام کر رہا ہے۔''

سہ فریقی اجلاس کا اعلامیہ: ان مذاکرات کے بے نتیجہ ثابت ہونے کے بعد برنس اپریل 1838ء میں ہندوستان واپس آ گیا۔ گورنر جنرل نے اس صورتِ حال سے مطلع ہونے کے بعد فیصلہ کیا کہ دوست محمد خان سے تختِ کابل چھین لیا جائے اور اپنے مہرے شاہ شجاع کو بزورِ قوت افغانوں کے سروں پر مسلط کر دیا جائے۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ افغانستان پر برطانوی تسلط کے لیے اب اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں رہا۔

جون 1838ء میں انگریزوں، سکھاشاہی اور شاہ شجاع پر مشتمل وہ تین فریقی تاریخی اجلاس ہوا جس سے افغانستان کی تاریخ کے ایک اور سیاہ باب کا آغاز ہوا۔ اس اجلاس کے اعلامیے کا خلاصہ یہ ہے:

''امیر کابل بلاجواز سکھوں پر فوج کشی کا مرتکب ہوا ہے اور انگریز سفیر برنس کی سکھوں اور افغانوں میں مصالحت کی کوششیں بھی اس کی ہٹ دھرمی کے باعث ناکام رہی ہیں۔ امیر کابل

نے غیر معقول مطالبات رکھ کر اس سفارت کو بے نتیجہ کیا ہے۔ سردارانِ بارک زئی نے حکومت افغانستان کو ناجائز طور پر سدوزئی (ابدالی) حکمرانوں سے چھینا ہے۔ لہٰذا ہم مجبور ہیں کہ ان سے افغانستان کی حکومت چھین لیں اور شاہ شجاع کو جس کی مقبولیت افغان عوام میں طے شدہ ہے، انگریزی فوج کی مدد سے آبائی تخت واپس دلائیں تا کہ افغان قوم کے اتحاد و اتفاق کی تکمیل ہو۔"

اتحادی لشکر کی پیش قدمی: اکتوبر 1938ء میں انگریزوں، سکھوں اور شاہ شجاع کی مشترکہ فوجوں نے افغانستان کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ اس لشکر میں 55 ہزار کے لگ بھگ سپاہی تھے۔ انگریزی فوج کے بنگال ڈویژن کے ساڑھے نو ہزار سپاہی جنرل بلیوکیٹن کی قیادت میں تھے جبکہ جنرل جان کین پانچ ہزار چھ سو سپاہیوں کے ساتھ بمبئی ڈویژن کی قیادت کر رہا تھا۔ جنرل ڈنکن کے پاس چار ہزار سے زائد ریزرو فوجیوں کا دستہ تھا۔ اس کے علاوہ بھی تین ہزار ریزرو سپاہی ساتھ تھے۔ خود شاہ شجاع کے پاس چھ ہزار افغان سپاہی تھے۔ سکھوں کی جانب سے پندرہ ہزار جنگجوؤں کا لشکر اس متحدہ قوت میں اضافہ کر رہا تھا۔ ستر توپوں، بارہ ہزار خدمت گاروں اور بار برداری کے تیس ہزار اونٹوں پر مشتمل یہ لشکر تین حصوں میں تقسیم تھا۔ پہلا حصہ خالص انگریزی فوج کا تھا۔ دوسرا شاہ شجاع کا اور تیسرا اس کے بیٹے شہزادہ تیمور شاہ کی قیادت میں تھا۔ اِس متحدہ لشکر کی شان و شوکت کا یہ عالم تھا کہ جہاں سے گزرتا لوگ دنگ رہ جاتے۔ انگریز افسران میں سے ہر ایک کے پاس دس دس اونٹ، پانچ پانچ گھوڑے اور تقریباً چالیس چالیس نوکر چاکر تھے۔ ان کی شاہ خرچیوں کے باعث یہ فوج جہاں قیام کرتی وہاں کی بستیاں اناج اور اشیائے خورونوش سے خالی ہو جاتیں۔

رنجیت سنگھ کی ہوش مندی: انگریز افسران کا ارادہ یہ تھا کہ وہ پشاور سے ہوتے ہوئے درہ خیبر عبور کر کے کابل پہنچیں گے مگر پنجاب کے حکمران رنجیت سنگھ نے ان کا اتحادی ہونے کے باوجود انہیں پنجاب سے گزرنے کی اجازت نہ دی۔ اس نے صرف شہزادہ تیمور کو چار ہزار آٹھ سو سپاہیوں سمیت پشاور کا راستہ اپنانے کی سہولت دی۔ مجبوراً انگریزوں اور شاہ شجاع کو سندھ سے ہوتے ہوئے بلوچستان کی طرف جانا پڑا۔ اس موقع پر رنجیت سنگھ کی دور اندیشی اور مسلمان رہنماؤں کی عاقبت نا اندیشی نہایت قابلِ غور ہے کہ رنجیت نے انگریزوں کے ساتھ دوستانہ معاہدوں کے باوجود ان کا وجود اپنی سرزمین کے لیے خطرناک سمجھتے ہوئے، انہیں پنجاب میں قدم نہ رکھنے دیا۔ جبکہ مسلمان لیڈر ذاتی اغراض کے لیے انگریزوں کو خود اپنے وطن اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔

برطانیہ کی پروپیگنڈا مہم: اس مہم سے قبل انگریزوں نے جاسوسوں کے ذریعے افغانستان میں اپنی راہ

ہموار کرنے کی کوششیں شروع کردی تھیں۔ چونکہ شاہ شجاع کی حکومت حقیقت میں انگریزوں ہی کی بالادستی کا باعث بننے والی تھی اس لیے انگریزوں کے جاسوس پورے زور وشور سے شاہ شجاع کی حمایت کی تحریک چلارہے تھے۔ ان جاسوسوں میں انگریز خفیہ ایجنسیوں کے افسران ''مسٹر لارڈ'' جلال آباد میں، ''لیفٹیننٹ میکن'' کوہاٹ میں اور ''کیرن'' باجوڑ میں تعینات تھے۔ مسلمان جاسوسوں میں غلام خان پوپلزئی کابل، پروان اور کاپیسا میں شاہ شجاع کی حمایت کے لیے رائے عامہ پر اثر انداز ہورہا تھا۔ چہار سو نہایت شدومد سے یہ اعلان کیا جارہا تھا: ''افغانستان کے تاج وتخت کے اصل اور شرعی وارث ابدالی ہیں۔ اس تخت کے حقدار اعلیٰ حضرت شاہ شجاع الملک نواسۂ حضرت احمد شاہ بابا غازی ہیں جو عنقریب اپنے وطن لوٹ رہے ہیں۔ پوری قوم ان کی حمایت اور استقبال کے لیے تیار رہے تاکہ اسے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے والے سرداروں سے نجات ملے اور ایک متحد و مستحکم افغانستان وجود میں آئے۔''

افغان عوام وخواص کو اس قسم کے پیغامات نہایت تسلسل سے دیے جارہے تھے اور انہیں یہ باور کرایا جارہا تھا کہ شاہ شجاع خود اپنی قوت اور اپنے لشکر کے ساتھ افغانستان آرہا ہے۔ انگریزوں کی حیثیت محض اس کے میزبان کی سی ہے جو افغانستان میں اس کی رسمِ تاج پوشی میں شرکت کی سعادت حاصل کرنے آرہے ہیں اور تقریب میں شریک ہوکر فوراً واپس چلے جائیں گے۔

حاکم کابل کی کمزوری: ان دنوں افغانستان کے اکثر باشندے خصوصاً قومی جذبے سے سرشار قبائلی رہنما، علما اور عمائد بارک زئی حکمرانوں کے ہاتھوں افغانستان کی تقسیم در تقسیم کو ملک کے لیے نہایت تشویش ناک یقین کرچکے تھے۔ سردار پائندہ خان کے اٹھارہ بیٹوں نے ملک کو ٹکڑوں میں بانٹ کر اس کا جو حشر کیا تھا وہ تو سب کے سامنے ہی تھا مگر اگلا منظر اس سے بھی زیادہ دہشت ناک ثابت ہوسکتا تھا اس لیے کہ موجودہ حکمرانِ کابل امیر دوست محمد خان کے ستائیس بیٹے تھے اور ان میں سے ہر ایک سلطنت کے کسی نہ کسی اہم عہدے پر فائز ہوچکا تھا۔

دوست محمد خان ذاتی طور پر ایک صوم وصلوٰۃ کا پابند مسلمان تھا۔ روزانہ نماز فجر اور تلاوت کلام اللہ کے بعد عوام کے ہجوم میں گھل مل کر ان کے مسائل سننا اور ان کے حل کے احکام جاری کرنا اس کا معمول تھا مگر غیر مستقل مزاجی اور اقرباء پروری جیسی کمزوریوں نے اس کے سارے نظام سلطنت کو بارود کے ڈھیر پر لاکھڑا کیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے آنکھیں بند کرتے ہی چند ٹکڑوں میں بٹا ہوا افغانستان ان گنت اجزا میں اس طرح بکھر کر رہ جائے گا کہ اسے پھر سے جوڑنا ممکن نہیں ہوگا۔ اس صورت حال میں بڑے بڑے قومی رہنماؤں، عمائد، علماء اور سرداروں کو شاہ شجاع کی شکل میں ایک متحدہ حکومت کی آس نظر آئی تو انہوں

نے اسے خوش آمدید کہا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کے ساتھ کتنا گھناؤنا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

انگریز فوج سندھ میں: 25 ہزار نفری کی انگریز فوج نے 20 جنوری 1839ء کو دریائے سندھ کے کنارے پہنچ کر پُل باندھنا شروع کیا اور پندرہ بیس دن میں دریا عبور کر کے آگے بڑھی۔ شاہ شجاع کا چھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل لشکر اس سے پہلے شکار پور پہنچ چکا تھا۔ انگریز فوج بھی وہاں اس سے جا ملی۔ اب ان کی اگلی منزل بلوچستان تھی جہاں درہ بولان سے گزر کر انہیں افغانستان میں داخل ہونا تھا۔ بلوچستان کا حاکم محراب خان ایک بہادر اور محب وطن انسان تھا۔ اس کا تعلق بلوچوں کے مردِ آہن میر نصیر خان نوری کے خاندان سے تھا جو کہ احمد شاہ ابدالی کا خاص معتمد امیر تھا۔ انگریزوں نے شکار پور میں ٹھہر کر اپنے نمایندے الیگزینڈر برنس اور موہن لال کو محراب خان کے پاس روانہ کیا تاکہ وہ اسے یہ یقین دلائیں کہ انگریزی فوج شاہ شجاع کے خادموں کی حیثیت سے ادھر آ رہی ہے لہٰذا وہ ابدالی خاندان سے اپنے قدیم تعلقات اور ملک وملت کے مفادات کی خاطر اس لشکر کو نہ صرف اپنی حدود سے گزرنے دے بلکہ درہ بولان کے خطرناک علاقے میں اس کی خوراک ورسد کا بھی انتظام کر دے۔ انگریز فوج محراب خان کی مدد کی اس لیے محتاج تھی کہ درہ بولان کو مقامی باشندوں کی مدد کے بغیر عبور کرنا کسی حملہ آور کے لیے ممکن نہیں۔ اگر گنتی کے افراد بھی اس درّے کی ناکہ بندی کر دیں تو وہ بڑی سے بڑی فوج کو روک سکتے ہیں۔ چنانچہ انگریز محراب خان سے تعاون کے طالب ہوئے۔

درہ بولان میں: اُدھر قندھار کے حاکم کہن دل خان کو یقین تھا کہ انگریزوں کی سب سے پہلی یلغار اس کے شہر پر ہوگی چنانچہ اس نے محراب خان کو خط لکھا کہ وہ انگریزی فوج کو درہ بولان ہرگز عبور نہ کرنے دے مگر افسوس کہ اس کا یہ خط انگریزوں کے جاسوسی نظام کی زد میں آ کر پکڑا گیا۔ ادھر انگریزوں کے نمایندوں نے محراب خان کے پاس پہنچ کر اسے اعتماد میں لے لیا۔ اسے یہ بھی یقین دلایا کہ شاہ شجاع کے بادشاہ بننے کے بعد اسے بلوچستان کا حاکم برقرار رکھا جائے گا اور اسے سالانہ دو لاکھ روپے انگریز سرکار کی طرف سے ادا کیے جایا کریں گے۔ انگریزوں کی اس خوش نما پیش کش کے باوجود بلوچ سرداروں محمد حسن خان، گل محمد خان اور سید محمد شریف نے اس کی مخالفت کی مگر میر محراب خان نے شاہ شجاع کی حکومت کو افغانستان کے لیے مفید سمجھتے ہوئے انگریزوں سے سمجھوتہ کر لیا اور درہ بولان کو ان کے لیے کھول دیا۔ تاہم بلوچ قبائل کے بہت سے جانباز اپنے طور پر درّہ بولان میں انگریز فوج پر حملے کرتے رہے۔ انگریزوں اور شاہ شجاع کی مشترکہ فوج بڑی مشکل سے درہ بولان عبور کرنے میں کامیاب ہوئی۔

کہن دل خان کا فرار: اپریل 1839ء میں انگریز اور افغان لشکر قندھار کی فصیلوں کے سامنے پہنچ

گیا۔ ہر طرف یہی شہرہ تھا کہ شاہ شجاع اپنے آبائی تخت لینے واپس آیا ہے۔ اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر حاکمِ قندھار کہن دل خان کے حامی بڑے بڑے سردار یکے بعد دیگرے شاہ شجاع سے آن ملے۔ ان میں حاجی خان کاکڑی بھی تھا جو "خان بزرگ" کے لقب سے مشہور تھا۔ کہن دل خان نے صورت حال دیکھی تو اب یقین ہو گیا کہ کسی مزاحمت کا خیال فضول ہے چنانچہ وہ اپنے خاص ساتھیوں سمیت راتوں رات قندھار سے فرار ہو گیا۔ انگریزی فوج کے دستوں نے اس کا تعاقب کیا مگر وہ ایران کی سرحدوں کی طرف نکل گیا اور وہیں پناہ لی۔

شاہ شجاع کی تاجپوشی: 25 اپریل کو انگریز فوج کسی روک ٹوک کے بغیر قندھار میں داخل ہو گئی۔ شاہ شجاع کی رسمِ تاج پوشی بڑے دھوم دھام سے ادا ہوئی۔ عوام کو یہی بتایا جا رہا تھا کہ انگریز سپاہی صرف مہمان کے طور پر جشنِ تاج پوشی میں شرکت کے لیے آئے ہیں مگر اتنی بڑی تعداد میں انگریز سپاہیوں اور افسروں کی موجودگی لوگوں کو تشویش میں مبتلا کرنے کے لیے کافی تھی۔

بلوچستان پر حملہ: قندھار پر قبضے کے فوراً بعد انگریزوں نے بلوچستان پر قبضے کا منصوبہ بنایا۔ وہ جانتے تھے کہ افغانستان پر تسلط کو برقرار رکھنے کے لیے بلوچستان کے تمام راستوں کو اپنے ہاتھ میں رکھنا لازمی ہے۔ اگرچہ حاکمِ بلوچستان سردار محراب خان نے اس بار انہیں راہداری کی سہولت مہیا کر دی تھی مگر ضروری نہیں تھا کہ وہ ہر بار اسی مروت کا مظاہرہ کرتا۔ چنانچہ انگریزوں نے ایک فوج بلوچستان کی جانب روانہ کر دی۔ اس فوج نے محراب خان کو مستونگ کے قلعے میں گھیر لیا۔ محراب خان بھی مقابلے پر ڈٹ گیا۔ صبح سے شام تک جنگ جاری رہی۔ آخر کار انگریزی توپ خانے نے قلعے کا دروازہ توڑ تو ڈالا اور گورے سپاہی ایک ریلے کی طرح قلعے میں گھس گئے۔ محراب خان یہ دیکھ کر میدان میں کود گیا اور ان میں سے درجنوں کو ہلاک کرنے کے بعد متعدد زخم کھا کر شہید ہو گیا۔ محراب خان کے ساتھ ہی اس کے نامی گرامی بلوچ سرداروں محمد خان مینگل، داد کریم شوانی، نبی بخش خان جتوئی اور شہباز خان انچاری نے بھی شہادت پائی۔ اس کے بعد سے بلوچستان انگریزوں کی تحویل میں اس طرح رہا کہ علاقے کا نظام داخلی خود مختاری کے ساتھ مقامی سرداروں کے پاس تھا جبکہ بالادستی انگریز سرکار کو حاصل تھی۔ انگریزی فوج شال کوٹ (کوئٹہ) اور جیکب آباد میں چھاؤنیاں ڈال کر سندھ و بلوچستان پر اپنی گرفت مضبوط کیے رہی۔

شہزادہ تیمور درہ خیبر میں: قندھار میں شاہ شجاع کی تخت نشینی کے ناٹک کے بعد انگریز سپاہ نے دو ماہ تک وہیں قیام کیا۔ اس دوران شاہ شجاع کا بیٹا شہزادہ تیمور، امیر دوست محمد خان سے مقابلے کے لیے پشاور سے کابل روانہ ہو چکا تھا۔ اس نے درۂ خیبر میں امیر دوست محمد خان کے متعین کردہ حفاظتی دستوں کو

زبردست مقابلے کے بعد شکست دے دی اور جولائی 1839ء میں خیبر کے مضبوط ترین دفاعی مرکز "علی مسجد" پر قبضہ کرایا۔ یوں کابل تک اس کی راہ صاف ہوگئی۔

غزنی کا محاذ: ادھر قندھار سے انگریزی فوج غزنی پر حملے کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔ شاہ شجاع ایک کٹھ پتلی کی طرح ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ 21 جولائی 1839ء کو یہ لشکر غزنی پہنچا۔ یہاں امیر دوست محمد خان کا نائب غلام حیدر خان تین ہزار سپاہیوں کے ساتھ موجود تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ انگریز فوج قندھار اور غزنی کے درمیانی راستے کے انتہائی دشوار گزار ہونے کے باعث بھاری توپ خانہ ساتھ نہیں لا سکی۔ ساتھ میں اسے اطلاع ملی کہ امیر کابل کا بیٹا افضل خان تین ہزار سپاہیوں کے ساتھ اس کی مدد کے لیے پہنچنے والا ہے۔ غلام حیدر خان کی ہمت بڑھ گئی اور اس نے مقابلے پر کمر باندھ لی۔

ابھی انگریزوں کی غزنی کے محافظین سے جنگ شروع نہیں ہوئی تھی کہ انہیں ایک غیر متوقع صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ غلزئی قبائل کے مجاہدین تھے جو شاہ شجاع اور اس کے سرپرست انگریزوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ غلزئی قبائل قندھار کے گردونواح میں آباد تھے اور ان کی دلیری کی داستانیں مشہور تھیں۔ انگریزی فوج قندھار سے غزنی کے سفر کے دوران جگہ جگہ ان کے چھاپہ مار گروہوں کے حملوں کا شکار ہوتی رہی تھی اور اب غزنی کے دفاع کے لیے غلزئی مجاہدین کی ایک جمعیت موسیٰ خان زرمئی کی قیادت میں ادھر آرہی تھی۔ اس رضا کار جماعت نے آتے ہی غزنی کے شمال اور مشرق میں ڈیرے ڈال دیے اور انگریزوں کو للکارا۔

انگریزوں کی سفاکی: انگریزوں نے شاہ شجاع سے مشورہ کیا جس نے ان کی فوری سرکوبی پر زور دیا۔ انگریز افسر کیپٹن نکلسن اپنے دستوں کو لے کر ان پر حملہ آور ہو گیا۔ غلزئی مجاہدین نے جم کر مقابلہ کیا۔ دست بدست جنگ میں جانبین کے بے شمار افراد کام آئے۔ آخر کار انگریزی لشکر نے غلزئی کو پسپا کر دیا اور متعدد مجاہدین گرفتار ہو گئے۔ ان تمام مجاہدین کو انگریزی کیمپ میں لے جایا گیا۔ انگریز افسران کے لیے افغانوں سے میدانِ جنگ میں لڑنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ وہ ان کی شجاعت اور معرکہ آزمائی پر حیران بھی تھے اور غضب ناک بھی۔ اس طیش اور انتقام کے جذبات سے مغلوب ہو کر انگریز افسران نے ان تمام مجاہدین کو ذبح کر دینے کا حکم جاری کیا۔ جب مجاہدین کے گلے پر تیز دھار خنجر پھیرے جا رہے تھے تو انگریز افسران فلک شگاف قہقہے لگا کر اس بات کا ثبوت مہیا کر رہے تھے کہ وہ مسلمانانِ افغانستان کے بدترین دشمن ہیں اور ان کے دلوں میں رحم اور خیر خواہی کا ایک ذرہ تک نہیں ہے۔

افغانوں کا منصوبہ: اگر شاہ شجاع میں رتی برابر بھی غیرتِ قومی ہوتی تو وہ اس سنگ دلی پر احتجاج ضرور کرتا

مگر اس کی خود غرضی نے اسے اندھا کر دیا تھا۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ حاکم غزنی غلام حیدر خان غزنی میں کئی ماہ تک لڑ سکتا تھا کیونکہ انگریزوں کے بھاری توپ خانے کی غیر موجودگی میں اسے افضل خان کے ساتھ آنے والے تین ہزار سپاہیوں کی کمک بھی ملنے والی تھی۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ جنگ کو طویل تر کر کے انگریزوں کو محاصرہ اُٹھانے پر مجبور کر دیا جائے اور پھر جب فرنگی لشکر کابل روانہ ہو تو کابل میں امیر دوست محمد خان کی افواج سامنے سے ان کا مقابلہ کریں اور غزنی کی فوج پیچھے سے ان پر ٹوٹ پڑے۔ یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا تھا کیونکہ انگریز سپاہی غزنی کی فصیلوں کو سرنگوں کرنے سے مایوس ہو چکے تھے۔

ایک اور غدار: مگر انگریزوں کو اس موقع پر ایک اور غدار ہاتھ لگ گیا جس نے سارے نقشۂ جنگ کو پلٹ کر رکھ دیا۔ یہ امیرِ کابل کا بھانجا عبدالرشید خان تھا۔ اس نے انگریز افسران کو اپنی وفاداریاں پیش کرتے ہوئے انہیں غزنی سمیت اُفغانستان کے تمام قلعوں، چھاؤنیوں اور مورچوں کی تفصیلات بتا دیں۔ یہ بھی بتا دیا کہ غزنی کے قلعے کے بعض کمزور حصوں کو توپ خانے کے بغیر صرف بارود سے اُڑایا جا سکتا ہے۔ عبدالرشید خان نے ان کمزور حصوں کی نشان دہی بھی کر دی تھی۔ چنانچہ اب غزنی پر قبضہ کوئی مشکل نہ تھا۔

غزنی میں دست بدست لڑائی: 22 جولائی 1839ء کی شب انگریز افسر کیپٹن ٹامسن چند سپاہیوں سمیت فصیل کے کابلی دروازے تک پہنچ گیا۔ یہاں بارود لگا کر اس نے دروازے کے پرخچے اُڑا دیے۔ ساتھ ہی انگریز فوج ٹڈی دل کی طرح غزنی کے گلی کوچوں میں پھیل گئی۔ یہ رات 3 بجے کا وقت تھا۔ غزنی کے شہری گھوڑوں کی ٹاپوں اور سپاہیوں کے بے ہنگم نعروں سے ہڑبڑا کر بیدار ہوئے۔ ہر طرف یہی شور تھا کہ انگریزی فوج اندر گھس چکی ہے۔ غزنی کے دلیر عوام آزادی کی نعمتِ عظمیٰ کو کفار کے پنجوں میں اتنی آسانی سے کیسے جانے دیتے۔ وہ نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے گھروں سے نکل آئے اور تلواروں، خنجروں اور توڑے دار بندوقوں سے دشمن کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ بہت سے لوگ صرف پتھروں اور ڈنڈوں سے لڑ رہے تھے۔ ایک بڑی تعداد بالکل خالی ہاتھ انگریز سپاہیوں سے گتھم گتھا تھی۔ صبح تک یہ دست بدست لڑائی جاری رہی یہاں تک کہ اکثر مزاحمت کار لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔

انگریزوں کے نقصانات بھی کوئی کم نہیں تھے۔ بارہ سو انگریز سپاہی اس چند گھنٹے کی لڑائی میں نہتے عوام کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ زخمیوں کی تعداد تین سو سے زائد تھی۔ شدید زخمیوں میں انگریز جنرل سیل کے علاوہ سترہ دیگر بڑے افسران بھی شامل تھے۔ یہ وہ تعداد ہے جو انگریزوں کی بیان کردہ ہے ورنہ افغان مورخین کے بقول انگریزوں کے ہلاک شدگان وزخمی اس سے کہیں زیادہ تھے مگر اپنی بکی کے ڈر سے انگریزوں نے اصل اعداد و شمار کو خفیہ رکھا۔

اہلِ غزنی پر مظالم: غزنی پر قبضے کے ساتھ ہی انگریزوں نے سردار غلام حیدر خان اور اس کے بیوی بچوں سمیت حکمران خاندان کے 30 افراد کو گرفتار کر کے شہر کی ایک عمارت میں قید کر دیا۔ غزنی کے عوام کی جرأت مندانہ مزاحمت سے بپھرے ہوئے انگریز کئی دنوں تک شہر میں قتل و غارت کرتے رہے۔ قیدیوں کو توپ کے دھانوں سے باندھ کر اُڑانا انگریز افسران کا دل پسند مشغلہ تھا۔ غزنی میں بھی اس بہیمانہ کھیل کو دہرایا گیا۔ بہت سے قیدیوں کو باندھ کر چھریوں سے ذبح کیا گیا۔ غدار سردار عبدالرشید اس دل خراش منظر کو دیکھ کر بھی مہر بلب رہا۔ خود شاہ شجاع کی بے حمیتی کا یہ عالم تھا کہ اس نے ذرہ برابر مداخلت نہ کی۔ جب پچاس قیدیوں کو اس کے سامنے لایا گیا تو ان میں سے چند ایک نے اس سے رحم کی درخواست کی۔ شاہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ یہ دیکھ کر ایک قیدی نے بلند آواز سے نعرہ لگایا: ''نوکرِ فرنگی.....''

شاہ شجاع غصے میں آگ بگولا ہو گیا۔ ان پچاس قیدیوں کو بھی اس وقت ذبح کر دیا گیا۔

اہلِ غزنی کے اس عبرت ناک انجام سے سردار افضل خان پر سخت خوف و ہراس طاری ہوا۔ وہ غزنی کے محصورین کی امداد کے لیے کابل سے تین ہزار سپاہی لے کر آ رہا تھا مگر اب اس کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ اپنے سپاہیوں سمیت تیزی سے کابل کی طرف پلٹ گیا اور امیر دوست محمد خان کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

دوست محمد خان کا پیام صلح: دوست محمد خان بازی ہاتھ نکلتے ہوئے دیکھ رہا تھا، اسے یہ بھی اطلاع مل چکی تھی کہ خیبر سے شہزادہ تیمور ایک بھاری لشکر کے ساتھ جلال آباد کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے انگریزوں سے صلح ہی میں عافیت سمجھی اور اپنے بھائی نواب عبدالجبار خان کو جو کہ انگریزی زبان اور انگریزوں کے مروجہ آداب و قواعد سے واقف تھا، صلح گفت و شنید کے لیے غزنی روانہ کر دیا۔ نواب عبدالجبار خان وہاں پیامِ صلح لے کر پہنچا۔ انگریز جنرل میکنٹن نے اس پیغام سے امیرِ کابل کی کمزوری کا اچھی طرح اندازہ کر لیا اس لیے اس نے نواب سے بڑی بے رخی سے بات کی۔

نواب نے کہا: ''امیر کابل آپ سے صلح اور شاہ شجاع کی بادشاہت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں، بشرطیکہ آپ انہیں افغانستان کی وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ عطا کرنے کا وعدہ کریں۔''

میکنٹن نے زہر آلود لہجے میں جواب دیا: ''ہمارا ارادہ تو کچھ اور ہے۔ ہم دوست محمد کو قیدی بنا کر ہندوستان لے جانے کا سوچ رہے ہیں۔''

نواب عبدالجبار مرعوب ہو گیا اور فوراً اس فرمائش کو ترک کر کے ایک عاجزانہ درخواست کی: ''اگر آپ صلح کے بدلے کم از کم سردار غلام حیدر خان کو ان کے بیوی بچوں سمیت رہا کر دیں تو یہ بھی بڑی نوازش ہوگی۔''

جنرل نے ترش رُو ہو کر جواب دیا: ''یہ بھی نہیں ہو سکتا۔''

''کم از کم غلام حیدر خان کی اہلیہ محترمہ خانم کو ہی آزاد کر دیں۔''

''یہ بھی ناممکن ہے۔ ہاں تم چاہو تو تمہیں غلام حیدر سے ملا دیتے ہیں۔''

اس موقع پر انگریز جنرل نے دوست محمد اور نواب عبدالجبار میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش بھی کی۔ اس نے عبدالجبار کو کہا: ''اگر تم چاہو تو ہم تمہیں شاہ شجاع کا وزیر بنا دیں۔''

نواب عبدالجبار اس چال کو سمجھ گیا اور معذرت کر لی۔ گفتگو اس پر ختم ہو گئی اور نواب عبدالجبار ناکام ہو کر 29 جولائی کو کابل کی طرف لوٹ گیا۔

دوست محمد خان کا غرور: امیر دوست محمد خان کابل اور غزنی کے درمیان ارغندہ میں پڑاؤ ڈالے ہوئے کسی اچھی خبر کا منتظر تھا مگر نواب عبدالجبار خان کی سفارت کی ناکامی کے بعد اس کی رہی سہی خوش فہمی بھی دور ہو گئی، اسے یقین ہو گیا کہ اب اس کا انجام بہت برا ہو گا۔ شاہ شجاع انگریزوں کی مدد سے اس کے خاندان سمیت اسے مروادے گا۔ چنانچہ وہ کسی پس و پیش کے بغیر اپنے کنبے کو لے کر کابل سے بامیان کی پُر پیچ گھاٹیوں کی طرف فرار ہو گیا۔ اس کی تمام فوج ''ارغندہ'' میں رہ گئی۔ دوست محمد خان نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس فوج کی مدد سے وہ کابل جیسے مستحکم قلعہ نما شہر کو ایک طویل مدت تک انگریزوں کے لیے آزمائش گاہ بنا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر وہ حقائق سامنے لا کر عوام میں اسی جذبۂ جہاد کو اُجاگر کرنے کی کوشش کرتا جس کے بل بوتے پر اس نے جمرود میں سکھوں کو شکست دی تھی تو بعید نہ تھا کہ عوام بھی شاہ شجاع اور انگریزوں کے خلاف آمادہ پیکار ہو جاتے۔ یہ ہدف حاصل کرنا اس لیے مزید آسان ہو گیا تھا کہ غزنی میں انگریزوں کے مظالم کی خبریں سامنے آ چکی تھیں مگر دوست محمد خان نے جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرار ہونے میں ہی عافیت سمجھی۔ یہ اگست 1839ء کا واقعہ ہے۔

بادشاہ فقر و فاقے میں: دوست محمد خان اپنے خاندان سمیت بامیان پہنچا اور وہاں کچھ دن ٹھہر کر ''درۂ خلم'' کا رُخ کیا جو افغانستان کا محفوظ ترین علاقہ تصور کیا جاتا ہے۔ خلم میں اس کے وفادار سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ ان سب نے اسی جگہ کو مورچہ بنا کر انگریزوں سے مقابلہ کرنے پر اصرار کیا مگر دوست محمد خان تیار نہ ہوا۔ ان دنوں وسطِ ایشیا کے شہر بخارا پر خود مختار ازبک امیر نصر اللہ خان کی حکومت تھی۔ دوست محمد خان نے سفیر بھیج کر اس سے پناہ کی درخواست کی اور اجازت ملنے پر اپنے کنبے سمیت وہاں پہنچ گیا۔ نصر اللہ خان نے اس سے کچھ زیادہ اچھا سلوک نہیں کیا اور اصرار کیا کہ وہ اپنے بیٹوں سے الگ رہائش اختیار کرے۔ اس پر دوست محمد خان نے اپنے اہل و عیال کو واپس افغانستان بھیج

دیا جنہیں انگریزوں نے حراست میں لے کر غزنی پہنچا دیا۔ کچھ مدت بعد نصر اللہ خان نے دوست محمد خان کے مصارف برداشت کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ افغانستان کے دورِ زوال کا یہ وجیہ حکمران اب ایک فقیر کی طرح مفلسی کی زندگی گزارنے لگا۔

شاہ شجاع کابل میں: دوست محمد خان کے فرار کے فوراً بعد انگریزی لاؤ لشکر کابل پہنچ گیا۔ سات اگست 1839ء کو شاہ شجاع انگریز افسران جنرل میکناٹن اور جنرل کین کے ساتھ شہر کی فصیل کے سامنے نمودار ہوا۔ عوام امیر دوست محمد خان کی بزدلی پر برافروختہ تھے اور برطانوی ایجنٹوں کے پروپگینڈے سے متاثر ہو کر شاہ شجاع سے بہتر توقعات وابستہ کرتے ہوئے اس کے استقبال کے لیے چشم براہ تھے۔ انہیں خوشی تھی کہ ابدالی تاج و تخت کا وارث طویل آزمائشوں کے بعد اپنا موروثی حق وصول کرنے آ پہنچا ہے جس کے ہاتھوں بکھرا ہوا افغانستان ایک بار پھر امن و سکون کا گہوارہ بن جائے گا۔ مگر جب انہوں نے شاہ شجاع کا جلوس دیکھا تو ہکا بکا رہ گئے......! شاہ کے دائیں بائیں بھی انگریز افسران تھے اور اس کے پیچھے بھی تا حد نگاہ انگریز پلٹنیں ہی نظر آ رہی تھیں۔ ملکی سپاہی اکا دکا ہی تھے۔ امیر دوست محمد خان کے سپاہی جو شاہ شجاع کی اطاعت کا اعلان کر چکے تھے، اصل صورتِ حال سے واقف تھے اس لیے انہیں زیادہ حیرت نہیں تھی۔ وہ قواعد کے مطابق فاتح بادشاہ کا استقبال کر رہے تھے، مگر عوام کا حیرت کے مارے برا حال تھا۔ ان کے استقبالیہ نعرے حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئے۔ ان کی جانب سے مبارک سلامت کا کوئی شور بلند نہ ہوا۔ شاہ شجاع تیس برس بعد اپنے پایۂ تخت کو سامنے دیکھ کر خوشی سے جذباتی ہو گیا۔ کابل کی سڑکوں اور عمارتوں پر عوام کا بے پناہ ہجوم ساکت و جامد کھڑا تھا۔ شاہ شجاع کو یوں محسوس ہوا جیسے یہ لوگ ایک فاتح بادشاہ کا نہیں، بے جان لاش کا استقبال کر رہے ہوں۔

شاہ قلعہ بالا حصار میں اس طرح داخل ہوا جیسے جنازہ کاندھوں پر لے جایا جا رہا ہو۔ شاہی محل میں قدم رکھتے ہوئے وہ بے اختیار رو پڑا۔ معلوم نہیں یہ آنسو مسرت کے تھے یا ان میں ندامت کی بھی آمیزش تھی۔ شاہ کو اتنا احساس تو بہر حال ضرور تھا کہ انگریزوں نے اسے سہارا دینے کے بہانے پورے افغانستان پر قبضہ کر لیا ہے اور اب وہ ایک کٹھ پتلی کی طرح عمر بھر ان کے اشارے پر رقص کرے گا۔

شہزادہ تیمور کابل میں: کابل پر انگریزوں کے قبضہ کے بیس دن بعد 19 اگست 1839ء کو انگریزی فوج کا دوسرا ڈویژن شہزادہ تیمور کے ساتھ جلال آباد پر قابض ہو گیا۔ یہ لشکر تین ستمبر کو کابل پہنچا۔ عوام نے دیکھا کہ شاہ شجاع کی طرح اس کے بیٹے کی سرکردگی میں آنے والی فوج میں بھی افغان سپاہی کم اور انگریز زیادہ ہیں۔ یوں سب کو یقین ہو گیا کہ شاہ شجاع کی آڑ میں انگریزوں نے افغانستان پر قبضہ کر لیا ہے۔

انگریز چھاؤنیوں کا قیام: انگریزوں کو عوام کی اس تشویش کا پورا اندازہ تھا۔ اس لیے انہوں نے جلد از جلد افغانستان کے تمام اہم شہروں، قلعوں اور راستوں پر قبضہ مستحکم کرلیا۔ قندھار میں جنرل ناٹ ایک بڑی فوج کے ساتھ مقیم رہا جبکہ غزنی اور قندھار کے درمیان ''اولنگ رباط'' نامی علاقے میں انگریزی فوجوں کے لیے نئی چھاؤنی اور قلعہ تعمیر کیا گیا جس میں کرنل ویمر کو متعین کیا گیا۔ کابل پر قبضہ مضبوط رکھنے کے لیے انگریزی فوج کو خاصی ترتیب سے شہر کے تمام قلعوں، ناکوں اور پہاڑوں پر مقرر کردیا گیا۔ ان کے لیے بیرکیں تعمیر کرائی گئیں، تفریح گاہیں اور باغ بنوائے گئے۔ اس مضبوط انتظام کے ساتھ ساتھ جاسوسی کا شعبہ بھی مزید فعال بنایا گیا۔

کابل شہر میں اب سرکاری عمال اور افسران کی حیثیت محض قاصدوں کی سی تھی۔ تمام احکام انگریزی سفیر میکناٹن جاری کرتا جنھیں سن کر شاہ شجاع صرف ''ہاں'' کردیتا۔ شہر میں ہر طرف ایک افسردگی کا راج تھا۔ انگریز اپنی فتح پر پھولے نہ سماتے تھے، ہندوستان کے انگریز گورنر جنرل نے فتح افغانستان پر بے حد مسرت ظاہر کرتے ہوئے ان افسروں کو خوب نوازا تھا۔ عام طور پر یہ انگریز افسران اور ان کے اہل خانہ صبح سے شام تک کرکٹ کھیلتے رہتے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہاں جیسی بادشاہت انہیں یقیناً کہیں اور نصیب نہیں ہوگی جس میں عیش و عشرت کے سوا اب انہیں اور کوئی کام نہیں ہے۔

شاہ شجاع کی بے مائیگی: انگریزوں نے شاہ شجاع کا ایسا انتظام کرایا تھا کہ وہ ان کے سامنے لب کشائی کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ تاج پوشی کے بعد بس کچھ دنوں تک اسے دربار میں آنے اور عوام کو اس سے ملنے کا موقع دیا گیا، اس نے لوگوں کے مسائل سن کر کچھ احکام جاری کیے مگر جب انگریزوں کو محسوس ہوا کہ اس طرح بادشاہ اور عوام ایک متحد طاقت بن جائیں گے تو انہوں نے شاہ کے اختیارات کم کرتے کرتے اسے بالکل گوشہ نشین کرادیا۔

اب شاہ شجاع اپنے خاندان کے آٹھ سو کے لگ بھگ افراد کے ساتھ شاہی محل میں قیدی کی طرح رہ رہا تھا۔ اس کی اپنی فوج صرف نو سو افراد پر مشتمل تھی اور یہ سب نہتے تھے۔ انگریزوں نے انہیں صرف لاٹھیاں رکھنے کی اجازت دی تھی۔ خود محل کے چاروں طرف اور اندر بھی انگریز سپاہی تعینات تھے جن کی تعداد پانچ ہزار سے کم نہیں تھی۔ انگریز افسران بے باکی کے ساتھ شاہ کے کمرے میں گھس جاتے اور اس کا مذاق اُڑاتے۔ شاہ نے انگریز حکام سے احتجاج بھی کیا مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

انگریزوں کی زیادتیاں: ادھر عوام میں انگریزوں سے نفرت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ انگریزوں کی زیادتیوں کا یہ عالم تھا کہ شہریوں کے نظامِ زندگی کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ افغان عوام کی عادت رہی ہے کہ شام کے فارغ اوقات میں داستان گو قسم کے لوگوں سے پرانے زمانے کے بہادروں کی داستانیں سنا کرتے تھے جو نظم اور نثر

دونوں اندازے سنائی جاتی تھیں۔ انگریز افسران نے ایسی محفلوں پر بھی صرف اس لیے پابندی لگادی کہ کہیں اس طرح عوام میں انگریزوں کے خلاف مزاحمت کا جذبہ نہ پیدا ہوجائے۔ انگریزوں نے جبری ٹیکسوں اور لوٹ کھسوٹ اور عوام کو معمولی شبہات میں سخت سزاؤں کے ذریعے جو خوف وہراس پھیلا رکھا تھا لوگ اس میں شاہ کو برابر کا قصوروار سمجھتے تھے، اس لیے کہ اب بھی تمام احکام شاہ ہی کی مہر سے جاری ہوتے تھے۔ اس طرح عوام میں شاہ شجاع سے نفرت مزید بڑھتی جارہی تھی۔ شاہ نے چند بار انگریزوں سے اس صورتِ حال پر کمزور سا احتجاج کیا مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا بلکہ انگریزوں نے شاہ پر دباؤ بڑھانے کے لیے سابق حاکم دوست محمد خان کے کئی ایسے اعزہ واقارب کو جو شاہ کے سخت مخالف تھے، حکومت میں اہم عہدے دے دیے۔ دراصل انگریزوں کے اختیارات کا یہ عالم تھا کہ وہ جسے چاہتے گورنر یا وزیر بنادیتے اور جسے چاہتے معزول کردیتے۔ شاہ کا بیٹا شہزادہ فتح جنگ قندھار کا عامل تھا۔ انگریز افسران نے شاہ شجاع پر دباؤ ڈال کر شہزادے کو قندھار کی حکومت سے معزول کردیا اور اس کی جگہ شہزادہ صدر جنگ کو لے آئے۔

شاہ کی ندامت: شاہ شجاع انگریزوں سے جان چھڑانا چاہتا تھا مگر انگریز اس کے تاج وتخت کی بقا کے ضامن تھے۔ شاہ کو یقین تھا کہ یہ سنہری پنجرہ انگریزوں کے واپس جاتے ہی اس کا مقبرہ بن جائے گا اور عوام اسے غدار قرار دے کر مار ڈالیں گے۔ اس ادھیڑ پن میں وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ تاہم اسے اپنے گناہوں کا احساس ہوگیا تھا۔ وہ اس دن کو کوس رہا تھا جب اس نے انگریزوں کی سرپرستی قبول کی تھی۔

اس دوران شاہ شجاع انگریز سفیر میکناٹن سے بارہا یہ فریاد بھی کرچکا تھا کہ افغانستان کو اب کوئی خطرہ نہیں لہٰذا آپ تشریف لے جائیں تو بہتر ہے...... مگر انگریزوں کا جواب تھا: ''جب تک امیر دوست محمد خان زندہ ہے، آپ کے اقتدار کو خطرہ لاحق ہے جس کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔''

ہم انگریزوں کو نہیں جانتے: آخرکار شاہ شجاع انگریزوں سے بالکل بےزار ہوگیا اور خفیہ طور پر ان کے خلاف کسی تحریک برپا کرنے پر غور شروع کردیا۔ مگر اس کے پاس وسائل تھے نہ طاقت۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ اسے افغان سرداروں سے ملنے کا موقع بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ مگر آخر ایک دن شاہ کو اپنے دل کی بات کہنے کا بہانہ مل گیا۔ ہوا یہ کہ انگریز افسران نے چند محب وطن افغان عمائد کو جن میں سردار شمس الدین، عبداللہ خان اچکزئی اور امین اللہ خان لوگری قابل ذکر ہیں، ملک بدر کرنے کا ارادہ کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے شاہ شجاع کو پیغام بھیجا کہ ان عمائد کو حکومت کی حفاظت کی خاطر جلاوطن کردیا جائے۔ چونکہ یہ عمائد اپنے اپنے قبائل کے رئیس تھے اس لیے شاہ نے انہیں خود شاہی محل میں بلا کر تخلیے میں یہ حکم سنایا اور بتایا کہ انگریز آپ کے افغانستان میں رہنے پر راضی نہیں ہیں۔ ان عمائد نے کہا: ''ہم انگریزوں کو نہیں

جانتے۔ ہم صرف آپ سے واسطہ رکھتے ہیں، ہم نے آپ کی دعوت پر امیر دوست محمد خان سے بغاوت کی اور آپ کو اپنا بادشاہ مان کر تخت پر بٹھایا۔ اب انگریزوں کی تمام تر بدکاریوں کے جواب دہ آپ ہی ہیں۔''

شاہ شجاع نے یہ سن کر ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولا: ''تم میرے دل کے حال سے واقف نہیں ہو، میں انگریز پہرے داروں کی حراست میں ہوں۔ بے بس ہوں۔ کچھ کر گزرنے کا وقت میرے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ ہائے افسوس کہ خراسان کے غیور و باہمت فرزند مٹ گئے ورنہ آج بھی میری یہ تلوار اسلام کی تلوار ہے۔ اگر کوئی بندہ صاحبِ ہمت ہو تو آ کر اسے اُٹھا لے اور انگریزوں سے برسرِ پیکار ہو جائے۔''

شاہ شجاع کے یہ الفاظ اس بات کا ثبوت تھے کہ وہ اپنے کیے پر شرمندہ تھا اور اس کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔ انگریزوں کے ہاتھوں سے پہنچنے والی رسوائی نے اسے دوست دشمن کی پہچان کرا دی تھی۔ تمام سرداروں نے شاہ کی بات سن کر اسے یقین دلایا کہ وہ انگریزوں کے خلاف لڑائی کے لیے تیار ہیں۔ شاہ نے ان سے ہر ممکن مالی تعاون کا وعدہ کیا اور اس راز کو سربستہ رکھنے کا عہد لیا۔ واپس جا کر ان عمائد نے افغانستان کے دیگر سرداروں سے مل کر انہیں اس صورتِ حال سے آگاہ کیا اور انہیں انگریزوں کے خلاف اُبھارا۔ کچھ ہی عرصے میں انگریزوں سے متنفر سرداروں اور عوام کی ایک بڑی تعداد انقلاب کے لیے ہر قربانی دینے پر آمادہ ہو گئی۔

مزاحمت کا آغاز: اب انگریزوں کے خلاف مختلف گوشوں سے آوازیں اُٹھنے لگیں پھر یکے بعد دیگرے کئی قبائل مسلح لڑائی پر اُتر آئے۔ سب سے پہلے غلجائی اور زرمت قبائل کے افراد نے انگریزوں کے خلاف کارروائیوں کا آغاز کیا مگر انگریزوں نے ان کی طاقت کو اپنی بھاری عددی نفری اور جدید توپ خانے سے پارہ پارہ کر دیا۔ غلجائیوں اور زرمتیوں کے مستحکم قلعے ویران کر دیے گئے۔ اسی سال کنڑ کے لوگوں نے سید ہاشم خان کی سرکردگی میں مزاحمت کا آغاز کیا۔ انگریزوں کی ایک بڑی فوج نے کنڑ پہنچ کر زبردست جنگ کے بعد انہیں شکست دے دی۔ کچھ ہی دنوں بعد جبار خیل قبیلے کے لوگ عبدالعزیز خان کی قیادت میں اُٹھ کھڑے ہوئے، انگریزوں نے انہیں بھی بری طرح کچل دیا اور ان کا قلعہ تباہ کر دیا۔

شاہ شجاع کا خفیہ خط پکڑا گیا: انہی ایام میں انگریزوں کے جاسوسوں نے شاہ شجاع کی جانب سے افغان عوام کے نام تحریر کردہ ایک خط برآمد کر لیا جس میں عوام کو انگریزوں کے خلاف اُبھارا گیا تھا۔ انگریزوں کو پہلے بھی اندازہ تھا کہ شاہ کے دل و دماغ میں کیا لاوا پک رہا ہے۔ وہ چپ چاپ اس کی حرکات کی نگرانی کر رہے تھے مگر اس خط کے برآمد ہو جانے کے بعد انہوں پختہ ثبوت مل گیا تھا۔ وہ چاہتے تو شاہ کا قصہ وہیں تمام کر سکتے تھے مگر انگریز ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے والے لوگ تھے۔ انہوں نے از راہِ مصلحت خاموشی اختیار کر لی تاہم اب انہوں نے شاہ کے رسمی آداب ترک کر دیے اور اس کی حیثیت بالکل ایک قیدی کی سی رہ گئی۔

منصور خان کی گرفتاری: 1840ء کے اوائل میں انگریزوں نے شاہ کے ایک وفادار منصور خان کو گرفتار کیا جو کہ شاہ کی جانب سے قندھار کے عوام کو انگریزوں کے خلاف اتحاد کی دعوت دینے جا رہا تھا۔ انگریزوں نے منصور خان کو شاہ کے پاس بھیج دیا اور اسے حکم دیا کہ اپنے اس وفادار کو گدھے پر سوار کر کے کابل کے گلی کوچوں میں گشت کرائے۔ شاہ اگرچہ اندر ہی اندر انگریزوں کے خلاف کھول رہا تھا اور نجی مجلس میں انہیں خوب برا بھلا کہہ لیتا تھا مگر ان کے احکام کے سامنے دم مارنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ وہ سر تسلیم خم کرتے ہوئے منصور خان کو اپنے آدمیوں کے ذریعے یہ سزا دلوانے کے لیے تیار ہو گیا۔ منصور خان کابل کا نہایت معزز آدمی تھا۔ جب شاہ نے اسے سزا دینے کا حکم دیا تو وہ دنگ رہ گیا...... اور پھر جب اسے گدھے پر سوار کر کے کابل کے گلی کوچوں میں رسوا کیا جا رہا تھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا: ''ہاں ہاں! یہی ہے شاہ سے وفاداری کا انجام......''

اس قسم کے واقعات نے شاہ کی رہی سہی ساکھ بھی ختم کر دی۔ انگریزوں کے خلاف جہاد کی تیاری کرنے والوں کو بھی اب شاہ سے کوئی اُمید نہ رہی۔ انہیں یقین ہو گیا کہ وہ ایک پٹا ہوا مہرہ ہے۔ اب وہ اس کے لیے ہرگز تیار نہ تھے کہ انقلاب میں کامیابی کے بعد بھی شاہ کا نامبارک سایہ ان کے سروں پر رہے۔

شاہ کی بے بسی: انگریزوں کو مزاحمت کاروں کے لیے شاہ کی خفیہ حمایت کا علم ہو چکا تھا۔ اس کے ردِ عمل میں انہوں نے شاہ کی جگہ دوست محمد خان کو واپس بلانے پر غور شروع کر دیا۔ اس دوران شاہ شجاع نے انگریزوں کے خلاف لڑائی میں شریک مختلف قبائل رہنماؤں کو اپنے سابقہ تعلقات کی بنا پر بچانے کی کوشش کی اور انگریز سفیر کو مشورہ دیا کہ افغان عوام کو مطمئن کرنے کی خاطر مزاحمت کار قبائل سے کچھ شرائط پر صلح کر لی جائے اور مزاحمت میں شریک سرداروں کے لیے عام معافی کا اعلان کر دیا جائے۔ شاہ کا یہ مشورہ انگریزوں کو مزید متنفر کرنے کا سبب بنا۔ اکتوبر 1841ء میں انگریز سفیر نے ہندوستان کے گورنر جنرل کو لکھ بھیجا کہ شاہ شجاع ہمیں دھوکا دے رہا ہے۔

مآخذ و مراجع

- ...... افغانستان در مسیر تاریخ۔ میر غلام محمد غبار
- ...... Encyclopedia of Islam.V.1
- ...... اردو دائرہ معارف اسلامیہ۔ ناشر: دانش گاہ، پنجاب یونی ورسٹی

سولہواں باب

انگریزوں کے خلاف جہاد

افغان عوام میں شاہ اور انگریزوں کے خلاف نفرت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ شاہ شجاع اور اس کے عمال کی بے حیثیتی سب پر واضح ہو چکی تھی۔ یہ تو انگریزوں کی سیاسی مجبوری تھی کہ انہوں نے مقامی سرداروں اور عمائد کو مختلف عہدوں پر متعین کر کے ایک بے اختیار سا نظام قائم کیا ہوا تھا تا کہ بظاہر ملک پر مقامی لوگوں ہی کی حکومت کا تاثر ملے ورنہ حقیقت میں عام عہدے دار تو کجا بادشاہ بھی بالکل بے بس تھا۔ انگریزوں نے مزید چالبازی یہ کی کہ تمام باصلاحیت، دیانت دار اور ملک وملت کے مفاد کو عزیز رکھنے والے لوگوں کو گوشہ گمنامی میں دھکیل دیا اور عہدوں پر چن چن کر ایسے لوگ متعین کیے جو مکمل طور پر ابن الوقت تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے سیاسی مخالفین کو انتظامیہ میں اس طرح شامل کر لیا کہ کسی مسئلے پر بھی قومی اتفاق رائے ناممکن ہو جائے۔ انگریزوں نے افغانستان کی باحمیت مجاہد بادشاہت کو دہلی کی زوال پذیر مغل بادشاہت جیسے مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔ ایک ہی وقت میں ہندوستان اور افغانستان میں ایک ہی کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ جو حیثیت وہاں مغل بادشاہ کی رہ گئی تھی کم وبیش وہی ابدالی خاندان کے اس آخری بے نور چراغ کی تھی۔

<u>خاکپائے کمپنی</u>: شاہ شجاع نے تاج پوشی کے بعد جو سکہ رائج کیا تھا اس پر مندرجہ ذیل شعر کندہ تھا:

"سکہ زد بر سیم وزر روشن تر از خورشید و ماہ نور چشم دُرِّ دران شہ شجاع الملک شاہ

(چاند اور سورج سے زیادہ روشن، درّانی خاندان کے نور چشم شاہ شجاع الملک نے سونے چاندی کا یہ سکہ ڈھالا ہے)"

اس پر ایک افغان شاعر نے طنز کرتے ہوئے کہا:

سکہ زد بر سیم و طلا شاہ شجاعِ ارمنی نورِ چشم لارڈ و برنس، خاکپائے کمپنی

(شاہ شجاع یورپی نے یہ سکہ ڈھالا ہے جو انگریز گورنر جنرل اور کیپٹن برنس کا فرزند اور ایسٹ انڈیا

کمپنی کے قدموں کی دھول ہے)

غلجائیوں کی مزاحمت: 1840ء کے دوران انگریزوں کو بار بار مجاہدین کے مختلف گروہوں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ سب مقامی طور پر میدان میں اُترے تھے اور ان کے درمیان رابطوں اور مشترکہ منصوبہ بندی کا فقدان تھا اس لیے انگریز ہر مزاحمت کو دبانے میں کامیاب رہے۔

موسمِ گرما میں مزاحمتی گروہوں کی چھاپہ مار کارروائیاں مزید بڑھ گئیں۔ قلات کے غلجائیوں نے انگریزوں کا وہ خزانہ جو قندھار سے کابل جا رہا تھا، لوٹ لیا۔ اس کے علاوہ قندھار میں متعین میجر کلیب بوزون کو مجاہدین نے قتل کر دیا تھا۔ ان خبروں سے انگریز سفیر کا پریشان ہونا لازمی تھا۔ وہ اس سے پہلے ہی کابل اور دوسرے بڑے شہروں میں بڑے پیمانے پر قبائلی رؤساء کی گرفتاریاں شروع کر چکا تھا، پکڑ دھکڑ کا بازار گرم تھا، نیز بڑے بڑے سیاسی رہنما اور سردار اپنے کنبوں سمیت اپنے علاقوں سے نکال کر دور دراز کے شہروں اور بستیوں میں منتقل کر دیے گئے تھے تاکہ وہ عوام پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ اس کے باوجود مجاہدین کی قوت کم نہیں ہو رہی تھی۔ مزاحمت کو کچلنے کے لیے انگریزی فوج کا سب سے ہوشیار آفیسر جنرل رابرٹ سیل مجاہدین کی سرکوبی کے لیے بھاری نفری لے کر غلجائیوں کے علاقے میں پہنچا۔ ماہ جولائی میں یہ علاقہ زبردست معرکوں کا مرکز بنا رہا، آخر غلجائیوں کے پے در پے حملوں نے رابرٹ سیل کو ناکام واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا۔

رہنما کا انتظار: اَفغانستان انگریزوں کے مظالم کی وجہ سے مسائل و مصائب کا دہکتا ہوا آتش کدہ بن چکا تھا۔ مہنگائی اتنی بڑھ چکی تھی کہ عوام جاں بلب تھے۔ ٹیکسوں نے ان کی کمر توڑ دی تھی۔ کسان، مزدور اور نچلا طبقہ دہائیاں دے رہا تھا۔ اونچے طبقے کے لوگوں کی پگڑیاں اُچھال دی گئی تھیں۔ اب سب کو کسی ایسے راہنما کا انتظار تھا جو انہیں ایک صف میں کھڑا کر کے انگریزوں سے بھرپور ٹکر لے سکے۔

دوست محمد خان کی واپسی: اَفغانستان کے حالات کا یہ اُتار چڑھاؤ جلاوطن سابق حکمران دوست محمد خان سے پوشیدہ نہ تھا۔ اس نے موقع غنیمت جانتے ہوئے اَفغانستان واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ 1840ء کے موسمِ گرما میں وہ شمالی اَفغانستان پہنچا۔ تخار کے حاکم میر مراد بیگ نے اس کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور انگریز سے مقابلے کے لیے پانچ ہزار گھڑ سوار فراہم کر دیے۔ دوست محمد خان اس فوج کو لے کر بلخ آ گیا۔ اَفغانستان کے مختلف سردار امیر دوست محمد خان کی واپسی کی خبر سن کر خوش ہوئے اور اس کی سابقہ کوتاہیاں بھول کر اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ درۂ خلم کے سردار میر ولی بیگ نے بھی پانچ ہزار سوار اس کی امداد کے لیے بھیج دیے۔

افضل خان کی شکست: انگریزوں کو دوست محمد خان کی ان تیاریوں کی اطلاع سے سخت تشویش ہوئی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اگر دوست محمد خان کی طاقت کو فوری طور پر نہ کچلا گیا تو افغانستان کے طول وعرض میں ان کے خلاف سلگتا ہوا آتش فشاں پھٹ پڑے گا۔ چنانچہ انگریزی فوج نے شمالی افغانستان کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ ادھر سے دوست محمد خان کی فوج کے ہراول دستے اس کے بیٹے افضل خان کی سرکردگی میں چلے آرہے تھے۔ دوست محمد خان کی فوج کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ اس کے پاس توپ خانہ نہیں تھا جبکہ انگریز توپ خانے سے لیس تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزی پلٹن نے افضل خان کو پسپا کر دیا۔ یہ واقعہ اگست 1840ء میں پیش آیا۔

دوست محمد خان اس شکست کی اطلاع سے سخت پریشان ہوا، تاہم اس نے ہمت کر کے اگلے ماہ بامیان میں انگریزوں سے ٹکر لی۔ اس بار بھی بازی انگریزوں کے ہاتھ میں رہی اور دوست محمد خان کو پسپا ہونا پڑا۔

مجاہدین کی کارروائیاں: ان تازہ کامیابیوں کے باوجود انگریزوں کو قدم قدم پر سر اُٹھاتے ہوئے نئے خطرات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ کابل کے شمال میں جگہ جگہ قبائلیوں نے پرانے قلعوں میں مورچہ زن ہو کر برطانوی راج کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا تھا۔ پروان، کاپیسا اور لغمان میں انگریز مخالف لہر تیزی سے اُٹھ رہی تھی۔ انگریز کمانڈر جنرل سیل اور جنرل الیگزینڈر برنس اس لہر کو روکنے کے لیے بڑی بڑی فوجیں لے کر ہر طرف حملے کرتے رہے تھے۔ قرہ باغ کے بڑے بڑے گاؤں اور قلعے، جہاں مزاحمت کا زور تھا، زبردست لڑائیوں کے بعد تہس نہس کر دیے گئے تھے مگر عوام کا جذبۂ جہاد ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ چاریکار کے ''قلعہ جنگی'' میں علی خان مجاہد انگریزوں سے آخر وقت تک لڑتا رہا حتیٰ کہ یہ پورا قلعہ ملبے کا ڈھیر بن گیا۔ علی خان کے حملوں سے بے شمار انگریز بھی مارے گئے۔ جب انگریزی توپ خانے نے قلعے کو تودۂ خاک بنا کر گرد وغبار کے بادل اُڑائے تو علی خان مجاہد اپنے اہل وعیال اور بقیہ ساتھیوں کو لے کر تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ ہلاک شدہ انگریز سپاہیوں کی لاشوں کو روندتا ہوا وہ دشمن کے گھیرے سے بڑی خاموشی کے ساتھ نکل گیا اور دوسرے محفوظ علاقوں کے مجاہدین سے جا ملا۔

میر مسجدی خان کی دلیری: افغانستان کے باشندے اس دور کے ایک اور مجاہد کو بھی یاد کرتے ہیں۔ یہ میر مسجدی خان تھا جو اپنے قلعے میں 50 مجاہدین کے ساتھ ڈٹ گیا تھا۔ ان مجاہدین کے پاس صرف قدیم اسلحہ تھا۔ یہ بہترین تیر انداز اور شمشیر زن تھے۔ جب انگریزوں نے اکتوبر 1840ء کے آغاز میں میر مسجدی خان کے قلعے کا محاصرہ کیا تو مجاہدین نے قلعے کی برجیوں سے انہیں اس طرح تاک تاک کر تیر مارے کہ ایک تیر بھی خطا نہ گیا۔ سینکڑوں انگریز وہیں ڈھیر ہو گئے۔ انہیں محاصرہ برقرار رکھنا مشکل

ہو گیا۔ تاہم اپنی جدید توپوں سے قلعے پر آتش و آہن کی بارش کر کے وہ محصورین کو ختم کر دینے کی کوشش کرتے رہے۔ توپوں کی پے در پے گولہ باری سے قلعے کی دیوار میں ایک شگاف پڑ گیا۔ اب انگریزوں نے صرف اس شگاف کا نشانہ بنا کر گولہ باری شروع کی۔ شگاف بڑا ہوتے ہوتے اتنا کھل گیا کہ ایک دو آدمیوں کے اندر گھسنے کی گنجائش پیدا ہو گئی۔ انگریز کمانڈر کے اشارے سے پلٹن کے گورے قلعہ سر کرنے کے لیے اس شگاف کی طرف متوجہ ہوئے مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ میر مسجدی خان کے ساتھی تھوڑی ہی دیر میں وہاں پہنچ کر بھاری پتھروں سے اس شگاف کو پُر کر رہے ہیں۔ میر مسجدی خان بھی تلوار سونت کر وہاں کھڑا تھا۔ انگریزوں نے اس رکاوٹ کو توڑ کر قلعے میں گھسنے کے لیے پوری جان لڑا دی مگر وہ شگاف کی حفاظت پر متعین مجاہدین کو اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکے۔ میر مسجدی خان خود شگاف پر حملہ کرنے والے انگریزوں سے دست بدست لڑ رہا تھا۔ شگاف کی اس تنگ جگہ میں انگریز سپاہی چاروں طرف سے حملہ نہیں کر سکتے تھے۔ پلٹن کے سپاہی ایک ایک دو دو کر کے آگے بڑھتے تھے مگر فوراً میر مسجدی خان کی تلوار چمکتی اور وہ خاک و خون میں غلطاں نظر آتے۔

جب مجاہدین کو یقین ہو گیا کہ اب تھوڑی ہی دیر میں انگریز قلعے میں داخل ہو جائیں گے، تو انہوں نے ایک زوردار حملہ کر کے انگریز پلٹن کو پیچھے دھکیلا اور خود میر مسجدی خان کو لے کر تیزی سے پہاڑوں میں غائب ہو گئے۔

میر مسجدی خان اس لڑائی کے بعد بھی انگریزوں سے برسرِ پیکار رہا۔ وہ سب سے پہلے امیر دوست محمد خان سے ملا جو پروان کے نواح میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کی آمد سے امیر دوست محمد خان کے ساتھیوں کو نیا حوصلہ ملا اور انگریزوں پر بھرپور حملے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ جہاد کی اس پوری داستان میں میر مسجدی خان اپنے مجاہدین کے ساتھ کئی اہم محاذوں پر دادِ شجاعت دیتا نظر آتا ہے۔ کابل اور گردونواح کے دیہاتوں میں آج بھی میر مسجدی خان کی بہادری کے قصے سنائے جاتے ہیں۔ اس کی معرکہ آرائیوں کے ترانے اور نظمیں، داستان گو بڑے جوش و جذبے سے پڑھتے ہیں۔

<u>2 نومبر کی جنگ</u>: 2 نومبر کا دن انگریزوں کے لیے بڑا بھاری ثابت ہوا۔ اس وقت انگریزوں کا ایجنٹ شہزادہ تیمور مجاہدین کی سرکوبی کے لیے شمال کی طرف بڑھ رہا تھا جبکہ جنرل سیل اس کی پشت پر تھا۔ چانکیہ سیاست کا ماہر ایک ہندو، موہن لال بھی تلبیسات کے جال لے کر قبائلی علاقوں میں انگریزوں کی طرف سے ''پیامِ امن'' کا ناٹک رچا رہا تھا۔ انگریز کو اُمید تھی کہ یہ دو رُخی پالیسی کامیاب رہے گی مگر اسی دن مجاہدینِ آزادی نے پروان میں دشمن کی فوج پر ایک شدید ترین حملہ کر کے اس کی گھڑسوار فوج کو تباہ

کر دیا۔ کئی بڑے بڑے انگریز افسران بری طرح زخمی ہو کر میدان سے بھاگے۔

جنرل سیل اس خبر سے ششدر رہ گیا۔ اس نے فوراً پسپائی اختیار کی اور پروان سے چاریکار آ کر دم لیا۔ انگریز جنرل میکناٹن نے اس شکست سے گھبرا کر دوست محمد خان کی طرف صلح کا پیغام بھیجا مگر اسی دوران ایک حیرت ناک واقعہ پیش آ گیا۔ امیر دوست محمد خان یک دم اس طرح غائب ہو گیا تھا جیسے اسے زمین کھا گئی ہو یا آسمان نے نگل لیا ہو۔

دوست محمد خان کی مایوسی: دوست محمد خان کے غائب ہونے سے سب ہی حیرت زدہ تھے۔ کوئی سمجھتا تھا کہ وہ انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار ہو چکا ہے اور کچھ لوگ اسے "شہید" قرار دے رہے تھے۔ حقیقت سب سے پوشیدہ تھی جو اس سے زیادہ بھیانک تھی۔ ہوا یہ تھا کہ جنگ میں فتح یابی کے ساتھ ہی دوست محمد خان کے دل میں ایک عجیب خوف سما گیا تھا۔ وہ انگریزوں کی جوابی کارروائی اور انتقام سے خوف زدہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ اپنے فاتح لشکر کو وہیں چھوڑ کر وہ صرف دو سواروں کے ساتھ اندھا دھند کابل کی طرف دوڑ پڑا۔ نہ معلوم اس پر اتنی مایوسی کیسے طاری ہو گئی تھی حالانکہ وہ مکمل فتح کے قریب تر تھا۔ کابل پہنچتے ہی اس نے قلعہ بالا حصار کا رُخ کیا۔ وہاں دروازے کے باہر جنرل میکناٹن گھوڑے پر تفریح کر رہا تھا۔ دوست محمد خان کے ایک ساتھی نے اسے اطلاع دی: "امیر دوست محمد خان تشریف لائے ہیں۔"

جنرل میکناٹن حیرت زدہ رہ گیا، وہ گھبرا کر بولا: "اکیلے یا فوج کے ساتھ؟" جواب ملا۔ "اکیلے آئے ہیں۔" جنرل نے کہا: "فوراً بھیج دو۔" ...... چند لمحوں بعد افغانستان کا یہ بدقسمت حکمران انگریز جنرل کو اپنی تلوار پیش کرتے ہوئے شکست کا اعتراف کر رہا تھا۔ جنرل میکناٹن پروان کے فاتح کی اس حماقت پر حیران تھا۔ اس نے اس کی جھکی ہوئی گردن کو مزید جھکانے کی خاطر کہا: "امیر صاحب! آپ کو ہندوستان جانا ہو گا۔"

"میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں تو یہ سوچ سمجھ کر کہ اب آپ جو کہیں گے مجھے قبول ہو گا۔" دوست محمد خان نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "تو آپ اپنے بیٹے افضل خان کو ہمارے خلاف جنگ سے روک دیں جواب بھی شمشیر سونتے ہوئے ہے۔ اسے لکھ دیں کہ ہمارے پاس چلا آئے۔"

جلاوطنی: دوست محمد خان نے ایک قاصد کو یہ تحریر لکھ دی اور تصدیق کے لیے علامت کے طور پر اپنا چشمہ اور چاقو بھی ساتھ روانہ کر دیے۔ افضل خان باپ کا پیغام پا کر ششدر رہ گیا۔ اگر اس کا باپ انگریزوں کی تحویل میں نہ ہوتا تو شاید وہ اتنی جلدی جنگ سے باز نہ آتا مگر اب حکم عدولی کا مطلب انگریز کے ہاتھوں باپ کی جان خطرے میں ڈالنا تھا۔ اس نے فوراً تمام خاندان کو ساتھ لیا اور باپ کے پاس چلا آیا۔ انگریزوں نے دوست محمد خان کے پورے خاندان کو جو کہ ایک سو انچاس (149) مرد و زن پر

مشتمل تھا، جمع کر کے 12 نومبر 1740ء کو جنرل نکسن کی نگرانی میں ہندوستان روانہ کر دیا۔ کچھ عرصہ انہیں کلکتہ میں رکھا گیا، پھر لدھیانہ بھیج دیا گیا۔ انگریزوں نے افغانستان کی حاصل شدہ آمدنی سے سالانہ تین لاکھ روپے اس خاندان کی کفالت پر خرچ کرنے کا وعدہ کیا۔

افغان عوام کی ہمت: افغان عوام جو دوست محمد خان کو اپنا جہادی راہنما بنا بیٹھے تھے، اس واقعے سے حیران و پریشان تھے۔ تاہم انہوں نے انگریزوں کے خلاف لڑائی ترک نہیں کی۔ پروان اور کاپیسا میں جاری کارروائیاں انگریزوں کی بھرپور کوششوں کے باوجود نہ روکی جا سکیں۔ 13 نومبر کو ایک شدید جھڑپ میں کئی انگریز افسران زخمی ہوئے۔ جنرل ہارٹن بری طرح گھائل ہوا اور میجر پاٹینجر فوج کے بچے کھچے حصے کے ساتھ کابل کی طرف بھاگا۔

قلعہ فضل آباد اور کٹہ خیل کے لوگ اس شکست خوردہ لشکر کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میر مراد بادشاہ نے ان سے ایسا زبردست حملہ کیا کہ ایک سو ایک انگریز سپاہی میدان میں ڈھیر ہو گئے۔ بچ جانے والوں میں سے چار سپاہیوں نے کلمہ طیبہ پڑھ کر اپنی جان بچائی۔ ان جنگوں میں افغانوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ عورتیں بھی میدان جنگ کا نظارہ دیکھنے نکل آتی تھیں۔ توپوں کی گولہ باری میں یقیناً انگریز غالب تھے مگر دست بدست مقابلے میں وہ افغانوں کے سامنے بھیڑ بکریاں ثابت ہوتے تھے۔

دسمبر کے سرد ترین ایام میں ہلمند کا علاقہ بھی انگریزوں کے خلاف بھڑکتا الاؤ بن گیا۔ محمد اختر خان علی زئی نامی ایک سردار وہاں انگریزوں کو ناکوں چنے چبوانے لگا۔

جہاد کا نعرہ اور مُلّا: انگریزوں کے خلاف جہاد کا نعرہ اب ہر جگہ لگ رہا تھا۔ افغان عوام کسی بڑے لیڈر سے محرومی کے باوجود مختلف علاقوں میں انگریزوں کے خلاف سربکف ہو چکے تھے۔ ان میں سب سے بڑا کردار ''مُلّا'' کا تھا جو، ہر مسجد کے منبر پر جہاد کی فرضیت کا اعلان کر رہا تھا۔ افغان جو ''مُلّا'' کے احترام میں ہمیشہ سب سے آگے رہے ہیں، اس صدا کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ علمائے کرام، افغانستان کے ہر شہر اور دیہات میں گھوم پھر کر لوگوں کو جہاد پر اُبھار رہے تھے۔ وہ ہر سردار کو اسلحہ اُٹھانے اور ہر نوجوان کو جان ہتھیلی پر رکھنے کے لیے تیار کر رہے تھے۔ انہوں نے یہ فتویٰ بھی دیا تھا کہ انگریزوں کو اناج، غلہ یا ضرورت کی کوئی شے فروخت نہ کی جائے۔

مجاہدین کا طرزِ جنگ: 1841ء کا سال انگریزوں کے لیے حد درجے بھیانک تھا۔ ہر دن کا سورج افغانوں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کو پہاڑوں کی وسعتوں میں جہادی کارروائیوں کے لیے مختلف زاویوں پر نقل و حرکت کرتے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت انگریزوں کی بہت بڑی طاقت افغانستان میں

موجود تھی۔ کابل میں 20 ہزار، جلال آباد میں 5 ہزار، غزنی میں دس ہزار اور قندھار میں 15 ہزار سپاہی ہروقت تیار رہتے تھے۔ ان کے سوار اور پیادہ دستوں کی الگ الگ رجمنٹیں تھیں۔ صحرائی اور کوہستانی جنگ کے ماہر سپاہیوں کے الگ الگ اسکواڈ تھے۔ کم از کم 70 توپیں انگریز لشکر کے ساتھ ہوتی تھیں۔ دوسری طرف اُفغانوں کے پاس کوئی پیشہ ور کمانڈر نہیں تھا۔ شاہ شجاع اور دوست محمد خان کی ضمیر فروشی کا مشاہدہ کرنے کے بعد وہ حکمران طبقے اور سرکاری افسران سے ویسے ہی مایوس ہو چکے تھے۔ ان کی قوت ان کی غیرت ایمانی اور وہ جنگجویانہ خُو تھی جو فطرت نے انہیں سکھائی تھی۔ وہ قدیم قبائلی انداز حرب اپنا کر انگریزوں کو چوٹیں لگا رہے تھے۔

ایک مؤرخ کے مطابق ہر اُفغان مجاہد کے پاس مختصر سا سامان ہوا کرتا تھا۔ سردی سے بچنے کے لیے جسم پر ایک پوستین ہوا کرتی تھی۔ بارود سے بھرا ہوا ایک ڈبا اس نے پیٹی میں باندھا ہوتا تھا، پرانی لمبی نال والی بندوقیں ان کا واحد دور مار ہتھیار تھیں۔ دست بدست جنگ کے لیے پیش قبض (چھوٹی تلوار) ان کا پسندیدہ اسلحہ تھی۔ کھانے پینے کے لیے ایک تھیلی جس میں بھنی ہوئی گندم ہوتی اور ایک پانی کی بوتل اس کی کمر پر لٹک رہی ہوتی تھی۔ گھوڑوں یا خچروں کا چارہ سواری کے ساتھ ہی تھیلے میں بندھا ہوا ہوتا تھا۔ یہ لوگ کئی دن پہاڑوں میں سفر کرتے تھے اور انگریزوں کی چوکیوں اور ان کے قافلوں پر یکدم طوفانی حملے کر کے غائب ہو جاتے۔

ایک انگریز تاریخ نگار، لیڈی سیل جس نے اُفغانوں اور انگریزوں کی ان لڑائیوں کا خود مشاہدہ کیا تھا، لکھتی ہے: ''اُفغان جنگجو ٹیلوں سے انگریزوں کی صفوں پر یوں کودتے تھے جیسے بھیڑیا بکریوں کے ریوڑ پر لپکتا ہے۔''

اُفغان مجاہدین کا سب سے بڑا کمال ان کی زبردست نشانہ بازی تھی۔ وہ چار پانچ سو گز کے فاصلے سے انگریز سپاہیوں کا ایسا نشانہ لیتے کہ کوئی گولی خطا نہیں جاتی تھی۔ ان کی پرانی بندوقیں انگریزوں کے بہترین اسلحے پر حاوی تھیں۔ ان کے بعض گروہوں کے پاس چھوٹی توپیں بھی تھیں۔ وہ انگریزوں سے لوٹی گئی بڑی توپوں کو کھول کر ایسی چھوٹی توپیں خود بنایا کرتے تھے جنہیں آسانی سے پہاڑوں پر منتقل کیا جاسکتا تھا۔ جنرل ایری نے اپنی یادداشتوں میں اُفغان مجاہدین کی نشانہ بازی کے کمال کا یوں اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''انگریز فوج کو آتشیں اسلحہ کے استعمال میں اُفغانوں سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ اُفغان سوچ سمجھ کر نشانہ لگاتے ہیں اور شاذ و نادر ہی ہوائی فائرنگ کرتے ہیں جبکہ ہمارے سپاہی کسی نشانے کے بغیر اندھا دھند فائرنگ کے عادی ہیں۔''

افغان عورتوں کا جذبہ: افغان مجاہدین کے ساتھ عورتیں بھی اس جہاد میں شریک تھیں۔ مجاہدین کے لیے خوراک کا سارا انتظام ان کے ہاتھ میں تھا۔ وہ چھاپہ مار ٹولیوں کے لیے روٹیاں پکا کر بھیجا کرتی تھیں۔ جب برطانوی سپاہی کسی گنجان آبادی میں آگھستے تو یہ بہادر عورتیں گھروں کی چھتوں پر مورچے بنا کران پر سنگ باری کرتیں اور کھولتا ہوا پانی ان پر انڈیلتیں۔ برطانوی فوج کے مظالم، تشدد اور جبر کے سلسلے ان بلند ہمت عورتوں کا حوصلہ پست نہ کر سکے۔

افغان مجاہدین اس جہاد کے دوارن گوریلا جنگ میں اپنی صدیوں پرانی مہارت کا بھرپور استعمال کر رہے تھے۔ وہ کھلے میدانوں میں مورچہ زن برطانوی افواج پر چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کے ذریعے حملے کر کے انہیں اشتعال دلاتے۔ برطانوی فوجیں ان کے تعاقب میں نکلتیں، مجاہدین وقفے وقفے سے حملے کرتے ہوئے پیچھے ہٹتے رہتے۔ یہ ایک دو دن کی جھڑپیں نہیں ہوتی تھیں بلکہ ان کا سلسلہ ہفتوں پہنچتا۔ دشمنوں کو اندازہ نہیں ہو پاتا تھا کہ وہ کس طرف جا رہے ہیں۔ وہ مجاہدین کو گھیرنے کے لیے آگے بڑھتے رہتے مگر آگے چل کر انہیں اپنے چاروں طرف ناقابلِ عبور پہاڑوں کا حصار دکھائی دیتا۔ ایسے مقامات پر مجاہدین اپنی پوری طاقت سامنے لاتے۔ سینکڑوں افراد برطانوی سپاہیوں کو گھیر لیتے۔ وہ بلندی سے دشمن کو آسانی سے نشانہ بناتے تھے جبکہ برطانوی سپاہیوں کے پاس ادھر اُدھر چھپنے کی کوشش کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔ موسمِ سرما میں مجاہدین کی کارروائیاں رُک گئیں مگر وہ برف پگھلنے کے منتظر رہے۔ اس دوران وہ اپنی صفوں کو مضبوط کرتے رہے۔

تلواروں سے توپوں کا مقابلہ: موسمِ گرما کے آغاز کے ساتھ افغانستان انگریزوں کے لیے ایک آتش فشاں بن گیا۔ اپریل 1841ء میں قلات کے غلجائیوں نے گل محمد خان کی قیادت میں انگریزوں کے سیاسی نمائندے مسٹر لیچ کو قندھار سے گرفتار کر لیا۔ جنرل ناٹ نے گھڑ سوار فوج کو توپ خانے کے ساتھ ان کے خلاف کارروائی کے لیے روانہ کیا۔ غلجائی تلواریں لہراتے ہوئے توپ خانے پر ٹوٹ پڑے اگرچہ انہیں خاصا جانی نقصان اُٹھانا مگر انگریزوں پر ان کی بہادری کی دھاک بیٹھ گئی۔ ہلمند کے قریب علماء کی کرپرتی میں مجاہدین کا ایک نیا اتحاد قائم ہو چکا تھا جس کا پرچم ''حسبی اللہ'' کے الفاظ سے جگمگا رہا تھا...... اس لشکر نے محمد اکرم خان کی سرکردگی میں دریائے ہلمند کے قریب انگریزی فوج سے ٹکر لی تاہم اسے کامیابی نہ ہوئی اور محمد اکرم خان گرفتار ہو گیا۔ انگریزوں نے اسے توپ کے منہ سے باندھ کر اُڑا دیا۔

ایک دلیر خاتون: اکرم خان کی شہادت کے بعد بھی اس کے قبیلے کے لوگ انگریزوں سے برسرِ پیکار رہے۔ اکرم خان کی بیوی نہایت دلیر تھی۔ وہ برقع پہن کر اپنے مجاہد شوہر کے گھوڑے پر سوار ہوئی اور

مجاہدین کے ساتھ مہمات پر جانے لگی۔ لشکر کا جھنڈا اس کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ وہ انگریزوں کے خلاف متعدد کارروائیوں میں اسی طرح شریک رہی اور اپنے قبیلے کی غیرت کو برانگیختہ کرتی رہی۔

مجاہدین میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش: قندھار جنوبی افغانستان کی ان جنگوں میں مرکزی کردار ادا کر رہا تھا۔ چنانچہ انگریزوں کے زیرک سیاسی آفیسر راولنسن نے قندھاری سرداروں میں اختلاف پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ انگریزوں کے نزدیک مجاہدین کو زیر کرنے کا آخری حربہ یہی تھا اور ان کی باہم لڑائی ہی انگریز کی فتح کی ضامن تھی۔ راولنسن نے چند پوپلزئی سرداروں کو ایک لاکھ روپیہ پیش کیا تاکہ وہ پوپلزئی اور بارک زئی سرداروں کو آپس میں لڑا دیں مگر یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ دونوں قبیلے پہلے سے زیادہ متحد ہو کر انگریزوں کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

غزنی کا معرکہ: جولائی 1841ء کے مہینے میں غزنی کے نواح کے لوگ بھی یکبارگی نعرۂ جہاد بلند کر کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کابل سے قندھار تک انگریزوں کی آمد و رفت، مواصلات اور کمک و رسد بالکل بند ہو گئی۔ غزنی شہر اگرچہ انگریزوں کے قبضہ میں تھا اور وہاں چھاؤنی میں ان کے ہزاروں سپاہی موجود تھے مگر انہیں باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

مجاہدین کی قوت اتنی بڑھ گئی کہ انہوں نے جولائی 1841ء میں تاج محمد خان اور ملک محمد خان کی قیادت میں باقاعدہ یلغار کر کے غزنی کو محاصرے میں لے لیا جس سے قندھار اور کابل کے درمیان راستہ مسدود ہو گیا۔ محاصرے میں مجاہدین کا کمزور پہلو یہ تھا کہ وہ بھاری توپوں اور وافر مقدار میں بارود سے محروم تھے۔ انہوں نے کابل میں نائب امین اللہ لوگری کو پیغام بھیجا کہ غزنی کے محاذ پر بڑی توپیں مع گولہ بارود فراہم کی جائیں مگر مجاہدین کی اعلیٰ قیادت کابل کی کارروائیوں میں مصروفیت کی وجہ سے اس تقاضے کو بروقت پورا نہ کر سکی۔ پانچ ماہ تک یہ محاصرہ جاری رہا حتیٰ کہ موسم سرما آ گیا۔

گردیز کی جنگ: حیرت کی بات یہ تھی کہ اس سال موسمِ سرما کی آمد کے باوجود مجاہدین کی کارروائیاں کم نہیں ہو رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ برف باری شروع ہونے سے پہلے پہلے انگریزوں کو افغانستان سے نکال دینے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔ اسی دوران خبر مشہور ہوئی کہ گردیز کے قلعے پر بھی مجاہدین قابض ہو گئے ہیں۔ جنرل میکناٹن نے قلعہ واپس لینے کے لیے تین چنیدہ افسران کی قیادت میں کابل سے امدادی فوج روانہ کی۔ اکتوبر کے وسط تک برطانوی فوج محاصرہ کر کے گردیز کے قلعے کو سر کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر مجاہدین نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ آخر 17 اکتوبر کو انگریز فوج ناکام ہو کر کابل واپس لوٹ آئی۔

کابل کی صورتِ حال: کابل کے حالات بھی سخت کشیدہ تھے۔ مشہور مجاہد میر مسجدی خان ایک بار

پھر میدان میں آ چکا تھا۔ اس نے کابل جلال آباد شاہراہ مسدود کر دی تھی۔ 19 اکتوبر کو اس کے خلاف فوج کشی شروع ہو گئی۔ لیفٹیننٹ ڈینی ایک فوج لے کر درۂ خورد روانہ ہوا جہاں میر مسجدی خان کا مورچہ تھا۔ اس کے پیچھے جنرل سیل خود باقی لشکر اور توپ خانہ لے کر نکلا۔ مجاہدین نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ جنرل سیل سمیت بڑے بڑے انگریز افسران شدید زخمی ہوئے جبکہ درجنوں سپاہی مارے گئے۔ اسی ہفتے چار سو مجاہدین نے کابل چھاؤنی پر شب خون مارا اور انگریزوں کو بھاری نقصان پہنچایا۔ انگریز اس صورت حال کے تسلسل سے اتنے گھبرا گئے کہ مجاہدین سے مذاکرات پر آمادہ ہو گئے۔ ان کا نمایندہ مجاہدین کے پاس آیا اور صلح کی شرائط پیش کیں۔ مجاہدین کسی صلح کے لیے آمادہ نہ تھے مگر انگریزوں کو ابہام میں رکھنے کے لیے انہوں نے صاف جواب نہ دیا اور فیصلے کو اگلی نشستوں پر چھوڑ دیا۔ اس دوران مجاہدین کے حملے جاری رہے۔ کابل میں انگریزوں کے وفاداروں کے لیے ٹھہرنا دوبھر ہو گیا۔ شاہ شجاع اور انگریزوں کے ملازمین درجنوں کی تعداد میں شہر چھوڑ کر بھاگنے لگے۔

متحدہ کونسل کا قیام: مجاہدین کے مختلف گروہوں نے شدت سے اس بات کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا کہ ان کے درمیان رابطے ایک باقاعدہ نظم کی شکل میں ڈھلنے چاہئیں۔ ایک ایسا اتحاد وجود میں آ جانا چاہیے کہ جس کی کمان چند سرکردہ افراد کے ہاتھ میں ہو اور ملک بھر میں ہونے والی تمام مجاہدانہ کارروائیاں اس ہائی کمان کے فیصلے کے مطابق ہوں۔ چونکہ کوئی ایک ایسا بڑا راہنما موجود نہ تھا جس پر سب کا اتفاق ہو سکتا اس لیے جنگی کونسل تشکیل دینے کا فیصلہ ہوا۔ رمضان کے مہینے میں کابل اور گردونواح میں سرگرم مجاہدین کے راہنماؤں نے خفیہ ملاقاتوں کا سلسلہ تیز کر دیا۔ شمسی تقویم کے لحاظ سے نومبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا اور عوام سردی کے رمضان میں بڑے آرام سے روزے رکھ رہے تھے۔ جہادی کارروائیاں بھی ساتھ ساتھ جاری تھیں۔ ایسے میں یکم نومبر 1841ء کو کابل کے کوچہ باغ نواب کے ایک کشادہ مکان میں ملک بھر کے مجاہدین کے نمایندے جمع ہوئے۔ یہ رمضان کی سولھویں شب تھی۔ انگریزوں کو کانوں کان خبر نہ تھی کہ کابل کے دروازوں، سڑکوں اور ناکوں پر کڑی نگرانی کے باوجود اتنے اہم مجاہد راہنما کابل کے بیچوں بیچ مصروف مشاورت ہیں۔

کونسل میں شامل مجاہد لیڈروں کی فہرست بہت طویل ہے، ان میں کابل کے میر مسجدی خان کوہستانی، نواب محمد زمان خان، شہزادہ اکبر خان، سردار عثمان خان، ملا مومن غلجائی، سکندر خان، ملا احمد، خان شیرین جواں شیر، میر جنید کابلی، محمد ہاشم کاہ فروش، درویش خان، عبدالسلام خان پوپلزئی، میر حاجی معصوم بن میر واعظ روحانی اور شمس الدین خان کے نام زیادہ مشہور ہیں۔ ملک کے دیگر علاقوں سے مرزا احمد

قندھاری، عطامحمد خان قندھاری، گل محمد غلجائی، تاج محمد غزنوی، سید ہاشم کنڑی اور سعادت خان لعل پوری جیسے عمائدکونسل میں شامل کیے گئے۔ چونکہ بار بار اتنے دوردراز کے علاقوں سے مجاہد رہنماؤں کا جمع ہونا مشکل تھا اس لیے ان افراد میں سے بارہ سرکردہ افراد پر ایک ہائی کمان تشکیل دی گئی جس کی سربراہی سابق امیر دوست محمد خان کے بھتیجے سردار عطامحمد خان کو سونپی گئی اور اسے ''نواب'' کالقب دیا گیا۔ امین اللہ لوگری کو نائب کالقب دے کر سردار عطامحمد خان کا ''نائب'' قرار دے دیا گیا۔

جنگی ترتیبات کے فیصلے: اس مشاورت میں یہ طے ہوا کہ ''نائب'' کی کمان میں دس ہزار مجاہدین ہوں گے۔ باقی تمام علاقوں کے مجاہد رہنما اپنے اپنے گروہوں کے ساتھ جماعتی ترتیب اور فیصلوں کے مطابق کام کریں گے۔ بارود اور ہتھیاروں کے حصول، نئے اسلحے کی تیاری، مجاہدین کو خوراک ورسد کی فراہمی اور خبر رسانی کے لیے الگ الگ شعبے قائم کیے گئے اور ان کے لیے ذمہ دار افراد کا تقرر کیا گیا۔ دشمنوں میں شامل ہو کر جاسوسی کرنے کا الگ محکمہ قائم ہوا۔ علمائے دین کو ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ ہر مسجد میں جہاد کی فرضیت کا اعلان کریں اور اس سلسلے میں وعظ وتبلیغ کا سلسلہ تیز تر کردیں۔ پنج شیر سے تعلق رکھنے والے افراد کو قلعوں کی لڑائیوں میں خاص طور پر شامل رکھنے کا فیصلہ کیا گیا جو قلعے کی دیواروں میں نقب زنی کا مشکل ترین کام انجام دے سکتے تھے اور بلند وبالا فصیلیں پھلانگنے میں بھی کمال رکھتے تھے۔

انگریزوں کے خطوط راستے میں پکڑنے اور ان کا ترجمہ کرنے کے لیے ایسے افراد کو الگ کرلیا گیا جو انگریزی زبان جانتے تھے۔ مجاہدین کے ہر راہنما کو تاکید کی گئی کہ وہ پیادہ اور سوار مجاہدوں کی الگ الگ ترتیبات قائم کرے۔ طے کیا گیا کہ دشمن کی چوکیوں اور چھاؤنیوں پر اسی مبارک مہینے میں پے در پے حملوں کا ایک ساتھ آغاز کیا جائے گا، ان کی کمک اور رسد کے تمام راستے مسدود کردیے جائیں گے اور ان کی ہر جمعیت کو اپنے اپنے مقام پر گھیر لیا جائے گا۔ مجلس کے آخر میں فیصلہ ہوا کہ اس سلسلے کا پہلا بڑا حملہ کابل میں ہی کیا جائے گا اور یہاں قلعے اور سرکاری علاقوں میں رہائش پذیر انگریزوں کو نشانہ بنایا جائیگا۔

کابل میں انقلاب: 17 رمضان المبارک 1257ھ (2 نومبر 1841ء) کی صبح افغانستان میں ایک نیا سورج طلوع ہوا۔ جہاد کے وہ شعلے جن سے ہر کفریہ طاقت ڈرتی آئی ہے، انگریزوں کے مضبوط ترین مرکز کابل کو جلا کر بھسم کرنے والے تھے۔ اس دن کابل کی ہر مسجد کے منبر سے الجہاد الجہاد کی صدا بلند ہورہی تھی۔ کابل کے تمام بازار بند تھے اور گلیاں سنسان تھیں۔ صرف پیادہ اور گھڑسوار مجاہدین کی نقل وحرکت کا شور تھا جو آہستہ آہستہ بلند ہورہا تھا۔ ان کے پاس چھ ہلکی توپیں بھی تھیں۔ دوڑتے قدموں کی چاپ اب اس گلی کی طرف بڑھ رہی تھی جو انگریز آفیسر جنرل الیگزنڈر برنس کے محل کی طرف

جاتی تھی۔محل کی فصیل پر انگریز محافظوں نے مجاہدین کو آگے بڑھتا دیکھ کر رکنے کو کہا اور گولیوں کی بارش شروع کردی مگر مجاہدین لپکتے چلے گئے۔سب سے پہلے ہاشم خان کاہ فروش نہایت بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے گولیوں کی بوچھاڑ میں محل کے اندر گھس گیا۔اس کے پیچھے خضر خان اور دیگر مجاہدین بھی اندر لپکے، نائب امین اللہ خان لوگری جو ہائی کمان کے ذمہ دار ترین فرد تھے، خود اس حملہ آور جماعت کی پہلی صف میں تھے۔چند لمحوں کے اندر اندر یہ مجاہدین الیگزینڈر برنس کے سر پر کھڑے تھے اور وہ خوف کے مارے اپنی آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔کچھ دیر بعد کابل کے شہری جنرل برنس کا کٹا ہوا سر شہر کی ایک سڑک پر لٹکا ہوا دیکھ رہے تھے۔برنس کا بھائی چارلس بھی اس حملے میں مارا گیا۔ایک انگریز افسر براڈ فوٹ زخمی ہوا۔انگریزوں کا بدترین آلہ کار موہن لال بھاگتے ہوئے پکڑا گیا۔جب اسے قتل کیا جانے لگا تو اس نے لرزتی زبان سے کلمہ پڑھ لیا۔مجاہدین اس چالباز انسان پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہ تھے مگر شرعی حکم بہرحال ہر مصلحت پر مقدم تھا۔انہوں نے اسے خان شیرین خان کے حوالے کردیا۔

ایک انگریز افسر کا قبولِ اسلام: اس دن مجاہدین کے دیگر گروہوں نے کابل میں انگریزوں کے مزید کئی بنگلے خاکستر کردیے...... انگریزوں کا سب سے بڑا کمانڈر جنرل میکناٹن اس ہنگامے سے ایسا بدحواس ہوا کہ اپنا مستقر بالا حصار چھوڑ چھاڑ کر فرار ہوگیا اور ''قلعہ بی بی ماہرو'' میں پناہ لی۔انگریز آفیسر جنرل کمپبل جس کی ہوشیاری اور معرکہ دانی برطانیہ میں مشہور ہو چکی تھی، اپنی بٹالین کے ساتھ کابل سے نکلنے لگا تو عورتوں نے گھروں سے سنگ باری کی اور کھولتے ہوئے پانی کی ہانڈیاں اُنڈیلیں۔مجاہدین بھی آپہنچے اور سات سو انگریز وہیں گاجر مولی کی طرح کٹ گئے۔جنرل کمپبل خود کو گھیرے میں دیکھ کر بلند آواز سے کلمہ طیبہ کا ورد کرنے لگا۔یہ دیکھ کر مجاہدین نے اس کی جان بخش دی۔

شاہ شجاع کی بے بسی: پہلے دن شاہ شجاع کو کابل میں اس انقلاب کی صحیح صورت حال کا بالکل اندازہ نہ تھا۔وہ اپنے محل میں گوشہ نشین تھا۔شور شرابا سنا اور کابل کے شہریوں کے انگریزوں پر حملے سے آگاہ ہوا تو اپنے بیٹے شہزادہ تیمور کو فوراً باہر بھیجا تا کہ وہ جا کر لوگوں کو روکے اور یہ ہنگامہ آرائی بند کرائے۔شہزادہ تیمور باہر نکلا تو دیکھا ہنگامہ کوئی معمولی نہیں ہے۔انگریزوں کا ہر طرف تعاقب ہو رہا ہے اور وہ چوہوں کی طرح چھپتے پھر رہے ہیں۔یہ دیکھ کر تیمور کو خیر اسی میں نظر آئی کہ مجاہدین کو روکنے کی بجائے شاباش دے کر ان کا حوصلہ بڑھائے چنانچہ وہ مجاہدین کو انگریزوں کا نام و نشان تک مٹا دینے کا کہہ کر واپس آگیا۔ اگر وہ ایسا نہ کہتا تو مجاہدین اسی پر پل پڑتے۔3 نومبر کو مجاہدین نے کابل کے قلعہ چہار باغ اور قلعہ نشان خان سمیت کئی اہم عسکری مقامات پر قبضہ کر کے ان پر سبز پرچم لہرا دیے۔اگلے دن آدھی رات کو قلعہ

محمود خان بھی مسخر کرلیا گیا۔ انگریز اپنے اہل وعیال سمیت فرار ہوگئے اور مجاہدین نے اسلحے اور غلّے کے بڑے بڑے گوداموں پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح کابل پر مجاہدین کی گرفت مضبوط ہوگئی۔

شاہ شجاع کی حیثیت اب ختم ہوچکی تھی۔ اس انقلاب میں اس کا کوئی کردار نہیں تھا۔ بلکہ سب جانتے تھے کہ وہ انگریزوں کا مہرہ ہے۔ کابل کے عمائد نے اس پر یہ مہربانی کی کہ اسے کوئی گزند نہیں پہنچائی۔ مگر مجاہدین کو شہر پر تسلط پاتے دیکھ کر شاہ شجاع کے تمام نوکر چاکر اور ملازم از خود شجاع کی ملازمت چھوڑ چھاڑ کر انقلابی ریلے میں شامل ہوگئے۔

مجاہدین میں پھوٹ ڈالنے کی ایک اور کوشش: انگریزوں نے کابل میں مجاہدین کو غالب دیکھ کر ان میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش شروع کردی۔ انگریزوں کا نمک خوار موہن لال جو کہ جھوٹ موٹ اِسلام قبول کر کے خان شیرین خان کے پاس یرغمال تھا اس مقصد کے لیے متحرک ہوگیا۔ انگریز افسر جان کنولی نے موہن لال کو خفیہ پیغام بھجوایا کہ وہ خان شیرین خان کو ورغلانے کی کوشش کرے اور اسے انگریزوں کی جانب سے ایک لاکھ (آج کل کے کئی کروڑ) روپے کی پیش کش کرے۔ اس کے ذمے صرف یہ کام ہوگا کہ مجاہدین رہنماؤں کو آپس میں لڑادے۔ موہن لال نے خان شیرین خان کو یہ پیغام دے کر پھسلانے کی بھرپور کوشش کی مگر خان شیرین خان نے کسی بھی سازش کے لیے اپنا ایمان بیچنے سے صاف انکار کردیا۔ انگریزوں نے اس کے بعد دیگر کئی مجاہد رہنماؤں کو الگ الگ اس قسم کی پُرکشش پیش کشیں کیں مگر مجاہدین متحد رہے۔ ان میں کوئی دراڑ نہ پڑسکی۔ غلجائی سرداروں نے تو انہیں پُرفریب باتوں کے جواب میں صاف کہہ دیا: ”ہم نے عہد و پیمان کر چکے ہیں کہ تمہیں اَفغانستان سے نکال کر دم لیں گے۔“

مجاہد رہنماؤں کا خفیہ قتل: انگریزوں کی آخری کوشش یہ تھی کہ مجاہدین کم از کم ایک بار ان کے ساتھ مذاکرات کی میز آ بیٹھیں مگر مجاہدین رہنما اس کے لیے بھی تیار نہ ہوئے۔ انگریزوں کی حالت پتلی ہوچکی تھی، ان کے کئی افسران بالا حصار میں پناہ گزین تھے۔ انگریز قیادت بی ماهرو کے مستحکم قلعے میں محصور تھی۔ گورے افسران قندھار اور غزنی کے امدادی دستوں سے مایوس ہونے کے بعد اب ہندوستان سے تازہ دم لشکر کی آمد کی اُمید پر زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی کوشش کررہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نئے مہرے بھی تلاش کررہے تھے۔ آخر انہوں نے ایک اور چال چلی۔

مجاہدین کی اعلیٰ قیادت میں سے کسی کو خریدنے میں ناکامی کے بعد انہوں نے نچلے درجے کے سرداروں سے رابطے کرنا شروع کیے۔ ان میں سے انہیں کچھ آدمی ایسے مل گئے جو پیسے کے لیے ضمیر کا سودا کرنے کے لیے تیار تھے۔ انگریزوں نے بھاری رقم دے کر ان کے ذمے یہ کام لگایا کہ مجاہدین کی سپریم کمانڈ کے

بڑے بڑے افراد کو یکے بعد دیگرے نہایت خفیہ طریقے سے ٹھکانے لگاتے جائیں۔ ان غداروں میں سے ایک کا نام محمد اللہ تھا۔ اس نے انگریزوں کی چاکری کرتے ہوئے نامور مجاہد رہنما میر مسجدی خان کو قتل کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔ میر صاحب ان دنوں سخت بیمار تھے اور بستر پر پڑے ہوئے تھے۔ محمد اللہ نے انہیں چپکے سے زہر دے کر شہید کر دیا۔ یوں مجاہدین ایک بڑے رہنما سے محروم ہو گئے۔ ایک اور غدار سردار عبدالعزیز نے عبداللہ خان اچکزئی جیسے دلیر مجاہد سردار کو عین اس وقت پشت سے گولی مار کر شہید کر دیا جب وہ انگریزوں سے لڑنے بی ماہرو کے قلعے تک پہنچ چکا تھا۔ اس طرح پایندہ خان کاکڑ نے بھی انگریزوں کی ایسی ہی ناپاک خدمت انجام دی اور ایک بڑے مجاہد لیڈر کو جلال آباد میں گولی کا نشانہ بنا دیا۔

نئے رہنما: ممکن تھا کہ انگریزوں کی یہ نئی چال کامیاب ہو جاتی اور افغانوں کی قیادت کرنے والے تمام بڑے بڑے مجاہد رہنما اِن غداروں کے ہاتھوں آہستہ آہستہ ختم ہو جاتے مگر انہی دنوں مجاہدین کو چند اور رہنما میسر آ گئے۔

یہ جلاوطن امیر، دوست محمد خان کے بیٹے تھے جو ایک مدت سے بخارا میں امیر نصر اللہ کی قید میں تھے۔ چند معزز صوفیائے کرام نے ان کی سفارش کر کے انہیں رہائی دلوائی تھی۔ یہ آزاد ہوتے ہی افغانستان میں جاری انقلابی تحریک میں شامل ہونے ادھر روانہ ہو گئے اور بلخ، بامیان اور غور سے مختلف سرداروں کے مسلح جتھے اپنے ساتھ شامل کرتے ہوئے نومبر کے آخری ایام میں کابل پہنچ گئے۔ انہی دنوں نامور سردار محمد شاہ غلجائی بھی ایک بڑی جماعت کے ساتھ کابل آن پہنچا۔ اس طرح مجاہدین کی قیادت کا خلا پُر ہو گیا۔

انگریزوں کی بے بسی: انگریزوں کی ہائی کمان جنرل میکناٹن کے ہاتھ میں تھی جو بی ماہرو کے فلک بوس قلعے میں پناہ گزین تھا۔ اس کے پاس اب ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا۔ خصوصاً اس لیے کہ تازہ اطلاعات کے مطابق مجاہدین ہزاروں کی تعداد میں طوفانی دھاوا بول کر بی ماہرو اور بالا حصار کے قلعوں کو سر کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ انگریز افسران خود قلعوں کے گرد پہاڑوں پر مجاہدین کی غیر معمولی نقل و حرکت کا مشاہدہ کر چکے تھے۔ اِدھر مجاہدین کی قیادت میں اب امیر دوست محمد خان کے بیٹے اور رشتہ دار خاصی تعداد میں شامل ہو چکے تھے اور وہ مجاہدین کی قوت کا غالب حصہ بن چکے تھے اس لیے خاصے غور و فکر کے بعد یہ طے پا گیا تھا کہ انگریزوں کے انخلاء کے بعد متبادل قیادت کے لیے امیر دوست محمد خان کو جو کہ ہندوستان میں انگریزوں کے پاس یرغمال ہے، واپس بلا لیا جائے گا اور اگر مجاہدین متفق ہو گئے تو اس کو امیر تسلیم کر لیا جائے گا۔ مجاہدین قلعوں پر آخری حملہ کرنے کے لیے سامانِ حرب درست کر رہے تھے کہ انگریزوں کی جانب سے ہتھیار ڈالنے کی بات چیت شروع ہو گئی۔

صلح نامہ: انگریز جنرل مکناٹن اب صرف جان بخشی کے عوض افغانستان چھوڑنے پر تیار تھا۔ اس کے نمایندے نے مجاہد رہنماؤں سے کہا کہ انگریز فوج ہتھیار ڈال کر افغانستان سے نکل جائے گی اور آیندہ جب تک افغانستان کے حکمرانوں نے نہ بلایا، دوبارہ نہیں آئے گی۔ شاہ شجاع اگر انگریزوں کے ساتھ رہنے میں خود کو محفوظ سمجھتا ہے تو اسے لدھیانہ میں رہائش دی جائے گی تاہم افغان حکومت اسے سالانہ ایک لاکھ روپے کا خرچہ دینے کی ذمہ داری اُٹھائے۔ اس کے بدلے امیر دوست محمد خان کو واپس کابل بھیج دیا جائے گا۔

مجاہد رہنماؤں نے انگریزوں کے نمایندے سے ان نکات پر اتفاق کیا مگر ساتھ ہی یہ اضافہ بھی کیا کہ انگریز اپنا اسلحہ اور چھ بڑے افسران بطور یرغمال یہیں چھوڑ کر جائیں گے۔ شاہ شجاع بھی اس وقت تک یہیں رہے گا جب تک امیر دوست محمد خان اپنے تمام نظر بند خاندان سمیت واپس نہیں آجاتا۔ انگریزوں کا سارا ساز و سامان یہیں رہنے دیا جائے گا، صرف سفری ضروریات کے لیے بقدر سامان اور خوراک وغلہ ساتھ لے جاسکتے ہیں۔

جنرل میکناٹن کو اطلاعات مل چکی تھیں کہ دیگر علاقوں سے مجاہدین بڑی تعداد میں عن قریب کابل پہنچا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ 11 دسمبر کو ایک وادی میں مجاہدین کے نمائندوں سے ملا اور مجبوراً ان تمام شرائط کو قبول کرلیا۔ دو دن بعد قلعہ ریکا اور قلعہ ذوالفقار اسلحے اور اناج کے بھاری ذخائر سمیت مجاہدین کے حوالے کردیے گئے۔ چھ انگریز افسران، جنرل ٹریور، جنرل ڈرامونڈ، جنرل سکنر، جنرل پاٹینجر، جنرل ایری اور جنرل وار برٹن معاہدے کے مطابق یرغمال بن کر مجاہدین کے پاس آگئے۔

اس دوران ایک عجیب بات ہوئی۔ شاہ شجاع نے اس معاہدے کا علم ہونے پر، انگریزوں کی پناہ میں ہندوستان جانے سے انکار کردیا اور مجاہدین کو پیغام دیا کہ وہ انگریزوں کے خلاف جہاد جاری رکھیں۔ بہرکیف معاہدے کے مطابق اب انگریزوں کو افغانستان سے نکلنا تھا۔ اس کے لیے پہلے محصور انگریزی فوج کو ایک جگہ جمع کیا جانا تھا۔ 14 دسمبر کو سردار احمد خان بالا حصار قلعے میں محصور پانچ ہزار انگریز سپاہیوں کو بحفاظت قلعہ بی بی ماہرو میں جنرل میکناٹن کے پاس لے آیا تاکہ شکست خوردہ انگریز یہاں سے درّہ خیبر کی طرف روانہ ہونے کی تیاریاں کرسکیں مگر نہ معلوم کیوں اس کے بعد انگریزوں نے انخلاء میں تاخیر در تاخیر شروع کردی۔ انہوں نے بہانہ بنایا کہ اتنے طویل سفر کے انتظامات ناکافی ہیں، زادِ سفر اور سواری اور بار برداری کے جانور مہیا نہیں ہیں۔

چوں کہ معاہدے میں طے تھا کہ انگریزوں کو سفر کی ضرورت کا سامان دیا جائے گا، چنانچہ مجاہدین نے انہیں حسبِ ضرورت غلہ فراہم کردیا۔ خوراک کے ذخائر حاصل ہونے اور قلعہ بالا حصار سے انخلاء

کرنے والے پانچ ہزار سپاہیوں کے آملنے کے بعد جنرل میکناٹن محسوس کر رہا تھا کہ اتنی بڑی فوج کے ساتھ وہ مجاہدین کا مزید ایک ماہ تک مقابلہ کر سکتا ہے اور تب تک ہندوستان سے کمک آسکتی ہے، چنانچہ اس نے اپنی قومی بدطینتی کا ثبوت دیتے ہوئے بڑی بے شرمی کے ساتھ طے شدہ معاہدے کو نظر انداز کر دیا اور ایک نئے سمجھوتے پر اتفاق کے لیے مکروفریب کے جال بُننے شروع کر دیے۔ وہ جانتا تھا کہ دوست محمد خان کا بیٹا شہزادہ محمد اکبر خان (جو بعد میں وزیر اکبر خان کے لقب سے مشہور ہوا) نوجوان اور ناتجربہ کار ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے ذریعے وہ اپنا مطلب نکال سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اکبر خان سے علیحدہ ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ اکبر خان خود تو نہ گیا، اپنی جگہ اپنے نائب سردار احمد خان کو بھیج دیا۔ میکناٹن نے اسے شہزادے کے نام ایک خفیہ پیغام دے کر بھیجا جس میں اسے ایک خفیہ معاہدے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ پیش کش مجاہدین کے لیے انتہائی خطرناک مگر کم از کم شہزادہ اکبر خان کے لیے بڑی پرکشش ہو سکتی تھی۔ اس کی اہم شقیں درج ذیل تھیں:

- درّہ خیبر سے درّہ بولان تک تمام مشرقی اُفغانستان کی حکومت شاہ شجاع کو دے دی جائے گی اور اس کا انتظام محمد اکبر خان کی وزارت میں چلے گا۔
- امیر دوست محمد خان کو کابل بھیج دیا جائے گا، کابل، مغربی اور شمالی اُفغانستان کا حکمران وہی ہوگا۔ اس کی وزارت دونوں باپ بیٹا مل کر طے کر لیں گے۔
- اُفغان حکومت کا نیا نظام طے ہو جانے کے بعد انگریز کوئی مداخلت نہیں کریں گے۔
- محمد اکبر خان کو بارہ لاکھ روپیہ فی الفور دیا جائیگا اور بعد میں سالانہ دو لاکھ روپے پیش کیے جایا کرینگے۔
- محمد اکبر خان مجاہدین کے قائد نائب امین اللہ لوگری کو فوراً گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دے گا اور باقی تمام مجاہد رہنماؤں کو کابل سے نکال دے گا۔

اکبر خان نے پیغام بڑے غور سے سنا، اگر وہ ذاتی اغراض کو قومی مفادات پر ترجیح دینے کی کمزوری کا شکار ہوتا تو جنرل میکناٹن کا تیر چل ہی چکا تھا اور تحریکِ جہاد کا سبوتاژ ہونا کوئی چند دنوں کی بات تھی مگر اللہ نے نوجوان اکبر خان کو ایک غیرت مند دل اور ایک باتدبیر ذہن دیا تھا۔ اس کی عمر صرف 25 سال تھی مگر عقل وفہم میں وہ بہت سے کہنہ سالوں پر فائق تھا۔ اس نے انگریزوں کو انہی کے انداز میں مزہ چکھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے سردار احمد خان کو کہلا کر بھیجا کہ شہزادہ اکبر خان کو آپ کی تجویز پسند ہے مگر وہ آپ سے وعدہ خلافی کا اندیشہ رکھتا ہے۔ میکناٹن نے جواب میں سردار احمد خان کو یقین دلایا کہ ہماری طرف سے وعدہ خلافی نہیں ہوگی۔ توثیق کے لیے اس نے اکبر خان کو اپنا ریوالور بھیج دیا۔

اب اکبر خان نے بڑی رازداری کے ساتھ مجاہد رہنماؤں کو ساری بات بتادی۔ وہ اکبر خان کی دیانت داری سے بڑے متاثر ہوئے۔ امین اللہ خان لوگری اور نواب محمد زمان نے بتایا کہ میکناٹن کی جانب سے ان دونوں کو بھی الگ الگ اسی قسم کے پیغامات مل چکے ہیں جس میں ذاتی اغراض پوری کرنے کے عوض انہیں ایک نئے معاہدے کا جھانسا دیا جارہا تھا جو دراصل اَفغانستان کو دولخت کرنے کی گھناؤنی سازش تھی۔ یہ ان مجاہد رہنماؤں کا خلوص تھا جس نے فریب کا جال چاک کردیا اور میکناٹن کی دغابازی سب پر کھل گئی۔ سب نے فیصلہ کیا کہ میکناٹن کو ترکی بترکی جواب دیتے ہوئے گرفتار کیا جائے گا اور بقیہ انگریزی فوج کو صرف اور صرف قوت کے زور سے وطن سے بھگایا جائے گا۔

اب اکبر خان نے میکناٹن کو پیغام بھیج کر باقاعدہ مذاکرات کے لیے وقت طے کرنے کا تقاضا کیا۔ میکناٹن نے سفارتی ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہوئے کہا: ”اب تک سابقہ معاہدہ کی دستاویز اَفغان سرداروں کے پاس باقی ہے۔ آپ پہلے ان سے اقرار نامہ لکھوائیں کہ وہ آپ کو نئے مذاکرات کے لیے نمائندہ مان رہے ہیں۔“

اکبر خان نے امین اللہ خان لوگری اور دوسرے بڑے رہنماؤں سے اپنی نمائندگی کا تحریری منظوری کا رقعہ لکھوا کر 22 دسمبر کی شب اپنے نایب سردار احمد کے ہاتھ جنرل میکناٹن کو ارسال کردیا۔ سردار احمد وہاں پہنچا تو نصف شب بیت چکی تھی مگر جنرل میکناٹن نے اسی وقت اسے بلالیا۔

سردار احمد نے کہا: ”شہزادہ اکبر خان کو شاہ شجاع کا وزیر بننا اور دوسری تجاویز منظور ہیں، مگر ان کو فی الفور بارہ لاکھ نہیں، تیس لاکھ روپے چاہئیں اور سالانہ دولاکھ میں ان کا گزارا نہیں ہوگا۔ آپ کم از کم تین لاکھ منظور کریں۔“

میکناٹن کی باچھیں کھل گئیں، اس نے فوراً یہ مطالبہ منظور کرلیا اور تحریری وعدہ لکھ کر سردار احمد کے حوالے کردیا۔ یہ بھی طے ہوگیا کہ مجلسِ مذاکرات کل صبح قلعہ بی بی ماہرو اور قلعہ محمود خان کے درمیان منعقد ہوگی۔

وفد واپس گیا تو میکناٹن خیالی پلاؤ پکانے لگا۔ دشمن میں پھوٹ پڑتی دیکھ کر اس کے تمام اندیشے دور ہوگئے تھے اور وہ مذاکرات کے بہانے مجاہد رہنماؤں کو گرفتار اور قتل کرنے کا منصوبہ بنانے لگا۔ اس نے حکم دیا کہ علی الصبح جب مجلس مذاکرات جاری ہو، پیادہ فوج توپیں لے کر قلعہ محمود خان کا محاصرہ کرلے جہاں امین اللہ خان لوگری کی رہائش گاہ بھی تھی۔ گورے سپاہیوں کو ہدف دیا گیا تھا کہ امین اللہ لوگری کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے کی پوری کوشش کی جائے۔

تاہم اگلے دن یہ حملہ نہ کیا جاسکا کیوں کہ حملے سے پہلے ہی جنرل الفنسٹن نے خبردار کیا کہ مجاہدین

ایسے خطرات سے بے خبر نہیں ہیں، قلعہ محمود خان پر توپ نصب کر دی گئی ہے، لہٰذا ایسی کوئی کوشش خود اپنے لیے تباہ کن ہوگی۔ یہ جان کر میکناٹن کی خوش فہمیاں دور ہوگئیں۔ تاہم اس کے لیے یہ تصور بھی کم خوش کن نہیں تھا کہ کل وہ افغانستان کو دو ٹکڑوں میں بانٹنے کا معاہدہ کرانے جا رہا ہے۔

23 دسمبر 1841ء کی صبح جنرل میکناٹن، کیپٹن لارنس، کیپٹن ٹریور اور کیپٹن میکنزی کے ساتھ قلعہ بی بی ماہرو کی ناقابلِ تسخیر فصیل سے باہر نکلا۔ جنوب کی سمت تقریباً کچھ فاصلے پر سردار اکبر خان، محی الدین خان، خدا بخش خان اور محمد شاہ خان غلجائی مذاکرات کے لیے پہنچ چکے تھے۔ سردار احمد خان نے برطانوی وفد کا استقبال کیا، اکبر خان نے میکناٹن سے مصافحہ کیا اور گورا جنرل ''برٹش رول'' کی ابدیت کے سہانے سپنے دیکھتا ہوا، اکڑ کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

اکبر خان اس کے سامنے بیٹھ گیا اور گفتگو کا آغاز کیا مگر...... اس کے الفاظ میکناٹن کے لیے ناقابلِ یقین تھے۔ وہ کسی نئے معاہدے کی بات کرنے کی بجائے، انگریزوں کو گلہ دے رہا تھا۔ ان کے مظالم، سازشوں اور بدعہدیوں کے مناظر یاد دلا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا: ''اب انگریزوں کے کسی قول و قرار کی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی۔ تم غیر ملکی لوگ افغانستان کے مسلمانوں کے درمیان فتنہ و فساد پھیلانے، انہیں باہم لڑانے اور اپنے غاصبانہ قبضے کو طول دینے کے سوا کچھ اور نہیں سوچ سکتے۔''

پھر اس نے جنرل میکناٹن کے سامنے اس کی دستخط شدہ دو دستاویزات پیش کیں جن میں سے ایک میں افغانستان سے انخلاء کا معاہدہ تھا اور دوسرے میں اسے دو ٹکڑے کرنے کا ایجنڈا تھا۔ اس نے میکناٹن کو شرم دلاتے ہوئے کہا کہ وہ ایک ہی وقت میں اُسے بھی شرکتِ اقتدار کا لالچ دے کر اپنے ہم وطنوں کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور ساتھ ہی امین اللہ خان لوگری اور نواب محمد زمان سے بھی الگ الگ پرفریب معاہدوں کے لیے کوشاں تھا۔ ان میں سے ہر معاہدہ دوسرے کی ضد تھا۔ مشترک بات صرف یہ تھی کہ کسی بھی طرح افغانستان کی تباہی، اس کے عوام کی محکومیت اور انگریزوں کی بے تاج بادشاہت کے ایام دراز ہوتے چلے جائیں۔ اکبر خان پندرہ منٹ تک مسلسل اسی گرم جوشی سے بولتا رہا۔ آخر میں افغانستان کے اس مردِ جری نے جنرل میکناٹن کے بوکھلائے ہوئے چہرے پر عقابی نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا: ''اب ہم تمہارے کسی وعدے پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ ہاں ایک صورت رہ جاتی ہے۔ وہ یہ کہ ہم تمہیں یرغمال بنالیں اور برطانوی فوج کے مکمل انخلاء تک تم ہماری تحویل میں رہو۔''

جنرل میکناٹن کا یہ حال تھا کہ خوف اور ندامت سے پسینہ پسینہ ہوا جا رہا تھا۔

اکبر خان نے کہا: ''بہتر یہی ہے کہ تم ہمارے پاس رہو تاکہ ملک کا معاملہ کسی نتیجے تک پہنچ سکے۔''

یہ کہہ کر اکبر خان نے سپاہیوں کو اشارہ کیا کہ وہ میکناٹن اور انگریز افسران کو حراست میں لے لیں۔ ساتھ ہی اس نے میکناٹن کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر کابل شہر کی طرف لے جانے لگا۔ میکناٹن نے مزاحمت کی کوشش کی تو سردار احمد خان آگے بڑھا اور اس کا دوسرا ہاتھ دبوچ لیا۔

جنرل میکناٹن کا قتل: انگریز افسران کے محافظ دستے نے یہ صورت حال دیکھی تو فائرنگ شروع کر دی۔ ادھر سے مجاہدین نے بھی رائفلوں کے دہانے کھول دیے۔ اکبر خان کی کوشش تھی کہ کسی طرح میکناٹن اور بقیہ تینوں انگریز افسران کو زندہ قلعہ محمود خان تک لے جائے تاکہ انہیں یرغمال بنایا جا سکے مگر مشکل یہ تھی کہ انگریزی فوج کا مرکز قریب ہی تھا اور اِدھر یہ قیدی انگریز افسران مسلسل ہاتھ پیر مار کر بچ نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ خطرہ تھا کہ وہ ہاتھ سے نکل جائیں اور مجاہدین کی قیادت دشمن کی زد میں آجائے۔ آخر معاملہ جلد نمٹانے کے لیے اکبر خان کی اجازت سے مجاہدین نے انگریز جنرل میکناٹن اور جنرل ٹریور کو موت کے گھاٹ اُتار دیا، اس ہنگامے میں ایک انگریز افسر لارنس اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ البتہ کیپٹن میکنزی کو زندہ سلامت قلعہ محمود خان پہنچا دیا گیا۔ سردار محمد اکبر خان نے اسے مجاہدین کی حراست میں دیکھ کر طنزیہ لہجے میں کہا: ''اچھا تو تم لوگ ہمارے ملک پر قبضہ کرنے آئے تھے؟''

میکناٹن اَفغانستان میں برطانیہ کا سب سے بڑا عہدہ دار تھا۔ اس کی ہلاکت کے بعد انگریزوں کو اپنے انجام کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہ رہی۔ انہوں نے جنرل الفنسٹن اور جنرل پاٹینجر کی سرکردگی میں اپنی نئی منتظمہ کمیٹی تشکیل دی جس نے اَفغانستان سے نکلنے پر آمادگی ظاہر کر دی اور مجاہدین کے مطالبات کے مطابق اس سہ نکاتی معاہدے پر عملدرآمد کے لیے تیار ہو گئے۔ ❶...... انگریز اپنا تمام مال و متاع اور ساز و سامان کے سارے ذخائر مجاہدین کے حوالے کر کے جائیں گے۔ ❷...... انگریز اَفغان حکومت کو تاوان کے طور پر چودہ لاکھ روپے ادا کریں گے۔ ❸...... یرغمال بنائے جانے والے انگریز افسران میں سے جو غیر شادی شدہ ہیں ان کی جگہ اب شادی شدہ افسران یرغمال بنیں گے۔

یہ آخری شرط غالباً اس لیے رکھی گئی تھی کہ انگریز قیادت غیر شادی شدہ افسران کی جانوں کے ضیاع کا خطرہ برداشت کر سکتی کیوں کہ اس بارے میں ان پر عوامی دباؤ اتنا زیادہ نہ ہوتا جتنا شادی شدہ افسران کی بیگمات ڈال سکتی تھیں۔ طے پایا کہ 6 جنوری 1842ء کو برطانوی فوج کابل سے نکل جائے گی۔

برف ان کا کفن ہے: 6 جنوری 1842ء کو انگریز فوج نے کابل خالی کر دیا۔ اس شہر سے نکلتے ہوئے انگریزوں کی مایوسی کا عالم ناقابل بیان تھا۔ ایک انگریز افسر نے اس وقت کے اپنے تاثرات کو اشعار کی صورت میں یوں بیان کیا ہے:

جہاں کچھ لوگ متحد ہو جائیں......

وہاں کچھ لوگوں کو ہٹنا پڑتا ہے......

پھر برف ان کا کفن بن جاتی ہے......

اس سر سبز زمین کا ہر ٹکڑا......

اِن کے قدموں تلے......

ایک سپاہی کی قبر بننے کے لیے تیار ہے......

ایک بار پھر بد عہدی: کابل سے نکلتے ہوئے انگریز اپنی روایتی دھوکا بازی سے گریز نہ کر سکے۔ یہ طے ہوا تھا کہ وہ تمام اسلحہ مجاہدین کے حوالے کر کے جائیں گے مگر انہوں نے مجاہدین کو توپ خانے میں زیادہ تر ناقص توپیں دیں اور خود خاصا اسلحہ ساتھ لے کر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کی اگلی منزل جلال آباد تھی اور ان کا قائد جنرل الفنسٹن تھا۔ راستے میں انہیں اطلاع ملی کہ جلال آباد میں جنرل سیل جنگ پر آمادہ ہے اور پشاور سے انگریزوں کی بھاری کمک جلال آباد پہنچنے والی ہے۔ اس اطلاع نے جنرل الفنسٹن کی نیت بدل دی۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ جلال آباد میں جنرل سیل کے ساتھ یکجا ہو کر نئے سرے سے جنگ شروع کر دے گا۔ مجاہدین جو کابل سے روانہ ہونے والی انگریزی فوج کی ہر ہر حرکت کو بغور دیکھ رہے تھے، الفنسٹن کی بدنیتی کو بھانپ گئے۔ انہوں نے کوشش کی کہ الفنسٹن کے جلال آباد پہنچنے سے پہلے پہلے وہ جنرل سیل کو جلال آباد خالی کرنے پر آمادہ کر لیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے جنرل الفنسٹن پر زور دیا کہ جو اسلحہ اور توپ خانہ وہ اپنے ساتھ لیے جا رہا ہے اسے حسبِ معاہدہ مجاہدین کے حوالے کر دے مگر جنرل الفنسٹن نے انکار کر دیا۔ یہ انگریزوں کی طرف سے ایک اور بد عہدی تھی۔

جنگ کا از سرِ نو آغاز: اب الفنسٹن کو بہر صورت جلال آباد پہنچنے سے روکنا ضروری ہو گیا تھا۔ اگر وہ اتنے افراد کے ساتھ وہاں پہنچ جاتا اور پھر پشاور سے کمک بھی آ جاتی تو انگریزوں کی اتنی بڑی جمعیت جلال آباد کو ایک بہت بڑی چھاؤنی میں تبدیل کر دیتی جس سے نجات پانے میں مجاہدین کو شاید مہینوں بیت جاتے اور یہ بھی ممکن تھا کہ انگریز کابل پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ چونکہ الفنسٹن کے رویے سے معاہدہ از خود ٹوٹ چکا تھا اس لیے مجاہدین بھی انہیں بحفاظت سرحد تک پہنچانے کے ذمہ دار نہیں تھے انہوں نے الفنسٹن کے لشکر کو ہر قیمت پر جلال آباد تک پہنچنے سے روکنے کے لیے جنگ کا آغاز کر دیا۔

قبرستان لشکرِ الفنسٹن: یہ جنگ بہت بڑے پیمانے پر تھی۔ مجاہدین کی قیادت سردار محمد اکبر خان کے ہاتھ میں تھی جو انگریزوں کے کابل سے انخلاء میں سب سے نمایاں کردار ادا کر کے مجاہدین کا سب سے

بڑا لیڈر بن گیا تھا۔ مجاہدین کی تعداد ہزاروں میں تھی جبکہ انگریز بھی پندرہ ہزار کے لگ بھگ تھے۔

مجاہدین کا انداز حرب روایتی گوریلا جنگ کا سا تھا۔ انہوں نے پہاڑوں، وادیوں اور گھاٹیوں میں انگریزی فوج پر گھات لگا لگا کر حملے شروع کر دیے۔ یہ حملے اتنی کثرت اور تسلسل کے ساتھ تھے کہ صرف 8 جنوری کو پانچ ہزار انگریز سپاہی مارے گئے۔ کابل شہر سے 5 میل کے فاصلے پر ''خورد کابل'' کے علاقے میں انگریزوں کی اتنی لاشیں گریں کہ یہ جگہ ''قبرستانِ لشکرِ الفنسٹن'' کے نام سے مشہور ہوگئی۔

ڈاکٹر ڈف کی خودکشی: اس وقت انگریز سپاہیوں کا خوف و دہشت سے برا حال تھا۔ وہ ہر قدم پر موت کو سامنے دیکھ رہے تھے۔ انگریز سرجن ڈاکٹر ڈف نے اپنے سپاہیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح مرتے دیکھا تو خوف اور مایوسی کے عالم میں اس نے اپنے حلق پر نشتر پھیر کر خودکشی کر لی۔ مجاہدین کے چھاپہ مار حملے جاری رہے اور انگریز فوج کسی بھی طرح جلال آباد پہنچ جانے کی اُمید میں چپے چپے پر لاشیں چھوڑتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ 9 جنوری کو جنرل الفنسٹن نے سردار اکبر خان کو گفت و شنید کے ذریعے مطمئن کرنے کی کوشش کی جس پر سردار محمد اکبر خان نے انگریزی قافلے میں شامل تمام عورتوں بچوں اور گھر بار والے سویلین مردوں کو اپنی حفاظت میں لے لیا اور انہیں سرحد تک پہنچانے کا انتظام کر دیا۔

صرف ڈاکٹر بریڈن جلال آباد پہنچا: اب انگریزی قافلہ صرف سپاہیوں پر مشتمل رہ گیا تھا۔ الفنسٹن نے یہ صورت حال دیکھ کر محسوس کیا کہ وہ اب بہتر انداز میں لڑ سکتا ہے۔ چنانچہ ایک مقام کو لڑائی کے لیے موزوں سمجھ کر وہ پھر آمادہ پیکار ہو گیا مگر مجاہدین نے جوابی حملہ کر کے اسے وہاں سے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

دس اور گیارہ جنوری انگریزوں کے لیے قیامت کے دن تھے۔ کابل سے 22 میل دور ''جگدلک'' کے مقام پر مجاہدین نے انگریزوں کی اتنی لاشیں گرائیں کہ ان کا کوئی فرد سلامت نہ رہ سکا۔ ہزاروں انگریز مارے گئے اور جو بچ گئے تھے وہ اس قدر شدید زخمی تھے کہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہ گئے تھے۔ ان میں سے صرف ایک شخص ڈاکٹر بریڈن جسے تین کاری زخم آئے تھے، بڑی مشکل سے گرتا پڑتا جلال آباد پہنچا اور جنرل سیل کو انگریزوں کی شکست فاش کی عبرت ناک کہانی سنائی۔ جنرل الفنسٹن جو اس معرکے میں زندہ بچ گیا تھا، اپنے سپاہیوں کی لاشوں پر سے گزرتا ہوا سردار محمد اکبر خان کے پاس پہنچا اور خود کو اس کے حوالے کر دیا۔

جلال آباد کا محاصرہ: جلال آباد اب انگریزوں کی باقی ماندہ قوت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ جنرل سیل کابل کی انگریز فوج کی مکمل تباہی کے بعد بھی جلال آباد سے انخلاء کے لیے اس لیے تیار نہ تھا کہ اسے ہر صورت میں پشاور سے تازہ دم افواج کی کمک ملنے کا یقین تھا۔ اب مجاہدین کی تمام تر توجہ جلال آباد پر مرکوز ہوگئی۔

سردار محمد اکبر خان نے پندرہ ہزار پیادے اور پانچ ہزار گھڑسوار لے کر جلال آباد کا محاصرہ کر لیا، اس کے ساتھ ہی اس نے سلطان احمد خان کو تین ہزار مجاہدین کے ساتھ درہ خیبر کی طرف روانہ کر دیا تا کہ پشاور سے کوئی کمک جلال آباد نہ پہنچ سکے۔ جلال آباد میں انگریزوں نے دفاعی انتظامات نہایت مستحکم کر رکھے تھے اور خوراک کے بے پناہ ذخائر ان کے پاس موجود تھے، اس لیے محاصرہ طویل تر ہوتا گیا۔ مجاہدین نے جلال آباد سے ایک کلومیٹر دور اپنا معسکر قائم کر لیا تھا اور اب وہ بڑے حملے کی تیاری کر رہے تھے۔

غزنی میں انگریزوں کا انجام: اس دوران غزنی کے محاصرے کو چھ ماہ گزر گئے تھے، مجاہدین بڑی توپیں نہ ہونے کی وجہ سے اسے فتح نہیں کر پا رہے تھے۔ آخر کار جنوری 1842ء میں سردار شمس الدین خان کابل سے گولہ بارود اور توپیں لے کر پہنچ گیا۔ غزنی کی فصیل پر گولہ باری شروع ہوئی تو انگریز افسر کرنل پالمر کی ہمت جواب دینے لگی۔ مگر برف باری کی وجہ سے اس کا بھاگنا بھی ممکن نہ تھا۔ موسم سازگار ہوتے ہی 6 مارچ کو وہ غزنی کا تمام خزانہ، اسلحہ، گھوڑے، ساز و سامان اور مال مویشی سمیٹ کر کابل جانے والی شاہ راہ پر روانہ ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنے بہترین اسلحے کے بل بوتے پر لڑتا بھڑتا کابل پہنچنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ مگر مجاہدینِ غزنی نے فوراً اس کا تعاقب شروع کر دیا اور جگہ جگہ گھات لگا کر ایسے تابڑ توڑ حملے کیے کہ سارا مال و متاع وہیں دھرا رہ گیا۔ انگریز سپاہیوں نے لڑ بھڑ کر بھاگ نکلنے کی کوشش کی مگر چند افراد کے سوا کسی کو زندہ بچ کر نکلنا نصیب نہ ہوا۔ بھاگنے والے انگریز افسران نے دوبارہ غزنی کے قلعے میں پناہ لے لی مگر جلد ہی انہیں ہتھیار ڈالنا پڑے۔ گرفتار کیے جانے والوں کو غازیوں کے گھوڑوں کا فضلہ اٹھانے اور دوسرے محنت مزدوری کے کاموں پر لگا دیا گیا۔ مجاہدین کی طرف سے قیدیوں کے ساتھ یہ سلوک، انگریزوں کے جیل خانوں میں کیے جانے والے برتاؤ کی بہ نسبت، بہت نرم تھا۔

بڑے حملے کا فیصلہ: مارچ 1842ء میں مجاہد رہنماؤں نے کابل میں ایک اعلیٰ سطحی مجلس مشاورت کے دوران فیصلہ کیا کہ نائب امین اللہ خان لوگری اور میر حاجی کی قیادت میں پوری قوت سے جلال آباد پر عمومی یلغار کی جائے اور آخری انگریز سپاہی تک کو ختم کیے بغیر ہتھیار نہ رکھے جائیں۔ اس فیصلے کے بعد کابل کے باہر، جلال آباد جانے والی شاہراہ پر مجاہدین کے خیمے گڑنے اور جگہ جگہ جہاد کے پرچم لہرانے لگے۔ ہزاروں کی تعداد میں مجاہدین جمع ہو رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک انگریزوں کے خلاف آخری معرکے میں شرکت کی سعادت حاصل کرنا چاہتا تھا۔

شاہ شجاع کا انجام: مجاہد رہنماؤں نے اس موقع پر قلعہ بالا حصار میں مقیم بے دست و پا شاہ شجاع سے ملاقات کر کے اس پر واضح کر دیا تھا کہ اگر وہ افغانستان میں رہنا چاہتا ہے تو اسے جلال آباد جانے والے

مجاہدین کی صفوں میں شامل ہونا ہوگا۔ بصورت دیگر انگریزوں کے انخلاء کے ساتھ ہی اس کی حفاظت کی کوئی ذمہ داری نہیں دی جاسکتی۔ شاہ شجاع نے اس پیش کش کا مثبت جواب دیا تھا تاہم وہ عملی طور پر ساتھ چلنے میں ٹال مٹول کر رہا تھا، چنانچہ کابل سے لشکرِ مجاہدین کی روانگی میں تاخیر ہوتی جا رہی تھی۔ آخر کار 4 اپریل کو شاہ شجاع قلعہ بالا حصار سے نکلا اور مجاہدین کے معسکر کی طرف روانہ ہوگیا مگر اپنے کرتوتوں کا کفارہ ادا کرنا اس کی قسمت میں نہیں تھا۔ 5 اپریل کی صبح جب وہ معسکر پہنچنے ہی والا تھا کہ اچانک کچھ اُفغان سرداروں نے 60 مسلح افراد کے ساتھ حملہ کر کے اسے قتل کر دیا۔ غالباً انہیں یہ خطرہ تھا کہ شاہ کا وجود نئے فتنوں کا باعث بن جائے۔ اس بدقسمت بادشاہ کی زندگی جس بے بسی کا مرقع تھی، موت اس سے کہیں زیادہ عبرت ناک ثابت ہوئی۔ انگریزوں کا آلہ کار بن کر اس نے عظیم ابدالی خاندان کی روشن روایات کو جس طرح گہن لگایا اور اُفغانستان میں انگریزوں کو مداخلت کا موقع دے کر ملکی تاریخ کو جس طرح داغدار کیا، اس کی بنا پر تاریخ میں اس کا نام بزدلی، نفاق اور بے حمیتی کی ایک سیاہ علامت بن کر رہ گیا۔

کابل میں خانہ جنگی اور انگریزوں کی نئی چال: شاہ شجاع کے قتل میں سب سے بڑا حصہ نواب زمان خان کے آدمیوں کا تھا۔ وہ اس کے فوراً بعد کابل پہنچا اور اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ کابل اس وقت مجاہدین سے تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ اس لیے کہ سب جلال آباد کی طرف روانگی کی تیاری کر رہے تھے، نواب زمان خان کے اس احمقانہ اقدام سے مجاہدین ششدر رہ گئے اور ان کی طاقت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ نائب امین اللہ خان کو بھی جلال آباد کی بجائے کابل کی طرف متوجہ ہونا پڑا، اس نے نواب زمان خان کی بادشاہت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ اکثر مجاہد رہنماؤں کے نزدیک انگریزوں کے انخلاء کے بعد سردار محمد اکبر خان سے زیادہ سلطنت کا حق دار کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

کابل اب دو حصوں میں تقسیم ہوگیا تھا، ایک حصے پر نواب محمد زمان خان کا قبضہ تھا جبکہ بالا حصار نائب امین اللہ کے ہاتھ میں تھا۔ دونوں کے آدمیوں میں مسلح جھڑپیں ہونے لگی تھیں۔ نائب امین اللہ کو سردار محمد اکبر خان کا انتظار تھا جو انگریزوں سے الجھا ہوا تھا، نائب کی خواہش تھی کہ سردار محمد اکبر کے آتے ہی اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا جائے۔

اُدھر محمد اکبر خان ایک نئی آزمائش میں گھر چکا تھا، مجاہدین جو انگریزوں کی محصور افواج کو سرے سے بے نام ونشان کر دینا چاہتے تھے، میدان جنگ میں غالب ہونے کے باوجود ایک بار پھر مذاکرات کی میز پر آگئے تھے اور ان کا پلّہ کمزور ہو چکا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ ہندوستان کے انگریز گورنر جنرل نے اپنی محصور افواج کو بچانے کی خاطر ایک نئی چال چلی تھی۔ اس نے اپنے پاس محبوس سابق حکمرانِ کابل امیر

دوست محمد خان کو دوستی کے دام میں پھانس کر اسے دوبارہ افغانستان کا حکمران بنانے کا وعدہ کرلیا تھا۔ شرط یہ عائد کی تھی کہ جلال آباد اور کابل میں جمع ہونے والے مجاہدین کوہ ہندوکش تک پیچھے ہٹ جائیں تاکہ محصور انگریز فوج یقینی سلامتی کے ساتھ پشاور تک آسکے۔

دوست محمد خان کی حماقت: دوست محمد خان کو قطعاً معلوم نہ تھا کہ مجاہدین کتنی بہتر پوزیشن میں ہیں اور انگریز کس قدر مجبور ہیں۔ اس نے حماقت کا ثبوت دیتے ہوئے اس کا وعدہ کرلیا اور اپنے بیٹے سردار محمد اکبر خان کو یہ حکم بھیج دیا کہ وہ تمام راستے خالی کر کے مجاہدین کو پیچھے ہٹالے۔ نشانی کے طور پر اس نے قاصد کو اپنا چشمہ اور نسوار کی ڈبیا دے کر بھیجا۔ سردار محمد اکبر خان کے لیے یہ پیغام ناقابل یقین تھا مگر چشمہ اور نسوار کی ڈبیہ ساتھ دیکھ کر اسے یقین کرنا ہی پڑا۔ چونکہ اتنا بڑا فیصلہ اکبر خان تنہا نہیں کرسکتا تھا، اس لیے انگریز نمایندوں کے ساتھ مجاہدین کے مذاکرات دوبارہ شروع ہوئے، جب انگریز نمائیندے نے مجاہدین کا رویہ سخت دیکھا تو اس نے اکبر خان کو دھمکی دیتے ہوئے کہا:

> ”اگر آپ نے ہماری شرط نہ مانی تو ہم آپ کے باپ دوست محمد اور خاندان کے دوسرے ڈیڑھ سو یرغمال افراد کو ہندوستان سے لندن منتقل کردیں گے اور ان کے ساتھ کسی بہتر سلوک کی ضمانت نہیں دیں گے۔“

معاہدہ طے ہوگیا: اس بات نے محمد اکبر خان کو سوچنے پر مجبور کردیا۔ اُدھر کابل میں خانہ جنگی کی افسوس ناک صورت حال کے پیش نظر اس کا خطرہ بھی تھا کہ کچھ دن گزرنے پر مجاہدین کی اجتماعیت بکھر نہ جائے اور انگریز انخلاء کی جگہ لڑنے کی پوزیشن میں نہ آجائیں۔ آخر اس نے دیگر مجاہد رہنماؤں کو ان تمام پہلوؤں کے ساتھ اپنے باپ کی واپسی کی اہمیت کا احساس دلا کر اس بات پر آمادہ کرلیا کہ مجاہدین خود پیچھے ہٹے بغیر انگریزوں کو زندہ نکلنے کی ضمانت دے دیں۔ انگریزوں کے لیے اتنا بھی کافی تھا۔ چنانچہ معاہدہ طے پاگیا۔ اس کے فوراً بعد محمد اکبر خان کابل پہنچا اور وہاں نواب محمد زمان کو مغلوب کر کے فتنہ وفساد کو ختم کیا۔ امورِ حکومت محمد اکبر خان کے حوالے کردیے گئے۔ اُدھر طے شدہ معاہدے کے مطابق 20 اگست کو جنرل سیل بچی کھچی فوج کے ساتھ جلال آباد سے پشاور کی طرف روانہ ہوگیا۔

انگریز فوج کی شرمناک واپسی: غزنی اور قندھار میں بھی جہادی معرکے ہوئے تھے، غزنی میں تو انگریزوں کا بالکل صفایا ہوچکا تھا، البتہ قندھار میں جنرل ناٹ اپنے آٹھ ہزار سپاہی گنوانے کے بعد باقی فوج کے ساتھ محصور تھا۔ 20 اگست ہی کو وہ بھی معاہدے کے تحت قندھار سے براستہ کابل پشاور روانہ ہوا۔ یہ مجموعی طور پر 54 ہزار انگریز سپاہی نومبر 1842ء میں نہایت ذلت وخواری کے ساتھ واپس ہندوستان پہنچے۔

مضحکہ خیز لیپا پوتی: اس تاریخی شکست اور اپنی شرمندگی کو چھپانے کے لیے انگریز سرکار نے بڑے عجیب عجیب کام کیے۔ انہوں نے یہ مشہور کرنے کی کوشش کی کہ ہم فاتح ہیں اور ملک اپنے وفاداروں کو سونپ کر آرہے ہیں۔ چنانچہ ہر بستی میں وہ کسی اُفغان ایجنٹ کی گورنری یا نیابت کا اعلان کر کے آگے بڑھ جاتے، اگرچہ اس ''نائب'' کو انگریز فوج کے جاتے ہی مجاہدین کے خوف سے علاقہ چھوڑ کے بھاگنا پڑ جاتا تھا۔ انگریزوں کے پیچھے پیچھے ایسے درجنوں ''گورنر اور نائب'' چند دنوں کے اندر اندر اُفغانستان سے بھاگ کر ہندوستان پہنچ گئے تھے۔

ہندوستان پہنچ کر انگریز افسران نے فتحِ اُفغانستان کا جشن منا کر اپنی رسوائی کو چھپانے کی شرمناک کوشش کی۔ حد یہ ہے کہ جشن میں انگریز گورنر جنرل لارڈ ایلنبر و نے ایک ''فرضی دروازہ'' پیش کرتے ہوئے اعلان کیا: ''یہ سومنات مندر کا وہ پھاٹک ہے جو محمود غزنوی اکھاڑ کر لے گیا تھا۔ ہماری فاتح فوج اس سرمایۂ ہندوستان کو واپس لے آئی۔''

اس تمام تر ڈرامہ بازی اور لیپا پوتی کے باوجود حقیقت کو چھپایا نہ جاسکا۔ انگریزوں کی یہ عبرتناک شکست آج بھی تاریخ کے صفحات پر ثبت ہے۔ اس دور کے کئی انگریز افسران، صحافیوں اور سیاحوں کی یادداشتوں میں اس کی تفصیلات ملتی ہیں۔ ان میں لیڈی فلورنٹیا سیل (F.Sale) کا سفرنامہ قابل دید ہے جو جنرل سیل کی بیگم تھی۔ یہ سفرنامہ ''تذکرہ مصائب در اُفغانستان'' کے نام سے فارسی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ لیڈی سیل جنگ کے بعد کچھ مدت اُفغانوں کے ہاں نظر بند رہی اور پھر رہا ہو کر 1842ء میں ہندوستان پہنچی۔ اس کا انتقال 1853ء میں ہوا۔ کاش کہ برطانیہ اس دور کی تاریخ سے سے عبرت پکڑ سکے۔

مآخذ و مراجع

- ...... اُفغانستان در مسیر تاریخ، میر غلام محمد غبار
- ...... Encyclopedia of Islam.V.1
- ...... اردو دائرہ معارف اِسلامیہ، ناشر: دانش گاہ، پنجاب یونی ورسٹی
- ...... تذکرہ مصائب در اُفغانستان، لیڈی سیل، فارسی ترجمہ
- ...... درزوایائی تاریخ معاصر اُفغانستان، احمد علی کہزاد
- ...... سراج التواریخ، مرزا فیض محمد خان

سترھواں باب

دوست محمد خان، شیر علی خان اور یعقوب علی خان

اِسلامی دنیا کی تاریخ میں ایسے الیے ایک تسلسل کے ساتھ نظر آتے ہیں کہ متعدد اِسلامی خطوں میں جہادی تحریکوں اور صالح انقلابات کے بعد متوقع نتائج حاصل نہ کیے جاسکے اور بڑے بڑے اولعزم رہنماؤں اور ایثار پیشہ مجاہدین کی قربانیاں حالات میں کوئی تغیر پیدا کرنے سے قاصر رہیں۔ سرزمینِ اَفغانستان نے بھی اپنی دھرتی پر کئی انقلابی تحریکیں اٹھتی دیکھیں جن میں سے بعض، صحیح اصولوں پر کام کرنے اور ضروری احتیاطوں کو ملحوظ رکھنے کی وجہ سے کامیابی سے ہمکنار ہوئیں اور ان سے بے پناہ ثمرات بھی حاصل ہوئے مگر کئی تحریکیں بعض سیاسی غلطیوں کی وجہ سے عین وقت پر ناکام ہوگئیں اور کچھ تحریکیں کامیاب ہوکر بھی بے نتیجہ رہیں۔

مجاہدین کی دو سیاسی غلطیاں: 1840ء سے 1842ء تک جاری رہنے والی یہ تحریک جہاد جس نے انگریزوں کو ناکوں چنے چبوا کر اَفغانستان سے باہر دھکیل دیا، زمینی جنگ جیتنے کے باوجود آخر میں ایک سیاسی غلطی کے باعث ملک کے حالات سدھارنے کے لحاظ سے بارآور ثابت نہ ہوسکی اور انگریزوں کے اَفغانستان سے نکلنے کے صرف ایک برس بعد اسی سرزمین میں مجاہدین سرگرمیاں اور حالات نہایت کشیدہ دیکھے گئے۔ آیئے! اس صورتحال کا ذرا گہرائی سے جائزہ لیں۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ جہاد مجاہد رہنماؤں کی ایک کونسل کے تحت شروع کیا گیا تھا جس میں ملک کے بڑے بڑے رؤساء اور عمائد شامل تھے۔ امین اللہ خان، محمد شاہ خان، نواب محمد زمان خان اور میر حاجی جیسے لوگ اس کے اصل ستون تھے۔

جب تحریک جہاد کامیابی کے آخری مراحل میں تھی تو اس وقت سابق حکمران دوست محمد خان کے بیٹے بھی اس میں شامل ہوگئے۔ ان میں محمد اکبر خان اپنی کارکردگی کی بناء پر سب سے نمایاں رہا حتیٰ کہ مجاہد رہنماؤں نے اس پر مکمل اعتماد کرکے تقریباً تمام فیصلہ کن امور عملاً اس کے حوالے کردیے تھے۔ محمد اکبر خان نہایت محب وطن اور غیور انسان تھا۔ تحریک جہاد میں اس کا کردار یقیناً ناقابل فراموش ہے مگر

اس سے اور مجاہد رہنماؤں سے بھاری غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے آخر تک مستقبل کی نئی حکومت کے لئے کوئی واضح اور عملی ترتیب نہیں بنائی۔ حالات کے مطابق یہ وقت کا اہم تقاضا تھا۔ مجاہد رہنما انگریزوں سے لڑائی میں اس طرح الجھے رہے کہ ایک نئی حکومت کی تشکیل کی طرف توجہ سرے سے نہیں دی گئی۔ جب انگریزوں کا انخلاء شروع ہوا تو مستقبل کی حکومت کے خدوخال بالکل غیر یقینی تھے۔ ایسے میں کوئی بھی بااثر لیڈر خود کو نئے حکمران کے طور پر منوانے کا سوچ سکتا تھا، اسی سوچ کی بناء پر محمد زمان خان نے دیگر رہنماؤں کے مشورے کے بغیر کابل پر قبضے کی کوشش کی اور جب امین اللہ خان لوگری نے اس کو روکا تو کابل دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور خانہ جنگی شروع ہو گئی۔

اگرچہ محمد اکبر خان کی کوششوں سے یہ خانہ جنگی فوراً روک دی گئی مگر اس موقع پر قوم کے ان رہنماؤں سے ایک اور سنگین غلطی ہو گئی جس نے افغانستان کو ایک طویل عرصے کے لئے داخلی انتشار اور خانہ جنگی کے گڑھے میں دھکیل دیا۔ اس کے باعث نہ صرف مخلص رہنماؤں کو ناقابل برداشت آزمائشوں اور اذیتوں سے گزرنا پڑا بلکہ مستقبل میں ملکی سیاست میں ان کا کردار ختم ہو کر رہ گیا۔ دراصل اس موقع پر عواقب کا اندازہ کر کے جہاں مجاہدین کو نئی حکومت کی تشکیل حتمی طور پر طے کر لینی چاہئے تھی وہاں اس میں ایسے کسی فرد کو شامل نہیں کرنا چاہئے تھا جس کا تحریکِ جہاد سے گریز یا انگریزوں سے تعلق ثابت ہو چکا ہو۔ مگر ہوا یہ کہ کابل میں خانہ جنگی کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد مجاہد رہنماؤں نے عمائدِ قوم کو ایک حکمران پر اکٹھا کرنے کے لئے بڑی عجلت سے کام لیا اور انہوں نے فوری طور پر یہ فیصلہ کر لیا کہ ایک بار پھر جلاوطن معزول بادشاہ دوست محمد خان کو تخت پر بٹھایا جائے۔ انہیں امید تھی کہ دوست محمد کی خاندانی وجاہت، عمر رسیدگی اور سیاسی امور کے تجربے کے باعث تمام سردار اور رہنما اس پر اعتماد کریں گے۔

مجاہد رہنماؤں کو یہ حسن ظن بھی تھا کہ انگریزوں کے ہاتھوں اتنی ذلت اٹھانے کے بعد دوست محمد غیر ملکیوں کو اپنا بدترین دشمن تصور کرتا ہوگا۔ مجاہدین کو یہ بھی یقین تھا کہ دوست محمد خان امور حکومت اپنے بیٹے محمد اکبر خان ہی کے ہاتھ میں رہنے دے گا، جس کی جرأت و بہادری اور بیدار مغزی کے سب معترف تھے۔ ایسے میں بادشاہ کی حیثیت علامتی ہوگی اور شہزادے کے ہاتھوں امور سلطنت بخیر و خوبی انجام پاتے رہیں گے۔

خوش فہمیوں کا سراب: مگر حقیقت میں یہ سوچ محض خوش فہمیوں کا سراب تھی...... امیر دوست محمد خان اب بھی وہی بزدل دوست محمد خان تھا جو جیتی ہوئی جنگ کے بعد اپنی تلوار انگریز جنرل میکناٹن کو پیش کرنے تنہا کابل پہنچ گیا تھا۔ چار سالہ جلاوطنی نے اسے مزید پست ہمت کر دیا تھا۔

مجاہدین کی فتح کے بعد جب وہ کلکتہ کے قید خانے سے افغانستان کے تخت کی طرف روانہ ہوا تو اسی وقت ''انگریز دوستی'' کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے اس نے اِس معاہدے پر دستخط کر دیئے کہ ھرات اور قندھار افغانستان کی حدود میں شمار نہیں ہوں گے۔ اس کے بعد جب 1843ء میں جب وہ کابل پہنچا تو اس کے اندر کا ''مطلق العنان حکمران'' مزید بیدار ہو گیا اس نے تخت نشین ہوتے ہی سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ مجاہد رہنما اسے بادشاہ مان چکے تھے، اس لئے اب کچھ کرنا ان کے بس سے باہر تھا، انہیں اتنی خوشی کافی تھی کہ انگریزوں کے ناپاک قدم افغانستان سے نکل گئے ہیں اور ایک خود مختار، خاندانی مسلمان حکمران ان پر حکومت کرنے لگا ہے۔ اس کی تھوڑی بہت زیادتیوں کو برداشت کرنا وہ قوم کے لئے ایثار و قربانی کی جدوجہد کا حصہ سمجھ رہے تھے۔

دوست محمد خان کی پالیسی: مگر دوست محمد خان کی زیادتیاں بڑھتی گئیں۔ وہ انگریزوں کو اپنا محسن سمجھتا تھا جنہوں نے اسے تاج و تخت کابل طشتری میں رکھ کر پیش کیا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے محمد اکبر خان سے تقریباً سارے اختیارات چھین کر اسے عضوِ معطل بنا دیا کیوں کہ فرزند کی انگریز دشمنی اسے ناپسند تھی۔ محمد اکبر خان افغان عمائد اور مجاہد رہنماؤں کی اُمیدوں کا مرکز تھا، انہیں توقع تھی کہ قوم کا یہ ہیرو اپنے باپ کے فیصلوں پر اثر انداز رہے گا اور وہ سمجھتے تھے کہ اگر باپ نے کوئی بڑی غلطی کی تو لائق فائق بیٹا اس کی اصلاح کر دے گا۔ مگر اب ان کی یہ تمام اُمیدیں دم توڑ گئیں۔

امین اللہ لوگری کا انجام: دوست محمد خان نے مجاہد رہنماؤں کی عوامی مقبولیت کو اپنے اقتدار کے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوئے ایک ایک کر کے انہیں راستے سے ہٹانا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں اس کا سلوک شرمناک حد تک گرا ہوا تھا۔ سب سے پہلے اس نے مجاہدین کے بزرگ ترین قائد امین اللہ خان لوگری پر ہاتھ ڈالا اور اس پر ''ملک دشمنی'' کا الزام لگا کر بالا حصار کے قید خانے میں ڈال دیا۔ امین اللہ خان لوگری نے 17 سال تک قید و بند کی سختیاں جھیلنے کے بعد آخر کار زندان کی آہنی سلاخوں کے پیچھے دم توڑ دیا۔ اس وقت اس کی عمر 72 سال ہو چکی تھی۔ انگریزوں کے خلاف جدوجہد آزادی کے مرکزی رہنما کا یہ انجام محسن کشی کی بدترین مثال ہے اور اس سیاہ کارنامے کا دھبہ دوست محمد خان کے دامن سے مٹانا ناممکن ہے۔

دیگر مجاہد رہنماؤں سے بھی اس طرح کا سلوک کیا گیا۔ سردار عثمان خان، نواب محمد زمان خان، شجاع الدولہ خان اور شمس الدین خان جیسے بااثر عمائدین بھی دوست محمد خان کی ستم رانیوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ رہی یہ بات کہ اس موقع پر مجاہد لیڈر دوست محمد خان سے آمادہ پیکار کیوں نہ ہوئے...... تو دراصل وہ ملک کو ایک بڑی جنگ کے فوراً بعد نئی خانہ جنگی میں مبتلا کرنے سے بچانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ

ہمارے اوپر جو بھی گزرے، ہم جھیل لیں گے مگر ملک کو ذاتی اقتدار کے لیے مزید خوں ریزی کا شکار نہیں ہونے دیں گے۔ پھر عوام بھی سالہا سال سے لڑلڑ کر تھک چکے تھے۔ اگر کوئی نئی تحریک اُٹھائی جاتی تو ایک خاندانی بادشاہ کے مقابلے میں اس کی یکدم کامیابی کے امکانات کم تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ مایوسی کے اندھیروں کے باوجود شہزادہ محمد اکبر خان کی صورت میں ایک کرن باقی تھی۔ سب کا یہی خیال تھا کہ دوست محمد خان بڑھاپے کے یہ آخری ایام گزار کر جوں ہی رخصت ہوگا، محمد اکبر خان برسرِ اقتدار آ کر حالات درست کردے گا۔ خود محمد اکبر خان جس کا مشورہ مجاہد رہنما نظر انداز نہیں کرسکتے تھے امیر دوست محمد خان کے خلاف کسی فوری تحریک سے اجتناب پر زور دے رہا تھا اور بہتر وقت کا منتظر تھا۔ اسی سوچ بچار میں کچھ کرنے کا وقت گزرتا چلا گیا، مجاہدین کی کونسل کے ارکان پس منظر میں جا کر یکے بعد دیگرے حکمران کے عتاب کا شکار ہوتے گئے اور جہاد کے نام پر مجتمع ہونے والی قوت بکھر کر رہ گئی۔

<u>اولاد میں تقسیم حکومت:</u> دوست محمد خان نے ان رہنماؤں کو بے دست و پا کرنے کے بعد اقتدار پر اپنی آل اولاد کا قبضہ مستحکم کرنے کے لیے پورے ملک کو اپنے بیٹوں میں تقسیم کردیا۔ اس کے بیٹوں اور بیٹیوں کی مجموعی تعداد 52 تھی۔ چنانچہ اس کے پاس خانہ ساز ''عہدے داروں'' کی کمی نہ تھی۔ چنانچہ اُفغانستان چھوٹے چھوٹے صوبوں میں تقسیم ہوگیا۔ اس کے باوجود بھی کئی شہزادے ''عہدے داری'' سے محروم رہ گئے تو اس نے فوج کو پانچ مستقل حصوں میں تقسیم کرکے کئی شہزادوں کو الگ الگ سپہ سالار اعلیٰ بنادیا۔ اس طرح فوج کی مرکزیت بھی ختم ہوگئی۔ تاہم اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس طرح شہزادہ محمد اکبر خان کو جسے اب تک مناصب سے محروم رکھا گیا تھا، فوج کے ایک حصے کی کمان مل گئی۔

<u>دو اہم کام:</u> شہزادے نے اس عہدے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دو بڑے کام کرنے کی کوشش کی۔ ایک تو اس نے مجاہد رہنماؤں کو امیر دوست محمد خان کے مزید عتاب سے بچانے کی مہم شروع کی۔ اس کام میں وہ اس حد تک کامیاب رہا کہ سردار سلطان احمد خان اور محمد شاہ خان غلجائی جو مرکزی مجاہد لیڈر تھے، حکمران کی آشفتہ مزاجی کا شکار ہونے سے بچ گئے اور ان کی جان بخشی کردی گئی تاہم امین اللہ خان لوگری کو قید سے نجات دلانے کے لیے کوئی کوشش کامیاب نہ ہوسکی اور یہ عظیم مجاہد زندان ہی میں فوت ہوگیا۔
محمد اکبر خان نے دوسرا کام یہ شروع کیا کہ قندھار اور ہرات کو جنہیں دوست محمد خان نے انگریزوں سے معاہدے کے تحت اپنی قلمرو سے خارج قرار دے رکھا تھا، دوبارہ اُفغانستان میں شامل کرنے کی کوشش کی اور اس کے لیے باقاعدہ لشکر کشی کی مگر عین وقت پر امیر دوست محمد خان نے تاکیدی حکم بھیج کر اسے واپس بلالیا، اس طرح یہ مہم ناکام رہی۔

اکبر خان کی موت: ان دنوں پنجاب کا حکمران رنجیت سنگھ مر چکا تھا اور سکھوں کا اقتدار کمزور پڑ رہا تھا۔ وہ ہر وقت انگریزوں کے پنجاب پر قبضے کے اندیشے سے سہمے رہتے تھے۔ انہیں انگریزوں کی بجائے اَفغانوں کی بالادستی، غنیمت نظر آرہی تھی اس لیے ان کی نگاہیں اَفغانستان کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ شہزادہ محمد اکبر خان نے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے پنجاب پر فوج کشی کی تیاری کی مگر دریائے سندھ تک پہنچا تھا کہ امیر دوست محمد خان نے اسے نہایت سختی سے واپسی کا فرمان بھیج دیا۔ اس طرح باپ بیٹے میں اختلافات بالکل واضح ہو گئے۔

1846ء تک جب تین سال اس طرح گزرے تو لوگ دوست محمد کے ہوتے ہوئے اصلاحِ احوال سے مایوس ہونے لگے۔ چند قبائل نے حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ بھی کیا مگر امیر دوست محمد خان نے نہایت سختی سے انہیں دبا دیا۔ اسی سال جبکہ پنجاب میں انگریزوں کے مکمل تسلط کا ہنگامہ مچا ہوا تھا اور اَفغانستان ایک بار پھر برطانوی سامراج کا خطرہ محسوس کر رہا تھا، شہزادہ محمد اکبر خان ملیریا کے معمولی بخار میں مبتلا ہو کر یکا یک دنیا سے رُخصت ہو گیا۔

وزیر اکبر کا قاتل کون؟ مؤرخین بتاتے ہیں کہ اکبر خان چند دن معمولی بیماری کے بعد چل بسا تھا، بعد میں پتہ چلا کہ طبیب نے محمد اکبر خان کو دوا کی جگہ زہر آلود گولی کھلا دی تھی۔ اس طبیب کو سزا دینا تو بہت دور کی بات تاریخی ریکارڈ میں یہ تک کہیں نہیں ملتا کہ دوست محمد خان نے اس کو گرفتار کیا ہو یا اس پر عدالت میں کوئی مقدمہ چلایا گیا ہو، حالانکہ سب جانتے ہیں دوست محمد عفو و درگزر کا قائل نہیں تھا، مجرم تو الگ رہے اس کے عتاب سے وفادار و جانثار تک نہ بچ سکے۔ پھر کیا وجہ تھی کہ اپنے بیٹے کی موت کا سبب بننے والے شخص سے اس نے باز پرس تک نہ کی۔ یہ پہلو اس امکان کو قوی کرتا ہے کہ اکبر خان کو ایک سازش کے تحت شہید کیا گیا تھا۔ کابل کے شہریوں میں یہ مشہور تھا کہ خود باپ نے بیٹے کو قتل کرایا ہے تاکہ وہ اس کے اقتدار کے لیے خطرہ نہ بن جائے۔

محمد اکبر خان کو شمالی اَفغانستان کے شہر مزار شریف کے مشہور مقبرے کے احاطے میں دفن کیا گیا۔ اَفغان عوام نے اسے ایک مجاہد ہیرو کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جس کی بہادری، معرکہ آزمائی اور سیاست دانی نے انگریزوں کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ نالائق دوست محمد خان کا یہ لائق ترین بیٹا عوام میں ''وزیر'' کے لقب سے مشہور تھا اور اس کی قابلیت پر پوری قوم کا اتفاق تھا مگر اپنے باپ کی بزدلی، کوتاہ اندیشی اور تنگ نظری کا شکار بن کر وہ آخر میں ایک عضو معطل بن کر رہ گیا تھا۔ جب اس نے اصلاحِ احوال کی کوشش شروع کی تو اسے ایک سازش کے تحت موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ کابل شہر میں ایک محلہ اور

ایک مسجد اب تک وزیر اکبر خان کے نام سے موسوم ہیں۔

محمد شاہ خان کی جدوجہد: اکبر خان کی ناگہانی موت کے ساتھ ہی دوست محمد خان تمام جہادی رہنماؤں سے نجات پا گیا تھا۔ کابل میں اب کوئی مجاہد لیڈر باقی نہ رہا تھا۔ ہاں محمد شاہ خان جلال آباد میں موجود تھا جو صفِ اول کا مجاہد رہنما اور دوست محمد خان کا شدید مخالف تھا۔ اکبر خان کی زندگی تک وہ اُمید کا دامن تھامے رہا مگر اس کی دردناک موت کے بعد اسے حکومت سے حالات کے سدھرنے کی کوئی توقع نہ رہی۔ چنانچہ اس نے حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد کا آغاز کر دیا...... کابل اور ننگرہار کے درمیان بسنے والے غلجائی قبائل بھی اس کے ساتھ مل گئے۔

دوست محمد خان نے اس سے پہلے وزیر اکبر خان کو مکمل قابلیت کے باوجود محض اس لیے اپنا "ولی عہد" نامزد نہیں کیا تھا کہ کہیں انگریز ناراض نہ ہو جائیں۔ دوسری طرف کسی اور شہزادے کو "ولی عہد" بنانے کی صورت میں افغان عوام کے سخت ردِ عمل کا خطرہ تھا جو اکبر خان ہی سے اُمیدیں وابستہ کیے ہوئے تھے۔ چنانچہ دوست محمد خان نے اس موضوع کو چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور ولی عہدی کے بارے میں کوئی اعلان نہ کیا۔ مگر جوں ہی اکبر خان کو قتل کیا گیا اس نے ایک بیٹے "غلام حیدر خان" کو ولی عہد نامزد کر دیا اور اکبر خان کے ماتحت افواج بھی اس کے حوالے کر دیں۔ یوں دوست محمد خان نے غلام حیدر خان کو عسکری اُمور کا مکمل اختیار دے دیا۔ ادھر محمد شاہ خان حکومت کے خلاف جنگ چھیڑ چکا تھا۔ دوست محمد خان نے اسے گرفتار کرنے کے لیے بڑی کوششیں کیں مگر کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ 1847ء میں محمد شاہ خان نے سرکاری افواج کو ایک بڑے معرکے میں شکستِ فاش دے کر بھگا دیا۔

محمد شاہ خان کی جدوجہد جاری رہی۔ ممکن تھا کہ وہ دوست محمد خان کو مکمل شکست دے دیتا مگر اپریل 1848ء کے ایک معرکے میں گھمسان کی جنگ کے دوران اس کا دستِ راست عبدالعزیز خان اپنے سپاہیوں سمیت غداری کر کے سرکاری افواج سے جا ملا۔ اس سے میدانِ جنگ کا نقشہ پلٹ گیا۔ محمد شاہ خان کو بری طرح شکست ہوئی اور وہ میدانِ جنگ سے فرار ہونے پر مجبور ہو گیا۔ اس کی طاقت بکھر کر رہ گئی۔ محمد شاہ خان اپنے کنبے اور خاص مصاحبین کے ساتھ لغمان اور نورستان کے درمیان واقع بلند برفانی پہاڑوں کی طرف نکل گیا اور وہیں روپوش رہا۔

کھلی آمریت کا دور: اس واقعہ کے بعد اُفغانستان کے وہ جہادی رہنما اِک بھولی بسری داستان بن گئے جن کی شجاعت و بسالت نے ملک کو برطانوی سامراج کے چنگل سے نجات دلائی تھی۔ ملک اب ایک آمر کے ہاتھ میں تھا جو سابقہ کٹھ پتلی بادشاہ کی طرح اپنوں کے لیے گرم اور غیروں کے لیے نرم

تھا۔دوست محمد خان کی حکومت کا یہ دوسرا دور افغانستان کی سیاسی ابتری کے ساتھ ساتھ تعلیمی، معاشی واقتصادی زوال کا بھی بدترین مرقع تھا۔ 20 برس تک پستی اور تنزلی کا یہ سفرِ معکوس جاری رہا۔ ملک نے کسی بھی شعبے میں ترقی کی ایک منزل بھی نہ طے کی۔

دوست محمد خان نے ملک اپنے بیٹوں میں تقسیم کر کے مرکزیت کو تقریباً ختم کر دیا تھا۔ ہر بیٹا اور اس کے عمال زمین داروں، کسانوں، تاجروں اور صنعت کاروں سے بھاری مقدار میں ٹیکس وصول کر رہے تھے۔عوام کا استحصال ہو رہا تھا مگر مرکز اس سے لاتعلق تھا۔ حالات سے تنگ آ کر ملک میں جگہ جگہ مختلف سرداروں نے موقع بموقع بغاوت کی اور حکومت کے لیے پریشانی کا باعث بنتے رہے۔

1851ء میں محمود خان سریلی اور یار محمد خان نے خود مختاری کا اعلان کیا۔ 1852ء میں شبرغان کے عوام نے میر حکیم خان کے جھنڈے تلے جمع ہو کر بغاوت کی۔ 1854ء میں توخی اور ھوتک کے علاقے حکومت مخالف جدوجہد کا مرکز بنے رہے تاہم ان تمام مخالف قوتوں کو سختی سے کچل دیا گیا۔

<u>انگریزوں سے مزید معاہدے:</u> 1854ء میں دوست محمد خان نے انگریزوں کی مزید حمایت حاصل کر کے اپنا کمزور اقتدار مضبوط کرنا چاہا اور ولی عہد غلام حیدر خان کو بھیج کر انگریز گورنر جنرل جان لارنس سے دوستی کا نیا معاہدہ کیا جو ''معاہدہ جمرود'' کے نام سے مشہور ہے جس کے تحت انگریزوں نے دوست محمد خان کو ایسٹ انڈیا کمپنی سے مکمل تعاون کے وعدے پر افغانستان کے مقبوضہ علاقوں کا ''دائمی وارث'' تسلیم کر لیا۔اس سرپرستی کا وثیقہ حاصل کرنے کے بعد دوست محمد خان نے قندھار کی طرف توجہ دی جو کہ ملک سے الگ ایک چھوٹی سی آزاد ریاست بن کر بے انتہا بدانتظامی اور اندرونی کشاکشی کے دور سے گزر رہا تھا۔ وہاں کا والی کہندل خان مر چکا تھا اور شہر 14 کے لگ بھگ طالع آزماؤں کے مابین تقسیم ہونے والا تھا۔دوست محمد خان نے فوج کشی کر کے قندھار پر قبضہ کر لیا۔ادھر ہرات بھی آزاد تھا اور وہاں کے حاکم یار محمد خان کی موت کے بعد سیاسی بحران عروج پر تھا۔ 1856ء میں ایران نے اس سیاسی افراتفری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے فوج کشی کر کے ہرات پر قبضہ کر لیا۔دوست محمد خان کے پاس اپنے برطانوی آقاؤں کا سہارا موجود تھا۔اس نے فوراً انگریزوں سے ''جمرود'' میں ایک اور معاہدہ کر ڈالا جس میں ایران کو ہرات سے نکالنے کے لیے انگریزوں سے امداد لینے کا حق ثابت کیا گیا۔ بدلے میں اس خطے کے بارے میں انگریزوں کے کئی مطالبات تسلیم کر لیے گئے۔ 6 جنوری 1857ء کو دوست محمد کے ساتھ معاہدے پر دستخط ہوئے اور مارچ کے مہینے میں انگریزوں کے نمائندے محض مذاکرات کے ذریعے ایران کو ہرات سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔

ہرات میں سلطان احمد کی حکومت: مگر ایرانی فوج کے ہرات سے نکلتے ہی ایک عجیب واقعہ پیش آ گیا۔ دوست محمد خان کا داماد اور مجاہد رہنماؤں میں سے ایک اہم رہنما سلطان احمد خان، دوست محمد خان کے عتاب کے باعث ایک مدت تک ایران میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ ایرانیوں نے برطانیہ کے دباؤ پر ہرات خالی کر دیا ہے تو وہ دوست محمد کی فوج کے وہاں پہنچنے سے پہلے پہلے سرحد عبور کر کے ہرات میں داخل ہو گیا۔ عوام نے جو کہ دوست محمد سے نالاں تھے، اسے خوش آمدید کہا اور اسے اپنا حاکم مان لیا۔ اس طرح اس کا اقتدار مستحکم ہو گیا۔

5 سال تک اس نے اسلامی اقدار کی نگہداشت کرتے ہوئے مومنانہ آن بان سے ہرات پر حکومت کی، اس کی طاقت بڑھتی گئی حتیٰ کہ 1861ء میں اس نے فراہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ پورے اَفغانستان پر قابض ہو جائے گا۔ انگریزوں نے شروع شروع میں اس کی حکومت کی تائید کی اور اسے اپنا حلیف بنا کر سامراجی مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہا مگر سلطان احمد خان ایک غیور مسلمان تھا۔ اس نے انگریزوں کی پالیسیوں میں شرکت دار بننے سے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ انگریزوں نے اس کے خلاف سازشوں کا آغاز کر دیا کیونکہ سلطان احمد خان کسی وقت ان کے لیے موت ثابت ہو سکتا تھا۔

امیر دوست محمد خان جو سلطان احمد خان کو اپنے لیے سب سے بڑا حریف محسوس کر رہا تھا، اگست 1862ء میں ایک بڑا لشکر لے کر ہرات پہنچا۔ سلطان احمد خان نے محصور ہو کر بڑی بے جگری سے مقابلہ شروع کر دیا۔ کئی ماہ تک زبردست لڑائی جاری رہی۔ آخر شہر میں قحط کا سا سماں پیدا ہو گیا۔ بیماریاں پھیل گئیں اور مریضوں کی چارہ گری مشکل تر ہو گئی۔ خود سلطان احمد خان کی بیوی، دختر دوست محمد خان بیمار ہو کر چل بسی۔ جس کی نماز جنازہ کے لیے جنگ روک دی گئی اور دونوں متحارب فوجوں نے مل کر نماز جنازہ ادا کی۔

ہرات پر دوست محمد خان کا قبضہ: اس کے تین ماہ بعد 6 اپریل 1863ء کو سلطان احمد خان بھی سخت بیماری کی حالت میں عالم آخرت کو سدھار گیا۔ ہرات کے لوگوں نے اس کے باوجود مزید ایک ماہ تک دوست محمد خان کا مقابلہ کیا مگر آخر کار انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے۔ مئی 1863ء میں ہرات دوست محمد خان کے قبضے میں آ گیا۔ یوں ایک طویل عرصے بعد اَفغانستان دو اہم شہروں قندھار اور ہرات سمیت اپنے سابقہ رقبے تک وسیع ہو گیا۔

دوست محمد خان کا انتقال اور خانہ جنگی کا نیا دور: دوست محمد خان کو اس فتح کے بعد زیادہ دنوں تک اَفغانستان پر حکومت کا موقع نہ مل سکا۔ جون 1863ء میں اس کی زندگی کے دن پورے ہو گئے اور وہ اپنی وسیع سلطنت چھوڑ کر عالم ناپائیدار سے رُخصت ہو گیا۔ دوست محمد خان سردار پائندہ خان کے اٹھارہ

بیٹوں میں سے افغانستان کی سیاست پر سب سے زیادہ حاوی رہنے والا کردار تھا۔ شاہ شجاع کی طرح اس کی زندگی بھی عروج و زوال کا مرقع رہی۔ اسے کبھی تاج و تخت نصیب ہوا اور کبھی جلاوطنی ...... اسے ہم کبھی فاتحین کی صف میں دیکھتے ہیں تو کبھی وہ دشمن کے سامنے جھکے ہوئے کمزور حکمران کے روپ میں نظر آتا ہے۔ اس کا آخری دور بلاشبہ مطلق العنانیت کا دور تھا۔ اس کے سارے حریف ایک ایک کر کے ختم ہو گئے تھے اور انگریز سرکار کا سایہ اس کے سر پر تھا۔ افغانستان کے بعض مورخ اسے قومی ہیرو قرار دیتے ہیں جس نے ملک کو متحد کر کے قوم کو بکھرنے سے بچایا۔ تاہم انگریزوں سے وفاداری اور مجاہد رہنماؤں سے جابرانہ سلوک کا داغ اس کے دامن پر اس طرح لگا ہے کہ اسے مٹایا نہیں جا سکتا۔ علاوہ ازیں اس نے ملک کو اپنے درجنوں بیٹوں اور رشتہ داروں میں تقسیم کر کے عمال کو عوام کے مال پر بے محابا دست درازی کا جو موقع دیا اسے دیکھتے ہوئے اس کی حکومت کو قطعاً عوام دوست نہیں کہا جا سکتا۔

دوست محمد خان کے مرتے ہی اس کے بیٹوں میں اقتدار کی جنگ شروع ہو گئی اور یوں افغانستان اس خانہ جنگی کا شکار ہو کر رہا جس کی بنیاد دوست محمد خان اپنی اولاد میں صوبے تقسیم کر کے رکھ گیا تھا۔ اقتدار کی اس ہولناک جنگ میں دوست محمد خان کے جو بیٹے پیش پیش رہے تھے ان میں شیر علی خان، محمد اعظم خان اور محمد افضل خان قابل ذکر ہیں۔ محمد افضل خان کا دایاں بازو اس کا نوجوان بیٹا عبدالرحمن خان تھا۔ وہ اپنے باپ کی طرف سے ان جنگوں میں بھرپور انداز میں شریک رہا۔ یہی عبدالرحمن خان بعد میں امیر عبدالرحمن خان کے نام سے افغانستان کا مشہور حکمران بنا۔

نیا حکمران ...... شیر علی خان: دوست محمد خان کی اولاد کے مابین یہ خانہ جنگی 1863ء سے 1868ء تک لگاتار جاری رہی۔ ان لڑائیوں کی تفصیل میں جائے بغیر ہمارے لیے یہاں اتنا جان لینا کافی ہے کہ پانچ سالہ خانہ جنگی کا اختتام شیر علی خان کی فتح پر ہوا۔

شیر علی خان ایک مثبت سوچ رکھنے والا زیرک انسان تھا۔ خانہ جنگی سے نجات پانے اور پورے ملک پر قبضہ مستحکم کرنے کے بعد اس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اس ملک کی تعمیرِ نو تھا جو طویل عرصے سے اندرونی و بیرونی جنگوں کے باعث تباہ ہو چکا تھا۔ شیر علی خان نے سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے افغانستان کی سرحدوں کو وسیع کرنے کی کوشش نہ کی۔ وہ جانتا تھا کہ کمزور افغانستان اتنی وسعت کا بار نہیں اُٹھا سکتا۔ اس نے سرحدوں کو وہیں تک محدود رکھا جہاں تک وہ اس کے ہمسائے ممالک کے لیے قابل قبول تھیں۔ اگرچہ اسے اندرونی استحکام اور تعمیر و ترقی کی سمت میں کام کرنے کے لیے زیادہ مہلت نہ ملی تاہم چند برس میں اس نے بہت کچھ کر دکھایا۔ اس نے سابقہ دور کے محصولات کے ظالمانہ قوانین منسوخ

کر دیے۔عوام کوفوج کی ستم رانیوں سے محفوظ رکھنے کے لیےفوجی چھاؤنیاں اور بیرکیں شہروں سے دور بنوائیں۔کسانوں اور تاجروں کومراعات دے کرانہیں خوشحال کر دیا۔نئ صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی۔ تعلیم کے شعبے پر خاصی توجہ دی کیونکہ اس شعبے میں اَفغانستان دنیا سے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ملک کوئ ایجادات اور صنعت وحرفت سے روشناس کرایا۔اس دور میں پہلی بار اَفغانستان میں پریس لگایا گیااور 16 صفحے پر مشتمل ایک پندرہ روزہ اخبار ''شمس النھار'' کے نام سے چھپنے لگا جس کے مدیر حاجی محمد حسن خان تھے۔فوج کا نظام جدید خطوط پر استوار کیا گیا۔اسلحہ سازی کے کارخانے لگائے گئے جن میں توپیں اور بندوقیں تیار کی جاتی تھیں۔بارود کی صنعت کو بھی ترقی دی گئی۔

1870ء میں شیر علی خان نے کابل کے شمال میں شیر پور کے نام سے ایک نئ بستی کی تعمیر شروع کرائی جس کے حفاظتی انتظامات اپنی مثال آپ تھے اور دلکشی قابل دید تھی۔فصیل کی بلندی بیس فٹ تھی۔ایک ہزار انجینئر اور چھے ہزار کارندے پانچ سال تک مسلسل اس کام میں مشغول رہے......مگر انگریزوں سے جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے یہ کام مکمل نہ ہوسکا۔

سید جمال الدین اَفغانی: اس سے پہلے کہ ہم اَفغانستان اور برطانیہ کی اگلی جنگ کے حالات بیان کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک نامور اَفغان دانشور اور مفکر کا مختصراً ذکر کر دیا جائے جن کے افکار کے اثرات 19 ویں اور بیسویں صدی کی اِسلامی تحریکوں پر ثبت دکھائی دیتے ہیں۔دین کی سربلندی کے لیے ہر وقت کمر بستہ یہ شخصیت علامہ سید جمال الدین اَفغانی مرحوم تھے۔علامہ مرحوم 1838ء (1254ھ) میں اسعد آباد (کنڑ) میں پیدا ہوئے تھے۔وہ عالم اِسلام میں سیاسی بیداری اور مغربی استعمار سے اس کی آزادی کے لیے عمر بھر سرگرداں رہے۔وہ ایک بہترین ادیب اور شعلہ بیاں خطیب بھی تھے۔انہیں پشتو، فارسی، عربی، ترکی، روسی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ 16 سال کی عمر میں انہوں نے ہندوستان، عراق، شام اور حجاز کے اسفار کیے اور علوم دینیہ کے علاوہ یورپی فلسفے اور مغربی افکار ونظریات کا بھی گہرائی سے مطالعہ کیا۔

1857ء میں وہ وطن واپس آئے تو انہیں پنی قابلیت کی وجہ سے امیر دوست محمد خان کے دربار میں جگہ مل گئی،اس وقت ان کی عمر صرف 19 برس تھی۔دوست محمد خان نے توان کی صلاحیتوں سے خاطر خواہ استفادہ نہ کیا البتہ جب شیر علی خان حکمران بنا تو سید صاحب کے جوہر صحیح معنوں میں کھلے۔وہ گیارہ سال تک اَفغان دربار سے وابستہ رہے۔مگر بعد میں یہاں اقتدار کی کشاکشی اور اپنے مخالفین کی ریشہ دوانیوں سے تنگ آ کر وہ ہندوستان چلے آئے۔پھر زندگی کے مختلف ادوار میں مصر، ترکی، ایران،

فرانس، روس اور جرمنی میں اسلام کی سربلندی کے لیے متحرک رہے۔

سید صاحب کی زندگی کا لب لباب ''پان اِسلام ازم'' تحریک کی شکل میں سامنے آیا۔ جس کا مقصد عالم اِسلام کو ایک لڑی میں پرو کر استعماری طاقتوں کی بالادستی سے نجات حاصل کرنا تھا۔ اس تحریک نے پوری اِسلامی دنیا میں سیاسی بیداری پیدا کی۔ سید صاحب کو کئی بار مختلف ممالک سے جلاوطن کیا گیا، قید و بند کے مراحل سے گزارا گیا مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ فروری 1892ء میں لندن میں قیام کے دوران ایک اخبار جاری کیا۔ زندگی کے آخری پانچ سال مرکز خلافت استنبول میں گزارے اور 1897ء میں وہیں وفات پائی۔ سید صاحب کی تحریک اور افکار کے اثرات کا عکس اَفغانستان، ہندوستان، مصر، ترکی اور شام کے کئی مسلم زعماء کی سوچ میں واضح نظر آتا ہے۔

سید صاحب مغربی فکر و فلسفے کا مطالعہ کرتے کرتے تجدد پسندی کی طرف مائل ہو گئے تھے، اس لیے ان کی بہت سی آراء چودہ صدیوں کے ائمہ و فقہاء اور جمہور علماء کے خلاف تھیں۔ لہٰذا سید صاحب کی گراں قدر خدمات کے اعتراف کے باوجود جمہور علمائے امت ان کے متفردانہ افکار سے اتفاق نہ کر سکے۔

انگریزوں کی نئی چال: شیر علی خان کے دور میں انگریز اَفغانستان کی معاشی و اقتصادی ترقی کو حیرت سے دیکھ رہے تھے اور اس کی نو دمیدہ دولت کو دوبارہ لوٹنے کے لیے للچا رہے تھے۔ مگر وہ اپنے سابقہ زخم نہیں بھولے تھے اس لیے خواہش کے باوجود اب تک انہیں اَفغانستان پر دوبارہ یلغار کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں 1857ء کی جنگ آزادی کے اثرات بھی ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ اس تشویش کے باوجود لندن میں برطانوی پارلیمنٹ میں دو حریف بن چکے تھے۔ ایک اَفغانستان پر حملے کے حق میں اور دوسرا اس کے خلاف دلائل دے رہا تھا۔ آخر طے یہ پایا کہ پہلے سیاسی داؤ پیچ آزمائے جائیں۔

1869ء میں انگریزوں نے از سر نو اَفغانستان کے خلاف سازشوں کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے امیر شیر علی خان کو غیر ملکی دورے پر ہندوستان مدعو کیا تاکہ کچھ اہم اُمور پر گفتگو ہو سکے۔ یہ دعوت قبول کر لی گئی۔ امیر شیر علی خان نے 27 مارچ 1869ء کو انبالہ میں انگریز گورنر جنرل لارڈ میو سے روبرو ملاقات کی مگر اسے ٹوک انداز میں بتا دیا کہ میں اپنے باپ کے ان معاہدوں کی تجدید کے لیے نہیں آیا جن کے باعث اَفغانستان بے دست و پا ہو چکا تھا۔ میں نئے سرے سے کچھ معاہدے کرنا چاہوں گا۔ امیر شیر علی خان نے اب انگریزوں کے سامنے برابری کی بنیاد پر ہمسائیگی کے حقوق کی رعایت کے ساتھ کچھ نکات پیش کیے مگر انگریز ان پر رضامند نہ ہوئے۔ وہ اپنے ایک طرفہ مفادات پر مبنی نکات منوانا چاہتے تھے۔ چنانچہ کوئی معاہدہ طے نہ پا سکا اور شیر علی رسمی دورے کے بعد واپس آ گیا۔

برطانیہ اور روس کی چپقلش میں اَفغانستان تختہ مشق: انگریز 1857ء میں ہندوستان کے باشندوں کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد اپنی قوت بہت بڑھا چکے تھے۔ ہندوستان میں اب ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ براہ راست تاج برطانیہ کا اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ امیر شیر علی خان سے مذاکرات کی ناکامی کے بعد اب وہ ایک بار پھر اَفغانستان کے بارے میں اپنے ناپاک منصوبوں کی تکمیل کے لیے تیار تھے۔

اس دوران روس کی بڑھتی ہوئی طاقت جو پورے ایشیا کے لیے خطرہ بن چکی تھی انگریزوں کے لیے بھی پریشانی کا باعث تھی۔ زار روس ـ کے بعد دیگرے وسطِ ایشیا کی مسلم ریاستوں پر قبضہ کرتا جا رہا تھا۔ 1874ء میں اس نے خیوہ پر بھی قبضہ کر لیا جو ماوراء النہر کا قدیم اِسلامی شہر تھا۔ اب اس کی فوجیں اَفغانستان سے چند قدم کے فاصلے پر تھیں۔ اگرچہ زار روس نے اَفغانستان سے دوستانہ مراسم کی ابتدا کر دی تھی مگر یہ خطرہ بہرحال موجود تھا کہ روس مستقبل میں کسی وقت اَفغانستان کے لیے آتش فشاں کا لاوا ثابت نہ ہو۔

روس کے ہندوستان کی سرحدوں سے قریب تر ہو جانے کے بعد برطانیہ کو روس کی طاقت سے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ انگریز وائسرائے جنرل لیٹن نے اس موقع پر ضروری سمجھا کہ اَفغانستان میں برطانوی فوج کا ایک بڑا حصہ کوہ ہندوکش کے دامن میں مستقل طور پر فروکش رہے تاکہ اَفغانستان کی راہ سے روس کے ہندوستان پر ممکنہ حملے کے خطرے کا سدباب کیا جا سکے۔ یہ مقصد شیر علی خان کو رام کیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے سفارتی ذرائع سے اس کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ لیٹن اَفغانستان کی سیاست، تاریخ اور معاشرت پر گہری نظر رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اَفغانستان اب غیر جانب دار نہیں رہے گا۔ اس کا یہ قول مشہور تھا کہ "اَفغانستان یا تو برطانیہ کا سہارا لے گا یا روس کا۔"

پشاور میں جنوری 1877ء میں امیر شیر علی خان اور انگریزوں کے درمیان اَفغانستان میں انگریز افسران اور فوج کی تعیناتی پر طویل مذاکرات شروع ہوئے۔ امیر کے نمائندے صدر اعظم سید نور محمد خان نے آخر تک انگریزوں کی اَفغانستان میں دخل اندازی کی اس صورت کو قبول نہ کیا۔ صدر اعظم اَفغانستان کا نہایت دوراندیش اور تجربہ کار سیاست دان تھا۔ ان مذاکرات کی ناکامی کے فوراً بعد مارچ 1877ء میں وہ پشاور میں فوت ہو گیا۔ اَفغانستان کے سیاسی اُفق پر چھائے ہوئے نئے خطرات کے پیش نظر اس محب وطن وزیر کی موت ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔

روس کا اَفغانستان سے معاہدہ: ان مذاکرات کی ناکامی کے بعد برطانیہ اور اَفغانستان کے درمیان سرد مہری کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ سفارتی رابطوں میں کوئی سرگرمی باقی نہ رہی۔ اس کی جگہ روس کی بھرپور توجہ اَفغانستان پر مرکوز ہو گئی اور روسی سفیروں نے کابل آمد و رفت شروع کر دی۔ روسیوں کو اپنی کوشش

میں کامیابی ہوئی اور آخر کار روس اور افغانستان میں یہ معاہدہ طے پا گیا کہ اگر روس افغانستان سے گزر کر ہندوستان پر حملہ کرے تو افغانستان روس کا ساتھ دے گا۔ ہندوستان کی فتح کے بعد کشمیر، پنجاب، ڈیرہ جات، پشاور اور بلوچستان افغانستان کے صوبے قرار دیے جائیں گے۔

انگریز جاسوسوں کی سرگرمیاں: اُدھر انگریزوں کا جاسوسی نظام پوری مستعدی سے افغانستان میں کام کر رہا تھا۔ ان کا ایک جاسوس قاضی عبدالقادر خود شیر علی خان کا درباری تھا۔ ان تمام معاہدوں اور خط وکتابت کی اطلاع وہ مسلسل انگریزوں تک پہنچاتا رہا۔

امیر شیر علی خان نے اس موقع پر محسوس کیا کہ وہ انگریزوں سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے جنگ کی تیاری کے ساتھ اس کے کئی امراء کو خرید لیا تھا اور بعض کو بغاوت پر آمادہ کر دیا تھا۔ انگریزوں کے جاسوس پہلے ہی افغانستان میں موجود تھے جن کے ایک اشارے پر ملک کی سیاست میں بھونچال آ جاتا تھا۔

ان دنوں مزار شریف میں ''تغارہ شاہ'' نامی ایک شخص کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ وہ ایک تغاری میں نذرانے جمع کیا کرتا تھا اس لیے تغارہ شاہ کے لقب سے مشہور ہو گیا تھا۔ عوام تو عوام خواص بھی اس کے گرویدہ تھے۔ بہت سے وزراء بھی اس کے عقیدت مند تھے۔ اس کا گھر شہر سے باہر ویرانے میں تھا۔ یہ ایک عالی شان مکان تھا جس میں ہر راحت میسر تھی۔ جب تغارہ شاہ کی موت کے بعد اس مکان کی تلاشی لی گئی تو شراب کی بوتلیں اور دیگر لہو ولعب کا سامان برآمد ہوا جس سے اندازہ ہوا کہ ولی کے روپ میں کتنا بڑا جاسوس اور دشمنِ اِسلام چھپا ہوا تھا۔

شیر علی کا تذبذب: اگرچہ انگریزوں کو افغانستان سے 1841ء کی پسپائی اچھی طرح یاد تھی مگر اِن چار عشروں کی جدید ایجادات نے ان کی طاقت اتنی بڑھا دی تھی کہ وہ افغانستان کی فتح کے بارے میں پُرامید تھے۔ سابقہ مہم میں انگریز فوج کی اصل چھاؤنیاں جنوبی اور وسطی ہندوستان میں تھیں۔ درمیان میں پنجاب کا علاقہ سکھوں کی عملداری میں تھا اور یہاں ان کی کوئی چھاؤنی نہیں تھی۔ یہ تقریباً سات سو کلومیٹر کا فاصلہ انگریز فوج اور اس کے امدادی دستوں کو پیدل طے کرنا پڑتا تھا۔ مواصلات اور پیام رسانی کا ذریعہ قدیم طرز کا تھا مگر اب حالات خاصے بدل چکے تھے۔ یورپ کے صنعتی وسائنسی انقلاب نے اسے ایشیا سے بہت آگے پہنچا دیا تھا...... انگریزوں نے پورے ہندوستان میں ٹیلی گراف کی تاریں پھیلا دی تھیں...... ریلوے لائن بچھا دی گئی تھی۔ اب فیروز پور (مشرقی پنجاب) سے روانہ ہونے والے انگریز سپاہی چند گھنٹوں میں پشاور پہنچ سکتے تھے۔ پیغامات آناً فاناً بھیجے اور وصول کیے جا رہے تھے۔

سکھوں کی حکومت ختم ہو چکی تھی اور پورا پنجاب انگریزوں کے پاس تھا۔

دوسری طرف افغانستان کی حکومت کمزور اور عسکری وسائل قدیم تھے۔ اس ملک نے گزشتہ چار عشروں میں اسلحہ سازی میں کوئی خاص پیش رفت نہیں کی تھی۔ اگرچہ فوج کی تعداد پچاس ہزار کے لگ بھگ تھی اور تنظیم سابقہ دور سے بہتر تھی مگر افغانوں کے عسکری وسائل کا برطانیہ سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ وہ یورپ سے ایک صدی پیچھے تھے۔

یہ وہ اسباب تھے جن کے پیشِ نظر افغانستان میں انگریزوں کی دوبارہ عسکری مداخلت مشکل نہیں رہی تھی۔ شیر علی خان جو داخلی سطح پر افغانستان کو خوشحال بنانے کے لیے بہترین پالیسیاں طے کر کے اپنے اہداف پانے میں کامیاب رہا تھا، مدبّر ضرور تھا مگر بہادر اور حوصلہ مند نہیں۔ اس نے عسکری تیاریوں پر بھی حسبِ ضرورت توجہ نہیں دی تھی۔ ان کمزوریوں کی وجہ سے اب وہ خارجہ پالیسی میں دو بڑی طاقتوں کے درمیان جھول رہا تھا۔

<u>حملے کی تیاری اور مذاکرات:</u> انگریزوں نے بڑی تیزی سے افغانستان پر حملے کی تیاری شروع کر دی۔ دریائے سندھ پر ایک نیا پل تعمیر کیا گیا تاکہ فوج کو گزرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ کوئٹہ، بلوچستان اور وزیرستان سے راولپنڈی تک فوج کے لیے کوچ وقیام کا بندوبست ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے سیاسی نمائندے جنرل نوائل چیمبرلین اور سر لیوکیوناری ایک ہزار سواروں کے ساتھ 21 ستمبر 1878ء کو ہند افغان سرحد پہنچے جسے "علی مسجد" کہا جاتا تھا۔ امیر شیر علی خان انگریزوں کی جنگی تیاریوں سے پریشان ہو چکا تھا۔ اس کے نمائندوں نے سرحد پر آکر انگریزوں سے مذاکرات کیے۔ انگریزوں کا مطالبہ یہ تھا کہ روسی سفیروں کو افغانستان سے نکال دیا جائے، انگریز افسران کو افغانستان میں مستقل طور پر تعینات کیا جائے اور اپنی خارجہ پالیسی برطانیہ کی مشاورت سے طے کی جائے۔ اگر یہ بات مانی گئی تو برطانیہ افغانستان کو سالانہ 12 لاکھ روپے کی امداد دے گا...... بصورت دیگر جنگ ناگزیر ہے۔

<u>انگریزوں کی یلغار، خیبر کا محاذ:</u> شیر علی خان حالات کی سنگینی کے باوجود سمجھ رہا تھا کہ برطانیہ کی طرف سے جنگ کی تنبیہ محض ایک دھمکی ہے، اسے اندازہ نہیں تھا کہ برطانیہ حملے کا اٹل فیصلہ کر چکا ہے۔

21 نومبر 1878ء کو برطانوی فوج نے اچانک بیک وقت تین مقامات سے افغانستان کی سرحدیں عبور کر کے براہِ راست حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ افغان حکومت اپنے دفاع کے لیے عسکری بلکہ ذہنی طور پر بھی تیار نہ ہو سکی۔ شیر علی خان نے مقابلہ ناممکن تصور کرتے ہوئے اپنی فوج کو برطانوی افواج کے مقابلے میں ڈٹ جانے کی بجائے گریز پائی کی تاکید کی۔ وہ قوم کو اطمینان دلا رہا تھا کہ برطانیہ

کو مذاکرات کے ذریعے انخلاء پر آمادہ کرلیا جائے گا۔ اس سفیہانہ پالیسی کی وجہ سے کہیں بھی صحیح معنوں میں برطانوی افواج کا مقابلہ نہ کیا جاسکا اور بڑے بڑے شہر آناً فاناً ہاتھ سے نکلتے چلے گئے۔ جنرل براؤن اور جنرل میڈ کو جلال آباد پر قبضہ کرنے کا ہدف دیا گیا تھا۔ انہوں نے ''درۂ خیبر'' عبور کر کے 21 نومبر کو سرحدی چوکی علی مسجد پر حملہ کردیا۔ افغان سپاہیوں نے جم کر مقابلہ کیا اور جنرل براؤن کو پسپا کردیا مگر اس دوران انگریزوں کو مزید کمک پہنچ گئی اور 22 نومبر کو علی مسجد پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔

افغانوں نے اپنی فوج کی شکست کے باوجود ہار نہ مانی اور آفریدی قبائل نے برطانوی فوج پر شب خون کا سلسلہ شروع کردیا۔ مہمند اور شنوار قبائل بھی اٹھ کھڑے ہوئے، ساتھ ہی بونیر اور سوات کے علماء نے بھی جہاد کا اعلان کردیا۔ دشمن کی رسد کے قافلے اور بار برداری کے جانوران کا خاص نشانہ تھے۔ آفریدیوں نے اس محاذ پر اس تواتر سے چھاپہ مار حملے کیے کہ انگریز کچھ عرصے کے لیے رسد و برداری کے جانوروں سے محروم ہوگئے۔

اس دوران جنرل براؤن نے تیزی سے آگے بڑھ کر جلال آباد پر قبضہ کرلیا جہاں افغان حکومت کے دفاعی انتظامات نہ ہونے کے برابر تھے۔ مقامی لوگ بہر طور انگریزوں کے آگے سر جھکانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جلال آباد کے سقوط کی خبر سن کر لغمان سے عصمت اللہ خان قبائلیوں کی ایک جماعت لے کر برطانوی فوج سے لڑنے آن پہنچا اور بہت سے مجاہدین اس کے گرد جمع ہوگئے مگر جب دوبدو مقابلہ ہوا تو یہ شمشیر زن بہادر، دور مار برطانوی توپوں کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور شدید نقصانات اٹھا کر پسپائی پر مجبور ہوگئے۔

قندھار کا محاذ: جنرل ڈونلڈ اسٹوارٹ اور جنرل بیڈولوف کوئٹہ اور چمن کے راستے قندھار پہنچ گئے۔ حاکم قندھار سردار افضل خان برطانوی فوج کی آمد کی خبر سن کر فرار ہوگیا۔ مقامی لوگوں کی زبردست مزاحمت کے باوجود برطانوی فوج نے قندھار پر قبضہ کرلیا۔ نواب غلام حسین کو یہاں کا کٹھ پتلی حاکم اور سینٹ جان ڈیوڈ کو گورنر مقرر کردیا گیا۔

قندھار کو قابو میں دیکھ کر جنرل اسٹوارٹ نے فوج کے ایک حصے کے ساتھ قلات پر اور جنرل بیڈولف نے 'گرشک' پر قبضہ کرلیا۔ تاہم اس دوران قندھار کے گرد و نواح کے تمام قبائل انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے گوریلا جنگ شروع کر کے، جنوبی افغانستان میں انگریز افواج کی آزادنہ نقل و حرکت ناممکن بنادی۔ برطانوی فوج نے شدید نقصانات اٹھانے کے بعد خود کو قندھار کی فصیل میں محصور کرلیا۔ قبائلی ان کی خوراک و رسد کے قافلوں پر چھاپے مارتے اور بار برداری کے جانوروں کو لوٹتے اور مارتے رہے۔ قندھار کے گرد نقل و حمل کے جانوروں کی اتنی لاشیں گریں کہ شہر میں تعفن پھیلنے لگا۔

درجِ ذیل چند واقعات سے قندھار کے مسلمانوں کی جرأت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

- ایک قندھاری موچی انگریز افسر سینٹ جان پر ٹوٹ پڑا۔ قریب تھا کہ انگریز جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا، ایک ہندوستانی ملازم نے اسے بچالیا۔ موچی کو مجمع عام میں شہید کر دیا گیا۔
- نور احمد قندھاری نامی ایک جوان نے تنہا حملہ کر کے کئی انگریز قتل کیے۔
- غلجائی قبیلے کا ایک لکڑہارا اپنے دو بیٹوں سمیت انگریزوں کی مرتب فوج پر جھپٹ پڑا، سات گوروں کو قتل اور چار کو شدید زخمی کرنے کے بعد اپنے بیٹوں کے ساتھ شہادت کی منزل کو پہنچا۔
- قندھار کے ایک مدرسے کے پانچ طالب علموں نے فوجی مشقوں اور پریڈ میں مصروف انگریز سپاہیوں پر حملہ کیا اور تین انگریزوں کو جہنم رسید کر کے شہید ہو گئے۔
- ایک قندھاری جوان چھری لے کر برطانوی توپ خانے کے افسر پر چڑھ دوڑا۔ اسے موت کے گھاٹ اُتار کر مزید تین انگریزوں کو مار ڈالا اور خود شہادت کا رُتبہ پا گیا۔

برطانوی فوج معاہدہ گندمک تک بڑی مشکلات کے ساتھ قندھار میں پناہ گزین رہی۔ معاہدہ ہوتے ہی وہ شہر خالی کر کے ہندوستان لوٹ گئی۔

کرم ایجنسی: جنرل فریڈرک رابرٹس کرم ایجنسی کے راستے سے اَفغانستان میں داخل ہو کر تمام اہم شہروں کو فتح کرنے پر مامور تھا۔ 21 نومبر 1878ء کو اس کی فوج بھی ''ٹھل'' کے راستے سے کرم ایجنسی میں داخل ہو گئی، شیر علی خان کی تاکید پر اَفغان فوج پہلے ہی یہ علاقہ خالی کر چکی تھی اس لیے برطانوی فوج نے بلا مزاحمت یہاں قبضہ کر لیا۔ البتہ ''پیواڑ'' کے پہاڑوں میں کریم خان، گل محمد خان اور عبدالعلی خان نے اپنے جانبازوں کے ساتھ سخت مقابلہ کیا اور خاصا نقصان اٹھا کر پسپائی پر مجبور ہوئے۔

رابرٹس نے علاقے میں اعلان کرا دیا کہ ''ٹھل'' سے شتر گردن تک تمام علاقہ اب برطانوی سرکار کا ہے۔ یہ منادی بھی کی جا رہی تھی کہ انگریز گورنمنٹ کسی کے مذہب میں مداخلت نہیں کرے گی، لہٰذا علماء کو بھی سیاست میں دخل دینے کی اجازت نہیں ہے۔ عوام کو یہ بھی سمجھایا جا رہا تھا کہ انگریزوں کی جنگ اَفغان عوام سے نہیں، شیر علی خان سے ہے لہٰذا وہ جنگ میں شریک ہونے کی غلطی نہ کریں۔ اس صورتحال میں شیر علی خان نے 10 دسمبر 1878ء کو کابل میں ایک بڑی کانفرنس منعقد کی جس میں درباری امراء، سیاسی رہنما، عمائد اور عوامی نمایندے بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ ان کی بڑی تعداد برطانیہ کو اَفغانستان میں داخل ہوتا دیکھ کر جہاد کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ شیر علی خان بھی مقابلے کے لیے آمادہ تھا مگر روس کی مدد کے بغیر وہ اتنی بڑی جنگ لڑنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے کانفرنس میں اعلان

کیا: ”میں بلخ کے راستے روس جارہا ہوں تاکہ ایک بین الاقوامی کنونشن منعقد کر کے افغانستان کے حقوق کا تحفظ کرسکوں۔“

یہ اعلان سن کر حاضرین نے بیک زبان کہا: ”نہیں نہیں! یہ درست نہیں، آپ یہیں رہیے۔ ہم خود اپنی تلواروں سے انگریزوں کو مار بھگائیں گے۔“

مگر شیر علی خان نے کسی کی بات نہ مانی۔ اس نے فی الحال انگریزوں سے جنگ نہ چھیڑنے کا حکم دیا اور ایک بڑے قافلے کے ساتھ فوراً شمالی افغانستان کے راستے روس روانہ ہوگیا۔

بلخ پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ حاکمِ بلخ فیض محمد خان راستہ روکے کھڑا ہے۔ حاکم بلخ کا کہنا تھا: ”ہم بادشاہ کو غیر ملک نہیں جانے دیں گے۔ پرچمِ جہاد بلند کریں گے اور انگریزوں سے لڑیں گے۔“

فیض محمد خان کا یہ عندیہ زمینی حقائق کے مطابق تھا کیوں کہ دو مہینوں سے قبائلیوں نے سرکاری افواج کی مدد کے بغیر صرف اپنے جذبہ جہاد کے بل بوتے پر برطانوی افواج کو جلال آباد، خوست اور قندھار کے گرد و نواح میں روک رکھا تھا۔ تازہ خبروں کے مطابق خوست میں رابرٹس کو شکست ہو چکی تھی۔ جنرل رابرٹس نے جو کہ کرم ایجنسی کی طرف سے ایک بڑی فوج لے کر مشرقی افغانستان میں گھسا تھا، شروع شروع میں کئی کامیابیاں حاصل کی تھیں، غدارانِ ملت کو ساتھ ملا کر وہ کئی علاقوں پر قبضہ کر چکا تھا۔ خوست کے حاکم محمد اکرم خان نے بھی اپنا علاقہ تمام جنگی نقشوں سمیت کسی مزاحمت کے بغیر اسے تحفے میں پیش کر دیا تھا مگر خوست کے قبائلی زعماء یہ برداشت نہ کرسکے۔

17 جنوری 1879ء کو منگل، وزیر، جدران، محسود اور علی خیل قبائل کے بہادر پہاڑوں سے طوفانی ریلے کی طرح نیچے اُتر کر انگریز فوج پر ٹوٹ پڑے اور کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ انگریز فوج بے تحاشا نقصانات اُٹھا کر خوست سے نکل گئی اور دوبارہ کرم ایجنسی میں کیمپ لگا لیا۔ پسپا ہوتے ہوئے جنرل رابرٹس نے سلطان جان نامی ایک کٹھ پتلی سردار کو خوست کا حاکم بنا دیا تھا۔ قبائلیوں نے اُس قلعے پر بھی حملہ کر دیا جس میں یہ غدار ٹھہرا ہوا تھا۔ رابرٹس نے قبائلیوں کا حملہ فرو کرنے کے لیے دوبارہ لشکر کشی کی مگر مجاہدین کا جوابی حملہ اتنا شدید تھا کہ رابرٹس کو اپنا مال و اسباب چھوڑ چھاڑ کر دوبارہ کرم کی طرف بھاگنا پڑا۔ اس طرح خوست کو انگریزوں سے آزاد کرا لیا گیا۔

خیبر سے افغانستان میں داخل ہونے والے جنرل براؤن اور جنرل میڈ کے لشکر کو بھی ننگر ہار میں سخت مزاحمت کا سامنا تھا اور ان کو خوراک و رسد کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ محسودی اور وزیر قبائل کے چار ہزار بندوق برداروں نے ٹانک میں ان کی ایک پلٹن پر حملہ کر کے اسے تہس نہس کر دیا تھا۔ کوہاٹ میں

بھی انگریزی فوج پر زبردست حملے ہوئے تھے۔ انگریزوں کی مرکزی کمان کی طرف سے چھے ہزار سپاہیوں کی امدادی فوج نے آکر بمشکل قبائلیوں کے ان لشکروں کو پسپا کیا تھا۔ اُدھر قندھار میں پناہ گزیں انگریز فوج کے پاس ادویات ختم ہو چکی تھیں۔ حالات اُفغانوں کے لیے حوصلہ افزا تھے۔ اس کے ساتھ اگر قبائلی مجاہدین کو سرکاری فوج کی مدد مل جاتی تو برطانیہ کے قدم بہت جلد اکھڑ سکتے تھے مگر یہ کامیابیاں اور نصرتِ الٰہیہ کے یہ مناظر بھی شیر علی خان کا حوصلہ نہ بڑھا سکے۔ اس نے پہلے برطانیہ پر بھروسہ کیا تھا اور اب روس کی مدد کے بغیر اسے فتح کی امید نہیں تھی۔

غرض شیر علی خان نے آمو دریا کے کنارے ڈیرے ڈال کر حکومتِ روس کے ساتھ رابطے کیے اور اسے اپنا مدعا سمجھانے کی کوشش کی مگر اسے مایوس کن جواب ملا۔ روس نے کسی قسم کی مدد سے صاف انکار کر دیا اور خلافِ توقع اسے مشورہ دیا کہ وہ انگریزوں سے دوستی کر لے۔ ادھر اندرونِ ملک صورتحال یہ تھی کہ حکومت کی طرف سے قلعہ داروں اور حاکموں کو مزاحمت نہ کرنے کی تاکید نے انگریزی افواج کے لیے تمام راستے کھول دیے تھے اور عوام بادشاہ کی ناسمجھی پر برافروختہ تھے۔ ان حالات سے مایوس ہو کر شیر علی خان اتنا دل برداشتہ ہوا کابل واپسی کی ہمت بھی نہ کر سکا اور بستر سے لگ گیا۔ 21 فروری 1879ء کو یہ 56 سالہ حکمران دنیا سے رُخصت ہو گیا۔

<u>ایک اور بزدل حکمران یعقوب علی خان:</u> امیر شیر خان کی کابل سے روانگی سے قبل اس کے درباریوں اور عوامی نمایندوں نے اس سے درخواست کی تھی کہ وہ ملک چھوڑ کر جانے سے پہلے اپنے جانشین کا مسئلہ صحیح انداز سے طے کرتا جائے۔ دراصل شیر خان نے اپنے جس بیٹے کو ولی عہد نامزد کیا تھا وہ کم عمر تھا جبکہ اس کا نوجوان بیٹا یعقوب علی خان باپ سے اختلاف اور حکم عدولی کی پاداش میں سالہا سال سے جیل خانے کی اذیتیں برداشت کر رہا تھا۔ امیر شیر علی کے تمام بیٹوں میں وہی سب سے زیادہ لائق شمار ہوتا تھا۔ اس نے بڑے بڑے معرکوں میں اپنی بہادری کا لوہا منوایا تھا۔ جنگوں میں وہ زرہ بکتر پہن کر خود اپنے سپاہیوں کی قیادت کرتا اور دشمنوں سے دست بدست مقابلہ کیا کرتا تھا۔ اس کی شجاعت کے باعث اُفغان عوام اسے ''شیر بچہ'' کہہ کر یاد کرتے تھے۔

قبائل کے عمائد اور سرکاری امراء کو یقین تھا کہ یعقوب علی خان کو حکومت مل گئی تو سابقہ کارکردگی کے مطابق وہ اُفغانوں کا نجات دہندہ ثابت ہو سکے گا اور انہیں انگریزوں کے خطرے سے نجات دلا سکے گا۔ چنانچہ انہوں نے امیر شیر علی خان سے بیک آواز ہو کر یعقوب علی خان کی رہائی اور جانشینی کی درخواست کی تھی۔ امیر شیر علی خان اس متفقہ تحریک کو رد نہ کر سکا اور جاتے جاتے یعقوب خان کی جانشینی کا اعلان کر گیا۔

مگر شیر علی خان کے مرنے کے بعد مارچ 1879ء میں جب یعقوب علی خان کابل کے تخت پر بیٹھا تو عوام نے دیکھا اس یعقوب علی خان میں ایسی کوئی بات نہیں رہی تھی جس سے وہ کسی خیر کی اُمید کرتے ......سات سالہ قیدِ تنہائی کی صعوبتوں نے ''شیر بچہ'' کو نڈھال کر دیا تھا......وہ نہ صرف جسمانی طور پر نہایت لاغر ہو چکا تھا بلکہ کئی دماغی امراض میں مبتلا تھا۔ اسلحہ دیکھ کر اس کی رنگت تبدیل ہو جاتی تھی اور خوف و ہراس کی ایک کیفیت اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھی۔

انگریزوں کے تین بنیادی مقاصد: انگریز جو کہ کابل پر حملے کے لیے تلے بیٹھے تھے یعقوب علی خان جیسے کمزور حکمران کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد مطمئن ہو گئے کہ اب ان کا مقصد کسی جنگ کے بغیر حاصل ہو جائے گا۔

اس وقت انگریزوں کے بنیادی مقاصد تین تھے: ❶......ہندوستان اور اُفغانستان کے درمیان راہداری کے تینوں اہم راستوں یعنی درہ بولان، درہ خیبر اور درہ کرم کو اپنی تحویل میں لینا۔ ❷...... اُفغانستان سے ملحقہ ان قبائل کو جو کہ پشاور سے خیبر اور جلال آباد تک پھیلے ہوئے ہیں، اُفغانستان سے کاٹ کر اپنی عملداری میں داخل کر لینا۔ ❸......اُفغانستان میں روس کے اثر ورسوخ کے خاتمے اور اپنی سیاسی مداخلت کے استقلال کی راہ ہموار کرنا۔

معاہدہ گندمک: ان مقاصد کے تحت انگریز نمائندوں نے 2 مئی 1879ء کو یعقوب علی خان سے مذاکرات شروع کر دیے۔ یعقوب علی خان اتنا کمزور دل اور بے حوصلہ تھا کہ اس نے مذاکرات کے آغاز میں ہی تمام شرائط من وعن قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی مگر اس کے امراء نے اسے بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر چپ کرایا اور خود بادشاہت کی نیابت میں سفارت کارانہ حربوں کے ساتھ انگریزوں سے بات چیت شروع کی۔

مذاکرات نے طول کھینچا، 15 دن تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ آخر انگریز حکام پینترا بدل کر اس نکتے پر اڑ گئے کہ ہم براہ راست بادشاہ سے بات کریں گے۔ اُفغان امراء کے منع کرنے کے باوجود یعقوب علی خان اس پر رضامند ہو گیا کیوں کہ وہ ہر قیمت پر جنگ رکوانا چاہتا تھا۔ انگریزوں کو یقین تھا کہ یعقوب علی خان ان کی ہر شرط مان لے گا چنانچہ انہوں نے اپنی شرائط مزید سخت تر کر دیں۔

26 مئی 1879ء کو یعقوب علی خان نے انگریز سفارت کاروں سے خود گفتگو کی اور کسی حیل وحجت کے بغیر ان کی شرائط پر اپنے دستخط کر دیے۔ یہ دستاویز ''معاہدہ گندمک'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدے کے تحت درج ذیل تبدیلیاں وجود پذیر ہوئیں۔

1. اَفغانستان برطانوی گورنمنٹ کے مستقل حلیفوں میں شامل ہوگیا۔
2. اَفغان حکومت اپنی تمام خارجہ پالیسیاں برطانوی حکام کے مشورے (یعنی ان کی اجازت) سے طے کرنے کی پابند ہوگئی۔
3. اَفغانستان میں برطانیہ کا سیاسی اثر ورسوخ برقرار رکھنے اور اسے روز افزوں ''ترقی'' دینے کے لیے برطانوی سفارت اور عہدے داروں کو محافظ گورے سپاہیوں کی بھاری تعداد کے ساتھ اَفغانستان میں رہنے کی اجازت مل گئی۔
4. خیبر، کرم، پشین، سبی اور بولان کے علاقے انگریزوں کی تحویل میں چلے گئے۔
5. پشاور اور جلال آباد کے درمیانی قبائل انگریزوں کی عملداری میں آگئے۔
6. حکومت اَفغانستان سابقہ یا موجودہ دور میں انگریزوں کے لیے کام کرنے والے تمام غداروں کی سزائیں معاف کرنے کی پابند ہوگئی۔

چوں کہ معاہدے کے مطابق جلال آباد، ننگرہار اور قندھار اَفغانستان کے علاقے تسلیم کر لیے گئے تھے، اس لیے برطانوی فوج ان علاقوں سے نکل گئی۔

لندن میں جشن: معاہدہ گندمک اَفغانستان کی تاریخ کا ایک سیاہ ورق ہے جس نے اس ملک میں غیر ملکی مداخلت کے راستے چوپٹ کھول دیے۔ اس صلح نامے سے اہلِ اَفغانستان پر سکوتِ مرگ طاری ہوگیا جبکہ کلکتہ اور لندن میں اسے عظیم فتح قرار دے کر بہت بڑا جشن منایا گیا۔ لندن کے پارلیمنٹ میں ڈسرائیلی نے عوامی نمایندوں کو برطانیہ کی جیت کی خوشخبری سناتے ہوئے کہا: ''ہماری اس جنگ کا مقصد اَفغانستان کی سرحدوں کی اصلاح تھا۔ اس معاہدے سے یہ مقصد حاصل ہوگیا ہے۔ اَفغانستان کی تینوں شاہراہیں اب ہماری ملکیت میں ہیں اور خود اَفغانستان بھی برطانوی عملداری میں شامل ہوا چاہتا ہے۔''

مآخذ و مراجع

- ...... اَفغانستان در مسیر تاریخ۔ میر غلام محمد غبار
- ...... سراج التواریخ۔ مرزا فیض محمد خان
- ...... Encyclopedia of Islam.V.1
- ...... اردو دائرہ معارف اِسلامیہ ۔ناشر: دانش گاہ، پنجاب یونی ورسٹی

اٹھارہواں باب

برطانیہ کے خلاف جہادی تحریک

معاہدہ گندمک کے ایک ماہ بعد انگریزوں کی سفارت کابل پہنچ گئی، اس کا سربراہ سرلوئی کیوکنری تھا۔ اس سفارت میں بڑے بڑے انگریز افسران اور سفارتی ماہرین بھی شامل تھے۔ ان کے ساتھ گورے سپاہیوں کا محافظ دستہ بھی تھا۔ یہ سفارت کار دراصل بادشاہ پر انگریز سرکار کا مسلسل دباؤ ڈالنے اور اسے انگریزوں کا بندۂ بے دام بنا کر افغانستان پر غیر عسکری تسلط کا خواب پورا کرنے آئے تھے۔ انہیں قلعہ بالا حصار کی ایک شاندار عمارت میں زبردست مراعات کے ساتھ رہائش دی گئی۔ کچھ دنوں کے بعد انہوں نے پر پرزے نکالنا شروع کر دیے۔ سرلوئی براہ راست بادشاہ پر اثر انداز ہونے لگا۔

سرلوئی کا قتل: بزدل یعقوب علی خان پہلے ہی حکومتِ برطانیہ سے سہا ہوا تھا۔ اب وہ ان مستقل رہائش پذیر انگریز نمایندوں کو اپنے درباریوں اور عمائد سلطنت سے بڑھ کر اہمیت دینے لگا۔ یہ صورت حال افغان امراء اور عوام کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ وہ معاہدہ گندمک کے باعث پہلے ہی زخم خوردہ تھے۔ اب کابل کے شاہی قلعے میں انگریزوں کا راج ان کی غیرت پر ضرب لگا رہا تھا۔ آخر 3 ستمبر 1879ء کو کابل کے عوام کے غیظ وغضب کا لاوا پھٹ پڑا۔ افغان سرکاری فوج کے چند دستے جن کی قیادت کریم خان نامی ایک افسر کر رہا تھا، قلعہ بالا حصار میں جمع ہو کر برطانوی تسلط کے خلاف آواز بلند کرنے لگے۔ ہزاروں شہری بھی ان کے ہمنوا ہو گئے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اگر انگریز سفیر اور ان کا عملہ فوراً کابل سے نہ نکلا تو انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

برطانوی سفیر لوئی کیوکنری یہ دیکھ کر سہم گیا، اس نے فوراً امیر یعقوب علی خان کو پیغام بھیج کر اپنی حفاظت کی التجا کی۔ امیر نے سپہ سالار داؤد خان کو تاکید کی کہ وہ فوراً جا کر مجمعے کو منتشر ہونے کا حکم دے۔ سپہ سالار نے جوں ہی مجمعے کے روبرو ہو کر سرکاری فرمان سنانے کی کوشش کی، لوگ اس پر پل پڑے اور اسے گھوڑے کی زین سے کھینچ کر لاتوں اور گھونسوں سے اس کی خوب تواضع کی۔ اس صورتحال سے لوئی

کیوکنری کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، اس نے امیر یعقوب سے مطالبہ کیا کہ اس کی حفاظت کے لیے بڑی تعداد میں سپاہی بھیجے جائیں۔ امیر نے اپنے سسر سردار یحییٰ خان اور اپنے ولی عہد موسیٰ خان سمیت کئی نامور درباری امراء کو مظاہرین کے پاس بھیجا۔ ان عمائد نے قرآن مجید کا واسطہ دے کر اور قسمیں کھلا کر انہیں احتجاج ختم کرنے کی تلقین کی مگر مظاہرین نہ مانے اور برطانوی سفارت خانے کی طرف بڑھنے لگے۔ مظاہرین کی بڑی طاقت ان میں شامل سرکاری مسلح سپاہی تھے۔ کیوکنری کے نائب جینکنز نے اس موقع پر انہیں ورغلانے کے لیے سفارت خانے کے ایک ملازم تیمور شاہ کو کہا کہ وہ مظاہرین کے لیڈر کریم خان کو پیش کش کرے کہ اگر مجمع منتشر ہو جائے تو برطانوی سفارت خانے کی جانب سے افغان فوج کے ہر سپاہی کو چھ ماہ کی تنخواہ کے بقدر روپیہ دیا جائے گا۔ تیمور شاہ دوڑتا ہوا گیا مگر یہ پیغام کریم خان تک پہنچانے کی بجائے خود مظاہرین میں شامل ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس مجمعے نے برطانوی سفارتخانے اور سفیروں کی رہائشی عمارتوں کو گھیر کر اندھادھند حملہ کر دیا۔ لوئی کیوکنری سمیت تمام سفارت کاروں کو موقع پر ہی قتل کر دیا گیا اور سفارت خانے کو ان کی لاشوں سمیت نذرِ آتش کر دیا گیا۔

یہ افغان عوام کی طرف سے برطانیہ کے منہ پر اتنا زبردست طمانچہ تھا کہ اس کی گونج نے پوری دنیا میں بھونچال مچا دیا۔ ٹیلی گراف کے ذریعے یہ خبر چند منٹ میں لندن پہنچ گئی۔ وہاں سے وائسرائے ہند لارڈ لیٹن کو تاکید کی گئی کہ برطانیہ کی اس بے عزتی کا فوری انتقام لیا جائے۔ یہ اطمینان بھی دلایا گیا کہ کمک کے لیے تازہ افواج روانہ کی جارہی ہیں۔ وائسرائے ہند کی طرف سے کابل کے واقعے کو غلط رنگ دینے کی کوشش کی گئی اور کہا گیا کہ افغان فوجیوں نے چھ ماہ کی تنخواہیں بیک وقت لینے کے لیے مظاہرہ کیا تھا اور مطالبہ تسلیم نہ کیے جانے پر انہوں نے آپے سے باہر ہو کر سفیروں کو قتل کیا۔ ساتھ ہی اعلان کر دیا گیا کہ برطانیہ کابل میں فوج بھیج رہا ہے۔

برطانیہ کا اعلانِ جنگ: جنرل فریڈرک رابرٹس احکام ملتے ہی بھاری نفری کے ساتھ کابل کی طرف روانہ ہو گیا، اس کے ساتھ جنرل میسی، جنرل بیکر اور جنرل میک فرسن بھی تھے۔ وہ راستے میں اعلان کرتے جارہے تھے کہ یہ لشکر کشی امیرِ کابل یعقوب علی خان کی درخواست پر افغان حکومت کے استحکام کی خاطر کی جارہی ہے۔

اُدھر جنرل اسٹوارٹ جنوبی افغانستان میں داخل ہو چکا تھا۔ قندھار کے حاکم سردار شیر خان، نے بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شہر فوراً اس کے حوالے کر دیا اور خود سلطنتِ برطانیہ کے ملازم کے طور پر شہر کی حکومت دیے جانے کی درخواست کی جو قبول کر لی گئی اور اسی کو قندھار کا والی مقرر کر دیا گیا۔ کم ہمت

شاہ اُفغانستان یعقوب علی خان کے پیروں تلے سے زمین نکل چکی تھی اور اسے انگریزوں کے ہاتھوں اپنی موت سامنے نظر آرہی تھی۔ اسے اپنی کمزوریوں اور برطانوی فوج کی قوت کا پورا اندازہ تھا اس لیے وہ مقابلہ بے سود سمجھتے ہوئے مذاکرات کرنا چاہ رہا تھا۔

اس نے اپنے وزیر اعظم حبیب اللہ خان اور وزیرِ خارجہ مرزا شاہ محمد کو انگریز حکام کے پاس بھیجا جنہوں نے 21 ستمبر 1879ء کو جنرل رابرٹس سے ملاقات کر کے درخواست کی کہ انگریز فوج کشی نہ کریں کیوں کہ حکومتِ اُفغانستان خود برطانوی سفیروں کے قاتلوں کو گرفتار کر کے عبرت ناک سزا دے گی۔ مگر انگریزوں نے اس درخواست کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ چند دنوں بعد رابرٹس کو یعقوب علی خان کا مکتوب موصول ہوا جس میں اس نے گوروں کا غیظ وغضب کم کرنے کے لیے بڑی عاجزی سے کام لیتے ہوئے لکھا تھا: ''میں جانتا ہوں کہ برطانوی فوج کی آمد میری حکومت کے استحکام کے لیے ہے، اسی لیے میں نے تمام حکام کو آپ کی راہ میں مزاحمت سے منع کر دیا ہے۔''

رابرٹس کو لوگر کے علاقے میں مقامی لوگوں کے کچھ حملوں کے سوا کہیں کوئی مزاحمت پیش نہ آئی اور پانچ اکتوبر کو وہ کابل کے قریب پہنچ گیا۔ بدقسمت حکمران یعقوب علی خان اس کے استقبال کے لیے اپنے سات سالہ ولی عہد، فوج کے سپہ سالار اور دو سو سواروں کو لے کر کابل سے باہر آیا مگر جو کچھ ہوا، وہ خلافِ توقع تھا۔

<u>حکمرانِ اُفغانستان حراست میں:</u> جنرل رابرٹس نے ہاتھ آئے دشمن کو جانے نہ دیا اور بدترین بے اُصولی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شاہ اُفغانستان کو گرفتار کر لیا۔ 6 اکتوبر 1879ء کو برطانوی فوج کابل کے نواح میں پہنچی اور وہاں کیمپ لگایا۔ یعقوب علی خان کچھ دنوں تک یہاں انگریزوں کی تحویل میں رہا۔

<u>عوامی مزاحمت:</u> جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ اس دوران انگریزوں کے خلاف اگر کوئی مزاحمت ہو رہی تھی تو وہ علمائے کرام کے اعلانِ جہاد اور قبائلی سرداروں کی غیرت مندی کا نتیجہ تھی۔ اُفغانستان کے علماء ایک بار پھر جہاد کا نعرہ لگا رہے تھے اور قبائل کے سردار جگہ جگہ اس پکار پر لبیک کہہ کر اپنے جوانوں کے ساتھ انگریزوں سے لڑنے پر آمادہ تھے۔ رابرٹس کا لشکر چہار آسیاب کے میدان میں پہنچا تو ایسے ہزاروں جانباز کابل کے دفاع کے لیے صفیں باندھے کھڑے تھے جبکہ شاہِ اُفغانستان ایک کٹھ پتلی کی طرح بلندی پر قائم کیے گئے برطانوی کیمپ سے اپنی قوم اور اپنے غیر ملکی آقاؤں کے تصادم کا منظر بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ برطانوی توپ خانہ گولہ باری کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا، مقابلے میں توڑے دار بندوقیں تانے اور تلواریں سونتے اُفغان ان پر جھپٹ رہے تھے۔ ان کی بڑی تعداد خاک وخون میں

غلطاں ہو رہی تھی مگر ان کی مزاحمت اس وقت تک جاری رہی جب تک میدان زخمیوں اور شہیدوں کے خون سے لالہ زار نہ ہو گیا۔

6 اکتوبر 1879ء کے اس معرکے میں انگریزوں نے اپنے بھاری اسلحے کے بل بوتے پر راستہ صاف کر لیا اور کابل میں داخل ہو گئے۔ افغان سرکاری افواج موی مجسموں کی طرح ساکت و جامد تھیں۔ رابرٹس کو لارڈ لیٹن کی طرف سے تاکید کی گئی تھی کہ اس بار افغانستان پر ایسا کڑا ہاتھ ڈالا جائے کہ یہاں دوبارہ مقاومت کی گنجائش نہ رہے، اسے جن اہداف کی تکمیل کا ذمہ دار بنایا گیا تھا وہ ترتیب وار اس طرح تھے: ''افغان دارالحکومت کے قلعہ بالا حصار کو تباہ کرنا، تمام جنگی قلعوں کو اجاڑ دینا، تمام خزانوں پر قبضہ کرنا، مزاحمت کرنے والوں کو نیست و نابود کرنا، آخر میں حکومتِ افغانستان پر قابض ہونا، اس ملک کو برطانیہ کا معسکر بنانا، اس سرزمین کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دینا۔ چنانچہ رابرٹس نے آتے ہی 12 اکتوبر کو کابل میں ایک مجمع عام سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا: ''دو دن بعد قلعہ بالا حصار کو آبادی سمیت مسمار کر دیا جائے گا۔ حکومتِ کابل، ملکی کرنسی اور پریس کے امور برطانوی گورنمنٹ سے متعلق ہوں گے، شہر کابل اور اس کے اردگرد پانچ میل تک مسلح آمدورفت ممنوع ہو گی، اگر کسی سے اسلحہ برآمد ہوا تو وہ سزائے موت کا حق دار ہو گا۔ برطانوی سفیروں اور افسران کے قاتلوں کو فوری طور پر برٹش سرکار کے حوالے کیا جائے۔''

اس تقریر کے بعد یونین جیک، قلعہ بالا حصار پر نصب کر دیا گیا اور کابل کے شہری افسوس اور اضطراب سے اپنے ہونٹوں کو کاٹتے ہوئے چپ چاپ منتشر ہو گئے۔

<u>یعقوب علی خان کا انجام</u>: یعقوب علی خان بدستور انگریزوں کی حراست میں تھا۔ 12 اکتوبر 1879ء کو انگریزوں نے یعقوب علی کو حکومت سے استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا۔ دھمکی کے مطابق انگریزوں نے دو دن بعد کابل کی مضبوط دفاعی دیوار قلعہ بالا حصار اور اسی کی آبادی کو تہس نہس کر دیا۔ اسلحہ خانے سے انہیں 250 ٹن بارود، 85 توپیں، ہزاروں بندوقیں اور تلواریں اور دیگر ساز و سامان ملا۔ کاش کہ یعقوب علی خان اسے ملک کی مدافعت کے لیے استعمال کرتا تو کم از کم اسے اتنی رسوائی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ فتح کابل کے ڈیڑھ ماہ بعد انگریزوں نے اس بزدل حکمران کو جلاوطن کر کے ہندوستان بھیج دیا۔ وہاں انگریزوں کی تحویل میں زندگی کے باقی دن گزار کر وہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ حکومتِ افغانستان کے دیگر اہم ارکان کو بھی گرفتار کر کے ہندوستان بھیج دیا گیا جن میں وزیر خارجہ شاہ محمد خان، سردار یحییٰ خان اور سردار زکریا خان قابل ذکر ہیں۔

جنرل رابرٹس برطانوی سفارت خانے پر حملے کے ملزمان کو گرفتار کر کے عبرت کا نمونہ بنانا چاہتا تھا مگر

افغان شہری اس بارے میں کوئی تعاون نہیں کر رہے تھے، بہر کیف چند دنوں بعد کابل کے تین معزز ترین شہریوں، جنرل خسرو خان، سردار سلطان عزیز خان اور کوتوال شہر اسلم خان کو مجرم قرار دے کر سر عام تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ صدر اعظم حبیب اللہ خان اور سپہ سالار داؤد شاہ خان کو قید خانے میں رکھا گیا۔ اب افغانستان انگریزوں کے ہاتھ میں تھا۔ صرف کابل میں 20 ہزار گورے سپاہی 46 جدید توپوں کے ساتھ موجود تھے۔ فاتحِ کابل جنرل رابرٹس کو اس کارنامے پر ملکہ برطانیہ نے مبارکباد کا خط بھیجا۔ ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ لیٹن نے اسے ترقی دے کر افغانستان میں اپنا نائب (لیفٹیننٹ جنرل) بنا دیا۔

جنرل رابرٹس نے کابل میں انگریز افواج کو اس ترتیب سے تعینات کیا کہ نہ صرف پورا کابل ان کی گرفت میں تھا بلکہ کسی بھی حملہ آور کے لیے ان کو زک پہنچانا انتہائی مشکل بن گیا تھا۔ اس نے فوج کی بڑی تعداد کو قلعہ سیاہ سنگ سے ہٹا کر شیر پور کی بستی میں محفوظ کر دیا۔ یہ بستی سابق حکمران شیر علی خان نے شاہی خانوادے اور اعلیٰ افسران کی رہائش کے لیے آباد کرنا شروع کی تھی مگر اس کی زندگی میں یہ کام ادھورا رہ گیا تھا۔ بہر کیف 21 فٹ بلند فصیل والی یہ بستی دفاعی لحاظ سے کسی بڑے سے بڑے قلعے سے زیادہ مستحکم تھی۔ دیواروں کا استحکام اس درجے کا تھا کہ جدید ترین بھاری توپوں کے بغیر اس میں شگاف ڈالنا ممکن نہیں تھا۔ جنرل رابرٹس نے اس کے گرد کئی مقامات پر خاردار تاریں بھی نصب کرا دیں۔ رابرٹس نے اسی مقام کو اپنا مرکز بنا کر یہاں باقاعدہ اپنا دربار لگانا شروع کر دیا۔ وہ ایک کرسی پر شاہانہ انداز میں براجمان ہوتا اور ملت فروش افغان امراء اس کے دائیں بائیں زمین پر بیٹھ کر اس کی ہاں میں ہاں ملاتے۔ ایسے میں جنرل رابرٹس خود کو ملکہ برطانیہ کے نائب السلطنت سے کم نہیں سمجھتا تھا۔

<u>قندھار سے کابل، فوج کا ناکام سفر:</u> اس کروفر کے باوجود افغان عوام کی مزاحمت کے ڈر سے جنرل رابرٹس اپنی زیادہ سے زیادہ قوت کابل میں جمع کرنا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے قندھار میں تعینات برطانوی فوج کو بھی کابل آنے کا حکم دیا مگر جب یہ فوج چلی تو اسے غلجائی قبائل کی سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ جب صاحب خان نامی ایک سردار اپنے مجاہدوں کو لے کر ان پر حملہ آور ہوا تو دست بدست لڑائی کے حیرت انگیز مناظر دیکھنے میں آئے۔ پیر محمد نامی ایک مجاہد ایک ہاتھ کٹوانے اور جسم پر 13 زخم کھانے کے باوجود لڑتا رہا۔ آخر برطانوی فوج شدید نقصانات اٹھا کر واپس قندھار لوٹ جانے پر مجبور ہو گئی۔

<u>جہاد کا باقاعدہ آغاز:</u> برطانویوں نے کابل میں دو ماہ تو آرام سے گزار لیے مگر موسم سرما شروع ہوتے ہی ان کے پیروں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔ افغان عوام نے دیکھ لیا تھا کہ انگریزوں کے وعدے جھوٹے تھے۔ امیر یعقوب علی کی حکومت کو استحکام بخشنے کا نعرہ لگا کر آنے والوں نے اسے قیدی بنا کر وطن سے دور

پھینک دیا تھا اور ملک کے تمام تر نظام کے مالک بن بیٹھے تھے۔ اُفغانوں کا دین، ایمان اور عزت وآن خطرے میں تھی۔ اس صورتحال میں کابل کے اردگرد پھیلی ہوئی وادیوں اور دیہاتوں میں آباد لاکھوں افراد برطانوی راج کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے لیے تیار تھے۔ ان بپھرے ہوئے افراد کی قیادت قبائل کے درجنوں سردار، علماء اور سابق فوجی افسران کر رہے تھے۔ کابل اور کوہدامن میں غلام حیدر کابلی، فوجی افسر کریم خان، میر بچہ کوہدامنی اور میر غلام قادر تحریکِ جہاد کے پیشرو تھے۔ لوگر میں غلام حیدر چرخی، سمندر خان اور محمد حسن خان لوگری جہاد کے روحِ رواں تھے۔ میدان شہر اور وردک میں جنرل جان خان نے بہت سے افراد جمع کر لیے تھے۔ غزنی اور زابل میں ملا دین محمد جو مشک عالم کے لقب سے مشہور تھے لوگوں کو درسِ جہاد دے رہے تھے۔ ملا عبدالغفور لنگری اور گل محمد خان اندری ان کے خاص رفقاء تھے۔ ننگرہار میں جبار خیل قبیلے کے عصمت اللہ خان نے لڑائی کی تیاری شروع کر دی تھی۔ ہرات میں سرکاری فوج کے نائب سالار حفیظ اللہ خان اور ایوب خان نے مجاہدین کی قیادت سنبھال لی تھی۔

دو ماہ تک یہ جیالے زیرِ زمین کام کرتے رہے تاکہ جب جنگ چھڑے تو ایک ہی ہلے میں برطانیہ کو دن میں تارے دکھا دیے جائیں۔ ان کے نمائندوں نے آپس میں ملاقاتوں کے ذریعے یہ طے کر لیا تھا کہ ہر علاقے کے مجاہدین ایک ہی وقت میں کابل کی طرف بڑھیں گے اور اسے چاروں طرف سے گھیر کر انگریزوں کو بے بس کر دیں گے۔

2 دسمبر 1879ء کو ملا مشک عالم نے غزنی میں انگریز کے خلاف کھلم کھلا جہاد کا اعلان کر دیا۔ یہ آواز دیکھتے ہی دیکھتے پورے اُفغانستان میں پھیل گئی اور چہار اطراف سے مجاہدین کے قافلے پُر پیچ راستوں کو طے کرتے ہوئے کابل کی طرف بڑھنے لگے۔ حسبِ سابق اس بار بھی ان کا اسلحہ قدیم وضع کی رائفلوں اور تلواروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک ہفتے میں یہ قافلے کابل کے پاس پہنچ گئے۔ یہ سخت ترین سردی کا موسم تھا اور عام طور پر اُفغان اس موسم میں مہم جوئیوں سے گریز کرتے ہیں مگر اِن غیر معمولی حالات کا تقاضا یہ تھا کہ دشمن کو زیادہ دنوں تک آرام کا موقع نہ دیا جائے۔

مجاہدین کا منصوبہ تھا کہ وہ انگریزوں کو سنبھلنے کا موقع ملنے سے قبل کابل کا محاصرہ کر لیں گے مگر انگریزوں کو اپنے جاسوس سردار ولی محمد خان کے ذریعے بروقت اطلاعات مل گئیں۔ چنانچہ جنرل رابرٹس نے برگیڈیئر میکفرسن کو فوج کے ایک حصے کے ساتھ کابل کے شمال میں کاریز میر کی طرف بھیج دیا اور برگیڈیئر بیکر کو فوج کا دوسرا حصہ دے کر مغرب میں ارغندہ کی جانب تعینات کر دیا تاکہ غزنی کے مجاہدین کو کوہستان کے مجاہدین سے کاٹ دیا جائے اور پغمان کے مجاہدین کا میدان شہر کے مجاہدین سے اتصال نہ ہو سکے۔

ایمان اور اسلحے کا مقابلہ: پغمان کے مجاہدین کاریز میر کے قریب پہنچے ہی تھے کہ برگیڈیئر میک فرسن اپنی فوج لے کر راستے میں کاریز میر کی بلندی پر پہنچ گیا۔ ادھر میر بچہ خان بھی اپنے جانبازوں کے ساتھ آ گیا اور رات کی تاریکی میں دشمن کے توپ خانے پر جا پڑا، برطانوی افواج نے زبردست گولہ باری کی اور میر بچہ نے دن کے وقت پیچھے ہٹ کر کاریز میر کے نواح میں مورچے بنا لیے۔ اگلے دن 11 دسمبر کو جنرل جان محمد خان بھی اپنے مجاہدین کو لے کر اسی سمت آ گیا اور قلعہ قاضی میں مورچہ بندی کر لی۔

جنرل رابرٹس قلعہ شیر پور میں اس تمام منظر پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اس نے جنرل میسی کو حکم دیا کہ اپنے پلٹن کو لے کر بائیں طرف مڑ کر میک فرسن کی فوج سے جا ملے، اور میک فرسن کو تاکید کی کہ وہ دائیں طرف پیش قدمی کرتے ہوئے کاریز میر میں مجاہدین پر ٹوٹ پڑے۔ مگر اس سے پہلے کہ میک فرسن جنرل میسی کی افواج کو اپنے ساتھ ملاتا، میر بچہ خان گھات میں بیٹھے ہوئے شیر کی طرح اس پر حملہ آور ہو گیا، یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ میک فرسن کے لیے آگے بڑھنا ممکن رہا نہ پیچھے ہٹنا۔ اس دوران جنرل جان محمد خان جنرل میسی کی افواج کی خاطر مدارات کر رہا تھا جو میک فرسن کی فوج سے ملنے آ رہی تھیں مگر جان محمد خان نے اس کا موقع نہ دیا۔

برگیڈیئر اسٹون بیکر جو چہار آسیاب میں مجاہدین کو روکنے کے لیے تعینات تھا، لوگر کے مجاہدین کے ریلے کی زد میں آ گیا۔ ان تمام محاذوں پر برطانوی فوج کو شدید نقصانات اٹھانا پڑے۔ جنرل رابرٹس کو اس تباہی کی اطلاع ملی تو وہ ریزرو دستوں کے ساتھ قلعہ شیر پور سے نکل کر خود محاذ کی طرف روانہ ہوا۔ وہ 'اونچی باغبان' کے دیہات سے گزر رہا تھا کہ ایک افغان نوجوان چیتے کی طرح دوڑتا ہوا آیا اور سخت حفاظتی پہرے کو توڑتا ہوا اس پر حملہ آور ہو گیا۔ ایک بنگالی محافظ مظہر علی نے جان پر کھیل کر جنرل رابرٹس کو بچا لیا ورنہ اس کا قصہ وہیں تمام ہونے کو تھا۔ برطانوی فوج قلعہ قاضی کے قریب پہنچی تو مجاہدین نے عام حملہ کر دیا، برطانوی توپ خانے کی گھن گرج کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے افغان جانباز شاہینوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑے اور اس وادی میں دست بدست لڑائی شروع ہو گئی، گورے سپاہی جان بچانے کے لیے سنگینیں آزما رہے تھے مگر افغانی خنجر برق کی طرح گر کر ان سے لہو کا خراج وصول کر رہے تھے۔

جنرل رابرٹس کا فرار: جنرل رابرٹس نے زندگی میں پہلی بار اپنے سپاہیوں کی لاشیں اس طرح گرتے دیکھیں، اس نے بڑی بدحواسی کے عالم میں اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اپنے سپاہیوں کی لاشوں کو روندتا ہوا میدانِ جنگ سے بھاگ نکلا۔ اس وقت صرف چالیس گورے اس کے ساتھ بھاگنے میں کامیاب ہو سکے۔ راستے میں 'دہ مزنگ' نامی ایک تنگ درّہ پڑتا تھا۔ رابرٹس نے سپاہیوں کے ایک حصے کو وہیں تعینات کر دیا

تا کہ مجاہدین اس کا تعاقب نہ کر سکیں۔ آگے دہ مزنگ بستی تھی، رابرٹس نے وہاں ایک سرائے میں جا کر دم لیا اور اس کے محافظ پہرہ دینے لگے۔ اس دوران انگریزوں کا نمک خوار سردار ولی محمد اپنے آقا کی حفاظت کے لیے افغان سرکاری فوج اور قبائلیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ مگر یہاں اس کے قبائلی ساتھیوں نے انگریزوں کی حفاظت سے انکار کر دیا اور مجاہدین میں شمولیت کا اعلان کر کے انگریزوں کا مال واسباب لوٹنے لگے۔ رابرٹس بمشکل اپنے محافظوں کے حلقے میں وہاں سے نکل کر شیر پور پہنچنے میں کامیاب ہو سکا۔

فرار ہوتے ہوئے اس نے تمام نقاط سے انگریزی افواج کو پسپائی کا حکم دے دیا تھا، ساتھ ہی کابل میں مقیم انگریز سپاہیوں کو بھی خطرے کی زد میں محسوس کر کے انہیں بھی قلعہ شیر پور میں پناہ لینے کی تاکید کر دی تھی۔ اگلی صبح تک کابل شہر کے قلعوں اور گردونواح کے محاذوں پر پھیلی ہوئی تمام برطانوی افواج شیر پور میں پناہ لی چکی تھیں اور جنرل رابرٹس شیر پور کے حفاظتی انتظامات مزید مضبوط کرنے میں جتا ہوا تھا۔ اس نے شیر پور کے ہر کونے کی حفاظت الگ الگ تجربہ کار افسران کے ذمے لگا دی جن میں برگیڈیئر میک فرسن، جنرل ہیوج گف، کرنل جنکنز اور جنرل ہلز وشامل تھے۔ فصیل شہر کے بارے میں بھی اسے یقین تھا کہ مجاہدین کی پرانی اور ہلکی توپیں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں، نیز پانچ مہینے کے لیے خوراک ورسد کے ذخائر جمع کر لیے گئے تھے، پھر بھی مجاہدین کا خوف اس کے اعصاب پر بُری طرح سوار تھا جنہوں نے دو دن کی جنگ میں پورے کابل کو برطانوی فوج سے خالی کرا لیا تھا۔ تاہم ابھی تک شہر کے گرد مجاہدین کا محاصرہ یا شہر پر ان کا قبضہ مکمل نہیں ہوا تھا، اس لیے انگریزوں کو کمک مل سکتی تھی۔

رابرٹس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گندمک میں تعینات جنرل چارلس گف کو بھی فوج سمیت شیر پور طلب کر لیا تا کہ ہلاک شدہ فوج کی کمی پوری ہو جائے، چارلس جلال آباد سے ہوتے ہوئے کابل کی طرف چلا تو راستے میں لغمان کے مجاہدین نے بھرپور مزاحمت کی، بہرکیف انگریزی توپ خانے کی گولہ باری نے راستہ صاف کر دیا اور یہ کمک شیر پور پہنچ گئی۔ رابرٹس نے ہندوستان سے بھی امدادی فوج طلب کی تھی۔ (24 دسمبر کو یہ کمک شیر پور پہنچ گئی۔)

انگریزی فوج کے شیر پور میں محصور ہوتے ہی ملا مشک عالم اور جنرل محمد جان اپنے مجاہدین کو لے کر کابل میں داخل ہو گئے۔ غلام حیدر خان چرخی بھی لوگر کی طرف سے بالا حصار پہنچ گیا اور تخت شاہ میں مورچے بنا لیے، اس طرح شیر پور کے محاصرے میں آجانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ جنرل رابرٹس نے یہ محاصرہ توڑنے اور مجاہدین کو پسپا کرنے کے لیے اپنی افواج کو حرکت دی اور 13 دسمبر کو تخت شاہ پر حملہ کر دیا، چار گھنٹوں کی شدید جنگ کے بعد برطانوی افواج تخت شاہ کی چوٹی پر قابض ہو گئیں۔ باقی ماندہ

مجاہدین پیچھے ہٹ کر سنگ سیاہ کے قلعے میں مورچہ زن ہو گئے۔ رابرٹس نے انہیں کمزور پڑتا دیکھ کر اپنی تمام افواج کو مجتمع کیا اور بھاری توپ خانے کی مدد سے مجاہدین کو منتشر کر کے اس مقام پر بھی قبضہ کر لیا۔ برطانوی افواج نے کوہ آسمائی پر مورچے بنا لیے۔ اب ان کی پوزیشن بہت مستحکم ہو گئی تھی۔

عبداللہ اور زہرہ کا قصہ: میدان جنگ کے ان قصوں کے ساتھ ساتھ شہریوں کی زندگی میں بھی عجیب عجیب داستانیں جنم لے رہی تھیں جن میں سے ہر ایک آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ کابل کا ایک محلہ عاشقان و عارفان کے نام سے آباد تھا جس کے لوگ بہادری میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ اسی محلے میں عبداللہ عاشقاں نامی ایک خوبرو اور دلیر نوجوان رہتا تھا۔ اس کی نسبت اپنے ہمسایے کی لڑکی زہرہ سے ٹھہر چکی تھی۔ 13 دسمبر کو عصر کے وقت جب کہ کابل کے باہر برطانوی افواج اور مجاہدین کے درمیان گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی، ان کے نکاح کی رسم بڑی سادگی سے انجام پا گئی۔ تقریب نکاح میں زیادہ لوگ نہیں تھے، کیوں کہ محلے کے اکثر جوان جہاد کے لیے جا چکے تھے۔ شام کو مقامی رسم کے مطابق اس کی ماں نے بیٹے کی ایک انگلی پر مہندی لگا دی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ آج ہی سہاگ رات ہے۔ یخ بستہ رات میں جب دولہا پہلی بار اپنی نئی نویلی دولہن کے پاس گیا تو اس وقت تک کوہ سمائی پر برطانوی فوج کے قبضے اور مجاہدین کی پسپائی کی خبر کابل میں پھیل چکی تھی۔ ہر غیرت مند مسلمان خاتون کی طرح زہرہ بھی یہ سن کر نہایت مضطرب تھی، اور اس بے چینی نے شادی خانہ آبادی کی خوشیوں کو بے حیثیت کر دیا تھا۔ چنانچہ زندگی کی اس یادگار ملاقات کے آغاز ہی میں دلہن نے دولہا سے کہا: ”کیسی عجیب بات ہے کہ محلے کے سب جوان فرنگیوں سے جہاد کے لیے گئے ہوئے ہیں اور عبداللہ حجلہ عروسی میں ہے۔“

عبداللہ نے یہ سنا تو تڑپ کر بستر سے اٹھ گیا اور بولا: ”سچ کہتی ہو، اس وقت مجھے یہاں نہیں، میدانِ جنگ میں ہونا چاہیے۔ زہرہ! میں جا رہا ہوں۔ اگر واپس نہ لوٹا تو اگلے جہان میں ہی تم سے ملاقات ہو گی۔“ یہ کہہ کر اس نے تلوار کمر سے لٹکائی، بندوق تھامی اور محاذ کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں: عبداللہ کی طرح اور بھی بہت سے نوجوان تھے جو مجاہدین کی پسپائی کی خبر سن کر راتوں رات محاذ کی طرف چل دیے تھے۔ اگلے دن 14 دسمبر کو علی الصبح ایسے سینکڑوں افراد مجاہدین میں شامل ہو چکے تھے۔ ان تازہ دم مجاہدین میں عثمان خان صافی اور اس کا بھائی محمد شاہ خان بھی تھے جو اپنے قبیلے کی قیادت کر رہے تھے۔ ان بھائیوں کی ایمان داری اور دلیری کے قصے مشہور تھے۔ برطانوی ایجنٹوں نے جنگ سے قبل عثمان خان کو محاذ سے واپس چلے جانے کے عوض تین لاکھ روپے کی پیش کش کی تھی جو اس مردِ حُر نے ٹھکرا دی تھی۔ 14 دسمبر کی جنگ میں ان بھائیوں

نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بہادری کے جوہر دکھائے اور فرنگیوں کے کشتوں کے پشتے لگا دیے۔
اس دن کابل کے پہاڑوں میں جرأت وعزیمت کی ایک نئی داستان لکھی گئی۔ مجاہدین کے مختلف گروہ رنگ برنگے پرچموں کے ساتھ برطانوی افواج پر حملے کر رہے تھے۔ کابل کی چارسو باپردہ خواتین پہاڑی راستوں پر دوڑ دوڑ کر مجاہدین کی مدد کر رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں پانی کی چھاگلیں اور بغل میں روٹیوں کی پوٹلیاں تھیں، گولیوں اور گولوں کی بارش میں وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر ہزاروں مجاہدین کو پانی، خوراک اور مرہم پٹی کا سامان مہیا کر رہی تھیں۔ ان میں سے 83 خواتین اس معرکے میں شہید ہوئیں اور قوم کو قربانی کا نہ بھولنے والا سبق دے گئیں۔

اس دست بدست لڑائی میں انگریزوں کی لاشیں کوہ سمائی کی چوٹی سے یوں گرتی نظر آ رہی تھیں جیسے پہاڑی تودہ کھسکنے کے بعد بلندی سے پتھروں کی بارش ہوتی ہے۔ جلد ہی برطانوی افواج مورچے چھوڑ کر بھاگ نکلیں۔

کچھ دور جا کر جنرل رابرٹس نے اپنی فوج کو دوبارہ منظم کیا اور اپنے مورچے واپس لینے کی سرتوڑ کوشش شروع کر دی۔ برطانوی توپ خانے نے مجاہدین کے مورچوں کو گولہ باری کی زد پر رکھ لیا۔ یہ دیکھ کر عثمان خان صافی خود شمشیر برہنہ سونت کر برطانوی توپ خانے کی طرف دوڑ پڑا، اس کے دلیر ساتھی بھی اس کے پیچھے پیچھے یلغار کرتے ہوئے آ رہے تھے، عثمان خان کے ساتھ ہی انہوں نے بھی توپ خانے پر حملہ کر دیا۔ عثمان خان خود گولہ باری کی زد میں آ کر زمین پر گر پڑا مگر مجاہدین کا حملہ جاری رہا اور انہوں نے انگریزوں سے توپ خانہ چھین کر اسے فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس دوران کابل کے شمال سے آنے والے مجاہد دستوں نے گھمسان کی جنگ کے بعد پیش قدمی کر کے سیاہ سنگ اور کوہ خیر خانہ کے مورچوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ جنگ کے اختتام پر تمام پہاڑی قلعے اور مورچے انگریزوں سے پاک ہو چکے تھے اور جنرل رابرٹس اپنی بچی کھچی فوج کے ساتھ شیر پور کے قلعے میں محصور ہو گیا تھا۔

شام کو شہیدوں کے جنازے کابل اور نواحی دیہاتوں میں لائے جا رہے تھے اور لوگ نہایت عقیدت سے ان کا استقبال کر رہے تھے۔ ان میں عبداللہ کا جنازہ بھی تھا جو محلہ عاشقان میں لایا گیا، بوڑھی ماں نے اپنے شہید بیٹے کی لاش کو دیکھا تو آنکھوں سے آنسو بہہ کر جھریوں بھرے چہرے کو تر کرنے لگے۔ تب زہرہ اپنے وفادار شوہر کے آخری دیدار کے لیے آگے بڑھی۔ اس کی مہندی لگی انگلی کو بوسہ دیا، اور بولی: ”ماں! مت رو، جب تک میں زندہ ہوں عبداللہ کی جگہ میں تیرا بیٹا بن کر رہوں گی۔“

زہرہ اس دن کے بعد عبداللہ کے لقب سے مشہور ہو گئی۔ قوم کی یہ بیٹی جب تک زندہ رہی کابل میں

اسے مثالی احترام حاصل رہا۔ کابل کی بڑی بوڑھیاں آج بھی زہرہ اور عبداللہ کی داستان سناتے ہوئے آب دیدہ ہوجاتی ہیں۔

انخلاء کا فیصلہ: 14 دسمبر 1879ء کی جنگ نے انگریزوں کے چھکے چھڑا دیے تھے، جنرل رابرٹس پہلی فرصت میں افغانستان سے نکلنے کا فیصلہ کرچکا تھا مگر اس سے قبل وہ اپنے راستے کو محفوظ بنانا چاہتا تھا جس کے لیے مزید مستحکم پوزیشن، بیرونی کمک یا مجاہدین سے کوئی معاہدہ ناگزیر تھا۔ ادھر شہر کابل پر مجاہدین کا قبضہ مکمل ہوچکا تھا۔ ملا دین محمد عرف مشک عالم کو کابل کا عبوری حاکم مان لیا گیا تھا۔ اس شہر میں اب غدارانِ ملت کے لیے زمین تنگ ہوگئی تھی۔ سردار محمد حسن خان بن دوست محمد خان اور سردار عبداللہ خان بن سلطان احمد خان اپنے عبرتناک انجام سے بچنے کے لیے غزنی کی طرف بھاگ گئے تھے۔ البتہ سردار ہاشم خان اور بعض غداروں نے سردار ایوب خان کو بیچ میں ڈال کر معافی مانگ لی اور آئندہ مجاہدین کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔

ایک ہفتے تک مجاہدین اور انگریز لاشوں کی تدفین، زخمیوں کے علاج معالجے اور نئی جنگ کی منصوبہ بندی میں مصروف رہے۔ اس دوران انگریزوں کا جاسوس سردار ولی محمد اپنے آدمیوں کے ذریعے جنرل رابرٹس کو مجاہدین کے حالات اور مشاورت سے آگاہ کرتا رہا۔ مجاہدین کی مجلس شوریٰ نے براہِ راست قلعہ شیر پور پر بڑے حملے کی ترتیب طے کرلی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ مجاہدین عمومی حملے کے لیے تیار ہوجائیں، عین وقت پر کوہ سمائی پر آگ جلائی جائے گی جسے دیکھتے ہی تمام اطراف سے مجاہدین کے دستے قلعے پر دھاوا بول دیں۔

شیر پور قلعے پر حملہ: 23 دسمبر کی شب کابل کے گردونواح میں مورچہ زن مجاہدین نے کوہِ سمائی کی چوٹی پر بڑے بڑے الاؤ روشن ہوتے دیکھے اور قلعے پر حملے کے لیے پیش قدمی شروع کردی۔ جنرل رابرٹس جو حملے کے فیصلے سے پیشگی آگاہ تھا، مدافعت کے لیے پوری تیاری کرچکا تھا۔ مجاہدین جوں ہی برطانوی توپوں کی زد پر آئے ان کی لاشوں پر لاشیں گرنے لگیں۔ تاہم ان کی جرأت مندانہ پیش قدمی جاری رہی۔ سینکڑوں شہداء اور ان گنت زخمیوں کے خون کا نذرانہ دیتے ہوئے وہ آخرکار شیر پور کی فصیل کے نیچے پہنچ گئے۔ یہاں وہ توپوں کی زد میں نہیں آسکتے تھے، تاہم فرنگیوں کا رائفل اسکواڈ اب فصیل کے خفیہ مورچوں سے ان پر گولیوں کی بارش کررہا تھا اور مجاہدین کھلے میدان میں 21 فٹ بلند فصیل پر چڑھنے کی سرتوڑ کوشش کررہے تھے۔ یہ ہولناک جنگ اگلے دن شام تک جاری رہی۔ شیر پور کی فصیل کے سامنے مجاہدین کی لاشوں کے انبار لگ گئے۔

اس موقع پر مجاہدین کے دو اہم سرداروں محمد شاہ سرخابی اور بادشاہ خان سرخابی نے من مانی کرتے

ہوئے اپنے زیرِ کمان مجاہدین کو پسپائی کا حکم دے دیا حالانکہ ابھی اعلیٰ قیادت مزید حملوں کے لیے کربستہ تھی اور ممکن تھا کہ مجاہدین فصیل پر چڑھ جاتے۔ ان دونوں کمانڈروں کے پیچھے ہٹنے سے مجاہدین کی پوزیشن مزید کمزور ہوگئی اور آخرکار مجاہدین کو شیرپور کا محاصرہ ترک کرکے واپس آنا پڑا۔

23 دسمبر کی یہ پسپائی اس نیت سے تھی کہ اپنی قوت کو منظم کرکے دوبارہ بڑا حملہ کیا جائے گا مگر اس کی نوبت نہ آسکی۔ 24 دسمبر کا دن انگریزوں کے لیے نہایت پُرمسرت تھا "میجر جان راس" ایک ڈویژن تازہ دم فوج لے کر شیرپور کے محصورین کی مدد کے لیے پہنچ گیا تھا۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اسی دن قلعہ شیرپور کے آس پاس ان تمام بستیوں اور عمارتوں کو نیست ونابود کردیا جو قلعے پر مجاہدین کے دوبارہ حملے کے دوران مورچوں کا کام دے سکتی تھیں۔

ایک مجاہد رہنما کے خلاف پروپیگنڈا: اس کے بعد انگریزی فوج شیرپور سے نکل کر کابل کی طرف بڑھی۔ مجاہدین ابھی 23 دسمبر کی خونریز جنگ میں شدید جانی نقصان کی تلافی نہیں کر پائے تھے اور کابل میں آیندہ کا لائحہ عمل مرتب کر رہے تھے یکدم انہیں اطلاع ملی کہ جنرل رابرٹس کثیر افواج کے ساتھ کابل کے اہم راستوں پر قابض ہوکر وہاں مورچے اور چوکیاں بنا رہا ہے۔ انگریزوں کو یقین تھا کہ مجاہدین ان سے کابل کے اطراف کا قبضہ چھڑوانے کے لیے جلد حملہ کردیں گے اس لیے انہوں نے مجاہدین میں پھوٹ ڈلوانے کے لیے کئی شاطرانہ چالیں چلیں۔ سب سے پہلے یہ مشہور کیا کہ 23 دسمبر کی جنگ میں مجاہدین کی شکست کا سبب جنرل محمد جان خان تھا جو کہ انگریزوں کا ایجنٹ بن گیا ہے اور انگریزوں نے اسے غداری کی قیمت میں سونے سے بھرا ہوا صندوق دیا ہے۔ حالانکہ یہ پروپیگنڈا سراسر جھوٹ تھا۔ شکست کا ذمہ دار محمد شاہ سرخابی تھا جبکہ جنرل جان محمد خان بے قصور تھا۔ تاہم اس پروپیگنڈے سے مجاہدین میں کچھ نہ کچھ بدظنی ضرور پھیل گئی جبکہ عوام کی تشویش کہیں بڑھ کر تھی۔

مجاہد لیڈروں نے اس موقع پر یہ خطرہ بھی محسوس کیا کہ اس سچی یا جھوٹی خبر کے پھیلنے کے بعد مزید مجاہد کمانڈر بھی سونے کے صندوقوں کے لالچ میں انگریز سے مل سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے جوابی پروپیگنڈا مہم چلائی جس میں یہ مشہور کیا گیا کہ جان محمد خان کو ملنے والا صندوق صرف سونے کی رنگت کے چاول نما ذرات سے بھرا ہوا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اگر کوئی اور مجاہد بھی انگریزوں سے ساز باز کر رہا ہے تو وہ رُک جائے۔ بہر کیف کچھ دنوں بعد حقیقتِ حال سب کے سامنے آگئی اور سب نے جان لیا کہ اصل خطاکار محمد شاہ سرخابی تھا جبکہ محمد جان خان کا دامن بالکل صاف ہے۔

غزنی میں خانہ جنگی: ادھر انگریزوں کا ایک اور جاسوس کرنل ولی اللہ خان غزنی اور گردونواح میں خانہ

جنگی کو ہوا دے کر انگریزوں کے لیے فضا سازگار بنا رہا تھا۔ اس کی شعلہ نوائی نے پختون، تاجک اور ہزارہ کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا تھا۔ چند دن پہلے تک غزنی میں بھی انگریزوں کے خلاف معرکے جاری تھے مگر اب قبائلی سردار انگریزوں کو بھول کر آپس میں لڑنے مرنے پر تیار تھے۔ مُلا مشک عالم یہ افسوس ناک خبر سنتے ہی فوراً کابل سے غزنی پہنچے اور خانہ جنگی کی اس آگ کو بڑی مشکل سے بجھایا۔

انگریزوں کی پیش بندیاں: نیا عیسوی سال 1880ء اس حال میں شروع ہوا کہ انگریز قلعہ شیر پور کے علاوہ کابل کے کئی مرکزی راستوں پر قابض تھے جبکہ مجاہدین ابھی تک دوبارہ کسی بڑے حملے کی تیاری نہیں کر سکے تھے۔ جنرل محمد جان خان اور میر غلام قادر خان جیسے رہنما قبائل سے تازہ دم افراد تیار کرنے کے لیے اپنے علاقوں کو لوٹ چکے تھے۔ کوہستان، پنج شیر، غور بند اور کوہدامن کے مجاہدین کی بڑی تعداد 23 دسمبر کی لڑائی میں شہید ہو گئی تھی اس لیے از سرِ نو افرادی قوت کو جمع کرنا ناگزیر تھا۔ جنگ کی اس عارضی بندش کے دوران جنرل رابرٹس تیزی سے اپنی افواج کو ایک جگہ جمع کر رہا تھا۔ وہ مجاہدین کے آیندہ متوقع حملوں سے پہلے پہلے تمام انگریز سپاہیوں کو کابل سے جلال آباد جانے والی شاہراہ پر اس طرح منظم کرنا چاہتا تھا کہ مجاہدین انہیں محصور نہ کر سکیں اور وہ تمام برطانوی سپاہ کے ساتھ بحفاظت پشاور پہنچ جائے اور اس دوران اگر مجاہدین میں پھوٹ پڑ جائے تو کابل پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش بھی کی جا سکے۔

جنرل اسٹوارٹ قندھار سے کابل تک: انگریز اس وقت قندھار اور غزنی میں بھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ جنرل رابرٹس نے قندھار کے جنرل اسٹوارٹ کو فوج کے ایک بڑے حصے کے ساتھ کابل پہنچنے کا حکم دیا۔ جنرل اسٹوارٹ ایک بریگیڈ فوج اور 12 توپوں کے ساتھ کابل کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ دیکھ کر قبائل کے چھاپہ مار مجاہدین کے گروہ حرکت میں آ گئے۔ غزنی پہنچنے تک وہ دونوں طرف سے برطانوی فوج کی خوراک و رسد کو لوٹتے رہے۔ غزنی کے قریب احمد خیل کے میدان میں مجاہدین کا ایک گروہ دو توپیں لے کر انگریزوں پر حملہ آور ہو گیا۔ 12 توپوں کا دو چھوٹی اور پرانی توپوں سے مقابلہ کرنا ایک ایسی عجیب و غریب جرأت تھی کہ خود انگریز مورخ اس پر آفرین کہہ اُٹھے۔ یہ تمام مجاہدین اس میدان میں حیرت انگیز بہادری کے ساتھ لڑتے رہے۔ انگریز خاصا نقصان اُٹھانے کے بعد محض اپنی 12 توپوں کی اندھا دھند گولہ باری کے ذریعے خود کو مکمل تباہی سے محفوظ رکھ سکے۔

22 اپریل کو جنرل اسٹوارٹ اپنی باقی ماندہ فوج کے ساتھ بمشکل غزنی پہنچنے میں کامیاب ہو سکا اور جنرل رابرٹس کو رقعہ بھیجا کہ وہ کابل پہنچنے میں اس کی مدد کرے۔ اس پیغام کے بعد وہ کابل کی طرف بڑھنے لگا۔

جنرل رابرٹس نے فوراً میجر جان راس کی قیادت میں ایک فوج اس کی مدد کے لیے روانہ کر دی مگر 25

اپریل کو چہار آسیاب میں محمد حسن خان لوگری نے اس فوج کو گھیر لیا اور مکمل طور پر روند ڈالا۔ ادھر جنرل اسٹوارٹ کو توپ وردک کے صحرا میں مجاہدین نے مزید حملوں کا نشانہ بنایا۔ الغرض جنرل اسٹوارٹ شدید نقصان اُٹھانے کے بعد کابل پہنچ سکا۔ جنرل رابرٹس کو بہر حال اس کی آمد سے مزید تقویت ملی۔ شیر پور کے قلعے میں وہ خود کو محفوظ تصور کر رہا تھا۔ اسے یہ بھی توقع تھی کہ ضرورت پڑنے پر اسے پشاور سے ایک ڈویژن مزید فوج مل سکتی ہے۔

جنگ بندی کا اعلان: جنرل رابرٹس کو اب کچھ عرصے کے لیے پُرسکون ماحول میسر آ گیا تھا تاہم وہ جانتا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے انگریز قوت بازو سے اُفغانوں کو سرنگوں نہیں کر سکیں گے چنانچہ ایک بار پھر اس نے برطانوی حکومت کے زیرِ سایہ کسی کٹھ پتلی اُفغان حکومت کی تشکیل پر کام شروع کر دیا۔ یہ تجویز ہندوستان اور وہاں سے لندن بھیج دی گئی تھی اور اسے منظور کر لیا گیا تھا۔ اب اس تجویز پر بڑی مکاری سے مرحلہ وار عمل شروع ہوا۔

پہلے اُفغانستان میں انگریزوں کی جانب سے یہ اعلان ہوا کہ وہ اُفغانستان سے نکلنے کے لیے تیار ہیں اور جنگ ہرگز نہیں چاہتے۔ اُفغان عوام جسے چاہیں اپنا حکمران منتخب کر لیں۔ اس اعلان کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ مجاہدین جو ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری کر رہے تھے مطمئن ہو گئے کہ انگریزوں نے شکست تسلیم کر لی ہے۔ چنانچہ انہوں نے بھی عارضی طور پر جنگ بندی کر دی اور نئے حاکم کے انتخاب میں دلچسپی لینے لگے۔

نئی حکومت کی تشکیل کے لیے جرگہ: انگریز جانتے تھے کہ یہ مجاہد رہنما اگرچہ میدان جنگ میں فتح پا چکے ہیں مگر انہیں انتقالِ اقتدار کے مراحل کے دوران باہم لڑا کر کمزور کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے کچھ مسندِ اقتدار کے لالچ میں برطانیہ کی سرپرستی قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے اور کچھ آپس میں اُلجھ کر اپنی طاقت کھو دیں گے۔

کچھ عرصے بعد انگریزوں نے غزنی میں ایک عمومی جرگہ بلایا تا کہ اُفغان عوام کو یہ تاثر دیا جائے کہ انگریز ان کی مرضی کی حکومت تشکیل دینے میں سنجیدہ ہیں مگر یہ جرگہ جان بوجھ کر شدید سردی اور برفباری کے موسم میں بلایا گیا جس میں دور دراز کے قبائلی سردار اور عمائد غزنی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ چنانچہ اس جرگے میں ملک بھر سے صرف 189 نمائندے شریک ہو سکے۔ اس اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اُفغانستان کا آئندہ حکمران سابق بادشاہ شیر علی خان کی اولاد سے ہونا چاہیے۔ رہی یہ بات کہ وہ کون شخص ہو؟ اس پر اتفاق نہ ہو سکا۔ خود انگریز سیاست دان اپنے قیدی یعقوب علی خان کو دوبارہ اُفغانستان پر مسلط کرنا چاہتے تھے جو مارچ 1879ء سے اکتوبر 1879ء تک اُفغانستان کا حکمران رہا تھا۔

عبدالرحمن خان کا ظہور اور ''اعلانِ جہاد'': اس دوران جبکہ مُلّا مشک عالم، جنرل جان محمد خان اور میر غلام قادر غزنی، کابل اور غور بند کے علاقوں میں مجاہدین کو ازسرِ نو منظم کر رہے تھے ہرات کے عوام بھی انگریزوں کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ ان کا جوش وخروش دیکھ کر سردار محمد ایوب خان نے بھی انگریزوں سے جہاد کا اعلان کر دیا تاہم وہ حملے سے پہلے منتظر تھا کہ کابل میں کیا ہوتا ہے؟ اور وہاں انگریزوں اور مجاہدین کے درمیان کشمکش کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ ابھی سردار محمد ایوب خان اس شش وپنج میں تھا کہ اُفغانستان کے اُفق پر ایک زیرک سیاست دان ظاہر ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک کی سیاست پر چھا گیا۔

یہ سردار عبدالرحمن خان تھا۔ امیر دوست محمد خان کا پوتا، سردار محمد افضل خان کا بیٹا۔ وہ برسوں سے روس میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اُفغانستان کی سیاست سے اس کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ روس کی پناہ میں اس کی زندگی نہایت تنگ دستی سے گزر رہی تھی مگر وہ ایک شاطر سیاست دان کا ذہن لے کر پیدا ہوا تھا۔ رموزِ حکومت سے خوب واقف تھا اور سیاسی جوڑ توڑ کا ملکہ اس کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اُفغانستان میں حصولِ اقتدار کے لیے اس سے بہتر موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔ چنانچہ حکومت روس کی اجازت سے مارچ 1880ء میں وہ دریائے آمو عبور کر کے اُفغانستان میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ صرف ایک سو گھڑسوار تھے اور جیب خالی تھی۔ مادرِ وطن میں قدم رکھتے ہی اس نے یہ مشہور کر دیا کہ وہ انگریزوں سے ٹکر لینے اور اپنے آباواجداد کی وراثت بازیاب کرانے آیا ہے۔

اس نے اعلانِ جہاد کیا تو دیکھتے ہی دیکھتے لوگ اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ اس وقت تک شمالی اُفغانستان کے عمائد میں انگریزوں سے جہاد کے بارے میں کوئی گرم جوشی نہیں پائی جا رہی تھی۔ امراء اور سردار محتاط انداز اختیار کیے ہوئے تھے مگر عوام تہہِ دل سے چاہتے تھے کہ آزادیٔ وطن کی اس تحریک میں اپنا حصہ ڈالیں۔

عبدالرحمن خان کی مقبولیت: عبدالرحمن خان نے شمالی اُفغانستان کی اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ اس کے ساتھ اس کے حسب ونسب کا بھی ایک خاص اثر پڑ رہا تھا چنانچہ جب اس نے جہاد کا اعلان کیا تو ہزاروں رضا کار اس کے پرچم تلے جمع ہو گئے۔ بدخشاں کے والی شہزادہ حسن نے اس کی حمایت سے انکار کیا تو خود اس کے اپنے عوام نے بغاوت کر کے اسے ملک سے بھگا دیا اور عبدالرحمن خان کی اطاعت کا اعلان کرتے ہوئے اسے چھ ہزار سپاہی اور تین لاکھ روپے نقد فراہم کیے۔ اب دوسرے سردار بھی اس سے مرعوب ہونے لگے، میر محمد عمر خان نے دو ہزار گھڑسوار اور ایک ہزار پیادے پیش کر دیے۔ بلخ کے حاکم غلام حیدر خان کو شک تھا کہ عبدالرحمن خان کی نیت درست نہیں، وہ اس کے

اعلانِ جہاد سے مطمئن نہ تھا، اس نے عبدالرحمن کی حمایت میں مہم چلانے والے کئی سرداروں کو قتل کرا دیا اور پھر اس کے خلاف لشکر کشی کی تیاری کی مگر خود بلخ کے سپاہیوں نے عبدالرحمن خان کی حمایت کا اعلان کر دیا اور غلام حیدر خان کو جان بچا کر جلاوطن ہونا پڑا۔

دودھاری تلوار: عبدالرحمن خان کی اس مقبولیتِ عامہ کی خبریں ملک کے دیگر حصوں تک پہنچ رہی تھیں۔ چونکہ انگریز یہ اعلان کر چکے تھے کہ اُفغانستان کے باشندے جسے چاہیں اپنا بادشاہ منتخب کرلیں اس لیے اکثر قبائلی سردار اور شہروں کے خودمختار حاکم یہ سوچنے لگے کہ اگر عبدالرحمن خان کی حکومت پر مشاورت کی جائے تو اکثریت اس پر متفق ہو جائے گی اور انگریز بھی بغیر لڑے چپ چاپ اُفغانستان چھوڑ دیں گے اس طرح یہ فیصلہ یہ ملک وقوم کی فلاح و بہبود کا سبب ہوگا۔

ہرات میں لشکرِ جہاد تیار کرنے والا سردار محمد ایوب خان بھی یہی سوچ رہا تھا۔ اس نے انگریزوں پر حملہ شروع کرنے سے پہلے عبدالرحمن خان سے خط و کتابت شروع کی جس میں جہاد کے لیے آپس میں اتحاد و اتفاق کی دعوت دی گئی تھی۔ محمد ایوب خان کو عبدالرحمن خان سے بڑی توقعات تھیں کیوں کہ چند ماہ میں عبدالرحمن خان نے اپنے پرچم تلے جتنے افراد اکٹھے کر لیے تھے اس سے پہلے کوئی مجاہد قائد تنہا انگریزوں کے خلاف اتنی بڑی تعداد میں آدمی جمع نہیں کر سکا تھا۔ اس لیے سب کو یقین تھا کہ وہ انگریزوں کے خلاف بڑھ چڑھ کر لڑے گا مگر عبدالرحمن خان مجاہد نہیں سیاست دان تھا، وہ ایک دودھاری تلوار تھا۔ بیک وقت لشکرِ مجاہدین کی حمایت اور انگریزوں کی سرپرستی کے ساتھ اقتدار حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے بڑی مہارت سے پتے کھیل رہا تھا۔

محمد ایوب خان کی جانب سے انگریزوں کے خلاف اتحاد کی پیش کش کا اس نے یہ جواب لکھوایا:
"انگریز سے دشمنی میں اُفغانستان کا فائدہ نہیں ہے۔ چاہیے کہ ہم اور آپ مل کر برطانیہ کے ساتھ امن وسلامتی کی راہ اختیار کریں۔"

انگریزوں کی حمایت حاصل کرنے کی چال: عبدالرحمن خان نے جوابی خط جان بوجھ کر ایسے راستے سے روانہ کیا کہ یہ انگریزوں کے ہاتھ لگ جائے۔ جب انگریز حکومت اس خط کے مندرجات سے آگاہ ہوئی تو اسے احساس ہوا کہ اُفغانستان میں عبدالرحمن خان ہی "اعتدال پسند" رہنما کا کردار ادا کر سکتا ہے چنانچہ اس کے بعد انگریزوں اور عبدالرحمن خان میں باقاعدہ خط و کتابت شروع ہوگئی۔

لندن کی مرکزی برطانوی گورنمنٹ نے ہند کے نئے وائسرائے کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ عبدالرحمن خان سے بات چیت کر کے اُفغانستان کا قضیہ موسمِ سرما سے پہلے اس طرح حل کر لے کہ ایک تو تمام

انگریز فوج مجاہدین کی دست و برد سے محفوظ رہے اور واپس ہندوستان پہنچ جائے اور دوسرے افغانستان میں انگریزوں کے لیے نرم گوشہ رکھنے والی اعتدال پسند حکومت قائم ہو جائے۔

عبدالرحمن خان اور انگریزوں میں مکاتبت: اپریل 1880ء میں برطانوی سیاسی نمائندے گریفن کا ایک خط سردار عبدالرحمن خان کو ملا جس میں یہ وضاحت چاہی گئی تھی کہ وہ روس سے کیا ارادے لے کر افغانستان آیا ہے۔ عبدالرحمن خان نے اپنی کمان میں جمع ہونے والے سرداروں کو یہ خط سنا کر اس کا جواب مانگا تو اکثر سرداروں نے اس قسم کے جوابات لکھ کر دیے:

''اے انگریزو! ہمارے ملک سے نکل جاؤ، ورنہ ہم تمہیں نکال پھینکیں گے۔''

''مذاکرات سے پہلے افغانستان کو پہنچائے جانے والے نقصانات کا ہرجانہ ادا کیا جائے۔''

مگر عبدالرحمن خان نے ان تمام جوابات کو چھوڑ کر خود نہایت شائستہ اور دوستانہ انداز میں یہ جواب لکھوایا:

''محترم دوست! ہم اس ملک میں تاشقند کے حکمران جنرل کافمان کی اجازت سے آئے ہیں۔ ارادہ یہ ہے کہ اپنی قوم کی پراگندہ حالت اور اہم معاملات کو سلجھانے کیلئے کمر باندھی جائے اور مخالفین سے مقابلہ کیا جائے۔ اگر آپ مذاکرات کے لیے تیار ہیں تو عورتوں کی سی حیلہ جوئی ترک کر کے دانش مند نمائندوں کے ذریعے اتحاد کا رشتہ قائم کر سکتے ہیں۔''

مجاہدین کا اضطراب: انگریزوں اور سردار عبدالرحمن خان کے درمیان اس خط و کتابت میں خاصا وقت ضائع ہو رہا تھا۔ سردار عبدالرحمن خان تو اپنی ہوشیاری اور ذہانت سے اپنے ماتحت سرداروں اور رضا کاروں کو مطمئن کیے ہوئے تھا مگر دیگر صوبوں کے مجاہدین جو مختلف رہنماؤں کے گرد جمع تھے بڑی بے چینی سے انگریزوں پر آخری ضرب لگانے کا انتظار کر رہے تھے اور قائدین کو ان کے جذبات پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا انگریزوں کی پوزیشن مضبوط اور مجاہدین کی کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ ہرات میں سردار محمد ایوب خان کے لشکر میں اضطراب کا یہ عالم تھا کہ روزانہ سردار سے پوچھا جاتا: ''لشکر کب روانہ ہوگا؟''

سردار ایوب خان جو کہ عبدالرحمن خان سے اتحاد کا متمنی اور کابل و غزنی کے مجاہدین کی حرکت کا منتظر تھا، بڑی مشکل میں پڑ گیا تھا۔ اس دوران اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ سردار شیر علی خان قندھار میں انگریزوں سے مل گیا ہے۔ سردار محمد ایوب خان کا منصوبہ تو یہ تھا کہ وہ ہرات سے قندھار کی طرف بڑھ کر جنوبی افغانستان کو انگریزوں اور غداران ملت سے پاک کرے گا اور عبدالرحمن خان دیگر مجاہد رہنماؤں کے ساتھ مل کر کابل سے انگریزوں کو باہر نکال دے گا مگر عبدالرحمن خان کا ارادہ کچھ واضح نہیں ہو رہا تھا۔ آخر کار ہرات کے مجاہدین کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ انہوں نے سردار ایوب کے سپہ سالار جنرل فقیر خان کو جو لشکر کی

باگیں تھام کر کھڑا تھا، قتل کر دیا اور خود اعلانِ جہاد کر کے قندھار کی طرف یلغار کا فیصلہ کر لیا۔ اب سردار محمد ایوب خان کو اپنی سرداری کے لالے پڑ گئے۔ اس نے مجبوراً مجاہدین کے فیصلے کو برقرار رکھا اور جون 1880ء میں 12 ہزار مجاہدین اور 32 توپوں کے ساتھ قندھار کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔

اگر میوند میں شہید نہ ہوئے تو: 20 جولائی کو مجاہدینِ اسلام کا یہ لشکر قندھار سے خاصے فاصلے پر میوند کے بے آب وگیاہ میدان میں آکر رُکا۔ آگے جنرل بروز اپنی فوج کے ساتھ راستہ روکے کھڑا تھا۔ انگریزوں کا پڑاؤ دریا کے کنارے تھا اس لیے انہیں پانی کے حصول میں کوئی دشواری نہیں تھی جبکہ مجاہدین کو مجبوراً ایسے چٹیل میدان میں ڈیرے ڈالنے پڑے تھے جہاں پانی ملنا بہت مشکل تھا۔ خوش قسمتی سے انہیں اپنے پڑاؤ سے کچھ دور قدیم زمانے کی ایک کاریز مل گئی۔ مجاہدین نے بڑی محنت سے اس بند کاریز کو صاف کیا اور یوں اس میں پانی جاری ہو گیا۔ مجاہدین نے سیراب ہو کر پانی پیا اور جنگ کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ چھ دن تک دونوں لشکر آمنے سامنے پڑاؤ ڈال کر ایک دوسرے کی قوت کا اندازہ کرتے رہے۔ انگریزی فوج کی تعداد 12 ہزار تھی جبکہ ان کے ساتھ ملت فروش افغانوں کا ایک گروہ بھی اپنے سردار شیر علی خان کی قیادت میں موجود تھا۔ وہ جدید اسلحے اور بھاری توپوں سے لیس تھے۔

ادھر مجاہدین کی افرادی قوت انگریزوں کے قریب قریب تھی مگر اسلحے کی کمی کے لحاظ سے ان کا پلہ کمزور تھا...... بہر کیف وہ قوت ایمانی اور جذبہ جہاد سے سرشار تھے۔ انہیں دشمنوں کی تعداد کا خوف تھا نہ اسلحے کی برتری سے کوئی اندیشہ...... ان کی نفسیاتی برتری کا واضح ثبوت یہ تھا کہ ان کی چھاپہ مار ٹولیاں بار بار دشمن کے پڑاؤ پر تند و تیز حملے کر کے اسے عمومی جنگ پر برانگیختہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جنگ اب جتنی جلد شروع ہوتی مجاہدین کے لیے بہتر تھا جبکہ تاخیر کی صورت میں انگریزوں کو کابل سے کمک پہنچ سکتی تھی۔ انگریز کمانڈر کو بھی غالباً اسی کمک کا انتظار تھا اس لیے وہ دم سادھے بیٹھا تھا۔

چھٹے روز مجاہدین کی کمان نے فیصلہ کر لیا کہ کل علی الصبح دشمن پر عمومی حملے کا آغاز کر دیا جائے۔ 27 جولائی 1880ء کا دن میوند کے چٹیل میدان میں مجاہدینِ اسلام کو جرأت ایمانی اور سرفروشی کی ایک نئی تاریخ رقم کرتا دیکھ رہا تھا۔ اس تاریخی معرکے کا آغاز طلوع آفتاب کے ساتھ مجاہدین کے طوفانی حملے سے ہوا۔ ہزاروں افغان مسلمان اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے ایک ریلے کی طرح صف در صف انگریز لشکر کی طرف بڑھنے لگے۔ انگریز بھی مقابلے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ انہوں نے توپوں کے دھانے کھول دیے۔ جو مجاہدین توپوں کی زد سے آگے نکل آتے، انہیں انگریزی فوج کا فائرنگ اسکواڈ نشانے پر لے لیتا۔ مجاہدین توپوں کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھے مگر فائرنگ کے جواب کے لیے ان کے

پاس پرانی بندوقیں ضرور تھیں...... انگریزوں کی جانب سے گولیوں کی بارش ہو رہی تھی جبکہ مجاہدین اپنی توڑے دار بندوقوں سے بڑی احتیاط کے ساتھ ایک ایک انگریز کو نشانہ بنا رہے تھے۔

جوں جوں سورج بلند ہو رہا تھا، لڑائی میں شدت آتی جا رہی تھی...... تیز دھوپ سے یہ سنگلاخ میدان لوہے کی طرح تپ رہا تھا...... مجاہدین بار بار دھاوؤں کے باوجود کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکے تھے جبکہ انگریزی پلٹن اپنے جدید اسلحے کی مدد سے اب تک انہیں دور رکھنے میں کامیاب تھی۔ مجاہدین ہر حملے میں درجنوں شہیدوں اور بیسیوں زخمیوں کو سنبھالتے ہوئے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو جاتے...... مگر اس کے باوجود ان کا حوصلہ برقرار اور ان کی ہمت بلند تھی۔

اس جوش و جذبے میں ان غیرت مند خواتین کا بڑا کردار تھا جو اپنے مجاہد بھائیوں کو غیرت دلا دلا کر آگے بڑھنے پر اُبھار رہی تھیں۔ ان میں خاتون ملالئی کا نام آج تک تاریخ افغانستان میں زندہ ہے جو رجز (جہادی ترانے) پڑھ پڑھ کر لشکرِ اِسلام میں ایک نئی روح پھونک رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انگریز اپنے جدید اسلحے، بہترین نظم وضبط اور جنگی قواعد میں مہارت کے باوجود مجاہدین کے حملوں کا سلسلہ نہیں روک پا رہے تھے۔

صبح سے اب تک انگریزوں کا پلہ بھاری نظر آ رہا تھا۔ 10 بجے تک پانچ سو مجاہدین شہید اور ساڑھے آٹھ سو سے زائد شدید زخمی ہو چکے تھے۔ انگریز کمانڈر محسوس کر رہا تھا کہ کچھ دیر تک وہ مجاہدین کو زیادہ سے زیادہ جانی نقصان پہنچانے کے بعد آگے بڑھ کر حملہ کرنے کی پوزیشن میں آ جائے گا۔

خاتون ملالئی کا ترانہ: دوپہر تک مجاہدین کے کئی کمانڈر بھی شہید ہو گئے۔ حیدر خان قندھاری، عبدالغفور خان مشر ہراتی، بچہ قادر خان اور محمد زمان بارک زئی جیسے مجاہد رہنماؤں کی لاشیں مجاہدین کے خیموں میں پہنچ چکی تھیں۔ اس کے باوجود مجاہدین جاں توڑ لڑائی لڑ رہے تھے۔ مجاہدین کا ایک پرچم بردار گولی کھا کر گرا تو خاتون ملالئی تیزی سے دوڑ کر آئی اور پرچم کو سنبھال لیا۔ اس نے پرچم اپنے کاندھے پر رکھ کر یہ یادگار اشعار پڑھے:

خال به د یار له وینو کیښږدم
به شنکئ باغ کل گلاب وشرموینه
که په میوند شهید نه شوی
خدائی یږو لالیه بې ننگی ته دی ساتینه

(میرے رُخسار پر خونِ معشوق کا ایسا سرخ تل ہے جو سر سبز و شاداب باغ کے سُرخ پھول کو شرمندہ

کردے۔ اگر تم میوند میں شہید نہ ہوئے تو خدائے ذوالجلال کی قسم بے غیرتی کی زندگی گزاروگے۔)

خاتون ملالئی کے ان الفاظ نے نہ صرف اپنے کمانڈروں کی لاشیں اُٹھانے والے مجاہدین میں ایک نئی روح پھونک دی بلکہ یہ اشعار اُفغان ادب کا حصہ بن کر آج تک مجاہدین کے لہو کو گرما رہے ہیں۔

نئی حکمت عملی: کئی سو مجاہدین اور متعدد بہترین کمانڈروں کی شہادت کے بعد مجاہدین کی اعلیٰ قیادت نے اپنی حکمت عملی میں تبدیلی کی۔ نائب سالار حفیظ خان نے دھاوا بولنے والے مجاہدین کو رُک جانے کا حکم دیا اور انہیں تاکید کی کہ انگریزوں کی گولیوں کے سامنے سینہ تاننے کی بجائے زمین پر لیٹ کر پوزیشن لے لیں اور آگے نہ بڑھیں۔ ادھر مجاہدین زمین پر لیٹے، ادھر سردار محمد ایوب خان کی قیادت میں چار ہزار سوار باگیں اُٹھائے میدان جنگ سے فرار ہوتے نظر آئے۔ جنرل برروز نے مجاہدین کو پیش قدمی سے عاجز اور مدافعانہ پوزیشن لینے پر مجبور پایا اور ساتھ ہی سوار فوج کو میدانِ جنگ سے بھاگتے ہوئے دیکھا تو اس نے اپنے سپاہیوں کو آگے بڑھ کر پوری قوت سے مجاہدین پر ٹوٹ پڑنے کا حکم دیا۔ اب گورے اپنی کمین گاہوں سے نکل کر تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ایک ہی حملے میں مجاہدین کی صف کو روند ڈالیں گے مگر جوں ہی وہ مجاہدین کی لمبی نال والی بندوقوں کی زد میں آئے، انہیں اپنی رفتار کم کرنا پڑی کیوں کہ یہاں مجاہدین کا کوئی نشانہ خطا نہیں جا رہا تھا۔ کچھ دیر تک انگریزوں اور مجاہدین کے درمیان گولیوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ پھر یکا یک میدانِ جنگ تکبیر کے فلک شگاف نعروں سے گونج اُٹھا اور گرد و غبار کے مرغولوں نے فضا کو ڈھانپ لیا۔ انگریز افسران نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا تو ہکا بکا رہ گئے۔ گرد کے بادلوں سے ہزاروں شہ سوار نمودار ہو رہے تھے۔ تب انگریزوں کو احساس ہوا کہ وہ مجاہدین کی چال میں پھنس گئے ہیں۔ لشکرِ اسلام کے جن گھڑسواروں کو انہوں نے فرار ہوتے دیکھا تھا وہ درحقیقت کئی میل دور جا کر ایک وسیع دائرے میں پھیل گئے تھے اور اب گھیرا تنگ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

برطانیہ کی عبرت ناک شکست: دیکھتے ہی دیکھتے گھڑسوار مجاہدین انگریزوں پر جھپٹ پڑے۔ اب دست بدست لڑائی شروع ہوئی۔ سنگینوں اور خنجروں کے وار بجلیوں کی طرح چمکنے لگے اور خون کے دھارے اڑا کر ایک صدی قبل کی جنگوں کا منظر پیش کرنے لگے۔

انگریز پلٹن اس حالت میں بھی اپنے معروف قواعد اور نظم وضبط کے ساتھ لڑ رہی تھی اس لیے جنگ کا فیصلہ جلد نہ ہوسکا۔ لڑائی سورج ڈھلنے تک جاری رہی۔ بہرکیف سہ پہر تک مجاہدین کا پلہ واضح طور پر بھاری ہوگیا۔ انگریزوں کی پیشہ ورانہ مہارت مجاہدین کے جذبۂ جہاد کے سامنے دم توڑ گئی۔ انگریزوں نے اب تک

دور مار اسلحے کے بل بوتے پر مجاہدین کو شدید نقصان پہنچایا تھا مگر دوبدو مقابلے میں ان کی سنگینیں اور تلواریں مجاہدین کے سامنے نہ ٹھہر سکیں۔ انگریزوں نے راہ فرار اختیار کرنے ہی میں عافیت جانی اور جس کا جدھر رُخ تھا بھاگ کھڑا ہوا۔ تاہم مجاہدین نے بچ نکلنے کا راستہ نہ دیا اور فرار ہونے والوں پر تیغ آزمائی جاری رکھی۔ بارہ ہزار انگریزوں میں سے گیارہ ہزار چار سو میوند کے میدان میں ڈھیر ہو گئے۔ صرف 600 افراد زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ بھگوڑوں نے ایک باغ میں پناہ لی مگر کچھ دیر بعد تعاقب کرنے والے مجاہدین ان کی تلاش میں یہاں پہنچ گئے اور کسی رعایت کے بغیر ان سب کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

مورخ مرزا یعقوب علی خوافی نے لکھا ہے کہ 12 ہزار انگریزوں میں سے صرف 25 افراد زندہ بچ سکے تھے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق یہ 25 انگریز بھی اس لیے بچ گئے تھے کہ وہ میدان جنگ میں اَفغانوں جیسا حلیہ بنا کر اور مقامی لباس پہن کر آئے تھے۔ نیز جب وہ فرار ہوئے تو غدار اَفغان سردار شیر علی خان ان کے ساتھ تھا۔ اس نے خفیہ راستوں سے گزار کر انہیں قندھار پہنچا دیا۔ انہی مفرورین کے ذریعے قندھار میں تعینات انگریز افسر جنرل پرائمروز کو برطانوی فوج کی عبرت ناک شکست کی خبر ملی۔ چونکہ اس وقت مواصلات کا نظام وجود میں آچکا تھا۔ اس لیے کابل سے یہ خبر فوراً لندن پہنچ گئی جس سے برطانوی حکومت میں ایک تہلکہ مچ گیا اور فوری طور پر افواج کو اَفغانستان سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ گویا برطانیہ نے عملاً اپنی شکست تسلیم کر لی۔

سردار عبدالرحمن خان کا اعلانِ بادشاہت: انگریزوں کو شکست دینے میں سردار ایوب خان کی قیادت میں لڑنے والے مجاہدین نے کلیدی کردار ادا کیا تھا اس لیے وہ بجا طور پر اَفغانستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے مجاز تھے۔ مگر اس وقت کابل میں سردار عبدالرحمن خان کے ظہور اور انگریزوں کے لیے اس کے دوستانہ رویے نے اتنی بڑی تاریخی فتح کے ثمرات کو بڑی حد تک بے مزہ کر دیا۔

معرکۂ میوند 27 جولائی 1880ء کو لڑا گیا تھا۔ اس سے صرف ایک دن پہلے سردار عبدالرحمن خان نے ایک لاکھ مجاہدین کی حمایت کے ساتھ چہاریکار میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا۔ اب انگریزوں کو ایک طرف تو میوند میں سردار ایوب خان کی قیادت میں جمع ہونے والے مجاہدین کے قندھار پر قبضے کا خطرہ لاحق تھا اور دوسری طرف سردار عبدالرحمن سے یہ خوف تھا کہ اگر وہ ایک لاکھ مجاہدین کے ساتھ کابل پر چڑھ دوڑا تو اسے روکنا ناممکن ہوگا۔

انگریزوں کی سردار عبدالرحمن سے سازباز: ان حالات میں انگریزوں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ سردار عبدالرحمن کو اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔ چونکہ سردار عبدالرحمن خود جہاد کے لیے مخلص نہ تھا بلکہ

مجاہدین کے اتنے بڑے جم غفیر کے ذریعے اقتدار حاصل کرنا چاہتا تھا اس لیے وہ پہلے سے انگریزوں کے لیے نرم گوشہ رکھتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں اور سردار عبدالرحمن کے درمیان یہ طے پا گیا کہ انگریز کابل کو سردار عبدالرحمن کے حوالے کر کے اسے اُفغانستان کا حکمران تسلیم کر لیں گے جبکہ سردار عبدالرحمن انہیں مکمل حفاظت کے ساتھ قندھار، غزنی اور کابل سے نکال کر پشاور پہنچائے گا۔ صرف یہی نہیں بلکہ انگریزوں نے یہ دیکھ کر کہ سردار عبدالرحمن اقتدار کی خاطر ان سے ہر طرح کی سازباز پر آمادہ ہے، اس سے معاہدہ گندمک کی چند ذلت آمیز شرائط بھی منظور کروالیں۔

معاہدہ گندمک مئی 1879ء میں شاہ اُفغانستان امیر یعقوب علی خان اور انگریزوں کے درمیان طے پایا تھا جس کے نتیجے میں اُفغانستان اپنی خارجہ پالیسی میں انگریزوں کا تابع فرمان بن گیا تھا اور اُفغانستان کو بیرونی دنیا سے ملانے والی اہم شاہراہیں انگریزوں کے قبضے میں چلی گئی تھی۔ انگریزوں نے سردار عبدالرحمن سے ایک بار پھر اس معاہدے پر دستخط لے لیے کہ:

(ا) حکمرانِ اُفغانستان برطانیہ کے سوا کسی دوسری حکومت سے دوستانہ روابط نہیں رکھے گا۔

(ب) درۂ بولان، کرم، پیواڑ اور درہ خیبر انگریزوں کے ہاتھ میں رہیں گے۔

(ج) پشین اور سبی میں انگریزوں کی چھاؤنیاں برقرار رہیں گی۔

(د) قندھار کو خودمختار علاقے کی حیثیت سے الگ حکمران کے ماتحت رکھا جائے گا۔

عبدالرحمن خان نے ان تمام شرائط کو منظور کر لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے انگریزوں کا محفوظ انخلاء بھی یقینی بنایا حالانکہ مجاہدین ان میں سے کسی کو اُفغانستان سے زندہ واپس جانے دینے کے حق میں نہیں تھے۔

<u>قندھار کا محاذ، شہر سے انگریزوں کا انخلا:</u> اُدھر سردار ایوب خان نے میوند کے فاتح مجاہدین کے ساتھ قندھار کا محاصرہ کر لیا تھا اور وہاں محصور انگریزی فوج کو جان کے لالے پڑ چکے تھے۔ جنرل رابرٹس نے یہ دیکھا تو ایک بھاری لشکر لے کر شیرپور سے قندھار روانہ ہو گیا۔ سردار عبدالرحمن خان نے اس لشکر کی حفاظت کے لیے اپنے امراء ساتھ کر دیے تھے اور راستے کے تمام قبائل کو انگریزوں پر کوئی دست درازی نہ کرنے کی تائید کی تھی۔ چنانچہ کابل قندھار شاہراہ جو ایک برس سے انگریزوں کے لیے موت کا گڑھ بنی ہوئی تھی اس بار پھولوں کی سیج ثابت ہوئی۔

جنرل رابرٹس کسی رکاوٹ کا سامنا کیے بغیر طوفانی رفتار سے سفر کرتا ہوا 28 اگست کو قندھار پہنچا اور سردار ایوب خان کے لشکر پر ٹوٹ پڑا۔ سردار ایوب خان انگریزوں کے اس اچانک حملے کی تاب نہ لا سکا اور یوں میوند کا فاتح لشکر قندھار سے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔ جنرل رابرٹس اب پورے اطمینان کے ساتھ قندھار

میں داخل ہوا۔ اس نے اعلان کیا کہ اب عبدالرحمن خان افغانستان کا بادشاہ ہے اس لیے ہم قندھار اس کے نمائندوں کے حوالے کریں گے۔ عبدالرحمن خان کا نمائندہ شمس الدین خان جنرل رابرٹس کے ساتھ کابل سے قندھار آیا تھا۔ انگریزوں نے قندھار اس کے سپرد کر دیا۔ انگریز اب مطمئن تھے کہ وہ افغانستان سے پورے تحفظ کے ساتھ نکل سکتے ہیں اور ان کے بعد عبدالرحمن خان خودمختار بادشاہ ہو کر بھی طے شدہ معاہدے کے مطابق اپنی سیاسی حکمت عملی میں قدم قدم پر ان کا محتاج ہوگا۔ افغانستان آزاد کہلانے کے باوجود برطانوی حکومت کا تابع دار ہوگا اور مجاہدین آزاد اسلامی حکومت کے قیام کا خواب پورا نہیں کر سکیں گے۔

<u>عبدالرحمن خان کابل میں:</u> اگست میں انگریزوں کا انخلاء شروع ہوگیا۔ ادھر عبدالرحمن خان جواب تک چاریکار میں پڑاؤ ڈالے ہوا تھا، کابل پہنچ گیا۔ کابل کے سادہ لوح عوام جو انگریزوں کی واپسی کو سردار عبدالرحمن کا کارنامہ تصور کر رہے تھے، اس کے استقبال کے لیے اُمنڈ آئے۔ عبدالرحمن خان نے کابل کے باغ شہر آرا میں پڑاؤ ڈالا۔ اس دوران انگریز کمان کے اعلیٰ آفیسر جنرل گریفن اور جنرل اسٹوارٹ جو اپنی افواج کے ساتھ کابل سے نکل رہے تھے، اس سے الوداعی ملاقات کے لیے آئے۔ بعد میں اس مقام پر عبدالرحمن خان کے حکم سے انگریزوں کے انخلا کی یادگار کے طور پر ایک عمارت ''برج شہر آرا'' بنائی گئی جس کے کھنڈرات آج بھی انگریزوں کی ذلت آمیز پسپائی کی یاد دلاتے ہیں۔

<u>انگریزوں کی پسپائی پر تبصرہ:</u> یہ درست ہے کہ 1879ء اور 1880ء کے اس یادگار جہاد کے تمام ثمرات کو محفوظ نہیں کیا جاسکا اور عبدالرحمن خان کی انگریزوں سے مفاہمت کے باعث اس سے خاطر خواہ فائدہ نہ اُٹھایا جاسکا مگر یہ بھی کم نہیں تھا کہ بے سروسامان مجاہدین نے صرف ایک سال 9 ماہ کی زبردست کارروائیوں سے دنیا کی سب سے بڑی طاقت کو چھٹی کا دودھ یاد دلا کر دوبارہ اپنے ملک سے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یاد رہے کہ یہ زمانہ انگریزوں کے انتہائی عروج کا تھا۔ 1841ء کی بہ نسبت اب وہ سلطنت کی وسعت، افواج کی طاقت، دولت وثروت اور صنعتی وسائنسی ترقی کے لحاظ سے بہت آگے نکل چکے تھے۔ دنیا کے ہر میدان میں وہ فتوحات حاصل کر رہے تھے۔ یورپ میں ان کا ہم پلہ کوئی نہ تھا۔ انہیں امریکا اور روس پر برتری حاصل تھی۔ ہندوستان کا ہر گوشہ ان کے قبضے میں تھا۔ عرب ان کی سیاست کے اسیر تھے اور عجم ان کا حلقہ بگوش تھا۔ ان کی سلطنت میں سورج نہ ڈوبنے کا محاورہ اسی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے باوجود دنیا کی یہ سب سے بڑی طاقت مجاہدین کے جذبہ ایمانی کے آگے دو سال بھی نہ ٹھہر سکی اور آخر اس کی سب سے بڑی ترجیح یہ بن گئی کہ کسی طرح اس کے سپاہی افغانستان سے زندہ سلامت نکل آئیں۔

اگر عبدالرحمن خان کی سیاسی مصلحتیں آڑے نہ آتیں تو یقیناً مجاہدین ان باقی ماندہ گوروں کو بھی

اَفغانستان کے پہاڑوں میں گاڑ دیتے مگر عبدالرحمن خان نے ایسا نہ ہونے دیا۔ اس نے معاہدے کے مطابق انگریزوں کو نہ صرف محفوظ راستے دیے بلکہ ان کی خوراک ورسد سے لے کر سواریوں کے چارے تک کا خیال رکھا اور تمام سفری سہولیات مہیا کریں۔ یوں موسم سرما سے پہلے پہلے تمام انگریز افواج اَفغانستان سے نکل گئیں۔ برطانیہ کے لیے یہ منظر نہایت عبرت انگیز تھا کہ 60 ہزار انگریزوں میں سے صرف 30 ہزار کے لگ بھگ واپس لوٹ رہے تھے۔ نصف فوج اَفغان مجاہدین کے ہاتھوں مختلف جنگوں میں ماری جا چکی تھی۔ پوری دنیا میں انگریزوں کا سر جھک گیا تھا اور یہ ثابت ہو گیا تھا کہ مسلمان اس تنزل وانحطاط کے دور میں بھی دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو شکست سے دوچار کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔

<u>برطانیہ کا گھمنڈ ٹوٹ گیا:</u> اس شکست کا برطانوی گورنمنٹ پر کیا اثر پڑا؟ اپنی افواج، سیاست، جدید اسلحے اور مواصلاتی ذرائع پر اس کا گھمنڈ ٹوٹ گیا۔ برطانیہ کے بڑے دماغوں نے ایک عرصے تک اس ''تاریخی المیے'' پر تحقیق کی اور آخر یہ فیصلہ سنایا کہ آیندہ کبھی بھی اَفغانستان میں عسکری مداخلت کی کوشش نہ کی جائے ورنہ نتائج اس سے زیادہ برے ہوں گے۔ اس پس منظر میں انگلستان کے سیاسی اُمور کے ماہر مسٹر والنٹین نے تحریر کیا:

''ہم اہلِ اَفغانستان کی مزاحمت کے شعلوں سے واقف ہو چکے ہیں۔ یہ باصلاحیت لڑاکا قوم ان ہولناک ریگستانوں اور دشوار گزار پہاڑوں کو اپنے آبائی وطن کی حیثیت سے پہچانتی ہے اور نہایت جانثاری کے ساتھ ان کے دفاع کے لیے لڑتی اور مدافعت کرتی ہے۔ اَفغانوں نے 1842ء اور 1880ء میں ہمارے ساتھ مقابلہ کیا حالانکہ وہ عسکری علوم اور جدید اسلحے کی ٹیکنالوجی سے آگاہ نہیں مگر اس کے باوجود وہ مردانہ وار لڑے۔ ان جنگوں میں ان کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ کفار کی یلغار کا مقابلہ کرنا جہاد ہے۔ چنانچہ انہوں نے جواں مردی کے ساتھ اپنا دفاع کیا۔ آج بھی اَفغانستان کے طبعی وقدرتی حفاظتی انتظامات اتنے ہی خوفناک اور بھیانک ہیں جتنے ہمیشہ سے تھے۔''

مآخذ و مراجع

⚜ ...... اَفغانستان در مسیر تاریخ، میر غلام محمد غبار
⚜ ...... تاج التواریخ، امیر عبدالرحمن خان
⚜ ...... سراج التواریخ، مرزا فیض محمد خان

انیسواں باب

امیر عبدالرحمن خان کا دور

عبدالرحمن خان اُفغانستان کے گزشتہ حکمرانوں کی طرح ''امیر'' کا لقب اختیار کر کے تختِ کابل پر براجمان ہوا۔اس کے سامنے کئی بڑے مسائل تھے جنہیں حل کرنا ناگزیر تھا۔

1842ء اور 1880ء کی برطانیہ اُفغان جنگوں میں اگرچہ استعمار کو شکست ہوئی مگر مالی و اقتصادی لحاظ سے اُفغانستان تباہ و برباد ہو گیا۔ صنعتیں ختم ہو گئیں، تجارت ماند پڑ گئی، تعمیراتی و ترقیاتی کام رُک گئے، آبادیاں ویران ہونے لگیں، تعلیمی سرگرمیاں برائے نام رہ گئیں اور زراعت کی خاک اُڑنے لگی۔ اب جبکہ امیر عبدالرحمن نے حکومت سنبھالی تھی، اُفغانستان کی صورتِ حال نہایت ناگفتہ بہ تھی۔ نظام مملکت کا ڈھانچہ بکھر چکا تھا اور اسے نئے سرے سے استوار کرنا، گزشتہ تمام ادوار سے زیادہ مشکل تھا اس لیے کہ اب اُفغانستان حقیقتاً مکمل آزاد نہ تھا۔اس کے تمام تجارتی راستے انگریزوں کے قبضے میں تھے اور سیاسی روابط بھی انہی کے رحم و کرم پر تھے۔اُفغانستان دنیا کا وہ پس ماندہ ترین ملک بن چکا تھا جو اب تک گزشتہ صدی میں جی رہا تھا۔

<u>امیر عبدالرحمن کی اصلاحات</u>: امیر عبدالرحمن خان نے اس صورتِ حال کو تبدیل کرنے کی کوشش کی اور کئی مؤثر اقدامات کیے مگر چونکہ طبیعت میں خود رائی غالب تھی اس لیے اس کے کئی اقدامات غیر معتدل اور کئی پالیسیاں اِسلامی اقدار کے مخالف تھیں۔ مثلاً: ملکی خزانہ خالی دیکھ کر اسے پُر کرنے کی کوشش میں عوام پر نئے بے جا ٹیکس عائد کر دیے گئے اور کئی سابقہ ٹیکسوں میں اضافہ کر دیا گیا۔

امیر عبدالرحمن نے تجارت پر خصوصی توجہ دی اور اس کے لیے شاہراہوں کو محفوظ تر بنا دیا۔ چور کے لیے پھانسی کی سزا مقرر کی گئی اور چوری شدہ مال کی خرید و فروخت کرنے والے تاجروں کی تجارت روک دی۔امیر کا رُعب و دبدبہ اس قدر تھا کہ شارع عام پر کسی کا بٹوہ گر جاتا تو کسی کو اُٹھانے کی جرأت نہ ہوتی۔ تجارت کو اتنا فروغ ہوا کہ اُفغان تاجروں نے پشاور، کراچی اور مشہد (ایران) میں منڈیاں بنالیں۔

اَفغان حکومت کے تجارتی نمائندے ان سرگرمیوں کی سرپرستی کرتے تھے۔ صنعت وحرفت میں بھی نمایاں ترقی ہوئی۔ قالین سازی، چمڑا سازی اور کپڑے کی صنعت خوب پھلی پھولی۔ بڑی بڑی عمارتیں تعمیر ہوئیں جن میں کابل کی مسجد پل خشتی، مہتاب قلعہ، باغ بابر قابل ذکر ہیں۔

عبدالرحمن خان کے ابتدائی حالات: اس سے پہلے کہ ہم امیر عبدالرحمن خان کے حالات کی مزید تفصیل بیان کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ابتدائی حالات پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اس کی 1880ء تک کی سرگرمیوں کا خلاصہ بیان کیا جائے تاکہ قارئین کو کسی پہلو سے تشنگی نہ رہے۔

امیر عبدالرحمن خان 1844ء میں افضل خان کے ہاں پیدا ہوا جو کہ اپنے والد امیر دوست محمد خان کی طرف سے بلخ کا حاکم تھا۔ وہ افضل خان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ امیر دوست محمد خان کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں میں اقتدار کی جنگ چھڑی تو نوجوان عبدالرحمن خان نے اپنے باپ افضل خان کی طرف سے ان لڑائیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ اس وقت دوست محمد خان کا نامزد جانشین امیر شیر علی اَفغانستان کا حکمران تھا۔ افضل خان اپنے بیٹے عبدالرحمن خان کے ساتھ اس کے خلاف محاذ آرائی میں مشغول رہا۔ یہ لڑائیاں 1864ء سے 1867ء تک جاری رہیں۔ اس دوران افضل خان وفات پا گیا اور عبدالرحمن خان اپنے دوسرے چچا اعظم خان کی معیت میں اقتدار کے لیے سرگرم رہا۔ شروع شروع میں اسے کچھ کامیابیاں ہوئیں اور 1866ء میں اس نے کچھ مدت کے لیے کابل پر قبضہ بھی کر لیا تھا مگر انجام کار سرکاری افواج نے اسے غزنی کے مضافات میں فیصلہ کن شکست دے دی۔

جلاوطنی سے تخت شاہی تک: عبدالرحمن خان اس ناکامی کے بعد ایک بے وطن مسافر کی طرح قریہ قریہ گھومتا رہا۔ وزیرستان میں کچھ عرصہ گزار کر ایران چلا گیا اور آخر کار صحراؤں کو چھانتا ہوا وسط ایشیا کے شہر تاشقند پہنچ گیا۔ روسی گورنر کاف مان نے اس کی بدحالی پر ترس کھا کر اسے پناہ دی اور اس کی گزر اوقات کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا۔ 1879ء میں شیر علی خان برطانیہ سے تعلقات بگڑ جانے کے سبب گھبرا کر از خود اقتدار سے سبک دوش ہو گیا۔ اس کے فرار کے بعد اس کا بیٹا یعقوب علی خان تخت نشین ہوا اور حالات کی مزید خرابی کا باعث بن کر آخر کار انگریزوں کے ہاتھوں تخت سے اُتارا گیا۔ اس کے بعد اَفغانستان میں انگریزوں کے خلاف تحریک جہاد شروع ہو گئی اور انگریزوں کے قدم اُکھڑنے لگے۔ اس موقع پر عبدالرحمن خان اَفغانستان کی حکومت کا اُمیدوار بن کر روس سے کابل آن پہنچا اور انگریزوں کو اپنی وفاداری کا یقین دلا کر ایک معاہدے کے ذریعے اَفغانستان کا حکمران بن گیا۔

عبدالرحمن کا مزاج: عبدالرحمن خان کی طبیعت میں تندمزاجی اور بے رحمی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جو

اس کے والد کی لاکھ کوششوں کے باوجود ختم نہ ہوئی۔ اپنی خود نوشت سوانح حیات ''تاج التواریخ'' میں اس نے بیان کیا ہے کہ بچپن میں مجھ پر چرس اور شراب پینے کا الزام لگایا گیا جس پر میرے والد نے مجھے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا اور ایک سال تک قید رکھا۔ اس واقعے کو اس کے معاصر مورخ یعقوب علی نے اس طرح بیان کیا ہے:

''سردار عبدالرحمن لڑکپن میں بندوق چلانے کی مشق کیا کرتا تھا۔ ایک دن شہر مزار شریف کے باہر نشانہ بازی کے دوران کہنے لگا: 'پتہ نہیں بندوق کی گولی سے آدمی مرتا ہے یا نہیں؟' یہ کہہ کر ایک غلام کو بلوایا اور چند قدم دور کھڑا کر کے اس پر گولی چلا دی۔ غلام مر گیا اور عبدالرحمن خان ہنسنے لگا۔ جب اس کے باپ کو پتہ چلا تو اس نے نالائق بیٹے کو توپ خانے کی ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔''

فوج کی تشکیل نو: عبدالرحمن خان اُمور سیاست کا ماہر تھا اس لیے اس نے اپنے کسی مخالف کو سر اُٹھانے کا موقع نہ دیا اور بہت جلد پورے ملک پر گرفت مضبوط کر لی۔ وہ ایک سخت گیر منتظم تھا۔ اس نے قدیم حکومتی ڈھانچے کو دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دینے سے عاجز پایا تو اس میں کئی تبدیلیاں کیں اور نئے شعبہ جات قائم کیے۔ مالیات کا نیا نظام قائم کیا۔ فوج کو نئے سرے سے تشکیل دیا اور اس سلسلے میں متعدد قوانین بنائے۔ ملک کے ہر آٹھ بالغ افراد میں سے ایک کا فوج میں شامل ہونا لازمی قرار دیا۔ ہر سپاہی کے لیے ضروری تھا کہ وہ رُخصت کے ایام میں اپنا متبادل آدمی فوج میں بھیجے۔ میدان جنگ میں رونے دھونے والے سپاہی کے لیے عبرتناک سزائیں طے کر دی گئیں جن میں سزائے موت بھی شامل تھی۔ میدان جنگ میں کام آنے والے سپاہی کے والدین اور اولاد کے لیے وظیفہ مقرر کیا گیا۔ امیر عبدالرحمن کی کوششوں سے کچھ ہی عرصے میں اَفغان فوج اتنی مضبوط ہو گئی کہ اس میں صرف رائفل برداروں کی تعداد 60 ہزار تک پہنچ گئی۔ پولیس کے نظام کو بھی جدید خطوط پر استوار کیا گیا مگر چونکہ امیر عبدالرحمن خان کی طبیعت میں سختی حد سے بڑھی ہوئی تھی اس لیے پولیس اور عدلیہ عوام کو انصاف مہیا کرنے کی بجائے شخصی اقتدار کے محافظ بنتے چلے گئے۔

حکومت میں عوامی نمائندگی، شورائیت اور قبائلی عمائدین و علماء کے اشتراک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہر فیصلہ امیر عبدالرحمن خان کے ہاتھ میں تھا۔ تمام بیوروکریسی ''دستور العمل حکام وضباط'' نامی ایک دستاویز پر عمل کرتی تھی اور عدلیہ ''اساس القضاۃ'' نامی ایک کتاب پر عمل کی پابند تھی۔ ملک میں نظم وضبط تو یقیناً قائم ہو گیا تھا۔ امن و امان بھی تھا مگر بالکل ایسا جیسے کسی قید خانے میں۔

جاسوسی کا نیا نظام، تشدد کی گرم بازاری: عبدالرحمن خان ایک گھاگ حکمران کی طرح اپنے مخالفین پر نگاہ

رکھے ہوئے تھا۔ مخالف عناصر سے نبٹنے کے لیے اس نے ایک آمر کا روپ دھار لیا تھا۔ ملک بھر میں جاسوسوں کا جال بچھا دیا جو اس کے خلاف کہے جانے والے ایک ایک لفظ کو نوٹ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

اس نے مخبری کے قدیم نظام کو تبدیل کر کے انگریزوں کے خفیہ اداروں کی طرز پر جاسوسی کا وسیع نظام قائم کرنے کی کوشش کی...... مگر وہ یہ بھول گیا کہ انگریزوں نے خفیہ ادارہ اپنے دشمنوں کے خلاف تشکیل دیا تھا جبکہ عبدالرحمن خان کا محکمۂ جاسوسی اپنے ہی لوگوں پر مسلط ہو رہا تھا۔ پھر اس میں کام کا کوئی ٹھوس معیار نہیں تھا۔ ہر کسی کو جاسوسی کے لیے بھرتی کر لیا جاتا تھا۔ خبروں کی تصدیق کے لیے کوئی موثر طریق کار نہیں تھا اس لیے بہت سے لوگ جاسوسی کے ذریعے سابقہ دشمنیاں نکال رہے تھے اور بے گناہوں کو پھنسوا کر اپنی آتشِ انتقام کو ٹھنڈا کر رہے تھے۔

جو لوگ حکومت کے خلاف کچھ کرنے یا کہنے کے شبہے میں گرفتار کر لیے جاتے انہیں الزامات کی تصدیق سے پہلے ہی روایتی انگریزی تھانوں کی طرح مار پیٹ اور تشدد کے مراحل سے گزرنا پڑتا تھا...... کوئی خوش قسمت ہوتا تو بعد میں بری ہو جاتا ورنہ کال کوٹھڑی یا پھانسی گھاٹ کی نذر ہو جاتا...... حکومت کے عتاب زدہ لوگ تقریباً ان تمام مظالم کا شکار ہو رہے تھے جن کی داغ بیل انگریزوں نے ڈالی تھی۔ ملزموں کو مسلسل بیدار رکھنا، لاٹھیوں سے پیٹنا، الٹا لٹکا دینا، اعضا کو داغنا، ہاتھ پاؤں کاٹ دینا، شکنجوں میں کس دینا اور توپ سے باندھ کر اُڑا دینا عام سی بات ہو گئی تھی۔

امیر عبدالرحمن خود قاضی کی طرح سزائیں تجویز کرتا اور مجرموں کو کسی پوچھ گچھ کے بغیر بدترین مظالم کا نشانہ بنا کر اپنے ذوقِ اذیت رسانی کو تسکین دیتا۔ اس کی ''عدالت'' کا ایک منظر ملاحظہ کیجیے۔

سخت جاڑے کے موسم میں چند افراد مجرموں کی حیثیت سے اس کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ پیش کار کہتا ہے: ''حضور! یہ کوہ دامن کے چور ہیں۔''

امیر کسی سوال و جواب یا غور و فکر کے بغیر فیصلہ صادر کرتا ہے: ''ان میں سے دو کو ذبح کر دو، چار کے ہاتھ کاٹ دو، تین کے کان کاٹ دو، دو کی آنکھیں سی دو، تین کے پیٹ چیر دو۔''

ان کے بعد چند مزید مجرم لائے جاتے ہیں اور پیش کار پکار کر کہتا ہے: ''یہ محمد کاظم کپڑے والے کی دکان کے چور ہیں۔''

امیر فوراً فیصلہ سناتا ہے: ''جن کے گھروں سے چوری شدہ مال برآمد ہوا ہے، ان کی آنکھیں پھوڑ کر ان میں چونا بھر دیا جائے، اس تھانے کے کوتوال کو قتل کر دیا جائے۔''

ملزموں پر جرم ثابت ہونے سے پہلے ڈھائے جانے والی عقوبت بھی اتنی سخت ہوتی تھیں کہ اکثر بے قصور

لوگ ناکردہ جرائم کا اعتراف کر لیتے تھے۔ مثلاً مرزا عبدالحکیم خان کو کسی الزام میں گرفتار کر کے شکنجے کے سامنے لایا گیا تو وہ بولا: ''میں یہ تکلیف برداشت نہیں کر سکوں گا، آپ جو چاہے قبول کروالیں۔'' چنانچہ اس سے ایک سنگین ناکردہ جرم لکھوا کر دستخط لے لیے گئے اور اگلے دن توپ کے منہ سے باندھ کر اُڑا دیا گیا۔

شش کلاہ: امیر عبدالرحمن خان کا تشکیل کردہ ادارہ ''شش کلاہ'' بھی عوام وخواص کے لیے بہت بڑا عذاب تھا۔ یہ ادارہ ایک قسم کا ''احتساب بیورو'' تھا جس میں چھ سخت گیر افسران متعین تھے۔ اس کے ذریعے احتساب کے نام پر سیاسی مخالفین کو انتقام کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اس ادارے کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ افغانستان کے بڑے بڑے عمائد اور امراء صرف یہ سن کر کہ ان کے خلاف ''شش کلاہ'' میں تفتیش کا آغاز ہونے والا ہے، ملک چھوڑ کر ہجرت کرنے لگے تھے۔

امیر کا تفریحی ذوق: امیر خود جفاکشی، محنتی اور مردانہ زندگی گزارنے کا عادی تھا۔ محلاتی عیش وآرام اور حرم سرا کی خلوتوں کی بجائے اسے مردانہ وعسکری کھیل اور میلے ٹھیلے زیادہ پسند تھے، اس نے افغانستان میں مقامی میلوں کو رواج دیا۔ بازاروں میں قصہ گوئی کی مجالس کی حوصلہ افزائی کی۔ کابل کے میدان اس کے دور میں گھڑسواری، نیزہ بازی، بنوٹ، شمشیرزنی اور نشانہ بازی کے مراکز بن گئے تھے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کے دور میں غیر شرعی تفریحات مثلاً کبوتر بازی، ناچ گانے اور موسیقی کا رُجحان بھی بڑھا۔

چودہ گھنٹے کام، اُجرت ہزار لعنت: اس کا خیال تھا کہ ملک کی ترقی کے لیے ملازمین کو زیادہ سے زیادہ کام کرنا چاہیے چنانچہ اس نے ایک دن اچانک حکم جاری کر دیا کہ سرکاری دفاتر میں سورج کی پہلی کرن کے ساتھ کام شروع ہو اور غروبِ آفتاب پر دفاتر بند ہو۔ اس حکم کے نتیجے میں دفاتر تو تیرہ چودہ گھنٹے آباد رہنے لگے مگر ملازمین ادھ موئے ہو گئے تاہم کسی کو ہمت نہ تھی کہ دم مار سکتا۔ آخر امیر کے بیٹے محمد عمر کی رسمِ عقیقہ کے موقع پر پچاس کے لگ بھگ افسران نے بہت ڈرتے ڈرتے امیر کی بیگم ''بوبوجان'' کی سفارش کے ساتھ ایک درخواست پیش کی جس میں اپنی مشکلات پیش کر کے عرض کیا گیا کہ ملازمین بیمار، لاچار اور زندگی سے بےزار ہو رہے ہیں۔ اس نیک ساعت میں ان پر رحم کھا کر اوقاتِ کار میں تخفیف کی جائے...... درخواست کے آخر میں 52 افسران کے دستخط تھے۔ سب نے خود کو کم ترین، نمک خوار، بندہ، تیرِ فقیر، جاں نثار، خادم، کمینہ وغیرہ لکھ کر دستخط کیے تھے...... مگر امیر عبدالرحمن نے درخواست اور نام پڑھتے ہوئے یوں جواب دیا: ''تم پر اور تمہارے آباء پر ہزار لعنت۔''

درخواست کو یوں مسترد ہوتے دیکھ کر پھر کسی کو کسی بارے میں دوبارہ التجا یا عرض ومعروض کی ہمت نہ رہی۔

عبدالرحمن کے خلاف مخالفانہ فضا: امیر عبدالرحمن خان نے اپنے کسی مخالف کو باقی نہ چھوڑا۔ اسے جس

پر ذرا بھی شک ہو جاتا کہ وہ اس کے اقتدار کے لیے خطرہ بن سکتا ہے، وہ اس کا خاتمہ کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کر دیتا...... اس کی یہ خوئے بد ان مجاہدین کے حق میں بھی ظاہر ہو کر رہی جن کی قربانیوں نے اسے تختِ شاہی تک پہنچنے کے قابل بنایا تھا اور جن کے سامنے پرچم جہاد بلند کر کے اس نے اپنی حمایت کے لیے فضا ہموار کی تھی۔

امیر عبدالرحمن خان کے برسرِ اقتدار آنے کے دوسرے سال (1881ء میں) یہ بات سب پر عیاں ہوگئی کہ اس کی پالیسیوں کا عوامی اُمنگوں سے کوئی تعلق ہے نہ اِسلامی روح سے جس کے لیے تحریک جہاد برپا کی گئی تھی۔ وہ خود پسندی اور خود رائی کا شکار حکمران تھا۔ اس کی کوئی کابینہ تھی نہ مجلس شوریٰ۔ اس کے فیصلے، شخصی فیصلے اور حکومت، شخصی حکومت تھی۔ عوام اب اسے ظالم بادشاہ کے لقب سے یاد کرنے لگے تھے۔

کابل کے جیل خانے میں اس نے ہزاروں مردوں اور عورتوں کو قید کر رکھا تھا۔ جہادی رہنما سمجھ چکے تھے کہ اس کا نعرۂ جہاد محض فریب تھا۔ وہ انگریزوں کا قریب ترین حلیف ہے اور ان سے معاہدے اور سودے بازی کے ذریعے حکمران بنا ہے۔ اس کی دوستانہ روش کے باعث انگریز اپنی طاقت بچا کر لے جانے میں کامیاب رہے ہیں اور اس کی انگریز نوازی نے ملک کو معاہدوں کی ایسی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے جن سے ملک کی خود مختار حیثیت سخت مجروح ہوئی ہے۔ چنانچہ مجاہد رہنما آہستہ آہستہ امیر عبدالرحمن کے خلاف آوازیں بلند کرنے لگے۔ ان رہنماؤں میں جنرل جان محمد خان، ملا مشک عالم، محمد افضل خان وردگی، سپہ سالار حسین خان، نائب سپہ سالار داؤ دشاہ، اکبر خان لعل پوری اور محمد شاہ خان غلجائی پیش پیش تھے۔ ان کے علاوہ اَفغانستان کے صوفیائے کرام کا طبقہ بھی جو ''روحانی'' کہلاتا تھا، بھرپور مخالفت کر رہا تھا، عوام میں کاشت کار جو کہ نئے اضافی ٹیکسوں سے تنگ آ چکے تھے حکومت کے خلاف آمادۂ بغاوت تھے۔

امیر کے خلاف اس نفرت کا نتیجہ تھا کہ ایک موقع پر مزار شریف کی حدود میں اس پر قاتلانہ حملہ ہوا مگر اس کی زندگی باقی تھی۔ گولی پاس سے گزر گئی۔ امیر کی گرفت اب اور سخت ہونے لگی۔ اسے سب سے زیادہ خطرہ جہادی رہنماؤں ہی سے تھا۔ چنانچہ اس نے بڑی تیزی سے ان کے خلاف کارروائی شروع کر دی۔ پروپیگنڈے کے ذریعے جہادی رہنماؤں کو ایجنٹ اور سازشی عناصر کے طور پر مشہور کر دیا گیا۔ ان کے ناموں اور القاب کو بگاڑ کر عوام کے لیے مضحکہ خیز بنا دیا گیا۔ جید عالم دین اور مجاہد فی سبیل اللہ ''ملا دین محمد افندی'' کو مشک عالم کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ امیر عبدالرحمن کی پروپیگنڈا مشینری نے ان کی کردار کشی کر کے انہیں موشی عالم (چوہا مولوی) کے نام سے مشہور کرنے کی کوشش کی۔ یہ الگ بات ہے کہ ملا صاحب کی خداداد مقبولیت میں کوئی فرق نہ آیا اور عوام نے اس ناپاک حکومتی کوشش کو نفرت کی نگاہ

سے دیکھا۔ اس کے باوجود بہت سے جہادی رہنماؤں کے خلاف پروپیگنڈا اس حد تک کامیاب ہو گیا کہ وہ عوام کو متحرک کرنے اور عوام ان کے گرد جمع ہونے میں تذبذب کا شکار ہو گئے۔ اس کے فوراً بعد سرکار کے فولادی ہاتھ حرکت میں آ گئے اور مجاہد لیڈروں کی گرفتاریاں شروع ہو گئیں...... کچھ ہی عرصے میں گرفتار شدگان کی تعداد تین ہزار تک پہنچ گئی۔ جنرل جان محمد خان کے خلاف یہ مشہور کر کے کہ وہ انگریزوں کے ساتھ مل کر منصب سپہ سالاری کے حصول کی سازش کر رہا ہے، اسے گرفتار کر لیا گیا اور پھر 200 سپاہیوں کے پہرے میں مزار شریف روانہ کر دیا گیا۔ مزار شریف سے کچھ فاصلے پر اسے خفیہ طور پر قتل کر کے وہیں دفنا دیا گیا۔

جنرل جان محمد کے بھائی محمد افضل خان، اور اس کے ساتھ عصمت اللہ خان، بہرام خان اور کئی لیڈروں کو بھی جیل میں ڈال دیا گیا۔ مجاہدین کا یہ انجام دیکھ کر کئی بڑے انقلابی لیڈر از خود ملک سے ہجرت کر گئے جن میں میر بچہ خان، غلام محمد خان، میر درویش خان اور فتح محمد خان قابل ذکر ہیں۔

ملا مشک عالم کی بے باکی: ملا مشک عالم اب تک اُفغانستان ہی میں تھے۔ امیر عبدالرحمن ان کی مقبولیت کے باعث ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا، چنانچہ انہیں انعام و اکرام کے ذریعے اپنا حامی بنانے کی کوشش شروع کی اور 1884ء میں ان کے علاقے غزنی میں دربار عام منعقد کر کے انہیں تشریف آوری کی دعوت دی۔ ملا صاحب نے اس دعوت کو سختی سے ٹھکرا دیا۔

آخر امیر نے اپنے بھائی شرین دل خان کو ایک وفد کے ساتھ ملا صاحب کو منانے کے لیے بھیجا۔ ملا صاحب نے اب بھی امیر کی حمایت اور دربار میں حاضری سے انکار کیا۔ وجہ پوچھی گئی تو بے باکانہ انداز میں فرمایا: ''وہ تین ہزار اُفغان بزرگ جنہوں نے انگریز کے غلبے کے خلاف جنگ کی تھی اور اسلام کی حرمت کی حفاظت کے لیے سخت قربانیاں دی تھیں، آج کابل کے جیل خانے میں قید ہیں اور ان کا یہ انجام لوگوں میں مایوسی اور دہشت کا سبب بن رہا ہے۔ اس حالت میں تو میں خود بھی جو کہ اُفغان عوام میں سے ایک ہوں، اپنے آپ کو خطرے میں محسوس کرتا ہوں۔''

ملا مشک کے بیٹے کی تحریک: امیر عبدالرحمن خان نے اس جواب کے بعد انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا کیوں کہ ملا مشک عالم ضعف و پیری کی وجہ سے اب اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں بن سکتے تھے۔ 2 سال بعد 10 ربیع الاول 1303ھ (1886ء) میں ملا صاحب وفات پا گئے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے عبدالکریم نے امیر عبدالرحمن کے خلاف مسلح تحریک شروع کی مگر سرکاری افواج نے کئی خوں ریز جنگوں کے بعد اس تحریک کو ابتدا ہی میں کچل دیا۔ ہزاروں افراد بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیے گئے۔ ملا مشک عالم

کے آبائی علاقے ''اندر'' کے لوگ اس تحریک میں پیش پیش تھے۔ امیر کے حکم سے ''اندر'' کے ایک ہزار مقتولین کی کھوپڑیاں الگ کر کے میدان جنگ سے کابل روانہ کی گئیں اور انہیں ایک اونچے مینار پر نصب کر دیا گیا۔ یہ نظارہ دیکھ کر عوام کے دل دہل گئے اور امیر کا خوف پہلے سے بڑھ کر چھا گیا۔

فاتح میوند محمد ایوب خان سے معرکہ: امیر عبدالرحمن خان کے اکثر مخالفین اس کے اقتدار کے ابتدائی تین چار برسوں ہی میں مغلوب ہو گئے تھے۔ البتہ ایک شخص تھا جو اس کی حکومت کے ساتویں برس تک اس کے لیے خوف و دہشت کی علامت بنا رہا۔ یہ جنگ میوند کا فاتح سردار محمد ایوب خان تھا۔ جولائی 1880ء میں اسی نے میوند کے میدان میں انگریزوں کو تاریخی شکست دی تھی۔ اس کے بعد اس نے قندھار کا محاصرہ بھی کر لیا تھا تاکہ وہاں پناہ گزین برطانوی فوج کو مزا چکھائے مگر عبدالرحمن خان اور انگریزوں کی ملی بھگت کے باعث اسے محاصرہ چھوڑ کر ہرات واپس جانا پڑا تھا۔

ہرات اور مغربی وجنوبی افغانستان کے عوام اس مردِ مجاہد کے زبردست حامی تھے۔ امیر عبدالرحمن خان اس کی مقبولیت سے جلتا تھا اور چاہتا تھا کہ موقع ملتے ہی ہرات پر حملہ کر کے اس سخت جان حریف کو ختم کر دے۔

امیر عبدالرحمن خان اور سردار ایوب خان کی کش مکش اس وقت سے چل رہی تھی جب امیر عبدالرحمن تخت پر بیٹھا تھا۔ یہ 1880ء کا سال تھا۔ اسی وقت سے سردار محمد ایوب خان اس تگ ودو میں تھا کہ امیر عبدالرحمن خان کو افغانستان سے بھگایا جائے۔ چنانچہ اپریل 1881ء میں اس نے امیر عبدالرحمن خان کے خلاف فوج کشی شروع کر دی۔ اس وقت تک انگریزوں کا افغانستان کے دیگر شہروں سے انخلاء مکمل ہو چکا تھا مگر کابل میں ان کی فوج کا ایک بڑا دستہ موجود تھا۔ ان کا امیر عبدالرحمن خان سے معاہدہ تھا کہ وہ اس کے حریفوں کے خلاف اس کی مدد کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے ایوب خان کی یلغار کو روکنے میں امیر عبدالرحمن خان کا بھرپور ساتھ دیا۔

قندھار پر قبضہ: محمد ایوب خان کا پہلا حملہ قندھار پر تھا جسے فتح کرنے کے بعد وہ غزنی سے ہوتا ہوا کابل پر چڑھائی کر سکتا تھا۔ ادھر امیر عبدالرحمن خان نے اپنی تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ اقتدار کے پہلے سال ہی میں اس نے فوج کو بے حد مضبوط بنا لیا تھا۔ چنانچہ اس نے دو فوجیں تیار کیں۔ ایک کو ہرات پر قبضے کے لیے روانہ کیا اور دوسری اپنی کمان میں لے کر قندھار کی طرف بڑھا۔ اِدھر سردار محمد ایوب خان جب قندھار پہنچا تو شہر کسی مزاحمت کے بغیر فتح ہو گیا۔ اس لیے کہ قندھاری ''فاتح میوند'' کا بے حد احترام کرتے تھے۔ قندھار کے صوفیائے کرام خصوصاً ان درویشوں نے جنہیں ''روحانی'' کہا جاتا تھا سردار محمد ایوب خان کو

ملت کا رہنما قرار دیا۔ جنوبی افغانستان کے اکابر علما ملا عبدالرحیم کاکڑ، ملا عبدالواحد پوپلزئی اور دیگر پانچ علما کی ایک مجلس نے اعلان کیا کہ سردار محمد ایوب افغانستان کی بادشاہت کا صحیح حق دار ہے کیونکہ انگریزوں سے جہاد میں اس کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں جبکہ عبدالرحمن خان ازروئے شرع معزول کر دیے جانے کے قابل ہے۔ اس کی انگریز دوستی اور وطن دشمنی اسے مسلمانوں کی حکمرانی کا حق نہیں دیتی۔

قندھار میں سردار محمد ایوب خان کی حکومت کے اعلان اور اہل شہر کی بھرپور حمایت کے باوجود عسکری قوت زیادہ نہیں تھی۔ جبکہ کابل سے امیر عبدالرحمن خان کی قیادت میں بہت بڑا لشکر چلا آ رہا تھا۔ اگر محمد ایوب خان اس تھوڑی سی طاقت کے ساتھ قندھار میں محصور ہو کر لڑتا تو شاید امیر عبدالرحمن کو کافی مدت تک کامیابی نصیب نہ ہوتی۔ مگر سردار کو پُرجوش لوگوں نے کھلے میدان میں لڑنے پر برانگیختہ کیا۔ آخر وہ اپنی تمام قوت مجتمع کر کے قندھار سے باہر نکلا۔ یہاں عبدالرحمن خان کے لشکر سے زبردست معرکہ ہوا۔ نتیجے میں ایوب خان کو شکست ہوئی اور وہ بچے کھچے سپاہیوں کے ساتھ فرار ہو گیا۔ اس کی جائے پناہ اس کا مرکز ہرات تھا مگر اس دوران وہ سرکاری فوج جو کابل سے عبدالقدوس خان کی قیادت میں نکلی تھی، ہرات پر قبضہ کر چکی تھی۔ اسے ہرات پر قبضہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی کیونکہ شہر کی تقریباً تمام فوج ایوب خان کے ساتھ قندھار چلی گئی تھی۔

فاتح میوند کا انجام: سردار ایوب خان ہرات پر دشمنوں کے قبضے کے بعد دل شکستہ ہو گیا۔ ادھر عبدالرحمن خان نے انگریز جنرل پرایمروز کو اس کے تعاقب میں لگا رکھا تھا۔ پرایمروز کے ایک ہزار سپاہی دن رات اس کی تلاش میں تھے۔ ایوب خان مجبور ہو کر ایران کی سرحد میں داخل ہو گیا اور سیاسی پناہ حاصل کی۔ شاہ ایران نصر الدین نے اسے اس شرط پر پناہ دی کہ وہ سیاسی سرگرمیوں میں ملوث نہیں ہوگا۔ ایوب خان کی شکست کے بعد امیر عبدالرحمن خان نے قندھار پر دوبارہ قبضہ کر لیا، وہاں ملا عبدالواحد پوپلزئی اور ملا عبدالرحیم کاکڑ سمیت ان تمام اکابر کو اپنے سامنے قتل کرا دیا جنہوں نے ایوب خان کو بادشاہت کے لائق قرار دیا تھا۔

سردار ایوب خان ایران میں پناہ کے دوران بھی خفیہ طور پر امیر عبدالرحمن کے خلاف منصوبہ بندی کرتا رہا۔ 1887ء میں میمنہ اور ہرات کے لوگوں نے امیر عبدالرحمن کے خلاف بغاوت کی تو سردار ایوب خان موقع سے فائدہ اُٹھانے کے لیے وہاں پہنچ گیا۔ مگر اس کے پہنچنے تک حالات ناسازگار ہو چکے تھے اور ہرات میں امیر عبدالرحمن کے مخالفین اور حامیوں میں خانہ جنگی ہونے لگی تھی۔ ایوب خان یہ دیکھ کر مایوسانہ حالت میں واپس ایران چلا گیا مگر اس بار حکومتِ ایران نے اسے پناہ دینے کی بجائے

گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ وہ فاتح میوند جسے برطانوی لاؤ لشکر زیر نہ کر سکا تھا اپنوں کی سازشوں اور جفاؤں کا شکار ہو کر کفار کا قیدی بن گیا۔ اس طرح اس کی جدوجہد کا زمانہ ختم ہو گیا۔

میر غلام قادر کا خفیہ قتل: سردار ایوب خان اور دیگر مجاہد رہنماؤں کی اسارت وجلاوطنی کے بعد افغانستان میں امیر عبدالرحمن خان کا کوئی مدِ مقابل باقی نہیں بچا تھا۔ مجاہد رہنماؤں میں سے صرف میر غلام قادر اوپیانی ایک ایسا شخص تھا جسے امیر عبدالرحمن نے اپنا مخالف جانتے ہوئے بھی مامون رہنے دیا۔ بعد میں اسے ایک سرکاری عہدہ بھی دے دیا مگر کچھ ہی دنوں بعد ایک ملازم کے ذریعے اسے زہر کھلا کر مروا دیا۔ یوں 1880ء کے تاریخی جہاد کا کوئی کردار افغانستان کے منظرنامے پر باقی نہ رہا۔

غداروں پر نوازشات: قوم کے محسنوں کے ساتھ اس افسوس ناک سلوک کے برعکس امیر کا رویہ ان امراء کے ساتھ بہت فراخدلانہ تھا جو برطانیہ کے یار اور قوم کے غدار ثابت ہوئے تھے۔ ان میں قندھار کے غدار شیر علی خان کے ورثاء بھی شامل تھے۔ شیر علی خان کا ملت فروش بیٹا نور علی خان انگریز کی سرپرستی میں جی رہا تھا۔ اس کا قیام کراچی میں تھا۔ امیر عبدالرحمن خان کو معلوم ہوا کہ وہ کراچی میں بہت مقروض ہو گیا ہے۔ امیر نے اپنے نمایندے کراچی بھیج کر اسے قرضے کے بوجھ سے آزاد کرایا اور واپس بلوا کر کابل میں اس کی آرام دہ رہائش کا بندوبست کیا۔ ساتھ ہی بارہ ہزار روپے مزید دیے۔

بلخ کی آندھی، قاتلانہ حملہ: 1888ء میں بلخ کے والی سردار محمد اسحٰق نے امیر عبدالرحمن کے مظالم سے متنفر ہو کر اس کی حمایت سے روگردانی اختیار کی اور اپنے ہم خیال سرداروں کو ملا کر اعلانِ بغاوت کر دیا۔ شروع شروع میں یوں لگتا تھا جیسے بلخ سے اُٹھنے والی یہ آندھی عبدالرحمن کی سلطنت کی چولیں اُکھاڑ دے گی مگر امیر عبدالرحمن نے پوری قوت اور جبر واستبداد کے ساتھ اس بغاوت کو کچل ڈالا۔ بلخ میں امن وامان قائم ہو جانے کے بعد امیر عبدالرحمن خود وہاں پہنچا۔ راستے میں مزار شریف میں اس پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ گولی اس کے تکیے کو پھاڑتی ہوئی خیمے کی پشت پر کھڑے سپاہی کو زخمی کر گئی...... حملہ آور کو فوراً قتل کر دیا گیا۔ سردار محمد اسحٰق خان کی بغاوت کو کچلنے کے بعد بہت سے سرکردہ افراد کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ امیر عبدالرحمن نے واپسی کابل آکر ان سے لرزہ خیز انتقام لیا۔ روزانہ پندرہ قیدیوں کو کابل کے "میدان مراد خان" میں لایا جاتا اور انہیں تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا۔

ہزارہ جات کی شورش: 1886ء میں امیر عبدالرحمن خان کو ایک اور سخت جان حریف کا سامان کرنا پڑا۔ یہ بامیان اور اس کے اردگرد پیچیدہ پہاڑی درّوں میں آباد ہزارہ جات قبائل کی بغاوت تھی جس نے امیر کو ایک عرصے تک سخت پریشانی میں مبتلا رکھا۔ ہزارہ جات عقیدے کے لحاظ سے اہلِ تشیع اور پیشے

کے لحاظ سے گلہ بان اور قالین باف چلے آ رہے ہیں۔ ان میں خوشحال طبقہ صرف سیدوں اور دینی رہنماؤں کا ہوتا ہے جن کے ہاتھ میں ان کی مذہبی باگ ڈور ہوتی ہے۔ امیر عبدالرحمن خان کے دور میں یہاں کے مذہبی طبقے کے اثر و رسوخ میں مزید اضافہ ہوا اور ہزارہ قبائل کے کچھ سرداروں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس موقع پر ہزارہ جات کی مذہبی قیادت نے شیعہ سنی منافرت کی آگ بھڑکا کر اپنے لوگوں کو حکومت کے خلاف کھڑا کرنے میں خاص کردار ادا کیا۔ امیر عبدالرحمن خان نے ابتدا میں اس صورتِ حال کو خلاف توقع صبر و تحمل سے برداشت کیا اور کوشش کی کہ ہزارہ جات گفت و شنید سے ٹھنڈے پڑ جائیں۔ شروع شروع میں ان کے چند سرداروں پر حکومت کی مصالحانہ پالیسی کا مثبت اثر ہوا۔ وہ بغاوت کی تحریک سے الگ ہو گئے مگر یہ آگ آہستہ آہستہ دیگر علاقوں تک پھیلتی چلی جا رہی تھی۔

1891ء تک حکومت کے خلاف ہزارہ قبائل کی بغاوت ایک عمومی تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔ اب امیر عبدالرحمن حسبِ عادت اسے پوری قوت سے پامال کرنے پر اُتر آیا۔ اس کے افسران زبردست لاؤ لشکر کے ساتھ ہزارہ جات پر ٹوٹ پڑے مگر ہزارہ جات آسانی سے زیر ہونے والے نہ تھے۔ انہوں نے سرکاری افواج کے بہترین کمانڈر عبدالقدوس خان کو "کوتل چورہ" کے مقام پر شکست فاش دی۔ پھر بریگیڈیئر زبردست خان کی قیادت میں آنے والی سرکاری فوج کا بھی یہی انجام ہوا۔ امیر عبدالرحمن کے قریبی معاون جنرل میر عطا محمد اور جنرل شیر محمد ان معرکوں میں شدید زخمی ہو کر واپس لوٹے۔

امیر عبدالرحمن نے یہ دیکھ کر کہ ہزارہ جات کو اس طرح مغلوب کرنا مشکل ہے، بہت بڑے پیمانے پر جنگی تیاریاں شروع کیں اور عوامی قوت کو پشت پر رکھنے کے لیے اس جنگ کو مذہبی جنگ کا رنگ دینے کی کوشش کی۔ یوں اُفغانستان میں شیعہ سنی منافرت اس قدر بڑھ گئی کہ دونوں میں سے ہر فریق دوسرے کو نیست و نابود کرنے پر تل گیا۔

1891ء میں شروع ہونے والی یہ جنگیں 1892ء میں سرکاری افواج کی کامیابی پر انجام پذیر ہوئیں۔ امیر عبدالرحمن خان نے ہزارہ جات کی قوت کو بالکل تہس نہس کر کے رکھ دیا اور بامیان سمیت ان تمام دور دراز کے علاقوں میں جہاں ہزارہ جات آباد تھے، اپنی طاقت و ہیبت کا سکہ بٹھا دیا۔ انہیں قوانین ملکی کا پوری طرح پابند بنایا اور ان پر وہ معاشی و اقتصادی پابندیاں عائد کر دیں جو اس سے پہلے کبھی لاگو نہیں ہوئی تھیں۔ مثلاً: پہلے ان کے گلہ بانوں کے لیے چراگاہوں کی کوئی حدود متعین نہیں تھیں، امیر نے ان چراگاہوں کی حد بندی کرا دی۔

شورش کے خاتمے کے کچھ عرصے بعد امیر نے ہزارہ جات کے مطیع فرمان ہو جانے والے سرداروں

اور مذہبی رہنماؤں سے فراخدلانہ سلوک شروع کیا اور انہیں اعزاز و اکرام سے نوازا۔ ہزارہ قبائل کی لڑکیوں کو دوسرے ملکوں میں باندیوں کی طرح بیچنے کا کاروبار ایک عرصے سے جاری تھا۔ امیر نے اس پر پابندی لگادی۔

کافرستان سے نورستان تک: اَفغانستان کے شمال مشرق میں واقع ''نورستان'' کا صوبہ بلند و بالا برف پوش پہاڑوں اور دشوار گزار راستوں کے باعث صدیوں سے ہر حملہ آور کے لیے ناقابل تسخیر ثابت ہوتا چلا آیا تھا۔ اس علاقے کا نام قدیم تاریخ میں ''بولر'' تھا جبکہ اِسلامی دور میں اسے ''کافرستان'' کہا جاتا تھا۔ یہ ایک بہت وسیع سرزمین تھی جس میں گلگت اور چترال بھی شامل تھا۔ بعد میں برطانوی استعمار نے گلگت اور چترال کو اس سے جدا کر دیا۔ یہاں کے لوگ ہزاروں برس سے بت پرستی میں مبتلا تھے۔ ان کا رہن سہن، تہذیب وثقافت اور زبان پر بیرونی دنیا کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ تیمور لنگ اور بابر جیسے فاتحین بھی اسے فتح کرنے سے عاجز رہے تھے۔

امیر عبدالرحمن نے نورستان کو زیرِ نگین کرنے کے لیے 1891ء میں پہلی کوشش کی تھی اور اپنے نمایندوں کے ذریعے اس آزاد دنیا کو کابل سے متعلق ہو جانے کی دعوت دی تھی۔ نورستان کے لوگ اس کے بعد دربار کابل میں رسمی طور پر آنے جانے لگے تھے۔ 1896ء میں امیر نے ننگرہار کے والی سپہ سالار غلام حیدر چرخی کو باقاعدہ فوج لے کر نورستان جانے کا حکم دیا۔ اس سے قبل غلام حیدر چرخی نورستان کی فتح کے لیے بڑی حکمت اور تدبر سے کام شروع کر چکا تھا۔ امیر عبدالرحمن کی سخت گیری کے برعکس وہ نرم خوئی اور حسن سلوک سے ان کے دل جیت رہا تھا۔ اس نے نورستان کے عمائد کو اِسلام کی دعوت دینا بھی شروع کر دی تھی اور ان کے کئی خاندان مشرف بہ اِسلام ہو چکے تھے۔

امیر کی جانب سے فوج کشی کا حکم ملنے کے بعد بھی غلام حیدر چرخی نے بڑی سمجھ بوجھ سے کام لیا اور پہلے نورستان کے عمائد کو اعتماد میں لے کر سمجھایا کہ ہماری فوج صرف بدخشاں اور نورستان کے درمیان راستہ کھولنے اور محفوظ کرنے کے لیے آرہی ہے۔ اس کے بعد جب غلام حیدر خان اپنے 4 ہزار سپاہیوں کے ساتھ نورستان پہنچا تو اسے راستے کھلے ملے۔ صرف بعض مقامات پر کچھ قبائل نے مزاحمت کی۔ یہ لوگ قدیم بود و باش کے مطابق نیزوں اور تیروں سے مسلح تھے۔ سپہ سالار نے انہیں جلد ہی زیر کر لیا۔ سرکاری عملداری قائم ہو جانے کے بعد اس علاقے کا نام کافرستان سے بدل کر نورستان رکھ دیا گیا کیونکہ اب یہاں تیزی سے اِسلام کا نور پھیل رہا تھا۔ سپہ سالار غلام حیدر نے شروع میں 80 مبلغین علماء و قراء حضرات یہاں متعین کر دیے جن کی تعداد بعد میں بڑھتی چلی گئی۔ آج کا نورستان اَفغانستان میں

سو فی صد مسلمان آبادی رکھنے والا صوبہ ہے جہاں علماء و مشائخ کی تعداد بھی کافی ہے۔

امیر عبدالرحمن کے حالات میں جہاں اس کی کمزوریوں اور مظالم کا ذکر ہوا وہاں اس کارنامے کا تذکرہ بھی ضروری تھا۔ اس کارنامے کا سب سے بڑا کردار سالار غلام حیدر چرخی تھا جس کی حکمت و بصیرت نے اس مشکل ترین مہم کو صرف آٹھ ماہ کی قلیل مدت میں ممکن کر دکھایا۔ یہ کارنامہ اس کے لیے ان شاء اللہ بہت بڑا صدقہ جاریہ ثابت ہوگا۔ اگر برطانیہ کی سازشیں چترال اور گلگت کو الگ کر کے نورستان کو تقسیم نہ کر دیتیں تو شاید آج وہاں آباد بچے کھچے بت پرست اور غیر مسلم قبائل بھی اسلام کی آغوش میں ہوتے۔

برطانیہ کی قبائلی علاقہ جات میں سازشیں: برطانیہ سے دو بڑی جنگوں کے بعد مسلمانانِ اُفغانستان اور انگریزوں کے مابین دشمنی کی بنیادیں مستحکم ہو چکی تھیں۔ برطانیہ بہر صورت اُفغانستان کو محکوم دیکھنا چاہتا تھا جبکہ اُفغانستان کے مسلمان اس کا تسلط برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان دونوں کے درمیان امیر عبدالرحمن کی حیثیت تنے ہوئے رسے پر چلنے والے کھلاڑی کی سی تھی جس کی ذرا سی لغزش بہت بڑی تباہی کا پیش خیمہ ہو سکتی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ امیر عبدالرحمن خان نے 1880ء کے معاہدے کے ذریعے اُفغانستان کے مفادات کو برطانیہ کے تابع کر کے انگریز نوازی کا ثبوت دیا تھا مگر یہ حقیقت اس پر بھی عیاں تھی کہ انگریز مسلمانوں کے دوست نہیں، دشمن ہیں۔ تاہم افسوس ناک بات یہ ہے کہ حقائق کو سمجھنے کے باوجود امیر کو یہ توفیق نہ ہو سکی کہ وہ غیور اُفغان عوام کی دلی امنگوں کے مطابق برطانیہ کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑا ہو سکتا۔ اس کے نزدیک ہر مسئلے کا حل صرف انگریزوں کا اعتماد برقرار رکھنے اور نیاز مندانہ مذاکرات کے ذریعے اپنی اغراض پوری کرنے میں تھا۔ 1880ء کے معاہدے کے بعد انگریزوں نے اُفغانستان کو مزید جکڑنے کی نئی سازشیں جاری رکھیں جن کی انتہا معاہدہ ڈیورنڈ پر جا کر ہوئی۔ اس معاہدے کا مقصد اُفغانستان سے ملحقہ قبائلی علاقہ جات کو تقسیم کرنا اور ان کے غالب رقبے کو برطانوی عملداری کے ماتحت لانا تھا۔ اس معاہدے کی ضرورت کو اُبھارنے کے لیے قبائلی علاقہ جات کے بعض سرداروں کو امیر عبدالرحمن خان کے خلاف اُبھار کر اُفغان سرحدوں کے پار دخل اندازی شروع کرائی گئی۔ یہ قبائلی سردار انگریزوں کی سازش کا شکار ہو کر مسلح جتھے اُفغانستان میں بھیجنے لگے جو لوٹ مار کر کے اور سرکاری املاک کو نقصان پہنچا کر واپس آ جاتے تھے۔ اکثر قبائلی لوگ اس بات سے لاعلم تھے کہ وہ انگریزوں کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔ انہیں یہ سمجھایا گیا تھا کہ یہ انگریزوں کے ایجنٹ عبدالرحمن خان کے خلاف جہاد ہے۔ چنانچہ اس قسم کی کارروائیاں تسلسل سے ہونے لگیں۔ قبائلی مداخلت کار اُفغانستان میں گھس کر اسلحہ

بھی تقسیم کرتے جو برطانیہ کے ایجنٹ انہیں مہیا کر رہے تھے۔ یہ لوگ اُفغان عوام کو امیر عبدالرحمن کے خلاف بغاوت پر اکسانے کے لیے اشتہارات بھی پھیلاتے۔ اگر اس کارروائی کا اصل محرک کوئی صالح اِسلامی رہنما ہوتا تو نتائج کچھ اور ہوتے...... مگر یہاں ڈوری خود برطانیہ ہلا رہا تھا...... امیر عبدالرحمن خان کوشش کے باوجود بغاوت کی اس آگ کو نہ بجھا سکا۔ آخر کار وہ سرحدی قبائل سے مایوس ہوگیا اور اس نے سمجھ لیا کہ ان علاقوں پر قابو پانا اس کے بس سے باہر ہے۔

کچھ عرصے بعد اسے یہ علم بھی ہوگیا کہ اس کھیل کے پیچھے برطانیہ کا ہاتھ ہے مگر وہ رسمی احتجاج کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ البتہ عوام میں اپنا ''مجاہدانہ کردار'' اُبھارنے کے لیے اس نے برطانیہ کے خلاف نمائشی اقدامات شروع کر دیے...... مثلاً وہ اپنی مجالس میں بار بار جہاد کی باتیں کرتا، برطانیہ کو اِسلام دشمن ملک قرار دیتا اور عوام وخواص کو اِسلام کے لیے سر کٹا دینے اور برطانیہ کے خلاف سینہ سپر ہونے کی تلقین کرتا۔ انہی دنوں اس نے خود کو ''حامئ شریعت'' اور ''مجاہد دینی'' کے القاب سے مشہور کرایا۔ جہاد اور انگریز دشمنی کے موضوع پر کتابچے اور رسالے شائع کیے...... برطانیہ سے عداوت میں سنجیدگی ظاہر کرنے کے لیے بہت سے لوگوں کو اس الزام میں گرفتار کر لیا کہ ان کے گھروں سے انگریزی لٹریچر یا انگریزوں کے خطوط برآمد ہوئے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ بعض لوگوں کو صرف اس لیے دھر لیا گیا کہ وہ انگریزی سفارت خانے کے سامنے واقع سڑک سے گزر رہے تھے۔ مگر اس سب ناٹک کے باوجود وہ اُفغان عوام میں مجاہد کی حیثیت حاصل نہ کر سکا کیونکہ اس میں سچے جذبۂ جہاد کے دور دور تک کوئی آثار نہیں تھے۔

قبائل پر برطانوی یلغار: جب برطانیہ امیر عبدالرحمن کو قبائلی علاقہ جات سے بدظن کر چکا تو اس نے اپنی افواج کا رُخ قبائل کی طرف کر دیا...... قبائلی عمائد برطانیہ سے لڑنے کے لیے امیر عبدالرحمن کی امداد کے محتاج تھے۔ انہوں نے بار بار دربار کابل میں درخواست کی کہ ان کی عسکری مدد کی جائے مگر امیر نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ 1888ء میں برطانیہ نے کوئٹہ سے راولپنڈی تک مختلف چھاؤنیوں میں یکدم 30 ہزار سپاہیوں کا اضافہ کر دیا...... پھر سرحدی قبائلی علاقوں پر حملہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے یوسف زئی قبیلہ اس کی لپیٹ میں آیا اور کئی سال تک مقابلہ کرنے کے بعد مغلوب ہوگیا۔ برطانوی افواج کی دوسری یلغار دیر، گلگت اور چترال پر تھی۔ یہاں کے لوگ جو عسکری وتمدنی لحاظ سے صدیوں پرانے دور میں جی رہے تھے، بہت جلد زیر ہوگئے۔ وانا میں خود امیر عبدالرحمن کا متعین کردہ افسر گل محمد خان اپنی فوج کے ساتھ موجود تھا۔ امیر نے اسے لڑے بغیر پسپائی کا حکم بھیجا اور انگریزوں نے وانا پر بھی قبضہ کر لیا۔

کرم (کرم ایجنسی) کے عمائد نے امیر کو پیغام بھیجا کہ ہم سلطنت اُفغانستان سے ملحق ہونا چاہتے

ہیں، انگریزوں کی غلامی میں منظور نہیں، آپ ہمیں افغانستان میں شامل کر لیجیے...... مگر امیر نے جواب دیا کہ معاہدہ گندمک کے مطابق آپ انگریزوں کے ماتحت ہیں۔ ان سے آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو خود کوشش کریں۔ بلوچستان کے سرداروں نے بھی انگریزوں کی ماتحتی مسترد کر دی اور خاران کا رئیس نوروز خان ایک عرصے تک افغانستان میں شمولیت کا اعلان کر کے برطانوی افواج سے برسرِ پیکار رہا مگر امیر عبدالرحمن نے اس کی بھی کوئی مدد نہ کی۔ اس طرح یہ تمام سرحدی قبائل برطانیہ کے مقابلے شکست کھا گئے۔ سرحدی قبائل کی شکست کے بعد برطانیہ کا کھیل پوری کامیابی سے اختتام پذیر ہو چکا تھا۔ اس نے امیر عبدالرحمن کو ان مخلص مسلمانوں سے بدظن کر کے قبائل کی بیرونی اعانت کے تمام راستے مسدود کر دیے تھے اور انہیں زیر کر کے امیر کو قبائل کی آہنی دیوار سے محروم کر دیا تھا۔

افغانستان پر حملہ: اب جبکہ راستہ صاف ہو چکا تھا، برطانیہ نے پوری ڈھٹائی کے ساتھ اس افغانستان پر حملے کا فیصلہ کر لیا جس کے حاکم کو وہ چند دن پہلے تک اپنا دوست اور حلیف قرار دیتا تھا۔ اب افغانستان اور برطانیہ میں سرد جنگ شروع ہوگئی۔ سفارتی تعلقات 1892ء میں بالکل ختم ہوگئے۔ برطانیہ نے افغانستان کو اسلحے کی فراہمی پر پابندی لگا دی اور افغان ٹرانزیٹ کو بالکل بند کر دیا۔ 1893ء میں برطانیہ نے اپنی ٹڈی دل افواج کو افغانستان پر حملے کا حکم دے دیا۔ امیر عبدالرحمن خان نے انگریزوں کی پیش قدمی کی اطلاع پا کر افغان افواج اور رضا کاروں کو مقابلے کے لیے تیار ہو جانے کی ہدایت کی۔ چند دنوں میں ایک لاکھ افراد پر مشتمل لشکر جمع ہوگیا۔ یہ لشکر کابل کے باہر سیاہ سنگ کے میدان میں آ کر ٹھہرا۔ اس وقت یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پورا افغانستان انگریزوں سے لڑنے کے لیے نکل آیا ہے۔ برطانوی افسران کو افغانوں کی ان تیاریوں کی اطلاع ملی تو انہوں نے پیش قدمی روک دی اور پندرہ افسران کا ایک وفد امیر عبدالرحمن سے مذاکرات کے لیے روانہ کر دیا۔ اس وقت برطانوی استعمار کے سامنے تھوڑی سی جرأت کا مظاہرہ کر کے امیر عبدالرحمن نے اپنی پوزیشن مضبوط کر لی تھی اور اگر وہ مذاکرات میں بھی مومنانہ آن بان اور فہم و فراست کا ثبوت دیتا تو یقیناً انگریزوں کو افغانستان کے بارے میں اپنے موقف سے پسپائی اختیار کرنا پڑتی مگر افسوس کہ مذاکرات کی میز پر ایک بار پھر فرنگی بازی گروں نے بازی جیت لی۔

معاہدۂ ڈیورنڈ: مذاکرات کے لیے انگریز آفیسر ڈیورنڈ ایک وفد کے ساتھ کابل پہنچا جہاں اس نے چالیس دن تک قیام کیا۔ ڈیورنڈ نے افغان حکام کو برطانیہ کی قوت وسطوت سے خوفزدہ محسوس کیا تو ڈٹ کر یہ مطالبہ کیا کہ یا تو افغانستان کی سرحدوں کی تشکیل نو کے لیے برطانیہ کی تجاویز کو من وعن قبول کر لیا جائے یا تمام دوستانہ وسفارتی مراسم ختم کر دیے جائیں۔ اس نے آگاہ کیا کہ برطانوی لشکر سرحدوں پر جمع

ہے جو کسی بھی وقت حملہ کر سکتا ہے پھر اس کے نتائج بھیانک ہوں گے۔ امیر عبدالرحمن خان نے اس مسئلے پر گہرائی سے غور کیے بغیر طے کیا کہ انگریزوں کے مطالبات مان لیے جائیں۔ دراصل وہ جانتا تھا کہ اس کی حکومت انگریزوں کے سہارے سے وجود میں آئی اور ان کے دوستی کے بل بوتے پر چل رہی ہے۔ اسے اندازہ تھا کہ انگریزوں سے جنگ کا نتیجہ کچھ بھی نکلے، وہ اپنے گورے سرپرستوں کی اس امداد سے محروم ہو ہی جائے گا جس کی بنیاد پر وہ عوامی مخالفت کے باوجود تخت شاہی پر براجمان ہے۔ انگریزوں سے ناتہ ٹوٹنے کے بعد وہ اُفغان عوام کے رحم وکرم پر ہوگا جو اسے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ ان پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے اس نے ملک وملت کے مفاد کو قطعاً نظر انداز کر دیا۔ شخصی اقتدار کے تحفظ کی خاطر کیے گئے فیصلے قوموں کی تباہی یقینی بنا دیتے ہیں۔ عبدالرحمن خان نے بھی شخصی اقتدار کو طول دینے کے لیے اُفغانستان کے خاصے بڑے حصے سے محرومی قبول کر لی ہے اور رسوائے زمانہ معاہدہ ڈیورنڈ پر دستخط کر دیے۔

<u>معاہدے کے مندرجات:</u> یہ معاہدہ کیا تھا؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے امیر اپنی خودنوشت سوانح حیات تاج التواریخ میں لکھتا ہے:

''واخان، کافرستان، اسمار، مہمند کا ایک حصہ لال پورہ اور وزیرستان کا کچھ حصہ میری مملکت میں شامل رہے گا اور میں دوستانہ طور پر وزیرستان کے بقیہ حصے، بلند خیل، کرم، آفریدی، باجوڑ، سوات، بونیر، دیر، چلاس اور چترال کو چھوڑ دوں گا۔'' (تاج التواریخ فارسی، ص: 431-430)

اسی طرح عیار ومکار ڈیورنڈ نے امیر عبدالرحمن خان سے ایک ایسے معاہدے پر دستخط لے لیے جو مسلمانوں کے لیے سراسر گھاٹے کا سودا تھا۔ یہ دن اُفغانستان اور قبائلی علاقہ جات کے غیور مسلمانوں کے لیے سوگ کا دن تھا۔ کیونکہ ہزاروں مربع کلومیٹر پر پھیلے ہوئے کوہ ودمن کسی جنگ کے بغیر اُفغان عملداری سے نکل گئے تھے۔ مگر امیر عبدالرحمن خان اس دن بہت خوش تھا کہ باغیوں اور فسادیوں کے علاقوں سے اس کی جان چھوٹ گئی ہے اور انگریز کی حمایت سے اس کی حکومت کے پائے مضبوط ہو گئے ہیں۔

اپنی خودنوشت سوانح میں وہ لکھتا ہے:

''تیرہ نومبر 1893ء کو سلام خانہ کی عمارت میں دربار عام لگایا گیا۔ تمام سلطنت اور کابل انتظامیہ کے عہدے دار، قبائل کے روسا میرے دو بڑے بیٹے حاضر ہوئے۔ اہلِ مجلس کے سامنے، ابتدائی کلمات کے طور پر میں نے کچھ گفتگو کی اور ان قراردادوں کی روداد جو کہ (انگریزوں کے ساتھ) طے پائی تھیں، اجمالی طور پر بیان کی۔ خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے

ان دونوں سلطنتوں کے درمیان اس دوستانہ تعلق کو جو پہلے سے موجود تھا، مزید مضبوط کردیا اور ان کے باہمی اتحاد کو پہلے سے بھی زیادہ کردیا۔ میں نے سر مارٹیمور ڈیورنڈ اور ان کی ٹیم کا بھی شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے بات چیت کو عاقلانہ طور پر دوٹوک انداز میں انجام پذیر کیا۔''

معاہدے کے نقصانات: امیر عبدالرحمن اور سر ڈیورنڈ کے ذریعے دو مملکتوں کے درمیان طے پانے والے اس معاہدے نے قبائلی علاقہ جات کو دو ٹکڑوں میں بانٹ کر ان کی صدیوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر ڈالا۔ معاہدۂ ڈیورنڈ کے ذریعے تشکیل پانے والی ''ڈیورنڈ لائن'' تقسیم ہند کے بعد بھی برقرار رہی اور آج تک قائم ہے۔ جس طرح انگریزوں نے کشمیر کے مسئلے کو اُلجھا کر اسے پاکستان کے لیے ایک خطرناک سرحدی پوائنٹ بنا دیا اسی طرح ڈیورنڈ لائن بھی پاکستان اور اَفغانستان میں تنازعات کی بنیاد بنتی رہی ہے۔ انگریزوں کی یہ یادگار دو ہمسایہ مسلمان ملکوں میں اچھے تعلقات کی تشکیل میں ہمیشہ رکاوٹ رہی ہے۔

روس سے سرحدی تنازعات: معاہدہ ڈیورنڈ کے ذریعے امیر عبدالرحمن کو جو سیاسی شکست اور جغرافیائی پسپائی ہوئی تھی انگریز اس سے مسلسل فائدہ اُٹھاتے رہے اور اَفغانستان میں ان کے اثرات بڑھتے چلے گئے۔ اس دوران روس اَفغانستان کے ساتھ تعلقات بڑھانے کے لیے پورا زور لگا رہا تھا۔ امیر عبدالرحمن چونکہ روس میں جلاوطنی کے دن گزار چکا تھا اس لیے وہ بظاہر روس کا ممنونِ احسان تھا مگر وسط ایشیا کے مسلمانوں کو روس کے پنجے میں بلبلاتا دیکھنے کے بعد وہ روس کی بہ نسبت برطانیہ ہی سے دوستی برقرار رکھنے کو ترجیح دیتا تھا۔

امیر عبدالرحمن کا برطانیہ کی طرف جھکاؤ روس کو اشتعال دلانے کے لیے کافی تھا چنانچہ اس نے کئی بار اَفغان سرحدوں پر فوج کشی کی اور امیر عبدالرحمن نے بمشکل اپنا دفاع کیا۔ 1884ء میں دریائے آمو کے کنارے ''پنج ندہ'' کی چوکی پر خونریز جھڑپیں ہوئیں۔ 1887ء میں روس نے دریائے آمو عبور کر کے خواجہ صالح اور نواحی قصبات پر قبضہ کرلیا۔ ''واخان'' کی پٹی پر بھی روس اپنے استحقاق کا دعوے دار رہا۔ 1892ء میں روسی افواج بدخشاں کے قریب پامیر کی سطح مرتفع پر قابض ہوگئیں۔ امیر عبدالرحمن نے برطانیہ کے اثر ورسوخ کا سہارا لے کر بار بار مذاکرات کے ذریعے اَفغانستان کی سرحدی تشکیلات بحال کرانے کی کوشش کی مگر روس کی ہٹ دھرمی ہمیشہ آڑے آئی۔

آخر کار برطانیہ کے توسط سے 1896ء میں ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت شمال مشرق میں واخان اَفغانستان کا حق مان لیا گیا۔ پامیر دونوں ملکوں میں تقسیم ہوگیا جبکہ دریائے آمو کو شمال میں حتمی سرحد مان لیا گیا اس طرح اَفغانستان دریائے آمو کے پار اپنے کئی علاقوں سے محروم ہوگیا۔

امیر عبدالرحمن کا انتقال: معاہدہ ڈیورنڈ اور روس سے معاہدے کے بعد امیر کی رہی سہی عوامی ساکھ بھی جاتی رہی۔ اس نے ایک بار پھر جہاد کا نام لے کر مجاہدین کی پیٹھ تھپک کر اور جہادی لٹریچر کی اشاعت کر کے اپنا وقار بحال کرنے کی کوشش کی مگر دھوکہ ہر بار نہیں چلتا۔ اسے عوام میں کوئی مقبولیت حاصل نہ ہوئی۔ 1901ء میں امیر شدید بیمار پڑ گیا اور آخر کار اسی سال یکم اکتوبر (9 جمادی الاخری 1319ھ) کو چپ چاپ دنیا سے رُخصت ہو گیا۔ بغاوت کے خوف سے تین دن تک یہ خبر خفیہ رکھی گئی۔

مآخذ و مراجع

- ...... اَفغانستان در مسیر تاریخ، میر غلام محمد غبار
- ...... تاج التواریخ، امیر عبدالرحمن خان کی خودنوشت سوانح حیات (فارسی)
- ...... Encyclopedia of Islam.V.1
- ...... اردو دائرہ معارف اِسلامیہ، ناشر: دانش گاہ، پنجاب یونی ورسٹی
- ...... درز وایائی تاریخ معاصر اَفغانستان، احمد علی کہزاد
- ...... سراج التواریخ، مرزا فیض محمد خان
- ...... تارخ تجزیہ شاہنشاہی اَفغانستان، علامہ عبدالحی حبیبی

بیسواں باب

حبیب اللہ خان کا دور

امیر عبدالرحمن خان کی وفات کے بعد اس کا بیٹا حبیب اللہ خان تخت نشین ہوا۔ وہ بنیادی طور پر اپنے باپ کی پالیسیوں سے اختلاف رکھتا تھا، اس لیے عوام نے اس کی تخت نشینی کو نیک شگون تصور کیا اور کسی شورش کے بغیر پورے ملک میں اس کا سکہ رائج ہو گیا۔ اس نے 1901ء سے 1918ء تک حکومت کی۔ حبیب اللہ خان اس لحاظ سے خوش نصیب تھا کہ اسے ایک مستحکم مملکت کا اقتدار ورثے میں مل گیا تھا جس کی فوج بھی مضبوط تھی اور روس و برطانیہ سے سرحدی معاہدوں کے بعد اسے فی الوقت بیرونی خطرات کا سامنا بھی نہیں تھا۔ نیز عوامی سطح پر کسی بغاوت کے آثار دور دور تک نہ تھے۔ حبیب اللہ خان ان بہترین مواقع سے فائدہ اُٹھا کر ایک مثالی حکمران کا کردار ادا کر سکتا تھا۔ تاہم اس نے یہ کردار نبھانے میں کہاں تک کامیابی حاصل کی۔ اس کے جواب میں ہم امیر حبیب اللہ خان کے دور کو دو حصوں میں تقسیم دیکھتے ہیں۔

رعایا پروری کا دور: اس کا پہلا دور وہ ہے جس میں امیر نے اپنے باپ کی پالیسیوں کے برعکس رعایا پروری میں غیر معمولی کشادہ دلی کا مظاہرہ کیا اور ایک پختہ فکر مسلمان حکمران کے طور پر عالمِ اِسلام میں شہرت حاصل کی۔ اس نے برسر اقتدار آتے ہی شریعت اِسلامیہ کی پابندی کا اعلان کیا۔ اس سے قبل اس کے نکاح میں پانچ بیویاں تھیں۔ شریعت کے نفاذ کا اعلان کرنے کے ساتھ ہی اس نے ایک بیوی کو طلاق دے کر احکام شرع کی پابندی کا آغاز اپنے گھر سے کیا۔ کابل شہر میں ایک محلہ گانے بجانے والی عورتوں کا تھا جہاں عیاش لوگوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ امیر نے ان سب عورتوں کو توبہ تائب کرا کے مختلف علاقوں میں منتشر کر دیا۔ خواتین پر پردے کی پابندی اس طور پر لازم قرار دی کہ وہ صرف خاکی رنگ کی بڑی چادر استعمال کر کے گھر سے نکلیں اور نئے قسم کے رنگین اور شوخ برقعوں سے اجتناب کریں۔ افغانستان میں مقیم ہندوؤں کو پابند کیا گیا کہ ان کے مرد زرد رنگ کی پگڑی اور عورتیں زرد برقعے پہنا کریں تا کہ مسلمانوں سے ان کا امتیاز ہو سکے۔ قبروں اور مزاروں کے کتبوں پر کندہ قرآنی آیات کی بے

حرمتی کا خیال کرتے ہوئے حکم دیا کہ ایسے تمام کتبے اور منقش پتھر اُکھاڑ لیے جائیں۔

امیر حبیب اللہ خان کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے جگہ جگہ دینی مدارس اور عصری تعلیم کے اسکول وکالج کھلوائے۔ صرف کابل میں حفظ قرآن کے گیارہ مدرسے بنوائے جن میں تین سے چھ سال کے دورانیے میں قرآن حفظ کرادیا جاتا تھا۔ عوام کو خوش کرنے کے لیے امیر نے قید خانوں کے دروازے کھول دیے اور بے شمار مرد وزن رہا کردیے۔ ان میں سے جو کسی الزام یا مقدمے کے اندراج کے بغیر قید تھے انہیں فوری رہائی دے دی گئی اور جن پر کیس چل رہا تھا، ان کی اکثریت کو تحقیق وتفتیش اور مختصر عدالتی کارروائی کے بعد آزادی مل گئی۔ انصاف اور رحم دلی کے اس مظاہرے پر اُفغان عوام حبیب اللہ خان کے گرویدہ ہوگئے۔ امیر حبیب اللہ خان ابتدائی سالوں میں رعایا کا دل جیتنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا رہا۔ وہ ماہ رمضان میں ہر شام غریبوں کی دعوت افطار کا اہتمام کرتا۔ دعوت کے لیے شاہی محل کے باغ میں دسترخوان بچھایا جاتا۔ ہزاروں آدمی روزانہ دسترخوان پر بیٹھتے تھے۔

<u>مکتب حبیب اور مکتب حربیہ:</u> اُفغانستان میں عصری علوم کے فروغ کی سخت ضرورت تھی۔ یہ ملک اس میدان میں ایک صدی پیچھے چل رہا تھا۔ امیر نے کابل میں ''مکتب حبیبیہ'' قائم کر کے جدید درسگاہوں کی داغ بیل ڈالی۔ 1903ء میں قائم ہونے والے اس اسکول میں دینیات، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، حکمت، کیمسٹری، فزکس اور انگریزی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ 1909ء میں امیر نے اُفغانستان کا پہلا جدید فوجی اسکول ''مکتب حربیہ'' کے نام سے قائم کیا۔ جس میں قرآن مجید، خوش نویسی، جغرافیہ، ریاضی، تاریخِ اسلام، صرف ونحو اور جدید سائنس کے علاوہ عسکری اُمور کی نظری تعلیم (Theory) اور عملی تربیت دی جاتی تھی۔ پیدل فوج، گھڑسوار فوج، توپ خانے، جاسوسی اور جسمانی ریاضت کو باقاعدہ الگ الگ مضامین کے طور پر پڑھایا جاتا تھا۔ اس نے تجارتی وصنعتی طور پر ملک کو ترقی دینے کی خاطر کئی اہم اقدامات کیے۔ اس کے دور میں پہلی بار اُفغانستان موٹر کار سے آشنا ہوا۔ بمبئی سے خریدی ہوئی موٹریں اُفغانستان کی سڑکوں پر نظر آنے لگیں۔ کابل میں ایک جدید طرز کے ہسپتال کا آغاز کیا گیا۔

<u>انانیت اور لاقانونیت کا دور:</u> امیر حبیب اللہ خان کا دوسرا دور وہ ہے جس میں وہ بے پناہ عوامی مقبولیت کے باعث غرور وتکبر کا شکار ہوگیا اور اپنے آپ کو خدا کا نائب اور ہر مسئولیت سے بالاتر تصور کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے خود کو شرعی احکام سے بھی آزاد سمجھ لیا اور حرم سرا میں درجنوں عورتیں داخل کرلیں۔ اب اس کا زیادہ وقت عیش وآرام میں گزرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اُفغانستان کی خارجہ پالیسی میں برطانیہ اور روس کے سامنے نیازمندی کا رجحان بڑھنے لگا۔ اس سے ایک اور سنگین غلطی

ہوئی کہ ملک کو ہر بحران سے دور اور امن وامان کی صورت حال کو تسلی بخش پایا تو تمام امور سلطنت اپنے نائبین کے حوالے کر دیے۔ امیر کی بے فکری کی وجہ سے ان نائبین کو بھی کسی پوچھ گچھ کا ڈر نہ تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حکام کی جانب سے عوام پر بے پناہ دست درازیاں شروع ہو گئیں۔ ٹیکس بڑھنے لگے، گرانی انتہا کو پہنچ گئی اور امن وامان سبوتاژ ہو گیا۔ اس صورت حال نے عوام کو بے چین کر دیا۔ اس کے علاوہ اب عوام کو برطانیہ اور روس کے سامنے ہر معاملے میں اپنی حکومت کا نیاز مندانہ کردار بھی بے حد ناگوار گزر رہا تھا۔ اس اضطراب کے نتیجے میں 1912ء میں پکتیکا اور قندھار سے کئی طاقت ور سردار امیر کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اگرچہ سرکاری افواج نے کئی معرکوں کے بعد ان بغاوتوں کو ناکام بنا دیا مگر اس سے یہ ظاہر ہو چلا تھا کہ امیر حبیب اللہ خان کی عوامی مقبولیت اب ختم ہوتی جا رہی ہے۔

نظام حکومت: سلطنت کے مرکزی عہدے کچھ یوں تھے کہ نائب السلطنت ولی عہد سمجھا جاتا تھا۔ یہ اعزاز امیر کے بھائی نصر اللہ خان کو حاصل تھا۔ امیر کے بڑے بیٹے عنایت اللہ خان کو معین السلطنت اور منجھلے بیٹے امان اللہ خان کو معین الدولہ کہا جاتا تھا۔ ہر صوبے کے گورنر کا تقرر امیر خود کرتا تھا۔ گورنر کو نائب الحکومت کہتے تھے۔ ہر ضلع کا کمشنر حاکم کہلاتا تھا۔ اس کا تقرر نائب السلطنت کرتا تھا۔ معین السلطنت کا کام شرعی فیصلوں کے لیے قضاۃ کا تقرر کرنا تھا۔ فوجی بھرتی کی ذمہ داریاں معین الدولہ کے سپرد تھیں۔ عنایت اللہ خان اپنے والد کی طرح انگریز نوازی کی طرف مائل تھا جبکہ نصر اللہ خان انگریزوں کا سخت مخالف تھا۔ یہی رُجحان معین الدولہ شہزادہ امان اللہ خان کا تھا۔ یہ دونوں چچا بھتیجے حبیب اللہ خان کی پالیسیوں سے خاصا اختلاف رکھتے تھے۔ ان کے حمایتیوں میں سردار محمود طرزی بھی شامل تھا۔ یوں حبیب اللہ خان سے اختلاف رائے رکھنے والا ایک مضبوط گروہ وجود میں آچکا تھا۔

امیر حبیب اللہ کی پالیسی: اگرچہ انگریزوں کے ساتھ حبیب اللہ خان کا طرزِ عمل دوستانہ تھا مگر بعض معاملات میں اس نے سابق حکمرانوں سے زیادہ پختہ کرداری کا مظاہرہ کیا۔ مثلاً جب لارڈ کرزن نے سابق حکمران امیر عبدالرحمن سے معاہدے کو ایک ذاتی نوعیت کا معاہدہ قرار دیتے ہوئے حکومت اَفغانستان کو ازسرِنو معاہدے کی پیش کش کی تو حبیب اللہ خان نے اس نئے جال میں پھنسنے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر جب انگریز اَفغانستان کو ہندوستان سے ملانے کے لیے ریلوے لائن بچھانے کا منصوبہ لے کر آئے تو امیر حبیب اللہ خان نے جدت پسند ہونے کے باوجود اس کے پسِ پردہ انگریزوں کے گھناؤنے عزائم کو بھانپ لیا اور ریلوے لائن کی اجازت نہ دی۔ انگریزوں نے یہ دیکھ کر نرم پالیسی اختیار کر لی اور 1905ء میں لارڈ کرزن کے نمائندے نے کابل آکر ایک اجمالی دستاویز پر دستخط

کر کے سابق معاہدے کی تجدید کر دی۔ حبیب اللہ خان نے اسی معاہدے کا پاس کرتے ہوئے جنگِ عظیم اول کے آغاز میں وائسرائے کے مکتوب کے جواب میں تحریر کیا تھا: ''افغانستان کی حکومت جناب کے دوستانہ مشورے کے مطابق ان شاء اللہ وفادار رہے گی۔''

خفیہ انجمنیں اور انگریزوں کے جاسوس: امیر حبیب اللہ خان کی ان پالیسیوں خصوصاً انگریزوں سے دوستانہ روابط نے بہت سے محب وطن افراد کو اس کا مخالف بنا دیا تھا۔ یہ مخالفین حکومتی اداروں میں بھی موجود تھے چنانچہ اسے تخت سے ہٹانے کے لیے بعض خفیہ انجمنیں وجود میں آئیں جن کی سازشیں ایک عرصے تک زیرِ زمین جاری رہیں اور آخر کار امیر انہی کے ہاتھوں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

امیر کے دور میں اُفغانستان میں انگریزوں کے لیے کام کرنے والے ضمیر فروش مسلمانوں کی کثرت ہو گئی تھی۔ انگریزوں کے خودکاشتہ پودے مرزا غلام احمد قادیانی کے مبلغین بھی اب اُفغانستان میں داخل ہو چکے تھے اور اپنے کذاب مربّی کی جھوٹی نبوت کا پرچار کرنے لگے تھے۔ ان میں سے ایک گماشتہ صاحبزادہ عبداللطیف تھا جو رفتہ رفتہ اُفغانستان میں اتنا بااثر ہو گیا تھا کہ سرحدی معاملات اس کی رائے کے بغیر طے نہیں پاتے تھے۔ ایک اور ایجنٹ ملا نعمت اللہ تھا جو اسی طرح دولتِ اُفغانستان کی خدمت کی آڑ میں مرزا کی جھوٹی نبوت کا پرچار کر رہا تھا۔

صد شکر کہ قادیانیوں کی اُفغانستان میں بالکل دال نہ گلی اور جوں ہی اُفغان حکام کو ان کی اصلیت اور بدعقیدگی کا علم ہوا انہوں نے شرعی عدالت میں مقدمہ چلا کر ایسے دجالوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ صاحبزادہ عبداللطیف کو اس کے منصب اور اثر و رسوخ کے باوجود ارتداد کی سزا میں قتل کر دیا گیا۔ یہی حال ملا نعمت اللہ کا ہوا۔

انگریزوں کے جاسوس دیگر شعبوں میں بھی متحرک تھے۔ امیر حبیب اللہ نے پہلی بار ملک میں ایلوپیتھی طریقہ علاج کو رواج دیا تھا۔ اس طریقہ علاج کے ماہرین کے روپ میں بعض جاسوس بھی کام کر رہے تھے۔ خود امیر کا معالجِ خاص، اللہ جویا خان انگریزوں کا ایجنٹ تھا۔ اس نے امیر کو تدریجی طور پر ایسی دوائیں کھلائیں جس سے اس کی صحت رفتہ رفتہ جواب دیتی گئی اور آخر کار وہ امورِ حکومت کی انجام دہی سے قاصر ہو گیا۔

درباری یونی فارم: امیر حبیب اللہ خان دربار کی شان و شوکت کو بہت اہمیت دیتا تھا اور چوں کہ خود بھی انگریزوں سے متاثر تھا اس لیے رعب و دبدبے کے لیے انگریزی لباس ہی اس کا مطمحِ نظر ٹھہرا۔ چنانچہ دربار کے لیے یورپی وضع کا یونی فارم لازم قرار دیا۔ تاہم عوامی سطح پر اس اقدام سے دربار کی اہمیت اور کم

ہوگئی اور یہ خیال کیا جانے لگا کہ افغان حکمران انگریزوں کے باقاعدہ خوشہ چین بن گئے ہیں۔

سیاسی بیداری کے نقیب، محمود طرزی: امیر حبیب اللہ خان افغانستان کا وہ پہلا حکمران تھا جو انگریزی اور جدید علوم وفنون پر دسترس رکھتا تھا، انگریز سفارتکاروں سے مذاکرات میں اسے کسی مترجم کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس کی جدید علوم وفنون میں دلچسپی کے باعث افغانستان میں بھی مغرب سے درآمدہ علوم کا چرچا ہونے لگا۔ سرکاری اسکول اور کالج قائم ہوئے جو قریب قریب علی گڑھ کی طرز کے تھے۔ ان درسگاہوں سے جہاں یہ فائدہ ہوا کہ افغانستان میں دور حاضر کے تقاضوں کو سمجھنے اور ان کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھنے والے وسیع الفکر لوگ پیدا ہوئے، وہاں یہ نقصان دہ پہلو بھی سامنے آ رہا تھا کہ جدید تعلیم یافتہ طبقے کی ایک بڑی تعداد قومی ومذہبی اقدار سے باغی اور یورپی تہذیب وتمدن کی دلدادہ بنتی جا رہی تھی۔ تاہم ان نوجوانوں میں بہت سے مذہبی اقدار کے پختہ حامی اور مغربی طرز حیات سے متنفر تھے۔ وہ افغانستان کی عظمت رفتہ کی بازیافت کے لیے بے چین تھے۔ ان نوجوانوں کو متاثر کرنے میں سید جمال الدین افغانی کے افکار کے علاوہ جن دانشوروں کی سعی کا خاص دخل تھا ان میں ایک نام محمود طرزی کا ہے جو کابل سے شائع ہونے والے مقبول ترین قومی اخبار سراج الاخبار کے مدیر تھے۔ اگرچہ یہ اخبار خود امیر حبیب اللہ خان نے جاری کیا تھا مگر محمود طرزی اس میں صداقت کا دوٹوک اظہار کرتے تھے۔ حالات حاضرہ پر بڑے نپے تلے انداز میں تبصرے کیا کرتے تھے۔ ان کا قلم انگریزوں اور روسیوں کی سازشوں کو بے نقاب کرتا رہتا تھا۔ محمود طرزی کی بے باکانہ صحافت کی شہرت دنیا بھر میں پھیل گئی تھی۔ ہندوستان کے اہل علم اور اربابِ صحافت بھی افغانستان کے حالات پر محمود طرزی کے تبصروں کو دلچسپی سے پڑھتے تھے۔

محمود طرزی اصل میں محمد زئی قبیلے کے سردار تھے، امیر عبدالرحمن خان کے دور میں ان کا خاندان سرکاری پکڑ دھکڑ سے بچنے کے لیے عرب چلا گیا تھا۔ اس دوران محمود طرزی نے دمشق میں تعلیم حاصل کی تھی۔ جب امیر حبیب اللہ خان نے تخت نشین ہو کر قیدیوں کی رہائی اور ہجرت کرنے والوں کی عام معافی کا اعلان کیا تو محمود طرزی واپس کابل آ گئے اور جلد ہی حبیب اللہ خان کے قریبی مشیر کی حیثیت حاصل کر لی۔ انہوں نے حبیب اللہ خان کو ملک میں اہم اصلاحات کی ضرورت کا احساس دلایا تھا۔ حبیب اللہ خان نے طرزی کو عالمِ اسلام اور یورپ کے احوال سے حکومت کو باخبر رکھنے کی ذمہ داری سونپی تھی۔ بعد میں جب ''سراج الاخبار'' جاری کیا گیا تو طرزی اس کے مدیر بنے۔ یہ اخبار حکومت کے دباؤ سے بڑی حد تک آزاد اور غیر جانبدار تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ محمود طرزی اپنے بے باکانہ اظہار

رائے کے باوجود امیر حبیب اللہ کے اتنے چہیتے رہے کہ امیر نے اپنے دو بیٹوں عنایت اللہ خان اور امان اللہ خان کی شادیاں ان کی بیٹیوں سے کرائیں۔ یوں طرزی کا اثر در سوخ مزید بڑھ گیا۔

عبدالہادی کی شاعری: انہی قومی دانشوروں میں ایک نام عبدالہادی داویی کا ہے جس کی رجزیہ فارسی اور پشتو شاعری نے افغانستان میں سیاسی بیداری کی لہر دوڑائی۔ اس کے کلام کا ایک نمونہ پیش خدمت ہے:

تابہ کی اولادِ افغاں تابکی ہاں تابکی ہاں تابکی
کو کوی مرغِ صحرا آمد بگوش خر خر خوابِ گراں جاں تابکی
نور بیداری جہانے را گرفت خواب غفلت اے حریفاں تابکے
بایدت برحال خویشت خوں گریست سیر انہار و گلستاں تابکے

ترجمہ:

کب تک، اے افغانوں کی نسل آخر کب کب تک، ہاں کب تک، ہاں کب تک
ریگستان کے پرندوں کی چہکار کانوں میں پڑ چکی پھر بھی گہری نیند کے خراٹے کب تک
بیداری کی روشنی ایک دنیا میں پھیل چکی ہے اے اپنی جان کے دشمنو! خواب غفلت کب تک
تمہیں اپنے حال پر خون کے آنسو رونا چاہیے دریاؤں اور باغوں کی سیر و تفریح کب تک

مضر پہلو: مذکورہ بالا مفکرین کی طرح اور بھی کئی شخصیات اس نہج پر کام کر رہی تھیں۔ ان کی کوششوں سے یقیناً افغانستان اور دیگر اسلامی ممالک میں سیاسی شعور پھیلا اور مسلمان استعمار کی سازشوں سے آگاہ ہوئے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ملحوظ ہے کہ ان میں سے بعض حضرات مغربی علوم وفنون کی تحصیل، مغربی لٹریچر کے مطالعے اور اہل مغرب سے بکثرت روابط کی بناء پر متعدد امور میں مغربی اقدار سے متاثر ہوگئے تھے اور کئی اسلامی نظریات کے حوالے سے ان کی فکر میں خلجان پیدا ہو گیا تھا۔ ان کے بہت سے خیالات تقریباً ایسے تھے جیسے ہندوستان کے سرسید احمد خان کے، کہ یورپ کی مخالفت کے باوجود وہ اس کی حکمت وصنعت اور ترقی سے بے جا متاثر نظر آتے ہیں۔ ایسے دانشوروں نے سیاسی امور کے علاوہ جب بھی عقائد یا فقہ کے میدان میں موشگافی شروع کی تو لازماً ٹھوکر کھائی اور ان کے افکار سے لوگوں کو فائدے کی بجائے نقصان ہونے لگا اور امت میں اتحاد کی جگہ نئی تفرقہ بازی کی راہ ہموار ہوئی۔

عالمی حالات: حبیب اللہ خان کا 19 سالہ دور عالمی حالات کے لحاظ سے انقلابات کا دور تھا۔ اسی دور میں ترکی کی خلافت پر یورپ نے آخری ضرب لگائی، مقاماتِ مقدسہ حرمین شریفین پر برطانوی ایجنٹ قابض ہو گئے، پہلی جنگِ عظیم برپا ہوئی اور دنیا خون سے نہا گئی۔ غرض یہ بڑے فتنے اور فساد کا دور تھا۔

امیر حبیب اللہ خان کے برسر اقتدار آنے سے کچھ عرصے بعد روس میں بالشویک انقلاب برپا ہوا اور اس کے اثرات براہ راست اُفغانستان پر پڑنے لگے۔ تاہم اس کے مقابلے میں اتحاد اِسلامی کے بین الاقوامی نظریے کے حامی اہلِ قلم اور دانش ور اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ حبیب اللہ خان کا بھائی نصر اللہ خان جو نائب السلطنت کہلاتا تھا ان کی سرپرستی کر رہا تھا۔

خلافت اِسلامیہ داؤ پر: امیر حبیب اللہ خان کے آخری چند سال عالم اِسلام کی عمومی سیاسی صورتِ حال کے حوالے سے انتہائی خطرناک تھے۔ برطانیہ دیگر یورپی طاقتوں کے ساتھ مل کر خلافتِ اِسلامیہ کے خاتمے پر تل گیا تھا۔ یہود و نصاریٰ کی سازشیں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ اٹلی اور ترکی کے درمیان جنگ طرابلس کئی ماہ تک جاری رہی۔ اس دوران خلیفۃ المسلمین کو کسی اِسلامی ملک سے امداد نہ ملی جبکہ پورا یورپ اٹلی کی پشت پر تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اکتوبر 1912ء میں طرابلس خلافتِ عثمانیہ کے ہاتھ سے نکل گیا۔ پھر جنگ بلقان برپا ہوئی اور ترکی کے یورپی مقبوضات میں مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہا دی گئیں۔ ستمبر 1913ء میں یورپی طاقتوں نے بلقان کے وسیع وعریض علاقے کو ترکی سے چھین کر کئی آزاد ریاستوں میں تقسیم کر دیا۔

اگرچہ اب تک اُفغانستان اس تمام کشت وخون سے لاتعلق رہا تھا اور اس نے خلافت عثمانیہ سے کسی قسم کا معقول تعاون نہیں کیا تھا مگر چونکہ اُفغان فوج کو منظم کرنے اور تربیت دینے والے کئی افسران ترک تھے اس لیے اُفغان سپاہیوں اور افسران میں ترکی سے خاص محبت پائی جاتی تھی۔ حبیب اللہ خان کے درباریوں میں سے بھی کئی ایسے تھے جو ترکی کی حمایت اور امداد کا جذبہ رکھتے تھے۔ اُفغانستان کے بعض سرکردہ امراء اس سلسلے میں زیادہ پُرجوش تھے۔ چنانچہ حبیب اللہ خان انگریزوں سے معاہدہ دوستی کے باوجود ترکی کے بارے میں اپنی خارجہ پالیسی پر غور وفکر پر مجبور تھا۔

اکابر دارالعلوم دیوبند اور ریشمی رومال تحریک: انہی دنوں امیر حبیب اللہ خان کو ہندوستان میں مسلمانوں کے سب سے بڑے دینی مرکز دارالعلوم دیوبند کے صدرِ مدرس حضرت مولانا محمود حسن رحمہ اللہ کی جانب سے خلافتِ اِسلامیہ کے تحفظ اور انگریزوں کے خلاف ایک عالمی تحریک میں شرکت کی دعوت ملی۔ حضرت مولانا محمود حسن رحمہ اللہ شیخ الہند کے لقب سے مشہور تھے اور زمانہ ان کی علمی اور روحانی شان کا معترف تھا۔ افغانستان میں ان کے عقیدت مند پہلے سے موجود تھے۔ ان کی یہ تحریک تاریخ میں ''تحریک ریشمی رومال'' کے نام سے مشہور ہے جس میں ترک خلافت اور اُفغان حکومت کی مدد سے انگریزی استعمار کے خاتمے کی کوشش کی گئی تھی۔

اس تحریک کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے اکابر دیو بند اور اِسلام کے غلبے کے لیے ان کی فکر و نظر اور کوششوں کے بعض پہلوؤں پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ برطانوی استعمار سے آزادی کی جدو جہد کے حوالے سے ہمیں اس وسیع وعریض قبائلی علاقے کے حالات کا جائزہ بھی لینا چاہیے جو معاہدۂ ڈیورنڈ کے بعد اُفغانستان سے الگ ہو کر تاریخ کا ایک نیا باب بن چکا تھا۔ چونکہ یہ علاقہ ہمیشہ اُفغانستان کے حالات پر اثر انداز ہوتا آیا ہے اور اہلِ اُفغانستان سے ان قبائل کے نسلی رشتے بہر حال برقرار ہیں اس لیے ہمیں یہاں اس باب کا مطالعہ کر کے ان احوال سے آگاہی حاصل کرنی چاہیے جو عالمِ اِسلام کے خلاف کفریہ طاقتوں کی ہمہ گیر یورش کے ردِّعمل سے یہاں وجود میں آرہے تھے اور اُفغانستان ان واقعات سے براہ راست متاثر ہو رہا تھا۔

لیجیے! اب ہم اُفغانستان کی تاریخ اس دور کے احوال کو گہرے پس منظر کے ساتھ سمجھنے کے لیے ہندوستان کی عظیم اِسلامی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قبائلی علاقہ جات کے ان انقلابات اور تحریکوں کا ذکر بھی ہوتا رہے گا جس کی سرپرستی دارالعلوم دیوبند کے اکابر کر رہے تھے۔

دارالعلوم دیوبند: 15 محرم 1283ھ (مئی 1866ء) کو دیوبند کے پس ماندہ سے قصبے میں حجۃ الاِسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ اور حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ نے مسلمانانِ ہند کی تباہ شدہ حالت کو ایک روشن مستقبل میں تبدیل کرنے کے لیے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی۔ چند سالوں میں اس علمی مرکز کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا۔ دارالعلوم دیوبند کے یہ اکابر 1857ء کی جنگ آزادی میں بھرپور طریقے سے شریک رہے تھے مگر جب یہ تحریک ناکام رہی تو انہوں نے دارالعلوم کی بنیاد رکھ کر مسلمانوں کو برطانوی استعمار کے مضر اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش شروع کی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس خطے سے انگریزوں کو نکال باہر کرنے کے لیے بھی غور وخوض کر رہے تھے۔

دارالعلوم میں سرحدی اور اُفغان طلبہ کی بھی خاصی تعداد تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ یہ طلبہ ''ولایتی'' کہلاتے تھے۔ ان کی وساطت سے اُفغانستان میں اکابر دیوبند کے عقیدت مندوں کا ایک حلقہ تیار ہو رہا تھا۔ یہ لوگ جو کہ پہلے سے سید احمد شہید رحمہ اللہ کی تحریک سے متاثر تھے، اکابرِ دیوبند کو سید صاحب رحمہ اللہ کا حقیقی وارث تصور کرتے تھے۔ سید صاحب نے بھی گزشتہ صدی میں اپنی تحریک جہاد کے دوران اُفغان سرحدی علاقوں کو اپنا مرکز بنایا تھا اور ان کی شہادت کے بعد بھی یہ علاقے مجاہدین کی سرگرمیوں کا مرکز اور ان کے لیے محفوظ پناہ گاہ تھے۔ انگریزوں نے 1857ء سے لے کر 1891ء تک کئی بار مجاہدین کے ان مراکز کو تباہ کیا مگر مجاہدین کو مکمل طور پر کچلنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ان مجاہدین کا اکابر دیو بند سے نہ صرف گہرا رابطہ تھا بلکہ شیخ الہند رحمہ اللہ کے مصاحب خاص مولانا عزیر گل رحمہ اللہ کے بقول ان کی سرپرستی پہلے مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ اور پھر شیخ الہند رحمہ اللہ کرتے رہے۔ وہ مرکز کو مسلسل ہدایات اور احکام دیتے تھے۔ مرکز کو اسلحے کی فراہمی کا انتظام بھی کرتے تھے جو کہ دارالعلوم دیوبند کے پہلو میں ایک خفیہ مقام پر تیار ہوتا تھا۔ اسے تیار کرنے کے لیے ماہر کاریگروں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔

"یاغستان": یہ قبائلی علاقہ جہاں مجاہدین سرگرم تھے، ڈیورنڈ معاہدے سے پہلے باضابطہ طور پر افغانستان کا حصہ تھا مگر ڈیورنڈ لائن کھنچ جانے کے بعد یہ علاقہ قانونی لحاظ سے برطانیہ کی عملداری میں آ گیا تھا۔ اس کے باوجود برطانیہ کو اس علاقے پر پوری دسترس حاصل نہ تھی۔ سرکاری قوانین یہاں اس لیے لاگو نہیں ہوتے تھے کہ قبائلی عوام اب بھی اپنے علماء و قضاۃ کے بتائے ہوئے شرعی احکام اور اپنے سرداروں کی ہدایات اور جرگے کے فیصلوں کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ برطانیہ کوشش کے باوجود ان پر ٹیکس عائد کرنے اور یہاں سرکاری عدالتیں قائم کرنے میں ناکام رہا تھا۔ یہاں اب بھی جھگڑوں کے فیصلے پنچایت اور جرگے میں ہوتے تھے اور ان سب سے بڑھ کر "مُلّا" کا شرعی فیصلہ حرف آخر شمار ہوتا تھا۔

ان لوگوں میں غیرت اور عزت نفس حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ عورتیں پردے کی سختی سے پابندی کرتی تھیں اور مردوں میں شرم وحیا کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ چونکہ افغانستان سے الگ ہونے کے باوجود یہاں برطانوی قانون نافذ نہیں ہو سکا تھا اس لیے گورنمنٹ اسے "یاغستان" یعنی "باغیوں کا ملک" کے نام سے یاد کرتی تھی۔

عمرا خان: اسی علاقے کا ایک مشہور مجاہد سردار عمرا خان تھا جس نے "جندول" میں ایک مضبوط اسلامی مرکز قائم کر کے انگریزوں کو ایک مدت تک ناکوں چنے چبوائے۔ عمرا خان کا تعلق یوسف زئی قبیلے سے تھا۔ وہ 1294ھ (1877ء) میں حج کے لیے مکہ معظمہ گیا تو وہاں اس کی ملاقات حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ سے ہوئی۔

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ اس سفر میں ہندوستان کے بڑے بڑے علماء و صلحاء کے ساتھ آئے تھے۔ ان دنوں ترکی اور روس میں زبردست جنگ جاری تھی اور پورا عالم اسلام برطانیہ کی فتوحات سے خائف ہونے کے بعد اب روس کے ہاتھوں ترکی کی شکست کے خطرات سے بے چین تھا۔ برطانیہ سمیت اکثر یورپی ممالک روس کی پشت پر تھے جس سے عالم اسلام میں تشویش کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس موقع پر حضرت گنگوہی رحمہ اللہ برطانیہ پر ضرب کاری لگا کر خلافت اسلامیہ کو تقویت فراہم کرنے کے لیے ایک منصوبہ تیار کر چکے تھے جس کے لیے قبائلی علاقہ جات کو منتخب کیا گیا تھا۔

''یوسف زئی افغان'' کے مولف اللہ بخش یوسفی کے مطابق عمرا خان نے اس موقع پر حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حجاز میں یہ منصوبہ تیار ہوا۔ حج سے واپس آنے کے بعد عمرا خان نے 1881ء میں اپنے علاقے ''جندول'' میں اِسلامی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ قبائلیوں نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔

عمرا خان اور انگریزوں میں معرکے: عمرا خان کی سرکوبی کے لیے برطانوی فوج نے بار بار قبائلی علاقوں پر یلغار کی، مگر اس مردِ مجاہد نے کئی معرکوں میں انہیں شکست فاش دی۔ اس نے چترال کی طرف ان کی پیش قدمی کو ناکام بنا کر کافرستان پر قبضہ کر لیا۔ پھر اسمار، مالاکنڈ، دیر، سوات اور بونیر تک اِسلامی حکومت کا دائرہ وسیع کر دیا۔

انگریزوں نے پہلے امیر عبدالرحمن خان کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے اس کے خلاف کارروائیاں کیں مگر اس نے دونوں دشمنوں کو منہ توڑ جواب دیا۔ تاہم کئی سال کی متواتر کوششوں کے بعد انگریز بے پناہ دولت خرچ کر کے قبائلی سرداروں کو خریدنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کی غداری کے باعث ایک فیصلہ کن جنگ میں عمرا خان کو شکست ہوئی اور اس کی تشکیل کردہ اِسلامی حکومت جس کا منصوبہ اکابر دیوبند نے مرتب کیا تھا ختم ہو گئی۔

حاجی صاحب ترنگزئی: عمرا خان کے بعد اس علاقے میں جس عظیم مجاہد نے جہاد کا پرچم اٹھایا وہ حاجی صاحب ترنگزئی تھے۔ حاجی صاحب 1846ء میں چارسدہ کے گاؤں ترنگزئی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا اصل نام فضل واحد تھا۔ مگر وہ ترنگزو بابا اور حاجی صاحب ترنگزئی کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ان کا روحانی تعلق سرحد کی مشہور روحانی شخصیت حضرت نجم الدین عرف ''ہڈہ مُلّا'' سے تھا۔ یہ بزرگ 25 سال تک انگریزوں سے جہاد میں مشغول رہے تھے۔ حاجی صاحب ترنگزئی اپنے شیخ کی زندگی کے اس پہلو سے نہایت متاثر تھے۔ شیخ کے بعد ان کی فکر و نظر پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والی ہستی حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ تھے۔ حاجی صاحب دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی زمانے میں اس عظیم دینی درسگاہ کی زیارت کے لیے جا پہنچے تھے۔ ان دنوں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی نوجوان تھے اور ابتدائی کتابیں پڑھاتے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ حاجی صاحب عمر میں مولانا سے چند سال بڑے تھے یعنی ان دنوں ان کی عمر تقریباً 32 سال تھی جبکہ شیخ الہند تقریباً 27 برس کے تھے۔

حاجی صاحب کی خوش قسمتی تھی کہ دارالعلوم میں قیام کے دوران انہیں دیوبند کے اکابر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے سفرِ حج کی سن گن ملی۔ حاجی صاحب یہ سن کر فوراً آمادہ سفر ہو گئے۔ اپنے وطن واپس آ کر اخراجات کا انتظام کیا۔ اس طرح انہوں نے اپنا پہلا حج ان جلیل

القدر ہستیوں کی ہمراہی میں کیا اور ان سے غیر معمولی فیض حاصل کیا۔ شیخ الہند بھی اس سفر میں ہم رکاب تھے۔ اس سفر نے دونوں کی دوستی کے بندھن کو بے حد مضبوط کر دیا۔ اس قافلے نے مکہ معظمہ میں فریضہ حج کی ادائیگی کے علاوہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر رحمہ اللہ کی زیارت بھی کی اور ان کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی۔

حاجی صاحب ترنگزئی کی تحریکِ اصلاح: حج سے واپسی کے بعد اکابر دیوبند نے سرحد میں حاجی صاحب ترنگزئی کو جہاد کی عملی تربیت کا ذمہ دار بنایا۔ یہ تربیت چند مراحل پر مشتمل تھی۔

1. سرحد کے قبائل میں "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کی بھرپور مہم چلانا۔ اصلاح نفس پر زور دینا۔
2. عوام کو منظم کرنا، اصلاح معاشرہ کے ساتھ ان میں مذہبی و سیاسی شعور پیدا کرنا۔
3. عیسائی مشنریوں کی مہم کا منہ توڑ جواب دینا اور مشنری اداروں کی سرگرمیوں کے مقابلے میں مناسب اقدامات کرنا۔
4. سول نافرمانی کی مہم چلانا۔
5. برطانوی راج کے خلاف مسلح جدوجہد کرنا۔

قابل غور بات یہ ہے کہ حاجی صاحب اپنے اکابر خصوصاً حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی رہنمائی کے مطابق تقریباً 25 سال تک اس منصوبے کے ابتدائی اہداف پر کام کرتے رہے۔ ترنگزئی میں ایک روحانی و اصلاحی مرکز قائم کیا۔ لوگ دور دور سے یہاں آکر فیض یاب ہوتے۔ انہوں نے عوام کے دلوں کو یادِ الٰہی سے روشن کیا، انہیں تمام بدعات اور بری رسموں سے توبہ تائب کیا۔ نسلِ نو کو اسلامی علوم سے آراستہ کرنے کے لیے سرحد میں ڈیڑھ سو سے زائد دینی مدرسوں کی بنیاد ڈالی، تعلیم نو کے نام پر اسکولوں اور کالجوں کی شکل میں ہونے والی مغربی یلغار کا مقابلہ کرنے کے لیے آزاد اسلامی اسکولوں کا سلسلہ شروع کیا جس کے تحت چارسدہ، مردان اور پشاور میں پچاس سے زائد اسلامی اسکول قائم کیے گئے۔ اس زمانے میں سرکاری اسکولوں کے اساتذہ کی تنخواہ چھ روپے ہوا کرتی تھی مگر حاجی صاحب نے اسلامی اسکولوں کا معیار بلند رکھنے کے لیے اپنے اسکولوں میں تنخواہ اس سے زیادہ مقرر کی۔ یہ آزاد اسکول زیادہ تر مساجد یا ان سے ملحقہ حجروں میں قائم کیے گئے تھے اور ان کا تمام خرچ مخیر لوگوں کے چندے سے پورا ہوتا تھا۔

اس وقت صورتحال یہ تھی کہ انگریز مشنریوں میں ڈاکٹر کلارک اور ڈاکٹر پینل جیسے عیار مستشرق موجود تھے جو قرآن و حدیث اور فقہ سے واقف تھے۔ وہ مسلمانوں کے مجمعوں میں مسلمان بن کر قرآن مجید کی آیات تلاوت کرتے ہوئے انہیں عیسائیت کی ترغیب دیتے اور قرآن و حدیث سے غلط استدلال کر کے انہیں سمجھاتے کہ اللہ ہمیشہ اپنے پسندیدہ لوگوں کو حکومت دیتا ہے۔ لہٰذا اس وقت گورنمنٹ

برطانیہ اور عیسائی اللہ کے پسندیدہ لوگ ہیں۔ تب ہی انہیں دنیا کا اقتدار عطا کیا گیا ہے۔ (نعوذ باللہ)

حاجی صاحب نے وعظ و تبلیغ اور اسلامی مدرسوں اور اسکولوں کے ذریعے ان کے پروپگینڈے کا فریب چاک کیا اور قبائلی علاقہ جات میں ارتداد کی اس مہم کو ناکام بنا دیا۔ مشنریوں کو ایک عرصے تک سرتوڑ جدوجہد کے باوجود سرحدی علاقے میں کوئی قابل ذکر کامیابی نہ ہو سکی۔

انگریزوں کی اس سازش کی ناکامی کے بعد سرحد کے عمائد میں سے صاحبزادہ سر عبدالقیوم نے گورنمنٹ کی منظوری سے 1912ء میں پشاور میں اسلامیہ کالج کی بنیاد رکھی تو اس کے سنگ بنیاد کے لیے حاجی صاحب ترنگزئی کو مدعو کیا۔ اسلامیہ کالج کی منظوری کے بعد حاجی صاحب کے ہاتھوں اس کا سنگ بنیاد پڑنا درحقیقت گورنمنٹ کی شکست کا اعلان تھا۔ اس تاریخی واقعے کے تین سال بعد شیخ الہند رحمہ اللہ کی اسکیم کا فیصلہ کن مرحلہ یعنی مسلح جہاد شروع ہوا جس میں حاجی صاحب پیش پیش رہے۔

حضرت شیخ الہند کی رہنمائی میں جہاد کا آغاز: شیخ الہند رحمہ اللہ کا برطانیہ سے باقاعدہ جنگ کا یہ فیصلہ اچانک نہیں تھا بلکہ انہوں نے مسلح جہاد کے اس مرحلے تک پہنچنے کے لیے برسوں تیاری اور مناسب وقت کا انتظار کیا تھا۔ حاجی صاحب ترنگزئی ان کی مہم کے ایک رکن تھے مگر ان کے علاوہ اور درجنوں سرفروش تھے جو ان کے ہدایات کے مطابق نہایت خفیہ انداز میں مختلف علاقوں میں اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ ان سرکردہ افراد میں مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خان، مولانا حسرت موہانی، اور ڈاکٹر مختار احمد جیسے لوگ موجود تھے۔

ان میں سے کئی افراد بذات خود لیڈر تھے اور اپنی اپنی تنظیموں کے ساتھ زیر زمین کام کر رہے تھے۔ مگر فیصلہ کن مرحلے پر وہ شیخ الہند رحمہ اللہ کی قیادت پر متفق ہو گئے تھے۔ ان کے علاوہ انگریز سامراج کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے والے بعض ہندو لیڈر بھی اپنی خفیہ انجمنوں کے ساتھ اس تحریک میں شامل ہو گئے تھے جن میں جلاوطن ہندو لیڈر راجہ مہندر پرتاب کا نام قابل ذکر ہے۔

جمعیت حزب اللہ: حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی اپنی خفیہ جماعت جمعیت حزب اللہ کے نام سے موسوم تھی۔ (حاجی صاحب ترنگزئی نے ترکی کے سلطان محمد خامس کو ایک خط بھیجا تھا جو کہ پکڑا گیا تھا۔ آج بھی یہ خط انڈیا آفس لندن کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس خط میں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کو ''صدر اعظم جمعیت حزب اللہ'' کے خطاب سے یاد کیا گیا ہے) اس جماعت کی تشہیر نہیں کی گئی تھی کیونکہ یہ ایک خفیہ انقلابی تنظیم تھی۔ صرف نہایت قابل اعتماد اور باصلاحیت افراد کو اس میں شامل کیا جاتا تھا۔ برسوں اس تنظیم نے زیر زمین کام کیا۔ مگر پھر وہ وقت آیا جب اسے منظر عام پر لا کر عوامی حمایت کا حصول ضروری

ہوگیا۔ یہ وہی وقت تھا جب ترکی کی خلافت اسلامیہ استعماری طاقتوں کے درمیان گھر گئی تھی اور 1912ء کی جنگ طرابلس اور پھر 1913ء کی جنگ بلقان میں متواتر شکستوں سے ترکی کی خلافت کا وجود خطرے میں نظر آنے لگا تھا۔

حضرت شیخ الہند کی بے چینی: حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ اس صورت حال سے کس قدر بے چین تھے۔اس کا اندازہ ان کے شاگرد رشید شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے ان الفاظ سے لگایا جاسکتا ہے:

''بلقان کے خونخوار اور طرابلس کے سنگین واقعہ نے مولانا کے دل ودماغ پر نہایت عجیب مگر بے چین کنندہ اثر ڈالا، چنانچہ اس وقت حسبِ طریقہ استاذ اکبر مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ (در جنگِ روس) مولانا نے پوری جاں توڑ کوشش امداد اسلام میں فرمائی۔فتوے چھپوائے، مدرسہ کو بند کرایا، طلبہ کے وفود بھجوائے، خود بھی ایک وفد کے ساتھ نکلے۔چندے کیے اور ہر طرح سے مدد کی ترغیب دے کر ایک اچھی مقدار بھجوائی مگر اس پر بھی چین نہ پڑا کیونکہ جنگ بلقان کے نشیب نے دور بینوں کو بالکل غیر مطمئن کردیا تھا کہ یورپ کے سفید عفریت اسلام کے ٹمٹماتے چراغ کو گل کرنے کی فکر میں ہیں۔'' (سفر نامہ اسیرِ مالٹا، ص:9،10)

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے اس موقع پر اکابر علماء حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہٗ اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ سے کئی دن تک طویل خفیہ مشاورت کی اور آخر کار ایک منصوبہ ترتیب دیا۔منصوبے کا خلاصہ یہ تھا کہ ترکی اور افغانستان کو ہندوستان پر قابض انگریزوں کے خلاف عسکری مہم کے لیے اُبھارا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ مقامی باشندے عمومی طور پر انگریزوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں۔انگریز اس سہ طرفہ حملے کی تاب نہیں لاسکیں گے اور انہیں نہ صرف ہندوستان بلکہ اپنے دیگر اسلامی مقبوضات سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے۔اس طرح ایک طرف ہندوستان اور دیگر کئی محکوم ممالک کے باشندوں کو آزادی نصیب ہوگی تو دوسری طرف خلافت اسلامیہ کا پایہ مضبوط ہوگا اور اس کا کھویا ہوا وقار لوٹ آئے گا۔اس منصوبے کی ان حضرات نے کسی کو بھی خبر نہیں لگنے دی۔اگرچہ منصوبے کی تفصیلات بھی طے ہوچکی تھیں مگر تحریک کے اہم کارکنوں میں سے ہر ایک کو صرف اسی کام کا علم ہوتا جو اسے سپرد کیا جاتا۔

حاجی صاحب کو ہجرت کا حکم: منصوبے کے آغاز کے لیے یہ ضروری تھا کہ انگریزوں سے لڑائی چھیڑ دی جائے جسے بنیاد بنا کر ترکی اور افغانستان کے حکام سے مدد طلب کی جاسکے اور انہیں یہ اطمینان بھی ہو کہ مقامی لوگ جہاد پر آمادہ ہیں۔اس مرحلے کے لیے قبائلی علاقے میں زمین ہموار کی جاچکی تھی اور حاجی صاحب ترنگ زئی حضرت شیخ الہند کے اشارے کے منتظر تھے۔

حضرت شیخ الہند نے اس سے قبل 1912ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کو قاصد بنا کر پشاور بھیجا تھا تا کہ وہ حاجی صاحب کو بتا دیں کہ انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد کا وقت قریب ہے لہٰذا قبائلی مجاہدین چوکنا ہو کر ہر دم جہاد کے لیے تیار رہیں۔ اب جبکہ وقت عمل آن پہنچا تھا، حضرت شیخ الہند نے حاجی صاحب ترنگ زئی کو پیغام بھیجا کہ وہ انگریزوں کی عملداری کے علاقے سے نکل کر آزاد علاقے ''یاغستان'' کی طرف ہجرت کر جائیں اور وہاں پرچم جہاد بلند کر دیں۔ خاندانی مجبوریوں کے تحت حاجی صاحب اب تک پشاور اور چارسدہ جیسے گورنمنٹ کے زیر اثر علاقوں میں قیام پذیر تھے مگر اب شیخ الہند کا تاکیدی حکم ملنے کے بعد وہ اہل وعیال کو اللہ تعالیٰ کے سہارے پر چھوڑ کر ''یاغستان'' کی طرف نکل گئے۔ ان کی عدم موجودگی میں حکومت کے اہلکاروں نے ان کے اہل وعیال پر ناقابل بیان مظالم ڈھائے مگر حاجی صاحب کے پایہ استقلال میں لغزش نہ آئی۔ انہوں نے آزاد قبائلی علاقے میں جہاد کی صدا لگائی تو تھوڑے ہی دنوں میں ہزاروں مجاہدین ان کے گرد جمع ہو گئے۔

حاجی صاحب بونیر میں: حاجی صاحب نے سب سے پہلے بونیر کو جہاد کا مرکز بنایا۔ یہاں سید احمد شہید کی تحریکِ جہاد سے وابستہ کچھ مجاہدین جو سید صاحب کی شہادت کو پون صدی گزرنے کے بعد بھی نسل در نسل جہاد کی شمع فروزاں کیے ہوئے تھے، ان سے مل گئے۔ اب انگریزوں کی چوکیوں اور کیمپوں پر منظم حملے شروع کیے گئے۔ یہ حملے اکثر شب خون کی صورت میں ہوتے تھے۔ 16 اگست 1915ء کو قلعہ رستم سے 8 میل دور مجاہدین نے ایک پہاڑی پر مورچے بنا لیے اور چار دن بعد یہاں سے قلعے پر زوردار حملے شروع کیے۔ قلعہ رستم میں تعینات برطانوی فوجیوں کو شدید نقصان اُٹھانا پڑا۔ روزانہ قلعے سے زخمیوں کو ڈولیوں پر لاد کر مردان کی طرف لے جایا جاتا۔

آخر انگریزوں کو یقین ہو گیا کہ یہ صورتِ حال برقرار رہی تو قلعہ رستم ان کا مقبرہ بن جائے گا۔ چنانچہ 25 اگست کو وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ قلعے سے نکلے اور مجاہدین کے مورچوں کی طرف بڑھنے لگے۔ اس انگریزی فوج کی تعداد کم از کم 5 ہزار تھی۔ اس نے تین اطراف سے مجاہدین کو گھیرنے کی کوشش کی مگر پہاڑوں کے چپے چپے سے واقف مجاہدین نے دائیں بائیں کے پہاڑوں کی اوٹ لے کر زبردست مقابلہ کیا۔

رات 9 بجے سے صبح 4 بجے تک جنگ جاری رہی۔ آخر انگریز چھ سو لاشوں اور زخمیوں کو اُٹھا کر پسپائی پر مجبور ہو گئے۔ مجاہدین کے دس افراد شہید اور چھ زخمی ہوئے تھے۔

امیر کابل کو آمادہ جہاد کرنے کی کوشش: انگریزوں کے خلاف جہادی کارروائیوں کی یہ اطلاعات حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کو برابر پہنچ رہی تھیں۔ آپ نے محسوس کیا کہ اب مسلم حکمرانوں کو اس جنگ میں

شمولیت کی دعوت دینے کا وقت آپہنچا ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنے شاگرد مولانا عبیداللہ سندھی کو کابل جانے کا حکم دیا تاکہ ان کے ذریعے امیر کابل حبیب اللہ خان کو مجاہدین کی مدد پر آمادہ کیا جاسکے۔ مولانا سندھی کے سفر کابل کا تذکرہ ہم آگے چل کر کریں گے۔

ادھر حاجی صاحب ترنگزئی بھی امیر حبیب اللہ خان کے پاس ایک وفد بھیج چکے تھے جس نے مطالبہ کیا تھا کہ امیر ایک اسلامی ملک کے سربراہ کی حیثیت سے انگریزوں کے خلاف اعلانِ جہاد کرے۔ دراصل امیر کابل کا اعلان جہاد کرنا مجاہدین کی کامیابی کے لیے بے حد اہم تھا کیوں کہ انگریز ان دنوں اپنے ایجنٹوں اور نمک خواروں کے ذریعے سرحد سے لے کر دہلی تک ہر جگہ اس بات کا پرچار کر رہے تھے کہ امیر کے حکم کے بغیر جہاد، شرعی جہاد نہیں ہوتا۔ حضرت شیخ الہند اور حاجی صاحب اس پروپیگنڈے کے توڑ کے لیے امیر کابل کو اعلان جہاد پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تاہم حبیب اللہ خان پس و پیش سے کام لے رہا تھا اور کھلے عام انگریزوں کے خلاف مجاہدین کی صف میں کھڑا ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔

مرنے والو اُٹھو!: ادھر حاجی صاحب ترنگزئی چملہ میں ٹھہر کر مجاہدین کے حملوں کی نئی ترتیب طے کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ہندوستانی مجاہدین کے قائد مولانا نعمت اللہ بھی تھے۔ انہوں نے مہمند قبائل کے مجاہدین کو بھی لشکر میں شمولیت کا حکم بھجوایا۔ اس طرح گنداب کے علاقے تک پہنچتے پہنچتے مجاہدین کی تعداد 18 ہزار سے تجاوز کر گئی۔ ان کی قیادت ملا بابڑہ کر رہے تھے۔

جہاد کا پیغام گھر گھر پہنچانے کے لیے حاجی صاحب کی طرف سے سرحد میں ایک پمفلٹ تقسیم کیا جارہا تھا جس میں تحریر تھا: ''مرنے والو اُٹھو! اب صبح ہورہی ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہندوستان اور آزاد علاقے کے بہادر اور غیور مجاہدین ظالم اور جابر حکومت کی غلامی سے ہندوستان کو آزاد کرانے کی خاطر جہاد کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور مظلوموں کی مدد کے لیے تلواریں میان سے نکال لی ہیں۔ جو شخص ہندوستان کی آزادی میں ہماری کوششوں اور جہاد میں مزاحمت کرے گا اسے کسی بھی صورت میں معاف نہیں کیا جائے گا۔''

شبِ قدر کا معرکہ: گنداب کے درے پر قبضہ کر کے مجاہدین نے انگریزوں کی پیش قدمی کو روک دیا تھا۔ انگریز شب قدر کے قلعے اور گنداب کے درّے کے درمیان مورچوں میں دبکے ہوئے تھے۔ مجاہدین آگے بڑھے تو انگریزوں نے بھی توپوں کے دہانے کھول دیے۔ ساتھ ساتھ ان کے 11 طیارے مجاہدین پر منڈلا رہے تھے۔

یہ معرکہ پورے تین دن اور تین رات اس طرح جاری رہا کہ مجاہدین کو کھانے پینے کا موقع بھی نہ ملا۔

آخر تین دن بعد انگریز پسپا ہو کر شب قدر کے قلعے میں چھپ گئے اور میدان مجاہدین کے ہاتھ رہا۔ چونکہ انگریزوں نے قبائلی علاقے میں تحریکِ جہاد کو ناکام بنانے کے لیے بعض زرخرید علماء کے ذریعے اس فتوے کی تشہیر شروع کر دی تھی کہ مسلمانوں کے امام یا امیر کی اجازت کے بغیر جہاد جائز نہیں اس لیے حاجی صاحب ترنگ زئی کے بہت سے ساتھی مخمصے کا شکار ہو گئے اور مجاہدین میں افتراق پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ اس صورت حال کے تدارک کے لیے جہاں امیر کابل حبیب اللہ خان کو جہاد پر آمادہ کرنا اہم تھا وہاں خلیفۃ المسلمین کی حمایت بھی ناگزیر تھی۔ حضرت شیخ الہند کے منصوبے میں یہ بات پہلے سے طے تھی کہ وقت آنے پر ترکی اور افغانستان سے انگریزوں کے خلاف مدد مانگی جائے گی چنانچہ حاجی صاحب نے حضرت شیخ الہند کو خطوط کے ذریعے تازہ حالات سے آگاہ کیا۔ جس کے بعد حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے حجاز روانگی کی تیاری شروع کر دی۔ انہوں نے سفر سے پہلے حکمت عملی کے طور پر اس بات کو شہرت دی کہ وہ حج کے لیے مکہ معظمہ جا رہے ہیں۔

1915ء میں حضرت شیخ الہند علماء کے ایک قافلے کے ساتھ حجاز روانہ ہو گئے۔ مولانا محمد رسول بھاگل پوری، مولانا عزیر گل، مولانا محمد میاں اور مولانا وحید احمد جیسے حضرات ان کے رفقائے خاص میں شامل تھے۔ برطانوی حکومت حضرت کی نقل و حرکت پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھی اور ان کے جاسوس سائے کی طرح ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ تاہم حضرت بخیر و عافیت مکہ معظمہ پہنچ گئے جہاں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے باحیثیت افراد کی وساطت سے ترک اعلیٰ انتظامیہ سے ملاقات کی کوشش کی۔

ترکِ حکام کی حمایت: آخر کار وہ حجاز کے گورنر غالب پاشا سے براہِ راست ملاقات میں کامیاب ہو گئے۔ غالب پاشا نے برطانوی استعمار سے عالمِ اسلام کی نجات کے لیے سرگرداں اس عظیم شخصیت کے متعلق نیک خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کے نام ایک حکم نامہ لکھ دیا جس کے آخر میں تحریر تھا: ''مولوی محمود حسن، مدرسہ دیوبند سے تعلق رکھنے والے ہمارے پاس آئے اور ہمارا مشورہ طلب کیا۔ ہم نے اس (ہندوستان کی آزادی) کے بارے میں ان سے اتفاق کیا اور انہیں ضروری ہدایات دیں۔ اگر وہ تمہارے پاس آئیں تو تمہیں ان پر اعتماد کرنا چاہیے اور آدمیوں اور روپوں اور ہر ایسی چیز سے ان کی امداد کی جائے جس کی انہیں ضرورت پیش آسکتی ہے۔''

حضرت شیخ الہند نے یہ تحریر مولانا محمد میاں اور چند علماء کو دے کر ہندوستان بھیج دیا اور خود مدینہ منورہ میں ترکوں کے وزیر دفاع انور پاشا سے ملاقات کی۔ انور پاشا نے بھی ان کے مشن سے پورا پورا اتفاق کرتے ہوئے ایک تحریر دے دی جس میں اسلامی دنیا کے تمام لوگوں کو ان مجاہدین کی مدد پر ابھارا گیا

تھا جن کی قیادت حضرت شیخ الہند فرما رہے تھے۔ انور پاشا نے حضرت شیخ الہند کو یقین دلایا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے انگریزوں کے خلاف متحد ہوتے ہی ترک افواج ہندوستان پر قابض انگریزوں کے خلاف کارروائی شروع کر دیں گی۔ چونکہ یہ بات واضح تھی کہ ترکی ہندوستان میں برطانیہ کی طاقت پر تب ہی ضرب لگا سکتا ہے جب اَفغانستان اس کی افواج کو راہداری کی سہولت مہیا کرے۔ اس لیے انور پاشا نے امیر کابل کے نام بھی ایک خط تحریر کیا اور اسے ترغیب دی کہ وہ اس جہاد میں ان کا ساتھ دے اور ترک افواج کو ہندوستان تک رسائی کا راستہ دے۔ حضرت شیخ الہند نے ترک حکام کے یہ انتہائی خفیہ خطوط پوری رازداری کے ساتھ اپنے قابل اعتماد ساتھیوں کے ذریعے ہندوستان روانہ کر دیے۔

مولانا سندھی رحمہ اللہ کابل میں: ان واقعات سے قبل حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے شاگرد مولانا عبیداللہ سندھی اکتوبر 1915ء میں کابل پہنچ چکے تھے۔ اَفغانستان کے قاضی القضاۃ مولانا عبدالرزاق خان دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ سے دورۂ حدیث پڑھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مولانا عبیداللہ سندھی سے بھرپور تعاون کیا۔ سردار محمود بیگ طرزی نے بھی مولانا عبیداللہ سندھی کو اعلیٰ حکام سے ملانے میں اہم کردار ادا کیا۔

کابل پہنچنے کے تقریباً دو ماہ بعد دسمبر 1915ء میں مولانا عبیداللہ سندھی کو امیر کابل حبیب اللہ خان سے ملاقات کا موقع ملا۔ امیر نے مولانا کے زاویۂ فکر سے بڑی حد تک اتفاق کیا مگر عملی طور پر کسی تعاون کا وعدہ نہ کیا۔ اس کے کچھ دنوں بعد حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے عالمِ اِسلام اور ہند و اَفغانستان کے مسلم زعماء کے نام ترک حکام کے تحریر کردہ فرامین روانہ کر دیے۔ انور پاشا اور غالب پاشا کے جو خطوط ہندوستانی و سرحدی مسلمانوں کے نام تھے وہ حاجی صاحب ترنگ زئی تک پہنچا دیے گئے۔ انہوں نے ان کی نقلیں بنوا کر بڑے پیمانے پر انہیں سرحد میں پھیلا دیا۔ اس طرح مجاہدین کو اطمینان ہو گیا کہ ان کا جہاد امیر اور خلیفہ کی سرپرستی میں ہو رہا ہے۔ چنانچہ انگریزوں کا پروپیگنڈا خود بخود دم توڑ گیا۔

خفیہ ترین خط: انور پاشا کا وہ خط جس میں حکومت اَفغانستان سے ترک فوج کو حملے کے لیے راستہ دینے کی درخواست کی گئی تھی، سب سے اہم اور انتہائی خفیہ نوعیت کا تھا۔ اس تحریر کو حضرت شیخ الہند نے نہایت احتیاط کے ساتھ ایک رومال میں بُنوا دیا۔ ایک قابل اعتماد شخص جو کپڑے کا تاجر بھی تھا، تجارتی کپڑے کے تھانوں کے ساتھ یہ رومال بھی اَفغانستان لے گیا۔ جگہ جگہ سخت ترین تلاشی کے باوجود انگریز یہ خفیہ تحریر نہ پکڑ سکے۔

منصوبے کے مراحل: حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ اور ترک حکام کے مابین منصوبہ مرحلہ وار اس طرح

طے ہوا تھا کہ:

❶ انگریزوں کے خلاف بھرپور انداز میں جہاد کے لیے اَفغان حکومت ترک افواج کو ہندوستان پر حملے کے لیے راستہ دے گی۔ اس منصوبے کا توثیق نامہ جو ریشمی رومال پر خفیہ انداز میں تحریر تھا پہلے امیرِ کابل کے پاس پہنچے گا۔

❷ اَفغان حکومت کے اتفاق اور امیر کابل کی مہر سے آراستہ ہونے کے بعد یہ توثیق نامہ دوبارہ ترکی پہنچایا جائے گا۔

❸ ترک حکام ریشمی رومال وصول کر کے اس کے ذریعے اَفغان حکام کی اجازت سے آگاہ ہوں گے۔ یہ سارا عمل دسمبر 1916ء کے اواخر تک مکمل ہو جائے گا۔

❹ یکم جنوری 1917ء کو ترک حکام کی جانب سے حکومت اَفغانستان کو حتمی اطلاع دے دی جائے گی کہ ترک افواج روانہ ہو رہی ہیں۔

❺ یکم فروری 1917ء کو کابل سے ریشمی رومال دہلی کے مرکز مجاہدین کو پہنچا دیا جائے گا جس کی نقول چھپوا کر ہندوستان کے حریت پسندوں کو یکبارگی برطانیہ کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے پر آمادہ کیا جائے گا۔

❻ یہ فضا بنتے بنتے 9 فروری کو ترک افواج اَفغانستان میں داخل ہو جائیں گی اور اسی دن ہندوستان میں آزادی کے متوالے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔

مجاہدین کا وفد کابل میں: اس منصوبے کے ابتدائی دو مرحلے بخیر وخوبی انجام پا گئے۔ حضرت شیخ الہند کی جانب سے مولانا ہادی حسن جان پر کھیل کر ترک حکام کے خفیہ خط کے ساتھ ترکی سے ہندوستان پہنچے اور حکومت برطانیہ کے بار بار چھاپوں اور تلاشیوں سے بمشکل بچتے بچاتے قبائلی علاقے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ حاجی صاحب ترنگزئی سے ملے اور ان کے معتمد ساتھیوں کے ہمراہ اَفغانستان پہنچے۔

اس وفد نے کابل پہنچ کر ترک اَفغان معاہدے کے لیے یہ دستاویز مولانا عبیداللہ سندھی کے سپرد کر دی۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے اس وفد کو لے کر پہلے نصر اللہ خان، امان اللہ خان اور عنایت اللہ خان سے علیحدہ علیحدہ ملاقاتیں کیں اور انہیں آمادہ کیا کہ وہ امیر کو ترک اَفغان جنگی معاہدے کی توثیق اور مجاہدین کی امداد پر مجبور کریں۔

ان دنوں امیر حبیب اللہ خان کی روش یہ تھی کہ وہ ایک دو رخی پالیسی اختیار کیے ہوئے تھا۔ اس نے اَفغانستان اور قبائلی علاقوں میں یہ اعلان کر رکھا تھا کہ انگریزوں کے خلاف جہاد میں نظم وضبط کا خاص

خیال رکھا جائے اور جب امیر کابل اعلان جہاد کرے تو سب لوگ اس کے ساتھ جہاد میں شامل ہو جائیں۔ جب تک وہ اعلان جہاد نہ کرے تب تک ہنگامہ آرائی اور بدنظمی سے احتراز کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ قبائلی مجاہدین میں بے دریغ روپیہ تقسیم کر رکھا تھا اور ان سے اپنی امارت کے بیعت ناموں پر دستخط لے رہا تھا۔ مجاہدین یہ سمجھ رہے تھے کہ اس سخاوت اور فیاضی کے ذریعے مجاہدین کی مالی امداد کرنا اور ''جہاد'' کو تقویت پہنچانا چاہتا ہے۔ پھر امیر حبیب اللہ خان نے ایک ہوشیاری یہ کی تھی کہ مجاہدین کے ساتھ ان تمام معاملات میں سردار نصر اللہ خان کو آگے رکھا تھا جو مخلص اور پختہ مسلمان تھا۔ قبائلی عوام اس پر اعتماد کر کے زور و شور سے بیعت ناموں پر دستخط کر رہے تھے۔ کسی کو شبہ نہ ہوا کہ امیر کابل اس طرح مجاہدین، قبائلی عوام اور ہندوستانی حریت پسند مسلمانوں کو اپنے تابع کر رہا ہے اور اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ مجاہدین آئندہ اپنی ہر مہم کے لیے اس کی اجازت کے محتاج بن جائیں۔

چونکہ امیر حبیب اللہ خود جہاد کے لیے ہرگز آمادہ نہ تھا بلکہ انگریز دوستی کو اپنے اقتدار کی بقا کا واحد ذریعہ تصور کرتا تھا اس لیے اس کا خود جہاد کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ خود تو جہاد سے گریز کر ہی رہا تھا مگر بیعت ناموں کے ذریعے دوسروں کو بھی جہاد سے روکنے کا سبب بن رہا تھا۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کو یہ تاثر دے رہا تھا کہ وہ انگریزوں سے نفرت کرتا ہے اور موقع ملتے ہی میدان جہاد میں کود پڑے گا۔

حاجی صاحب کی دھمکی: حاجی صاحب ترنگزئی امیر کابل کی اس بدنیتی کا اندازہ لگا چکے تھے اس لیے انہوں نے افغان سلطنت کے اہم ارکان کو پہلے اعتماد میں لینا ضروری سمجھا۔ اس کے ساتھ ساتھ حاجی صاحب نے امیر کے نام ایک دھمکی آمیز خط بھی ارسال کیا تھا جس میں تحریر تھا: ''اگر افغان حکومت نے ترک افغان معاہدے کی توثیق نہ کی تو مجاہدین کو حکومت افغانستان کے خلاف بھی علم جہاد بلند کرنا پڑے گا۔''

یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور امیر کابل نے مجبور ہو کر جرگہ طلب کیا جس میں قبائلی عمائد، فوجی امراء اور سلطنت کے دیگر عہدے دار بھی شریک تھے۔ حضرت شیخ الہند کا وفد جرگے میں پیش ہوا۔ حضرت شیخ الہند کے نمائندے مولانا عبید اللہ سندھی تھے اور حاجی صاحب ترنگزئی کے سفیر مولانا بشیر احمد تھے۔ یہی دونوں وفد کی ترجمانی کر رہے تھے۔ اس اجلاس کے انعقاد میں نائب السلطنت سردار نصر اللہ خان اور امان اللہ خان کا بڑا دخل تھا۔ دراصل وہ بھی سمجھ چکے تھے کہ امیر کی جانب سے اعلان جہاد میں تاخیر بدنیتی پر مبنی ہے۔ اس لیے وہ امیر کو راہ راست پر لانے کے لیے دباؤ بڑھا رہے تھے اور اسے آگاہ کر رہے تھے کہ قبائلی علاقوں کے مجاہدین ارسال کردہ بیعت ناموں پر دستخط کر کے اب اعلان جہاد کے بے چینی

سے منتظر ہیں۔ مزید تاخیر حالات کو ابتر کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔ ان محرکات کے تحت امیر نے جرگہ بلانے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔

جرگے کا اجلاس چار گھنٹے تک جاری رہا۔ تمام حاضرین نے جہاد کے فوری اعلان کے حق میں رائے دی۔ صرف عنایت اللہ خان نے شاہ کا منظورِ نظر بننے کے لیے اس رائے کی مخالفت کی۔ جہاد کے حامیوں میں سب سے بلند آواز امان اللہ خان اور نصر اللہ خان کی تھی۔ انہوں نے کھڑے ہو کر واشگاف الفاظ میں کہا کہ اُفغانستان کو اس نازک وقت میں انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا چاہیے۔ جرگے کے ارکان نے اس سے اتفاق کیا۔ اب سب عمائد امیر حبیب اللہ خان کی طرف سے تائید طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ امیر مجلس کا یہ رنگ دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔ تاہم وہ انگریزوں سے کھلم کھلا دشمنی مول لینے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ دوسری طرف پوری قوم کے عمائد کو ناراض کرنا بھی ممکن نہ تھا۔

امیر حبیب اللہ خان کا فیصلہ: امیر حبیب اللہ خان نے شرکائے مجلس کو سمجھانا چاہا کہ اُفغانستان کی عسکری قوت بہت کم ہے اس کے علاوہ اس وقت بین الاقوامی حالات اُفغانستان کو انگریزوں کے خلاف جہاد کا مرکز بنانے کی اجازت نہیں دیتے مگر عمائد کی اکثریت کا جوش وخروش دیکھتے ہوئے وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ اعلان جہاد کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔ آخر کار اس نے ایک ایسا طریقہ اختیار کیا جس سے اس کی حکومت اور اُفغانستان کے لیے کم سے کم مسائل پیدا ہوں۔ اس نے جرگے میں اپنے خاص اختیارات سے کام لیتے ہوئے فیصلہ سنایا کہ ترک اُفغان معاہدے کی توثیق اس شرط کے تحت کی جاتی ہے کہ اُفغان حکومت بذاتِ خود غیر جانبدار ہوگی۔ اگر اُفغان عوام میں سے بعض لوگ مجاہدین کا ساتھ دیتے ہیں تو یہ ان کا انفرادی عمل ہوگا۔ ترک افواج کو اُفغانستان کے سرحدی علاقہ جات سے گزرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ اگر انگریز سرکار نے کوئی دباؤ ڈالا تو اسے کہنے کے لیے یہ عذر ہمارے پاس ہوگا کہ جن علاقوں سے ترک افواج گزر رہی ہیں وہاں کے لوگ باغی ہو کر ہماری حکومت سے نکل چکے ہیں۔ الغرض حکومتِ اُفغانستان ناگزیر وجوہ کے سبب انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان نہیں کر سکتی۔ البتہ خفیہ طور پر مجاہدین کو حکومت اُفغانستان کی تمام ہمدردیاں حاصل ہوں گی۔

امیر حبیب اللہ خان کا اس حد تک تیار ہو جانا بھی مجاہدین کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ مولانا عبید اللہ سندھی، حاجی صاحب ترنگ زئی کے نمائندوں اور سردار نصر اللہ خان وغیرہ کی خوشی قابل دید تھی۔ یہ بھی طے ہو گیا کہ جہاد کے تمام معاملات نصر اللہ خان (نائب السلطنت) ہی کے پاس ہوں گے۔ اس فیصلے کی ایک تحریر لکھ کر اس پر امیر کابل سے دستخط لے لیے گئے۔ اس کے بعد خود سردار نصر اللہ خان اور پھر

سردار امان اللہ خان اور عنایت اللہ نے بھی اس پر دستخط کر دیے۔

ریشمی خط کی تیاری: اگر دیکھا جائے تو حکومت افغانستان نے پس و پیش اور مصلحت پسندی کے باوجود جہاد کے اس مرحلے پر اپنا کردار مناسب انداز میں ادا کر دیا تھا۔ اب آگے کے مراحل مجاہدین کے ہاتھ میں تھے جن کی تکمیل اگرچہ دشوار ضرور تھی مگر اصل گھاٹی بہر حال عبور ہو چکی تھی۔ دو حکومتیں برطانیہ کے خلاف لڑائی میں شرکت کے لیے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ کے منصوبے سے اتفاق کر چکی تھیں۔ اگرچہ حکومت افغانستان نے کھلم کھلا اعلان جنگ نہیں کیا تھا مگر سردار نصر اللہ خان نے مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے رفقاء کو یقین دلایا کہ مناسب موقع پر ہم برملا اعلانِ جہاد بھی کر دیں گے۔ ہمیں صرف اس دن کا انتظار ہے جب جرمنی کی فوجیں پیش قدمی کرتے ہوئے ایران تک آن پہنچیں گی۔ واضح رہے کہ ان دنوں برطانیہ اور جرمنی جنگِ عظیم اول میں ایک دوسرے سے برسرپیکار تھے اور جرمنی برطانیہ کے ایشیائی مقبوضات میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جرمنی کی پیش قدمی یقیناً برطانیہ کو مزید اُلجھانے اور کمزور کرنے کا باعث بنتی۔ ایسے میں ترکی اور افغانستان کا ہندوستان پر قابض برطانوی افواج پر ٹوٹ پڑنا اور ساتھ میں ہندوستان کے عوام کا برطانوی گورنمنٹ کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونا، حالات کا پانسا بالکل پلٹ سکتا تھا۔

وقت عمل سر پر تھا اور ایک ایک دن بلکہ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ مولانا عبید اللہ سندھی کابل اور ترک حکومت کے توثیق نامے کو جس پر امیر کابل کے وزراء کے دستخط ہو چکے تھے، ایک ماہرِ فن آدمی سے "ریشمی خطوط" کی شکل میں لا رہے تھے۔ رومال کی بُنائی میں معاہدے کی مکمل عبارت حتیٰ کہ حملے کی تاریخ کی منظوری کے الفاظ بھی درج کیے گئے۔ یہ عبارت عربی زبان میں تھی، نیچے امیر کابل، نائب السلطنت امان اللہ خان اور عنایت اللہ خان کے دستخط بھی ایک عجیب کاریگری کے ساتھ رومال کی بناوٹ میں شامل کر لیے گئے۔ یہ ریشمی رومال زرد رنگ کا تھا اور اس کا طول و عرض تین فٹ تھا۔ رومال کی تیاری کے بعد اس پر امیر کابل اور مذکورہ تینوں اعلیٰ عہدے داروں نے ایک بار پھر زرد روشنائی سے دستخط کیے۔ سرسری نگاہ سے یہ دستخط ہرگز دکھائی نہیں دیتے تھے۔

قضا و قدر کے فیصلے: ہر چیز اپنی جگہ مکمل تھی۔ یہ رومال اب فوری طور پر ترکی پہنچایا جانا ضروری تھا تا کہ ترک حکام حکومت افغانستان کے فیصلے سے آگاہ ہو جائے۔ یہ تحریر جس پر مسلمانوں کی آزادی کا دارومدار تھا، ایک کارکن شیخ عبدالحق کے حوالے کر کے اسے سندھ روانہ کیا گیا۔ وہ ہندو مذہب سے تائب ہو کر اِسلام قبول کرنے والا ایک پُرجوش نوجوان تھا۔ بظاہر اس سے کسی خیانت کی توقع ہرگز نہ تھی۔

شیخ عبدالحق کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ یہ رومال حیدر آباد کے ایک کارکن عبدالرحیم کو پہنچا دے۔

عبدالرحیم کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ مدینہ منورہ پہنچ کر اسے حضرت شیخ الہند کے سپرد کردے۔ یوں یہ تحریر ترک حکام تک پہنچ جاتی۔ مگر قضا وقدر کے فیصلے کچھ اور تھے۔ انگریز بے دریغ دولت خرچ کر کے نئے نئے مخبر خریدرہے تھے اوران کے جاسوس قدم قدم پر مجاہدین کے پیچھے لگے ہوئے تھے، اگر چہ اب تک انہیں اصل معاملے کا پتہ نہیں چل سکا تھا، البتہ یہ احساس تھا کہ ترکی سے افغانستان تک کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ مگر پھر اچانک یہ ہوا کہ بازی الٹ گئی۔ انگریزوں کو تمام اطلاعات مل گئیں اور مجاہدین ہندوستان وترکی کا سارا منصوبہ تلپٹ ہوگیا۔

یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ عام طور پر مؤرخین اس میں الجھ کررہ جاتے ہیں۔ زیادہ تر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ خفیہ خط انگریزوں کو کس نے دیا۔ اس بارے میں کئی آراء ہیں۔ ''مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشت کابل'' سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالحق نے خیانت کی۔ اس نے یہ اہم ترین دستاویز حق نواز نامی ایک افغان کے حوالے کردی اور اس نے فوری طور پر پنجاب کے انگریز گورنر ''ڈائر'' تک پہنچادی۔ اس طرح یہ سربستہ راز فاش ہوگیا۔

مگر یہ صورتحال کا صرف ایک پہلو اور ظاہری نقشہ ہے۔ اصل قوت جس نے ان غداروں کو تحریک دی تھی، کوئی معمولی شخصیت نہیں ہوسکتی جس کو پہچاننا بہت ضروری ہے۔ اس بارے میں ہم کچھ آگے چل کر بحث کریں گے کہ اصل غدار کون تھا۔ فی الحال یہ دیکھئے کہ خط پکڑے جانے کے بعد کیا ہوا۔

حالات بدل گئے: راز افشاء ہوتے ہی انگریزوں کے پیروں تلے سے زمین سرکنے لگی...... آن کی آن میں ہندوستان سے برطانیہ تک انگریزوں کی ساری مشینری حرکت میں آگئی۔ ترکی اور حجاز میں ان کے کارندے متحرک ہوگئے۔ ہندوستان میں درجنوں اہم افراد گرفتار کرلیے گئے۔ افغانستان پر دباؤ ڈال کر وہاں کے بھی کئی مجاہدین کو حراست میں لے لیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی برطانوی فوج حرکت میں آگئی اور اس نے بلاتاخیر ایران میں داخل ہوکر ترکی اور افغانستان کے مابین زمینی راستوں کو بند کردیا۔ پھر انگریزوں کی افواج ترکی پر ٹوٹ پڑیں اور اس کی مختلف فوجی سرحدوں پر شدید جنگ چھیڑ دی تاکہ ترک حکام کسی اور طرف فوج روانہ کرنے کا سوچ تک نہ سکیں۔

صرف یہی نہیں بلکہ مجاہدین کی تحریک کو جڑ سے ختم کرنے کے لیے انگریزوں نے ہندوستان کے بدعتی علماء اور دین فروش مفتیوں سے فتوے لکھوائے جن میں ترکوں کے خلاف لڑائی کے لیے انگریز فوج میں بھرتی کو جائز قرار دیا گیا۔ ترک خلیفہ کو کافر کہا گیا۔ بریلی کے دارالافتاء سے ہندوستان کو انگریزوں کے سائے میں ''دارالاسلام'' قرار دے دیا گیا۔ جزیرۃ العرب میں لارنس آف عربیہ جیسے انگریز جاسوس کی

آتش فشانی نے عرب قومیت کا زہر گھول دیا۔

حضرت شیخ الہند کی گرفتاری: شریف مکہ نے تحریک کے بانی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ اور ان کے رفقا شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا عزیر گل اور دیگر مجاہد رہنماؤں کو گرفتار کر کے انگریزوں کی تحویل میں دے دیا، بعد میں یہ بزرگان مالٹا کے بدنام زمانہ عقوبت خانے میں محبوس کر دیے گئے۔ ہندوستان میں تحریک کے اہم کردار حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ کو نینی تال جیل میں قید کر دیا گیا۔ یوں جہاد کی ایک زبردست تحریک اپنے اہداف حاصل نہ کر سکی۔ تاہم ان عظیم مجاہدوں کی بے مثال جدوجہد نے ہندوستان سے ترکی تک اسلام کے لیے قربانیاں دینے اور مسلمانوں میں باہمی اتفاق واتحاد کی اہمیت کو سمجھنے کی فضا پیدا کر دی۔ افغانستان میں اس تحریک کے اثرات نے جہاد کی وہ روح دوبارہ پھونک دی جو ربع صدی سے معدوم ہو چکی تھی۔ اسی جذبے اور ولولے نے امیر حبیب اللہ خان کے اقتدار کا سورج غروب کیا اور افغانستان کی پیشہ ور افواج کو برطانیہ کے خلاف میدان جنگ میں اُترنے پر مجبور کر دیا۔

جنگِ عظیم اول کے نتائج: 1917ء جسے اسلامی انقلاب کے اولوالعزم رہنما مسلمانوں کے حق میں دور رس تبدیلیوں کا پیامبر تصور کر رہے تھے ریشمی رومال تحریک کی ناکامی اور بڑے بڑے مسلم زعماء کی قید و بند کے المیے لے کر آیا۔ برطانیہ اور اس کے اتحادی ہر محاذ پر فتح یاب ہو رہے تھے۔ امریکا ایک بڑی طاقت کے طور پر اُبھر کر برطانیہ کی بھرپور مدد کر رہا تھا۔ پھر 1918ء میں امریکا کے برطانیہ کے ساتھ مل جانے کے بعد اتحادی ترکی کو شکست فاش دینے میں کامیاب ہو گئے۔

15 اگست 1918ء کو یہ خون ریز جنگِ عظیم اس طرح اختتام پذیر ہوئی کہ ترکی کے وہ بڑے بڑے لیڈر جو اس جنگ میں اہم کردار ادا کرتے رہے تھے جلاوطن ہو کر جرمنی میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے اور ترکی کو اتحادیوں سے ایک معاہدے کے تحت تقسیم کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اتحادی افواج نے استنبول میں داخل ہو کر حکومت کے کلیدی شعبوں کو اپنی گرفت میں لے لیا اور خلیفہ عبدالوحید خان کی حیثیت برائے نام رہ گئی۔

حبیب اللہ خان کا اطمینان: اس صورت حال سے مسلم سربراہوں کو جتنی بھی تشویش ہوتی کم تھی مگر حاکم افغانستان امیر حبیب اللہ خان اس وقت بہت مطمئن تھا۔ وہ منتظر تھا کہ کب ترکی کی خلافت کا خاتمہ ہو اور وہ خود کو خلیفہ کے لقب سے موسوم کر سکے۔ اس دوران اس نے مولانا عبید اللہ سندھی اور دیگر ہندوستانی مجاہدین کو جو کہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی تحریک سے تعلق رکھتے تھے ایک تنگ مکان میں نظر بند کر دیا تھا اور ان پر سخت پہرہ لگا رکھا تھا۔ جب ترکی کی شکست کی خبر کابل پہنچی تو حبیب اللہ خان کے نمک خواروں

کی خوشی چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ ان میں سے ایک آفیسر نے مولانا عبید اللہ سندھی کو یہ خبر بڑے طنزیہ انداز میں سنائی اور کہا: ''اینہ ترکی تمام شد'' (یہ لو، ترکی کا کام تو تمام ہوگیا۔)

مولانا عبید اللہ سندھی کے رفیق ظفر حسن ایبک جو اس واقعے کے راوی ہیں کہتے ہیں ''مولانا صاحب مرحوم کو اس خبر سے جتنا رنج ہوا اسے بیان کرنا میری طاقت سے باہر ہے۔''

چند تلخ سوالات: یہاں چند سوالات بار بار سر اُٹھاتے ہیں، آگے بڑھنے سے پہلے ان پر غور کرنا ضروری ہے:

1. امیر حبیب اللہ خان اتنا ہی انگریز نواز تھا تو اس نے ترک افغان معاہدے پر دستخط کیوں کیے؟
2. ریشمی رومال کس طرح پکڑا گیا؟ نومسلم عبد الحق اور حق نواز (یا رب نواز) کس کے آلہ کار تھے؟
3. ریشمی رومال پکڑے جانے کے بعد برطانیہ نے ہندوستان کے مجاہدین آزادی اور ترکی کو فوری ہدف بنایا مگر امیر کابل سے کوئی پوچھ گچھ کی، نہ احتجاج کیا۔ آخر کیوں؟

ویسے تو امیر حبیب اللہ خان کے رویے پر ایک نظر ڈالنے سے بعض سوالات کے جوابات خود سمجھ میں آسکتے ہیں، باقی اُلجھی ہوئی گتھیاں بھی اس پر غور کر کے سلجھائی جاسکتی ہیں، تاہم مزید وضاحت کیلئے چند قرائن پیش کیے جارہے ہیں۔

اصل غدار کون تھا؟ یہ بات تو یقینی ہے کہ امیر کابل نے اپنی خوشی سے اس وثیقے پر دستخط نہیں کیے تھے۔ اس نے عمائدِ قوم، فوج کے امراء اور حاجی صاحب ترنگزئی کی دھمکی سے مجبور ہو کر یہ اقدام کیا تھا...... تو کیا یہ قرین قیاس نہیں کہ اسی نے اپنے خفیہ کارندوں کے ذریعے اس وثیقے کی اطلاع انگریزوں کو دے دی ہو اور اسی نے حق نواز یا عبد الحق جیسے افراد کو براہ راست یا بالواسطہ متاثر کر کے اپنی اور انگریزوں کی وفاداری پر آمادہ کر لیا ہو۔ اگرچہ اس دور کی تاریخ میں اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا مگر یہ بات قرین قیاس ضرور ہے۔

اس کے برعکس یہ بات بڑی حد تک عقل وفہم سے بعید ہے کہ حبیب اللہ خان انگریزوں کا حامی ہونے کے باوجود آخر تک ان کے خلاف عسکری منصوبہ بندی میں بخوشی شریک رہا ہو۔ جبکہ یہ بات ریکارڈ پر کہ ہے کہ اس نے جرگے میں انگریزوں سے جنگ میں شرکت کے خلاف رائے دی تھی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امیر حبیب اللہ خان اپنے آخری سالوں میں یہود کی بدنام زمانہ خفیہ تنظیم ''فری میسن'' کا رکن بن گیا تھا۔ اگر یہ درست ہے تو ایسے شخص سے کیا یہ توقع ہوسکتی ہے کہ وہ انگریزوں کے خلاف مجاہدین کا ساتھ دے اور مجاہدین کے راز طشت از بام نہ کرے۔ یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ ترکی کی شکست پر حبیب اللہ خان بے حد خوش تھا اور اس نے ترک خلیفہ کی جگہ خود خلیفہ بننے کی تیاری کر لی تھی۔

اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے فری میسن کے ایجنڈے پر کام کرتے ہوئے ریشمی رومال تحریک کو سبوتاژ کیا، غالباً یہود اس سے وعدہ کر چکے ہوں گے کہ مجاہدین ہند کی ناکامی کے بعد ترکی کا کام بھی تمام کر دیا جائے گا اور بدلے میں اسے خلیفہ بننے کا موقع دیا جائے گا۔

اب ایک ایسی تاریخی حقیقت پیش خدمت ہے جو ان تمام اندازوں پر مہر توثیق ثبت کر دیتی ہے۔

ریشمی رومال تحریک کا راز افشاء ہونے سے قبل ترک اور جرمن نمایندوں کا ایک وفد اُفغانستان آیا۔ ترکی اور جرمنی جنگ عظیم اول میں اتحادی تھے اور مل کر برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ان دونوں کی خواہش تھی کہ اُفغانستان جنگ میں ان کا ساتھ دے اور انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کرے۔ امیر حبیب اللہ خان انہیں فریب دے رہا تھا کہ ترک اور جرمن افواج کے پہنچتے ہی وہ ان کے ساتھ مل جائے گا۔ مگر حقیقت کیا تھی؟ امیر حبیب اللہ خان نے ان نمایندوں کو جھوٹی تسلیاں دے کر کابل سے رُخصت کر دیا تھا اور آیندہ ان کی آمد مشکل بنانے کے لیے ان کے پاسپورٹ جلاڈالے تھے۔ اس کے فوراً بعد اس نے انگریزوں کو اطلاع بھجوادی تھی کہ میں نے ترک اور جرمن وفد سے وعدہ کرلیا ہے کہ ان کی افواج کے ایران کے راستے اُفغانستان پہنچنے پر برطانیہ کے خلاف اعلانِ جنگ کردوں گا۔ یہ اطلاع دے کر گویا حبیب اللہ خان نے خود اس خفیہ معاہدے کو بے اثر بنا دیا تھا۔ چنانچہ انگریزوں نے اس اطلاع کے فوراً بعد عراق پر حملہ کر کے ایران کی سرحدوں کی ناکہ بندی کر دی تھی۔

(دیکھیے: مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشت کابل، ص:172)

اس تلخ حقیقت کے پیش نظر یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں کہ حبیب اللہ خان نے ریشمی رومال کی دستاویز کو بھی اس طرح دوہرا کھیل کھیل کر انگریزوں کے ہاتھ لگوایا ہوگا...... اور ان سے اپنی عیاری اور فریب کاری کی داد وصول کی ہوگی۔

معما حل ہوجاتا ہے! ریشمی رومال تحریک کو سبوتاژ کرنے میں حبیب اللہ خان کا ہاتھ تسلیم کرلیا جائے تو پھر یہ معما بھی حل ہوجاتا ہے کہ انگریزوں کے خلاف ''اتنی بڑی سازش'' میں شرکت کا جرم کر کے بھی امیر حبیب اللہ خان کے انگریزوں سے تعلقات پر کوئی منفی اثر کیوں نہیں پڑا۔ پھر یہ پہیلی بوجھنا بھی آسان ہوجاتا ہے کہ وہ حبیب اللہ خان جو کہ انگریزوں کی مخالفت میں ان سے جنگ کا خطرہ مول لے چکا تھا، اسے اس کے بھائی اور بیٹے آخر تک قوم کا غدار اور انگریزوں کا نمک خوار کیوں سمجھتے رہے اور اس کے وجود کو اُفغانستان کے لیے ایک ناسور قرار دے کر نشتر زنی پر کیوں آمادہ ہوئے؟

رعونت کی آخری حدود۔ خلافت کا اعلان: 1918ء کے اختتام اور 1919ء کے آغاز میں امیر

حبیب اللہ خان کو موج مستی اور رعونت وخودسری کی آخری حدود پر دیکھا جاسکتا ہے...... اسے اسلامی اقدار کا کوئی لحاظ رہا تھا نہ قوم کے جذبات کا کوئی احساس تھا۔اس نے اپنی حرم سرا میں ان گنت عورتیں داخل کر رکھی تھیں...... امراء وخواص اس کی عیاشیوں سے نالاں تھے۔عیش وعشرت کے سوا اسے کوئی اور کام نہ تھا۔اسے اپنے اقتدار کی مضبوطی پر ناز تھا۔وہ اقتدار جسے انگریزوں کی سرپرستی حاصل تھی اس کے نزدیک لازوال تھا۔

فروری 1919ء میں جمعہ کے خطبے میں حبیب اللہ خان نے اپنی ''خلافت'' کا اعلان بھی کردیا تھا اور اپنے آپ کو خلیفۃ المسلمین اور ''امیر المومنین'' کے القاب سے موسوم کردیا۔اس نے ترکی کی خلافت کی رسمی حیثیت کے خاتمے کا انتظار بھی ضروری نہیں سمجھا اور یہ طے کرلیا کہ دنیا میں اب اس سے بڑھ کر مسلمانوں کی نمایندگی کے قابل کوئی نہیں رہا۔اس ہفتے اس نے انگریزوں سے وفاداری کا انعام حاصل کرنے کے لیے اپنے نمایندے پشاور بھیجے تھے۔اسے اُمید تھی کہ انگریز سرکار ایک خطیر رقم اسے روانہ کرے گی جسے وہ اپنی عیاشی پر خرچ کرسکے گا مگر قہرِ خداوندی کی شمشیر اس کے سر پر چمک رہی تھی۔اس کے قریبی ساتھی ہی اسے قتل کرنے کے درپے تھے۔

<u>قاتلانہ حملہ اور اس کے محرکات</u>: ان لوگوں کے پاس حبیب اللہ خان کے خلاف کارروائی کی وجوہ موجود تھیں۔سب سے بڑی بات یہ تھی حبیب اللہ خان اخلاقی عیوب میں مبتلا تھا۔اس کے کارندے اس کی عیاشی کے لیے شریف خاندانوں کی بہو بیٹیوں تک کو اغوا کرنے لگے تھے۔آخر یہ خبریں اس کی ملکہ جسے ''علیا حضرت'' کہا جاتا تھا تک جا پہنچیں۔وہ ایک غیرت مند خاتون تھی، اس سے برداشت نہ ہوا، امان اللہ خان اسی ملکہ کا بیٹا تھا۔اس نے بھی باپ کی ان حرکات سے شدید خفت محسوس کی۔پھر باپ کی انگریز نوازی بھی اس کے لیے سخت اذیت کا باعث تھی۔سپہ سالار نادر خان اور محمود خان طرزی دونوں امان اللہ خان کے انتہائی مخلص اور ہم خیال ساتھی تھے۔ان سب نے مل کر انقلاب کا منصوبہ بنایا۔پہلی کوشش کے طور پر کابل میں جشن کے دوران حبیب اللہ خان پر گولیاں برسائی گئیں مگر حبیب اللہ خان کی جان بچ گئی اور تحقیقات شروع ہوئیں کہ حملہ آور کون تھے؟ کس کے ایما پر حملہ ہوا؟

اس موقع پر امیر کے وزیر مالیات نے پورے وثوق کے ساتھ کہا کہ اس کے ذمہ دار امان اللہ خان اور اس کے ساتھی ہیں تاہم اس وقت حبیب اللہ خان نے اس الزام پر زیادہ توجہ نہ دی۔

ادھر امان اللہ خان اپنی والدہ ملکہ علیا سے کہہ چکا تھا کہ وہ امیر کو ان رُسوا کن حرکتوں سے باز رکھنے کی کوشش کریں ورنہ امیر کا انجام خطرناک ہوگا۔حبیب اللہ خان کو جب ملکہ نے شدومد سے یہ باتیں

سمجھانے کی کوشش کی تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ خیال آیا کہ ماں یہ باتیں بیٹے کے اُکسانے پر ہی کہہ رہی ہے۔ پھر یہ بھی یاد آیا ہے کہ وزیرِ مالیات نے قاتلانہ حملے میں امان اللہ خان پر ہی شک ظاہر کیا ہے۔ آہستہ آہستہ حبیب اللہ خان کے شکوک یقین میں بدلتے گئے۔

حبیب اللہ خان کا قتل: فروری 1919ء میں جب وہ شکار کھیلنے جلال آباد کے نواح میں گیا تو یہ طے کر چکا تھا کہ تفریح سے فارغ ہونے کی قاتلانہ حملے کے سازشیوں پر اچانک گرفت کر کے انہیں تختہ دار پر چڑھا دے گا مگر انقلابی امیر کا ارادہ بھانپ چکے تھے۔ امیر حبیب اللہ کو معلوم نہیں تھا کہ خود اس کے محافظین میں انقلابی موجود ہیں۔ شکارگاہ میں حفاظتی دستہ سپہ سالار نادر خان کی کمان میں تھا جو خود صفِ اوّل کا انقلابی تھا۔ 20 فروری کی رات حبیب اللہ خان اپنے خیمے میں بے خبر سو رہا تھا کہ رات 12 بجے کسی نے خیمے میں گھس کر اس کے سر اور سینے پر گولیاں برسائیں۔ حکمرانِ وقت نے موقع پر ہی دم توڑ دیا۔ قاتل فوراً رات کی تاریکی میں غائب ہو گئے۔ فائرنگ کی خوفناک آواز کے بعد اندھیرے میں امیر کے دربان کی آواز گونجی: "امیر صاحب شہید ہو گئے ہیں۔"

اگلے ہی لمحے امیر کے سب سے قابل اعتماد ذاتی محافظ ولی خان اور ہاشم دوڑتے ہوئے آئے اور فائرنگ کر کے دربان کو قتل کر دیا۔ کچھ افسران دوڑتے ہوئے جلال آباد شہر پہنچے اور کابل فون کر کے امان اللہ خان کو یہ اطلاع دی۔ اس نے کہا: "فہمیدم" (سمجھ گیا ہوں) اور فون بند کر دیا۔

حبیب اللہ خان کے قتل کا راز کبھی کھل نہ سکا۔ یہ سوال باقی رہا کہ اسے قتل کرنے والے کون تھے مگر اتنے سخت پہرے میں شاہی خیمے تک پہنچ جانا اور فائرنگ کر کے صاف بچ نکلنا اس پہلو کو تقویت دیتا ہے کہ یہ حبیب اللہ خان کے اپنے لوگ تھے۔

حبیب اللہ خان کے قتل پر ایک تبصرہ: ظفر حسن ایبک جو حبیب اللہ خان کی موت کے وقت کابل میں تھے، اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> 'امیر حبیب اللہ خان نے مرنے سے ایک ہفتہ پہلے اپنے کو جمعے کے خطبے میں امیر المؤمنین اور خلیفۃ المسلمین کہلایا تھا۔ قبلہ مولانا (عبید اللہ سندھی) صاحب مرحوم کو اس کی اس حرکت سے بہت رنج ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ امیر خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کا منتظر تھا کہ اپنے کو خلیفہ اعلان کرے۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ عالمِ اسلام میں پھوٹ پڑے گی۔ اسی ہفتہ امیر نے انگریزوں سے اپنی غیر جانبداری کی قیمت وصول کرنے کے لیے پشاور خچریں بھیجی تھیں تاکہ غیر جانبدار رہ کر جو اس نے جنگ میں انگریزوں کو مدد دی تھی یعنی بالفاظِ دیگر خلافتِ عثمانیہ ترکیہ کے

مفاد اور جہاد کے اعلان کو پس پشت ڈال کر جو اس نے عالمِ اسلام کو نقصان پہنچایا تھا اس کا صلہ اور معاوضہ حاصل کرے۔ لیکن خدا کی شان دیکھیے، کہ نہ اس کو خلیفۃ المسلمین بننا نصیب ہوا اور نہ ہی اس کو عیش و عشرت پر خرچ کرنے کے لیے روپیہ ملا۔" (آپ بیتی، حصہ اوّل:138)

مآخذ و مراجع

- ...... تاریخ تجزیہ شاہنشاہی افغانستان، علامہ عبدالحی حبیبی
- ...... افغانستان در مسیر تاریخ، میر غلام محمد غبار
- ...... مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل، ڈاکٹر غلام مصطفی خان
- ...... اسیران مالٹا، مولانا محمد میاں
- ...... حاجی صاحب ترنگزئی، عزیز جاوید
- ...... آپ بیتی، ظفر حسن ایبک

اکیسواں باب

بارک زئی خاندان کا آخری حکمران

امان اللہ خان: حبیب اللہ خان کے قتل کے بعد اسی رات شکارگاہ ہی میں نئے حکمران کے انتخاب کے لیے اجلاس طلب ہوا۔ حبیب اللہ خان نے اپنے ہم خیال اور سادہ مزاج بیٹے عنایت اللہ خان کو ولی عہد نامزد کیا تھا مگر وہ ایک کمزور آدمی تھا اس لیے اکثر امراء نے اس کے چچا نصر اللہ خان کو جو نائب السلطنت کہلاتا تھا، حکمرانی کا حق دار قرار دے دیا۔ عنایت اللہ نے بھی مصلحتِ وقت کے تحت چچا کے حق میں تخت سے دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا۔

یہ سارے معاملات جلال آباد کی شکارگاہ میں طے پا رہے تھے کیونکہ اکثر شاہی ارکان جو کہ ہر سال موسم سرما جلال آباد میں گزارتے تھے وہیں موجود تھے البتہ حبیب اللہ خان کا چھوٹا بیٹا امان اللہ خان گورنر کی حیثیت سے کابل میں تھا۔ اس نے چچا کی حکمرانی قبول کرنے سے انکار کر دیا اور خود بادشاہت کا دعویٰ کر دیا۔ اسی طرح دونوں میں ٹکراؤ اور ملک میں ایک طویل خانہ جنگی کا زبردست خطرہ پیدا ہو گیا۔ کابل کے تمام عمائد و امراء اور ملک کے اکثر گورنر امان اللہ خان کے حامی تھے۔ اس موقع پر امان اللہ خان نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا اور فوج کی تنخواہوں میں خطیر اضافہ کر دیا۔ جلال آباد کی فوج کو یہ اطلاع ملی تو اس نے بھی امان اللہ خان کی حمایت شروع کر دی اور نصر اللہ خان کی بادشاہت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یوں امان اللہ خان کسی خونریزی کے بغیر پورے اُفغانستان کا حکمران بن گیا۔ چونکہ اُفغانستان میں ٹیلی فون آ چکا تھا اس لیے جلال آباد اور کابل کے درمیان فون پر اطلاعات آ جا رہی تھیں۔ حبیب اللہ خان کے قتل کے اگلے دن یہ سارے معاملات طے ہو گئے اور 20 فروری 1919ء کو امان اللہ خان تخت نشین ہو گیا۔

خودمختار اُفغانستان، آزادی کا اعلان: امان اللہ خان نے مسندِ اقتدار سنبھالتے ہی قومی غیرت اور خودداری کا ثبوت دیتے ہوئے غیر ملکی طاقتوں کی ماتحتی سے اُفغانستان کی آزادی کا اعلان کر دیا۔

اس نے تخت نشینی کی رسم کے بعد کابل میں تعینات برطانوی سفیر کو طلب کر کے اسے کہا:

''آج سے افغانستان آزاد و خودمختار ہے۔ اس کی اندرونی و بیرونی پالیسیوں میں کسی غیر ملکی طاقت کی نگرانی اور مداخلت ہرگز قابل قبول نہیں ہوگی۔ ہمارے اس فیصلے سے اپنی حکومت کو آگاہ کردو۔''

اس کے بعد امیر امان اللہ خان نے قوم کو اعتماد میں لیتے ہوئے عوام کے نام یہ پیغام جاری کیا:

''اے میری غیور قوم اور اے میرے دلیر ساتھیو! میں افغانستان کی آزادی کا اعلان کرتا ہوں۔ آج سے ہمارا ملک اپنے اندرونی اور بیرونی فیصلوں میں مکمل طور پر خود مختار ہے۔ آج سے افغانستان کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو دنیا کے دیگر آزاد ممالک کو حاصل ہیں۔''

امان اللہ خان کی جانب سے افغانستان کی آزادی اور خودمختاری کا اعلان بیسویں صدی عیسوی کا اہم واقعہ اور تاریخ افغانستان کا ایک نیا موڑ تھا۔

تین نسلوں سے برطانوی تسلط کے تحت زندگی گزارنے والے افغان عوام کے لیے یہ بہت بڑی خوشخبری تھی۔ شاہ شجاع سے حبیب اللہ خان تک کئی ضمیر فروش حکمرانوں کی بزدلانہ پالیسیوں نے افغانستان کو سیاسی غلامی کی جن زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا امان اللہ خان نے ایک ہی جھٹکے سے انہیں توڑ ڈالا۔

مولانا عبید اللہ سندھی کی رہائی: سابق حکمران حبیب اللہ خان نے مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے رفقاء کو انگریزوں کی خوشنودی کے لیے قید کر رکھا تھا۔ امان اللہ خان کے برسراقتدار آتے ہی انہیں رہائی مل گئی۔ انہی دنوں امان اللہ خان نے یہ حکم بھی جاری کیا کہ غیر ملکی لوگ اپنے اپنے ملکوں کو واپس چلے جائیں ورنہ گرفتار کر لیے جائیں گے۔ چنانچہ مولانا عبید اللہ سندھی جو رہائی پا کر کابل سے جلال آباد آچکے تھے، ہندوستان کے آزاد قبائلی علاقوں کی طرف روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔ امان اللہ خان کو اس کی بھنک پڑ گئی، اس نے فوراً کارندے دوڑا دیے کہ مولانا کو بہر صورت کابل لایا جائے۔ دراصل امان اللہ خان مولانا سندھی سے بے حد متاثر اور ان کی دینی و سیاسی خدمات کا معترف تھا۔

مولانا سندھی جب پہلی بار کابل آئے تھے تو سردار محمود خان طرزی کے ہاں دعوت میں انہیں امان اللہ خان سے ملاقات اور گفت و شنید کا موقع ملا تھا۔ مولانا عبید اللہ سندھی جانتے تھے کہ ولی عہد سلطنت شہزادہ عنایت اللہ ہے مگر وہ امان اللہ خان کی صلاحیتوں کو ایک ہی نظر میں بھانپ گئے تھے۔ ان کا تجربہ کہہ رہا تھا کہ افغانستان کے تخت کا اگلا وارث یہی شہزادہ ہوگا۔ چنانچہ اس مجلس میں اور اس کے بعد ہر ملاقات میں وہ امان اللہ خان کو ایسے الفاظ سے مخاطب کرتے رہے جن سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ امان اللہ خان کو ولی عہد

سلطنت تصور کرتے ہیں۔ مولانا سندھی کے اس طرز تخاطب سے امان اللہ خان کا طبعی طور پر خوش ہونا فطری بات تھی چنانچہ پہلی ملاقات ہی سے اس کے دل میں مولانا کی شخصیت کا ایک دلربا نقش جم گیا۔

مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ میں نے پہلی ملاقات میں امان اللہ خان سے کہا تھا:

"من بجز شما کسے را لائق نمی دانم کہ والی اَفغانستان باشد"

"میں آپ کے سوا کسی کو اَفغانستان کی حکمرانی کا اہل نہیں سمجھتا۔"

یہ بات امان اللہ خان کو خوب یاد رہی، اب حکمران بنتے ہی اس نے مولانا کو تلاش کروایا۔ انہیں جلال آباد سے کار میں بٹھا کر عزت و احترام سے امان اللہ خان کے دربار میں لایا گیا۔ امان اللہ خان بڑی گرم جوشی سے ملا اور ان کی قلندرانہ پیش گوئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"من ہمو ہستم" (میں وہی ہوں جسے آپ ولی عہد کہا کرتے تھے)

مولانا سندھی کو وزارتِ عظمیٰ کی پیش کش: امیر امان اللہ خان مولانا سندھی سے اس قدر متاثر تھا کہ اس نے بڑے بڑے اَفغان امراء اور عمائد پر مولانا سندھی کو ترجیح دیتے ہوئے انہیں وزارتِ عظمیٰ کا منصب پیش کیا۔ یہ ایک قسم کی بادشاہت تھی کیونکہ ملک کا سارا انتظام اور تمام محکموں کی دیکھ بھال وزیر اعظم ہی کیا کرتا تھا۔ مگر اس مردِ درویش نے ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر صرف ایک اِسلامی ملک کی مصلحتوں کو دیکھا اور جواب دیا:

"میں کسی منصب یا عہدے کو قبول نہیں کر سکتا، کیونکہ اگر میں وزیر اعظم بن جاؤں تو سردارانِ اَفغانستان میں ناراضی پھیل جائے گی۔ یہ عہدہ کسی اَفغان کو دیا جائے۔ جو مصلحت اور خیر خواہی استقلالِ اَفغانستان کے لیے ہوگی اسے آپ کی خدمت میں عرض کرتا رہوں گا اور وزیر اعظم کو بھی مشورے دیتا رہوں گا۔"

امان اللہ خان اس پُرحکمت جواب سے بے حد مسرور ہوا۔ اس کے بعد مولانا جب تک اَفغانستان میں رہے امیر ہر اہم معاملے میں ان سے مشورہ لیتا رہا۔

باپ کے قتل کی تحقیقات: امان اللہ خان نے تاج و تخت سنبھالتے ہی امراء کو مطمئن کرنے کے لیے اپنے باپ سابق حکمران حبیب اللہ خان کے قتل کی تحقیقات شروع کرا دی تھیں۔ جلال آباد میں حبیب اللہ خان کے قتل کے بعد نصر اللہ خان اور عنایت اللہ خان دونوں کو حراست میں لے لیا گیا تھا۔ اَفغان افواج کے سپہ سالارِ اعلیٰ سردار نادر خان کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔

امان اللہ خان اپنے چچا نصر اللہ خان پر یہ الزام لگا رہا تھا کہ اس نے تخت پر قبضہ کرنے کے لیے امیر

حبیب اللہ خان کو قتل کیا ہے۔ جبکہ عام سپاہی اور افسران سردار نادر خان کو واردات کا اصل ذمہ دار قرار دے رہے تھے۔ سردار محمود خان طرزی کو بھی اس میں شامل سمجھا جارہا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو حبیب اللہ خان کی انگریز نوازی سے بے حد نالاں تھے اور افغانوں کی غیرت وخودداری کے تحفظ کے لیے امیر حبیب اللہ خان سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔

رضا علی شاہ کو پھانسی: قتل کے کیس کی تحقیقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ میجر سید رضا علی شاہ کو اصل مجرم قرار دیا گیا، یہ شخص حبیب اللہ خان کے قتل کی رات پہرے داروں کا آفیسر تھا۔ عدالت نے اسے سزائے موت سنائی اور اسے پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ یوں امان اللہ خان نے بظاہر قوم سے کیا ہوا یہ وعدہ پورا کر دکھایا کہ وہ باپ کے قاتلوں کو تختہ دار تک پہنچا کر دم لے گا۔ یہ اقدام شاید عوام کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہوسکتا تھا مگر خواص کے حلقے یہ سمجھتے تھے کہ اگر عدالتی کارروائی شفاف ہوتی تو سپہ سالار نادر خان اور خود امان اللہ خان بھی کٹہرے میں کھڑے ہوتے۔ عوامی حلقوں میں سب سے زیادہ شک خود امان اللہ خان پر ظاہر کیا جارہا تھا۔ بہر کیف رضا علی شاہ کو سزائے موت ملنے کا مطلب یہ تھا کہ باقی لوگ بے گناہ ہیں۔ چنانچہ الزامِ قتل میں گرفتار کیے گئے عمائد وشاہی ارکان عنایت اللہ خان اور سپہ سالار نادر خان کچھ دنوں بعد رہا ہوگئے۔ نصر اللہ خان بدستور قید رہا۔

مولانا سندھی کا حکیمانہ مشورہ: امان اللہ خان کی جانب سے افغانستان کی خودمختاری کا اعلان برطانیہ کے لیے ناقابل برداشت تھا مگر ان دنوں حکومتِ برطانیہ ہندوستان میں تحریکِ آزادی کے نئے ولولے سے پریشان تھی اس لیے وہ فوری طور پر کوئی اقدام نہ کرسکی۔ تاہم یہ امر یقینی تھا کہ افغانوں اور انگریزوں کے ٹکراؤ کا لمحہ تیزی سے قریب آرہا ہے۔ راکھ میں دبی چنگاریاں سلگنے لگی تھیں اور کسی بھی لمحے جنگ کے شعلے بھڑک سکتے تھے۔

اس حقیقت کے پیش نظر امان اللہ خان نے اپنے حکام، علماء اور امرائے لشکر سے مشورہ کیا اور برطانیہ سے جنگ کرنے یا نہ کرنے کے مسئلے پر غور کیا۔ مولانا عبید اللہ سندھی کی رائے یہ تھی کہ جنگ سے پہلے ہندوستانی عوام کا تعاون حاصل کیا جائے اور انہیں اندرونِ خانہ بغاوت پر اُبھارا جائے۔ اگر اس طرح انگریز ہندوستان سے نکلنے پر مجبور ہوگئے تو حضرت شیخ الہند کی ترتیب کے مطابق ہندوستان کے جلاوطن مجاہدین آزادی واپس آکر ہندوستان کی حکومت سنبھال لیں اور حکومت افغانستان اس میں بھرپور تعاون کرے۔

بہر صورت مشاورت میں سب امراء اور علماء نے برطانیہ سے جنگ ہی کو ترجیح دی، اس کے باوجود کسی حتمی فیصلے سے پہلے امان اللہ خان نے مولانا عبید اللہ سندھی کو تنہائی میں طلب کر کے ان کی رائے معلوم کی۔

مولانا نے فرمایا:

''اَفغانستان کو انگریزوں سے جنگ تو کرنی چاہیے مگر اعلانِ جنگ نہ کیا جائے۔ سرحدوں پر لشکر جمع کر لیا جائے اور انگریزوں کی جانب سے ابتدا کا انتظار کیا جائے۔ جب انگریزوں کی جانب سے توپ گولہ باری شروع کر دے تو اس وقت ساری دنیا میں یہ اعلان کر دیا جائے کہ انگریزوں نے ہم پر حملہ کیا ہے۔''

مولانا سندھی کا مقصد یہ تھا کہ جنگ میں صرف قوت اور عسکری تدبیروں پر بھروسہ نہ کیا جائے بلکہ سیاست حاضرہ کے پیشِ نظر عالمی رائے عامہ کو اپنے حق میں کرنے کا پہلے سے بندوبست کیا جائے۔ جب دنیا یہ محسوس کرے گی کہ اَفغان اپنا دفاع کر رہے ہیں اور برطانیہ جارحیت کا مرتکب ہوا ہے تو لازماً اس سے اَفغانستان کا وقار بلند اور برطانیہ کا مورال پست ہوگا۔ مولانا کے اس حکیمانہ مشورے سے امان اللہ خان کھل اُٹھا۔

قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند کے یہ بوریا نشین علماء کس پائے کے سیاست دان اور کس درجے کے عسکری ماہر تھے کہ شاہانِ وقت کی سیاست انہیں قدم قدم پر خراجِ تحسین پیش کرتی تھی۔

جنگ کے شعلے، اہلِ ہند کے نام پیغام: بہر صورت جنگ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے راتوں رات کابل کے ایک پریس سے اُردو اور انگریزی میں ایک پمفلٹ چھپوا کر اسے ہندوستان روانہ کر دیا۔ اس پمفلٹ میں برصغیر کے باشندوں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ انگریزوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں، انہیں افراد اور روپے پیسے کی امداد فراہم نہ کریں اور ان کا مواصلاتی نظام اور ذرائع آمدورفت تباہ کر کے اس جنگ میں آزادی کے ان رہنماؤں کے دست و بازو بنیں جو عسکری طاقت کے ساتھ انہیں برطانیہ سے نجات دلانے آ رہے ہیں۔ مولانا سندھی کے دو قابل اعتماد کارکن یہ پیغام لے کر ہندوستان روانہ ہو گئے۔

مولانا سندھی اور امیر کابل کے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ پہلے یہ پیغام ہندوستانی عوام تک پہنچنے کی تصدیق اور اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ مقامی لوگ انگریز فوج میں شامل ہو کر اَفغانوں سے نبرد آزما نہیں ہوں گے۔ اس کے بعد انگریزوں سے جنگ شروع کی جائے۔ (تاہم منصوبے پر اس طرح عمل نہیں ہو سکا اور اس سے پہلے ہی جنگ چھڑ گئی۔ اگر سارا کام منصوبے کے مطابق ہوتا تو ہندوستان کی کایا پلٹ سکتی تھی۔)

تین محاذ: امان اللہ خان نے جنگ کے لیے تین محاذوں کا انتخاب کیا، سرکاری افواج کا کمانڈر ان چیف محمد صالح خان فوج کے بہترین حصے اور جدید توپخانے کے ساتھ جلال آباد سے درۂ خیبر کی جانب بڑھا تا کہ لنڈی کوتل سے ہو کر پشاور چھاؤنی پر حملہ کیا جائے، یہ پہلا محاذ تھا...... دوسرا محاذ وزیرستان کا تھا جہاں

سردار شاہ ولی خان اور سردار شاہ محمود خان اپنے بڑے بھائی سالار نادر خان کے ہمراہ تعینات تھے۔ ان تینوں کے پاس تین الگ الگ فوجیں تھیں۔ تیسرا محاذ کوئٹہ کا تھا۔ عبدالقدوس خان صدر اعظم ایک لشکر کے ساتھ قندھار سے کوئٹہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تینوں محاذوں کے کمانڈروں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنے اپنے مقام پر پہنچ کر خاموشی سے پڑاؤ ڈال دیں اور جب تک کابل سے حکم نہ آئے، حملہ نہ کریں۔

بڑی کمزوری: یہاں اُفغان فوج کی ایک بڑی کمزوری کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ کہ یہ تینوں محاذ جو کہ ایک دوسرے سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر تھے اور پھر مرکز یعنی کابل سے ان کا فاصلہ اور بھی زیادہ تھا، کوئی مضبوط مواصلاتی نظام نہیں رکھتے تھے۔ حالانکہ اتنے وسیع محاذ پر مواصلاتی نظام کا سریع اور پائیدار ہونا بے حد ضروری تھا۔ اس کمزوری کا اثر یہ ہوا کہ عملاً تینوں محاذوں کے کمانڈر الگ الگ تھے، مرکز سے بھی ان کا کوئی رابطہ نہ تھا۔ ہر کمانڈر اپنے فیصلے خود کر رہا تھا۔ ادھر انگریز اپنی پیشہ ورانہ تنظیم اور جدید سامانِ حرب کے ساتھ اُفغان افواج کے مقابلے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اُفغانستان سے جنگ کے لیے فضائی قوت بھی لے آئے تھے۔

محمد صالح خان کی شکست: سب سے اہم محاذ لنڈی کوتل کا تھا۔ یہاں محمد صالح خان چار ہزار سپاہ اور آٹھ توپوں کے ساتھ موجود تھا۔ مرکز سے رابطہ کمزور ہونے کی وجہ سے اس نے ایک سنگین غلطی کر ڈالی۔

9 مئی 1919ء کو وہ لنڈی کوتل سے آگے بڑھ کر ان حدود میں داخل ہو گیا جو انگریزوں اور اُفغانوں کے درمیان متنازعہ تھیں۔ یہاں اس نے طورخم کے ایک علاقے ''عیش خیل'' پر (جو کسی چشمے کے پاس آباد تھا) قبضہ کر کے گویا از خود جنگ میں پہل کر دی۔ یہ اقدام مولانا سندھی کے مشورے اور امیر امان اللہ خان کے حکم کے خلاف ہوا تھا۔ انگریز اس دن اپنی فضائیہ مقابلے میں لے آئے، ان کے جنگی طیارے نے محمد صالح خان کی فوج پر اندھا دھند بمباری کی...... محمد صالح خان زخمی ہوا اور فوراً محاذِ جنگ سے ''ڈکہ'' کی طرف فرار ہو گیا۔ فوج بھی قیادت سے محروم ہو کر پسپا اور منتشر ہو گئی۔ انگریزی پلٹن محمد صالح خان کا تعاقب کرتے ہوئے ڈکہ پر قابض ہو گئی۔

جلال آباد میں لاقانونیت: کابل میں امیر امان اللہ خان کو محمد صالح خان کی شکست کے ساتھ ساتھ یہ اطلاع بھی ملی کہ جلال آباد میں تختِ کابل اُلٹنے کی افواہ پھیل گئی ہے اور اوباش لوگ سرکاری رعب و دبدبے سے آزاد ہو کر لوٹ مار کر رہے ہیں۔ یہ ایسا نازک وقت تھا کہ انگریزی افواج اگر پیش قدمی جاری رکھتیں تو بڑی آسانی سے جلال آباد پر بھی قبضہ کر سکتی تھیں مگر خوش قسمتی سے ابھی تک وہ جلال آباد کی بدامنی سے لاعلم تھیں۔ دوسری طرف امیر امان اللہ خان نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے سپہ سالار نادر خان کو حکم

دیا کہ وہ فوراً وزیرستان سے ہندوستانی سرحد پر حملہ کردے تاکہ انگریز اُدھر متوجہ ہو کر جلال آباد کی طرف بڑھنے سے باز رہیں۔ سپہ سالار نادر خان سرحد کی طرف روانہ ہونے لگا تو مولانا عبیداللہ سندھی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ان کے ایک ساتھی کو بھی ساتھ لیتے جائیں۔ چنانچہ نادر خان نے ظفر ایبک کو معیت کے لیے چن لیا۔ فوج میں ظفر ایبک کی موجودگی افغانوں کے لیے بے حد مفید ثابت ہوئی۔

ٹھل پر حملے کی وجہ: سالار نادر خان اپنی فوج کے ساتھ سرحد کی طرف روانہ ہوا اور ایک ایسے مقام پر جا کر رُکا جہاں سے میران شاہ اور ٹھل کی انگریزی چھاؤنیاں ایک دن کی مسافت پر واقع تھیں۔ نادر خان کے سامنے اب یہ مسئلہ تھا کہ میران شاہ پر حملہ کیا جائے یا ٹھل پر۔ آخر اس نے طے کیا کہ حملہ ٹھل پر کیا جائے جو جنگی لحاظ سے زیادہ اہم ہے۔ دراصل میران شاہ پر قبضہ جارحانہ لحاظ سے مدد فراہم کرتا تھا جبکہ ٹھل سے انگریزوں کو ہٹانا اپنی مدافعت کے لیے ضروری تھا۔

اصل صورتِ حال یہ تھی کہ میران شاہ پر قبضہ کرنے سے بنوں کا راستہ افغانوں کے قبضے میں آجاتا اور یوں وہ آسانی سے پنجاب میں داخل ہو سکتے تھے مگر اس طرح ان کا اپنا دفاع کمزور پڑ جاتا کیونکہ اس صورت میں کوہاٹ کی انگریز فوج کو "ٹھل" اور "کرم" کے راستے "پیواڑ" تک رسائی کا موقع مل جاتا۔ پیواڑ کے بلند پہاڑ سے کابل صرف تین دن کے فاصلے پر تھا۔ لہٰذا دارالحکومت کو بچانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ پیواڑ افغانوں کی مکمل گرفت میں رہے اور اس کے لیے "ٹھل" پر قبضہ ناگزیر تھا۔ "ٹھل" افغانوں کے ہاتھ آجاتا تو کوہاٹ کی انگریزی فوج کا اس طرف بڑھنا ممکن نہ رہتا۔ اس سوچ کے پیش نظر سپہ سالار نے ٹھل پر حملے کو زیادہ اہمیت دی۔

جنگی چال: تاہم اس کے ساتھ ساتھ جنگی چال کے طور پر یہ بھی طے ہوا کہ انگریزوں کو دھوکا دیا جائے گا، انہیں یہ تاثر دیا جائے گا کہ افغان فوج میران شاہ چھاؤنی پر حملہ کر رہی ہے۔ اس حکمت عملی کے تحت کرنل عبدالقیوم کو میران شاہ روانہ کر دیا گیا۔ اس کی زبردست گولہ باری سے میران شاہ کے انگریز سپاہیوں میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ چوکیوں سے بھاگ کر قلعے میں روپوش ہو گئے۔

نازک لمحات: ادھر نادر خان نے فوج کے بڑے حصے کے ساتھ ٹھل کی طرف کوچ کیا مگر راستے میں اسے اطلاع ملی کہ میران شاہ پر حملہ کرنے والی مختصر سی فوج انگریزوں کی جوابی گولہ باری کے باعث پسپا ہونے والی ہے، توپ خانہ تباہ ہو گیا ہے اور توپچی زخمی ہو چکے ہیں۔ ابھی نادر خان اس پریشان کن خبر سے سنبھلنے نہ پایا تھا کہ خبر ملی انگریز گھڑسوار دریائے کرم عبور کر کے میران شاہ کے محاذ پر لڑنے والی فوج کو گھیرنے کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں۔ سپہ سالار کے ساتھ اس وقت گنتی کے چند افراد تھے، اصل فوج

تقریباً تین گھنٹے کی مسافت پر پیچھے چلی آ رہی تھی، سپہ سالار کی پریشانی دیکھ کر ظفر ایبک اور دو افغان سپاہیوں نے انگریز گھڑسواروں کا راستہ روکنے کے لیے دریائے کرم کی طرف دوڑ لگا دی۔ بلند چوٹیوں پر چڑھ کر انہوں نے دیکھا کہ انگریزی رسالہ کسی نامعلوم خدشے کے تحت راستے میں رک گیا ہے۔

ظفر ایبک کے بقول ''اگر اس وقت انگریز سوار ذرا جرأت سے کام لے کر آگے بڑھ آتے تو سردار سپہ سالار صاحب اور ان کے ساتھ سارے سپاہیوں کو قید کر سکتے تھے۔''

جرمن توپ کی گولہ باری: اسی دن شام کو افغان فوج کا بڑا حصہ محاذ جنگ پر پہنچ گیا۔ اب سالار نادر خان نے جرمنی سے درآمد کی گئی واحد جدید توپ کو ایک بلند مقام پر نصب کرا کے ٹھل کے قلعے پر گولہ باری شروع کی۔ اسلحہ خانے میں اس توپ کے صرف سات گولے تھے، نیز توپچی اس کی ٹیکنالوجی سے ناواقف تھے اس لیے پہلے دو گولے ہدف سے بہت دور گرے۔ تب ظفر ایبک نے توپ سے متعلقہ گائیڈ بک کا مطالعہ کیا اور دوربین کی مدد سے فاصلے کا صحیح اندازہ کر کے توپ کا زاویہ درست کروایا۔ اس کے بعد گولہ باری شروع ہوئی تو پہلا گولہ قلعے کے وسط میں جہاں اسلحے کا گودام تھا، جا کر پھٹا۔ گولہ بارود کو آگ لگنے سے سیاہ دھوئیں کے بادل آسمان تک بلند ہونے لگے۔ قلعے میں محصور انگریز سپاہی جلتی ہوئی عمارت سے باہر نکلے اور میدان میں خیمے لگانے لگے۔ افغان فوج کا اگلا گولہ بھی صحیح نشانے پر ان خیموں کے درمیان جا کر لگا۔ یہ دیکھ کر انگریز کمانڈر نے امن کا سفید جھنڈا بلند کر دیا، یہ ہتھیار ڈالنے کا اعلان تھا۔

جھڑپوں کا سلسلہ: اب مجاہدین کی ہمت بلند ہوگئی مگر جب وہ قلعے پر قبضے کے لیے جا رہے تھے، انگریزوں نے گولہ باری شروع کر دی۔ افغانوں کی جرمن توپ ایک بار پھر گرجی اور انگریز میدان سے فرار ہونے لگے۔

اسی دوران مجاہدین نے ٹھل شہر کے نواح میں انگریزوں کی کئی چوکیوں پر قبضہ کر لیا۔ چند دنوں تک انگریزوں اور افغانوں میں یہ جھڑپیں جاری رہیں۔ انگریز ایک بار پھر قلعے میں محصور ہو گئے تھے۔

اگرچہ افغانوں کا پلہ بھاری تھا مگر انگریزوں کو کمک کی بھرپور امید تھی۔ آخر جلیانوالہ باغ میں قتل عام کا مرتکب، بدبخت جنرل ڈائر امدادی فوج لے کر پہنچ گیا اور انگریزوں نے دوبارہ قدم جما لیے۔

اس جنگ میں اگرچہ فتح وشکست کا واضح فیصلہ ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا مگر اتنے لاؤ لشکر کے باوجود انگریزوں کا افغانستان میں بزورِ طاقت داخل نہ ہو سکنا ان کی ناکامی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ نادر خان کی ہوشیاری کی وجہ سے انگریز پیواڑ تک پہنچنے سے عاجز تھے، یوں کابل کا راستہ بالکل محفوظ تھا۔

عالمی رائے عامہ برطانیہ کے خلاف: اس کے علاوہ انگریزوں پر بیرونی دنیا کی جانب سے بڑھنا

شروع ہو گیا تھا۔ جنگ شروع ہوتے ہی افغان حکومت نے وائرلیس کے ذریعے روس، ایران، جاپان، فرانس اور اٹلی جیسے اہم ممالک میں اطلاع بھیج دی کہ انگریزوں نے کسی اعلان کے بغیر افغانستان پر حملہ کر دیا ہے جس کے دفاع میں افغان ہتھیار اُٹھانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ادھر وائسرائے ہند نے لندن میں اس کے برعکس رپورٹ دی تھی کہ افغانوں نے حملے میں پہل کی ہے۔ بہرصورت برطانیہ کے اتحادی اس بات پر ناراض تھے کہ جنگِ عظیم کے زخم مندمل ہونے سے پہلے ہی انہیں اعتماد میں لیے بغیر ایک نئی جنگ کیوں شروع کر دی گئی؟

جنوبی سرحدی قلعے پر برطانیہ کا قبضہ: جنوبی افغانستان کے محاذ پر انگریز فوج کا انداز جارحانہ تھا۔ 26 مئی 1919ء کو انگریز کمانڈر جنرل ہارڈی نے افغان سرحد عبور کر کے ایک قلعے پر حملہ کر دیا۔ قلعے کی محافظ افغان فوج تعداد میں کم تھی مگر جان ہتھیلی پر رکھ کر مقابلے میں ڈٹ گئی۔ سات گھنٹے تک خونریز لڑائی ہوتی رہی۔ آخر کار انگریزی توپوں نے قلعے کی دیوار میں شگاف ڈال دیے، برطانوی سپاہی قلعے میں داخل ہو گئے اور دست بدست جنگ کے بعد قلعے پر قبضہ کر لیا۔ جنگ کے اختتام پر قلعے کے 300 سپاہیوں میں سے ڈیڑھ سو شہید اور ڈیڑھ سو زخمی حالت میں گرفتار ہو چکے تھے۔

عبدالقدوس خان کی آمد: سرحدی قلعے پر برطانوی افواج کے اچانک قبضے نے جنوبی افغانستان میں تشویش کی ایک لہر دوڑا دی۔ امان اللہ خان کی جانب سے اس محاذ کے لیے ترتیب دیا گیا لشکر جو کوئٹہ تک پیش قدمی کرنا چاہتا تھا صدر اعظم عبدالقدوس خان کی سرکردگی میں کابل سے قندھار آ رہا تھا مگر یہ لشکر بروقت نہ پہنچ سکا جس کے سبب انگریزوں کے لیے جنوبی سرحدیں لقمہ تر ثابت ہوئیں۔ بہرکیف چند دنوں بعد عبدالقدوس خان قندھار پہنچ گیا جہاں عوام کا جوش وخروش عروج پر تھا۔ عوام کو مطمئن کر کے عبدالقدوس خان سر پر کفن باندھے اپنی افواج کے ساتھ سرحد کی طرف بڑھا۔ سرکاری افواج کے علاوہ قبائلی مجاہدین ہزاروں کی تعداد میں اس کے ساتھ ملتے چلے گئے۔

شیعہ سنی فسادات کی سازش: انگریز کمانڈروں کو یہ خبر ملی تو انہیں محسوس ہوا کہ سرحدی قلعے پر قبضہ کر کے انہوں نے غلطی کی ہے۔ اب انہیں جان بچا کر نکلنا بھی مشکل معلوم ہونے لگا۔ اس موقع پر انہوں نے افغانوں میں پھوٹ ڈال کر ان کی قوت کو منتشر کرنے کی کوشش کی اور اس مذموم مقصد کے لیے ایک عجیب چال چلی۔

انہوں نے اپنے کارندوں کے ذریعے علاقے کے ایک سنی حنفی نوجوان کو قتل کرا دیا اور اس کی لاش قزلباش قبیلے کی ایک سرائے میں چھپا دی۔ قزلباشوں میں اکثریت شیعہ تھی۔ انگریزوں کے ایجنٹوں

نے راتوں رات یہ افواہ پھیلا دی کہ قزلباشوں نے شیعہ سنی منافرت کی بنا پر اس نوجوان کو قتل کیا ہے۔
اس خبر سے قندھار شہر میں یکدم نفرت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ شیعہ اور سنی ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے اور چند افراد موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ برطانوی جاسوسوں نے مجاہدین کے اس لشکر میں جو عبدالقدوس خان کے ساتھ سرحدوں کی طرف آرہا تھا، یہ مشہور کیا کہ قندھار میں خانہ جنگی سے ہزاروں مارے گئے ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ اس طرح مجاہدین اپنے اہل وعیال کے لیے فکرمند ہوکر قندھار واپس لوٹ جائیں گے مگر اس موقع پر افغانوں نے بڑی سمجھ داری کا ثبوت دیا۔ ایک طرف قندھار کے باشندوں نے بہت جلد دشمن کی چال کو سمجھ لیا اور گفت وشنید کے ذریعے معاملے کو ٹھنڈا کردیا۔ دوسری جانب لشکر میں شامل مجاہدین بھی اپنے رخ پر رواں دواں رہے اور طبعی پریشانی کے باوجود راہ جہاد سے نہ پھرے۔ پھر انہیں جلد ہی یہ بھی معلوم ہوگیا کہ قندھار میں حالات اتنے خراب نہیں تھے اور اب سب کچھ معمول کے مطابق ہے۔
سرحد کے پار: افغان لشکر کی پیش قدمی جاری دیکھ کر انگریزوں نے واپسی ہی میں عافیت سمجھی اور اس سے قبل کہ لشکر وہاں پہنچتا، وہ سرحدی مقبوضات خالی کرکے بلوچستان کی طرف روانہ ہوگئے۔ تاہم عبدالقدوس خان نے ان کا تعاقب کیا اور ان کے پیچھے پیچھے سرحد عبور کرلی۔ برطانوی فوج ''چمن'' پہنچ کر مورچوں اور خاردار تاروں کی پناہ میں چلی گئی۔ عبدالقدوس خان نے طے شدہ سرحد ڈیورنڈ لائن سے نصف میل آگے آکر ''بغرہ'' نامی گاؤں میں پڑاؤ ڈالا اور پانی کے ذخائر پر قبضہ کرلیا۔ انگریزوں کو اب خطرہ محسوس ہورہا تھا کہ لشکر افغان آگے بڑھتا ہوا کوئٹہ تک نہ پہنچ جائے۔
جنگ بندی کا اعلان: برطانیہ کی افسوس ناک جارحیت اور پھر شرمناک پسپائی سے ساری دنیا میں ایک ہلچل مچ چکی تھی۔ افغان عوام بے مثال اتحاد کا مظاہرہ کرکے دشمن کا حوصلہ پست کررہے تھے۔ ان دنوں کابل میں شارع عام پر ایک تاریخی احتجاجی مظاہرہ بھی ہوا جس میں عوام اور طلبہ نے بھرپور شرکت کی۔ جلوس میں ''زندہ باد افغانستان'' اور ''مردہ باد انگریز'' کے نعرے لگائے گئے جو ساری دنیا نے سنے۔ برطانیہ اور اس کے اتحادی یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ جنگ کے طول پکڑنے کی صورت میں ان کے نقصانات کا امکان زیادہ ہے۔ چنانچہ برطانیہ نے مذاکرات کی میز پر آنا پسند کیا۔ مذاکرات سے قبل 3 جون 1919ء کو دونوں فریقوں نے جنگ بندی کا اعلان کردیا۔
برطانیہ نے مذاکرات سے قبل یہ حامی بھی بھرلی تھی کہ وہ افغانستان کو خودمختار ملک تسلیم کرلے گا۔ آخر افواج کی واپسی کا آغاز ہوا۔ برطانیہ حتمی مذاکرات سے پہلے ''پیواڑ'' سے افغان فوج کا انخلا چاہتا تھا

تاہم سردار نادر خان نے اس اہم جنگی درّے کو خالی نہ کیا۔ خدشہ تھا کہ انگریز فوج بدعہدی کر کے اس مقام سے کسی بھی وقت کابل پر حملہ کر سکتی ہے۔

معاہدہ راولپنڈی: امان اللہ خان نے اس موقع پر انگریزوں کے سفارتی دباؤ اور چالوں کا اچھی طرح مقابلہ کیا۔ اس کامیابی میں اس کے ذہین اور محبان وطن امراء اور مشیروں خصوصاً نادر خان، محمود طرزی، مولانا عبیداللہ سندھی اور ظفر حسن ایبک کا بڑا ہاتھ تھا۔ آخر کار مکاتبت اور مذاکرات کے کئی ادوار کے بعد 8 اگست 1919ء کو راولپنڈی میں برطانیہ اور اَفغانستان کے درمیان ایک حتمی معاہدہ طے پا گیا۔ جس کے مطابق اَفغانستان ایک آزاد و خودمختار ملک قرار پایا۔ سرحدی قبائل کے باشندوں کے حقوق کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا۔ آزادیٔ اَفغانستان کے خلاف دیگر طاقتوں سے کوئی معاہدہ نہ کرنے کی ضمانت دی گئی نیز اس معاہدے کے ذریعے گزشتہ ادوار کے اکثر معاہدے منسوخ ہو گئے تاہم کچھ معاہدے باقی بھی رہے جیسے سرحدوں کی تعیین کے لیے ڈیورنڈ لائن کا معاہدہ۔ نیز معاہدے کی کچھ شقیں اَفغانوں کے مفاد کے خلاف بھی تھیں جیسا کہ اَفغان ٹرانزٹ براستہ بحیرۂ عرب پر برطانیہ کا یہ اختیار باقی رہا کہ وہ اس میں عسکری وسائل کی درآمد و برآمد پر پابندی لگا سکتا ہے۔

اَفغانستان کی شاندار فتح: معاہدہ راولپنڈی درحقیقت اَفغانستان کی شاندار فتح اور برطانیہ کی کھلی شکست کے مترادف تھا۔ کسی کو یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ جنگ عظیم کا فاتح برطانیہ جو لڑائی سے پہلے اَفغانستان کو مکمل طور پر مقہور و مغلوب کرنے پر تلا ہوا تھا، اس طرح دب کر صلح پر آمادہ ہوگا۔ ترکی اور جرمنی کو عسکری طاقت، خفیہ سازشوں اور مذاکرات کے پھندوں کے ذریعے بے بس کرنے والے برطانیہ کا اَفغانستان کے ساتھ برابری کی سطح پر مذاکرات کرنا ہی اس کی نفسیاتی شکست کا برملا ثبوت تھا۔

مئی 1919ء کی اس جنگ سے اَفغان دنیا میں ایک مضبوط آزاد و خودمختار قوم کے طور پر نمایاں ہوئے۔ برطانیہ نے اس کے بعد دنیا کے دیگر ممالک پر ترک و تاز جاری رکھی مگر اَفغانستان کے بارے میں اس نے طاقت کے استعمال کے نقصانات کو اچھی طرح سمجھ لیا۔ 82 سال تک برطانیہ اسی پالیسی پر کاربند رہا۔ تاہم 11 ستمبر 2001ء کے بعد اس نے سابقہ تجربات کو نظر انداز کرتے ہوئے امریکا کے شانہ بشانہ ایک بار پھر اَفغانستان میں عسکری مداخلت کی جس کے عواقب برسہا برس کی مسلسل جنگ کے باوجود مکمل ناکامی کی صورت میں اس کے سامنے آچکے ہیں۔

نصر اللہ خان کی نظر بندی: سردار نصر اللہ خان جو کہ سابق حکمران حبیب اللہ خان کے دور میں نائب السلطنت کے عہدے پر فائز تھا، امان اللہ خان کے دورِ حکمرانی میں نظر بندی کی زندگی گزارتا چلا آرہا

تھا۔ حبیب اللہ خان کے قتل کے الزام کے بہانے امان اللہ خان نے اسے مسلسل حراست میں رکھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ اس کی قائدانہ صلاحیتوں اور عوام میں اس کی بے پناہ مقبولیت سے خوفزدہ تھا۔ جب حبیب اللہ خان کے قتل کا مقدمہ نمٹ چکا اور میجر علی رضا کو پھانسی دینے کے ساتھ ساتھ عنایت اللہ خان اور سردار نادر خان کو بے قصور قرار دے کر رہا کر دیا گیا، تب نصر اللہ خان کو اُمید ہو چلی تھی کہ اسے بھی رہا کر دیا جائے گا مگر ایسا نہ ہوا۔ قید و بند کی یہ راتیں دراز ہوتی گئیں۔ آخر کار نصر اللہ خان نے عاجز آ کر امان اللہ خان سے درخواست کی کہ اسے جلاوطن کر کے حجاز بھیج دیا جائے یا اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دے دی جائے۔ وہ عمر بھر گھر سے باہر قدم نہیں رکھے گا مگر امان اللہ خان نے اسے قبول نہیں کیا۔

کچھ عرصے بعد امان اللہ خان نے اسے اپنے محل میں رہائش دے دی اور زندگی کی تمام سہولیات مہیا کر دیں۔ اس کے بیوی بچوں کو یہ اجازت بھی دے دی کہ وہ روزانہ صبح سے شام تک کا وقت اس کے پاس گزار سکیں۔ حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے بعد آخر امان اللہ خان نے نصر اللہ خان کو مکمل آزادی دے کر گھر واپس بھیجنے کا بھی ارادہ کر لیا۔

نصر اللہ خان کی وفات: مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ افغانستان کے مختلف طبقات جو نصر اللہ خان کے مجاہدانہ کردار کے باعث اس سے عقیدت رکھتے تھے، اس غلط پروپیگنڈے کا شکار ہو گئے کہ اس مردِ میدان کو نظر بندی کے دوران تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ ایسی باتوں سے عوام میں اشتعال پھیل گیا اور امان اللہ خان کی حکومت کے خاتمے کے لیے کئی گروہ میدان میں اُتر آئے، اگرچہ ان میں سے کوئی بھی کامیاب نہ ہو سکا اور سرکاری مشینری نے ان پر قابو پا لیا مگر اس کا سب سے زیادہ نقصان نصر اللہ خان کو ہوا۔ امان اللہ خان نے اس کی رہائی کے بارے میں اپنا ارادہ بدل دیا اور اسے محل سے ایک خفیہ قید خانے میں منتقل کر دیا۔ کچھ مدت بعد نصر اللہ خان اسی کسمپرسی کے عالم میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یہ شب جمعہ 2 رمضان 1338ھ (21 مئی 1920ء) کا واقعہ ہے۔

امان اللہ خان کو جب یہ اطلاع ملی تو وہ پغمان میں تھا۔ وہ فوراً کابل پہنچا، چچا کی لاش کو دیکھ کر ایک ٹھنڈی آہ بھری اور رو پڑا۔ 20 ویں صدی کی سیاست افغانستان کا یہ اہم کردار اور امت کے لیے دردمند دل رکھنے والا یہ پکا مسلمان اسی رات ''قول چکان'' کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

امان اللہ خان کے عزائم: صلح نامہ راولپنڈی کے بعد افغانستان ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی صورت میں اُبھرا تھا۔ اب وقت تھا کہ اہلِ افغانستان اس حیثیت کو بہتر انداز میں استعمال کریں اور ترقی و فلاح کی راہ پر چل کر سابقہ شان و شوکت اور گم گشتہ عروج و اقبال حاصل کریں۔ امان اللہ خان اس

مقصد کے لیے کچھ زیادہ ہی پُر جوش تھا۔ وہ اَفغانستان کی تقدیر بدل دینا چاہتا تھا اور اس تباہ حال ملک کو کامیابی کی بلند ترین منازل تک لے جانے کا خواہش مند تھا مگر یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اَفغانستان کا یہ متحرک اور پُر عزم حکمران فکری کج روی کا شکار ہو جاتا ہے۔ تاریخ میں ایسے بہت سے حکمران دکھائی دیتے ہیں جن کا دورِ حکومت ابتداء میں شاندار کامیابیوں کا عکاس اور آخر میں حماقتوں، ناکامیوں اور شکستوں کا مرقع نظر آتا ہے۔ امان اللہ خان کو بھی ہم ایسے حکمرانوں میں شمار کر سکتے ہیں۔

برطانیہ سے جنگ آزادی میں کامیابی کے بعد اسے جو پذیرائی ملی، اس سے وہ خطرناک حد تک خود اعتمادی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ عوام اسے غازی کے لقب سے یاد کرنے لگے تھے اور وہ سمجھتا تھا کہ عوامی مقبولیت کے ان جذبات سے کام لے کر وہ ملک کو کسی بھی سمت میں لے جا سکتا ہے۔

امان اللہ خان اتاترک کے نقشِ قدم پر: ان دنوں ترکی میں خلافتِ عثمانیہ کے دن گنے جا چکے تھے اور مصطفیٰ کمال پاشا ترک مسلمانوں سے ان کے مذہبی وثقافتی اثاثے چھیننے پر تلا ہوا تھا۔ یونان کے خلاف مصطفیٰ کمال کی عسکری کامیابیوں نے اسے سادہ لوح مسلمانوں کا ہیرو بنا دیا۔ اسی لیے ترکی کو جدت کی راہ پر ڈالتے ہوئے اس کے اِسلام دشمن اقدامات کو نظریۂ ضرورت کے تحت سندِ جواز ملتی گئی۔ امان اللہ خان ایک طرف تو برطانیہ کی بالادستی کے خطرے کے پیشِ نظر پہلے قرب وجوار اور پھر دنیا بھر کی حکومتوں سے تعلقات مضبوط کرنا چاہتا تھا دوسری طرف وہ جدید دنیا کے قدم بقدم چلنے کے بارے میں مصطفیٰ کمال جیسے جدت پسندوں سے متاثر ہوتا جا رہا تھا۔

مسلم دنیا سے مراسم: اپنے پڑوس کی ریاستوں سے تعلقات کی پائیداری کے لیے اس نے سب سے پہلے وسط ایشیا کی طرف توجہ دی۔ 1921ء سے 1926ء تک اَفغانستان کے متعدد سرکاری وفود نے وسط ایشیا کا دورہ کیا اور وہاں کی شوروی حکومت سے دوستانہ مراسم کو ترقی دی۔ اس حکومت کا مرکز بخارا تھا۔ اگرچہ یہ حکومت نیم خودمختار اور روس کے ماتحت تھی مگر اس وقت تک یہاں مسلمان اپنے مذہبی شعائر کے اظہار اور عبادات کی ادائیگی میں ایک حد تک آزاد تھے تاہم لینن یہاں بڑے پیمانے پر کمیونزم کی کاشت کر رہا تھا۔

امان اللہ خان نے ایران اور ترکی سے بھی تعلقات بہتر بنائے۔ 3 جون 1921ء کو ایران سے ایک معاہدہ کر کے باہمی تعلقات کو فروغ دیا گیا۔ ترکی سے مئی 1928ء میں ایک دوستانہ معاہدہ کیا گیا۔ اَفغانستان اور ترکی کے طلبہ کا تحصیل علم کے لیے آنا جانا آسان تر بنایا گیا۔ ترکی سے اَفغانستان کے تعلقات کی گہرائی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ترک فوج اور سیاست کے اہم افراد جمال پاشا، ضیاء

بیگ، بدری بیگ اور جنرل کاظم پاشا افغانستان میں ایک عرصے تک سرکاری خدمات انجام دیتے رہے۔

روس افغان تعلقات کا نیا دور: یہ وہ وقت تھا کہ روس میں بالشویک انقلاب ایک آندھی کی طرح چھا چکا تھا اور وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں کی نیم آزادانہ حیثیت بھی خطرے میں پڑ چکی تھی۔ لینن روس کے رہنما اور قائد کی شکل میں اس خطے کی سیاست پر چھا گیا تھا۔ اس کے ملحدانہ افکار و نظریات کی گرد سے سمرقند و بخارا کے در و دیوار آلودہ ہو رہے تھے۔ مزدوروں اور پسے ہوئے طبقات کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے والا یہ طوفان جلد ہی افغانستان کا رخ کرنے والا تھا۔ اس لیے اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ روس کی سیاسی تاریخ، سرخ انقلاب کے پس پردہ عزائم، روس افغان تعلقات اور بالشویک تحریک کے باعث افغانستان پر پڑنے والے اثرات کا شروع سے جائزہ لیں۔ اس مقصد کے لیے ہمیں نہ صرف امان اللہ خان کے دور سے کئی سال پیچھے پلٹنا پڑے گا بلکہ صدیوں پیشتر روس کے ابھرنے اور پھیلنے کے عمل کا بھی سرسری جائزہ لینا ہوگا۔

روس ''سلاف'' قوم کا قدیم مسکن ہے جو پونے دو ہزار سال پہلے اس خطے میں آباد ہوئی تھی۔ روس کا صدر مقام سینکڑوں برس سے مسکووی (ماسکو) چلا آ رہا ہے۔ یہاں کے بادشاہوں کا لقب ''زار'' رہا ہے۔ عالمِ اسلام کے شمال میں آباد یہ آزاد ریاست تہذیب و تمدن کے لحاظ سے باقی دنیا سے بہت پیچھے تھی۔ ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی میں جب تاتاریوں نے اسلامی دنیا کو پامال کرنے کے ساتھ ساتھ روسی شہزادوں کو شکست دی، تب سے ''ماسکو'' تاتاریوں کا باج گزار بن گیا۔ یہ باج گزاری اڑھائی صدیوں تک برقرار رہی۔ اس کے بعد تاتاریوں کا اقتدار کمزور پڑتے 1476ء میں ''ماسکو'' آزاد ہوگیا۔ باج گزار روسی حکمران پھر مطلق العنان بن گئے اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے سابق آقاؤں (تاتاریوں) کی روش اپنالی۔

سولہویں صدی عیسوی میں روس ایک نئی ابھرتی ہوئی استعماری طاقت کا روپ اختیار کر چکا تھا۔ اس دور میں صرف ماسکو اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ روس کہلاتا تھا۔ یہاں کے حکمران مذہباً عیسائی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے روسی حکمران ''ولادیمیر'' نے 989ء میں عیسائیت قبول کی تھی اور اس نے سب سے پہلے روس کی سرحدوں کو وسعت دی تھی۔ تاتاریوں کے زوال کے بعد انہی سے اخذ کردہ ہوس ملک گیری کے جذبے کے تحت روس نے اپنے ہمسایہ ممالک پر دست درازی میں دیر نہ لگائی۔

یاد رہے کہ ماسکو محل وقوع کے لحاظ سے تین دریاؤں کے درمیان واقع ہے۔ اس کے مغرب میں دریائے نیپر، جنوب میں دریائے دون، اور مشرق میں دریائے وولگا بہتے ہیں۔ روس نے انہی تینوں دریاؤں کو

کامیابی سے استعمال کر کے فتوحات کی راہ ہموار کی۔ دریائے نیپر کے ذریعے فن لینڈ، دریائے دون کے ذریعے بحیرہ اسود اور کریمیا اور دریائے وولگا کے ذریعے بحیرہ کیسپین اور پھر شمالی ایران تک کے علاقے مسخر کیے گئے۔ یہ کام چند سالوں میں نہیں، تین صدیوں میں ہوا مگر پیش قدمی کے بنیادی خطوط یہی تھے۔

1530ء میں آئی ون چہارم روس کا بادشاہ بنا اور ''زار'' کا لقب اختیار کیا۔ یہ لقب تین صدیوں تک روسی حکمرانوں میں چلتا رہا۔ استعماری اقدامات بھی جاری رہے۔ 1556ء میں نو مسلم تاتاریوں کا دارالحکومت استراخان روس کے قبضے میں آیا جس سے ماسکو کے لیے وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں اور ایران تک کے راستے کھل گئے۔ 1584ء میں سائبیریا بھی روس کا حصہ بن گیا۔ روس ''کریمیا'' کے اہم جزیرے کو بھی جو بحیرۂ اسود میں ترکی کے عثمانی سلاطین کی طاقت کا مرکز تھا، فتح کرنے کی بار بار کوششیں کرتا رہا۔

روس اور ترکی: 1692ء میں روسی بادشاہ زار پیٹر اعظم نے یورپ سے تعلقات مضبوط کر کے اِسلامی دنیا پر اس بھرپور یلغار کا آغاز کیا جس کا سلسلہ گزشتہ صدی تک وقفے وقفے سے جاری رہا۔ 1696ء میں روس ترکی کے اہم شہر ازوف پر قابض ہو گیا۔ اس دور کا روس عیسائیت کی متعصبانہ تعلیمات سے متاثر تھا، زار خاندان کے افراد بھی عیسائی تھے۔ زار پیٹر اعظم نے اپنی فوج کو یورپی افسران سے تربیت دلوا کر انہیں عالم اِسلام کو مسخر کرنے کے لیے تیار کیا۔ اِسلامی خلافت کا مرکز ترکی اس کا پہلا اور سب سے بڑا نشانہ تھا۔ یورپ کے صلیبی جنگجو صلاح الدین ایوبی جیسے مجاہدین سے شکست کھا کر ہمت ہار چکے تھے مگر روس عیسائیت کا علمبردار بن کر اِسلام کے خلاف اسی جوش و جذبے سے کھڑا ہو رہا تھا۔ یہ روس اور اِسلامی دنیا کی جنگوں کا آغاز تھا۔ 1711ء سے 1792ء تک روس بار بار عثمانی ترکوں کے مقبوضات پر حملے کرتا رہا۔ ترکوں نے کئی بار روس کو عبرتناک شکستیں دیں مگر جوں جوں عثمانی سلطنت سازشوں کا شکار ہو کر کمزور ہوتی گئی روس کی جارحیت تیز ہوتی چلی گئی۔ 1768ء سے 1774ء تک جاری ترک روس جنگ میں جو بلقان کے محاذ پر ہوئی روس کا پلّہ بھاری رہا۔ اس کامیابی کے بعد روس نے مفتوحہ ممالک میں صدیوں سے آباد مسلم تاتاریوں کی نسل کشی شروع کی جس کا سلسلہ جنگ عظیم دوم تک جاری رہا۔

1778ء میں روس بحیرہ اسود میں ترکی کے دفاعی مرکز ''کریمیا'' پر قابض ہو گیا۔ اگلے پندرہ برسوں میں ترکی کے مزید کئی اہم سرحدی اضلاع روس کے ہاتھ آ گئے۔ 1792ء میں جنگ بندی معاہدے کے تحت روس کا بحیرہ اسود کے تمام شمالی ساحلی علاقوں پر قبضہ قبول کر لیا گیا جس کے بعد ترک سلطنت کا دفاع کمزور تر ہوتا نظر آنے لگا۔

روسی استعمار وسط ایشیا میں: اگلی صدی میں روس نے وسط ایشیا کی طرف پیش قدمی شروع کی اور یکے

بعد دیگرے کئی اِسلامی ریاستوں پر قبضہ جمالیا۔ روسی استعمار کے خلاف 1827ء میں داغستان کے پہلے امامِ جہاد غازی محمد نے جہاد شروع کیا۔ پانچ سال بعد وہ شہید ہوگئے اور ''ہمزار بے'' نے علمِ جہاد سنبھالا، ان کے بعد امام شامل مقامی مسلمانوں کے قائد بنے اور ان میں ایک نئی روح پھونک کر پورے قفقاز کو روس کے خلاف کھڑا کردیا۔ سالہا سال تک جاری یہ تحریک جہاد آخر کار بیرونی مسلم ممالک کی بے اعتنائی کے باعث ختم ہوگئی۔ جس کے بعد روس بڑی تیزی سے ماوراء النھر کی اِسلامی ریاستوں پر قابض ہوتا چلا گیا۔ یہ ریاستیں بخارا، تاشقند، خیوہ اور مرو کے نام سے قائم تھیں۔ ترکستان، تاجکستان، ازبکستان، ترکمانستان اور کرغیزستان نامی موجودہ ریاستوں کی حد بندیاں جو نسلی بنیادوں پر استوار ہیں، اِسلامی دور میں دور دور تک کہیں دکھائی نہیں دیتیں۔ یہ حد بندیاں مسلمانوں کو نسلاً تقسیم کرنے کے لیے روس نے 1921ء کے بعد قائم کی تھیں۔ امام شامل کی تحریک کے خاتمے کے بعد 1867ء میں تاشقند، 1868ء میں بخارا، 1873ء میں خیوہ اور 1884ء میں مرو روس کے سامنے سرنگوں ہوگئے۔

لینن، سوویت روس کا بانی: اس دور میں یہودی تسخیرِ عالم کے عالمی منصوبے پر کام شروع کرچکے تھے اور روس کو اپنے مقاصد کے لیے موزوں پاکر یہاں ایک ایسی حکومت قائم کرنے کی تیاریاں کرنے لگے تھے جو بظاہر یہودی نہ ہوتے ہوئے بھی اندرونِ خانہ یہودنواز رہے۔ اس مقصد کے لیے یہودیوں کے بڑے بڑے دماغوں نے لادینیت اور لامذہبیت کو کمیونزم اور سوشلزم کا جامہ پہنا کر دنیا کے سامنے پیش کرنا شروع کیا۔ ان یہودی مفکرین میں سب سے بڑا فتنہ گر مارکس تھا جس نے The Capital نامی کتاب لکھ کر اشتراکیت کی داغ بیل ڈال دی۔ لینن کا نام اس حوالے سے سب سے نمایاں ہے کہ وہ دنیا میں پہلی اور سب سے بڑی دہریہ ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہوا جو سوویت یونین کے نام سے سات عشروں تک بندگانِ خدا کے لیے ایک عذاب بنی رہی۔

لینن 1870ء میں روس کے مقام سمبرسگ میں پیدا ہوا۔ 1891ء میں اس نے پیٹرز برگ یونیورسٹی سے قانون کی سند حاصل کی۔ پھر وہ مزدوروں کے حقوق کی جنگ لڑنے کے حوالے سے مشہور ہوا۔ زار نے اس کے انقلابی خیالات سے خطرہ محسوس کرکے اسے 1900ء میں سائبیریا جلاوطن کردیا مگر وہ فرار ہوکر یورپ چلا گیا۔

لینن جرمنی اور برطانیہ میں رہ کر صحافت کے ذریعے اپنے انقلابی نظریات کا پرچار کرتا رہا۔ اس کے پیغام کا خلاصہ شروع میں اس قدر تھا کہ دنیا کے پسے ہوئے طبقات اپنے حقوق کی جدوجہد کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں اور مذہبی امتیازات کو بالائے طاق رکھ کر اس کی جماعت کے ماتحت متحد ہوجائیں۔ مگر

آہستہ آہستہ مذہب سے قطع نظری کے زاویے کو بڑھا کر وہ اپنے عقیدت مندوں کو بے دینی کی اس انتہا پر لے جا رہا تھا جہاں خدا، رسول اور آسمانی مذاہب کا کوئی تصور باقی نہیں رہتا۔ جہاں انسان اپنی پارٹی کے سوا ہر چیز سے باغی ہوتا ہے اور اگر اس جذبۂ بغاوت میں کوئی کسر رہ جائے تو وہ پارٹی کے نزدیک ناقابلِ معافی شمار ہوتی ہے۔

روس میں اشتراکیت کی مہم: چونکہ روس کے عوام ''زار'' کے ظلم وستم سے تنگ آئے ہوئے تھے، اس لیے ''لینن'' کو اپنا نجات دہندہ تصور کر کے وہ اس کے خیالات سے متاثر ہو رہے تھے۔ جلد ہی روس میں مزدور اور کسان اپنے حقوق کے لیے آوازیں بلند کرنے لگے اور زار کی مطلق العنانی کو چیلنج کیا جانے لگا۔ 1905ء میں روس کے حالات مزید ابتر ہو گئے۔ زار کے خلاف بحری فوج نے عوام کے ساتھ مل کر بغاوت کر دی۔ 22 جنوری کو پیٹرز برگ میں سرکاری فوج نے مزدوروں پر گولی چلا دی۔ بغاوت کو سختی سے کچل کرنا کام بنا دیا گیا تاہم اس سے انقلابیوں کو اپنی تحریک کا سنگ میل مل گیا۔ اس کے بعد آئے دن احتجاجی مظاہروں اور ہڑتالوں کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔ آخر ''زار نکولس'' نے عوام کو مطمئن کرنے کے لیے منتخب پارلیمنٹ تشکیل دینے کا وعدہ کیا مگر انقلابی مطمئن نہ ہوئے۔ کچھ مدت کے لیے ہنگامے تھم گئے مگر زیرِ زمین لاوا پکتا رہا۔

سوشلسٹ پارٹی: ادھر لینن نے 1910ء میں سوشلسٹ پارٹی تشکیل دے دی اور پیرس منتقل ہو گیا۔ اس کے حامی کچھ مدت میں خود روس کے شہر پیٹرز برگ سے ''پراودا'' نامی اخبار نکالنے لگے۔ یہ اخبار روحانی نظریات کی تردید کر کے صرف مادّی حقوق کے لیے جدوجہد اور تنظیم پر زور دے رہا تھا۔ 1913ء میں لینن نے ''بالشویک کانفرنس'' کا پہلا اجلاس ''پراگ'' میں طلب کیا۔ یہ کانفرنس اللہ کی زمین پر اللہ کے تصور کے خلاف ایک اعلانِ جنگ کی تمہید تھی۔

اس کے کچھ عرصے بعد پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی جس نے شکست خوردہ ممالک کے ساتھ ساتھ فاتحین کو بھی شدید نقصانات سے دوچار کیا تھا۔ روس جیسے طاقتور ملکوں کی چولیں ہل گئی تھیں۔ لینن جیسے شاطر کے لیے یہ بہترین موقع تھا۔ وہ اپنے بیانات اور مضامین کے ذریعے جنگ کی مخالفت کرتا اور امن کے قیام پر زور دیتا رہا۔ اس طرح دنیا اسے ایک امن پسند رہنما کے طور پر جاننے لگی۔

سوویت انقلاب: اس دوران وہ بھیس بدل کر اکتوبر 1917ء میں اپنے وطن واپس پہنچا اور زار کے خلاف عوامی تحریک کی قیادت کرنے لگا۔ 25 اکتوبر کو شروع ہونے والی اس تحریک نے کچھ ہی دنوں میں ''زار'' کو ایوانِ اقتدار سے باہر کر دیا۔ مارچ 1918ء میں ''کریملین'' کو مرکز بنا کر سوویت حکومت

تشکیل دے دی گئی اور ہر طرف کیمونزم کا نقارہ پیٹ دیا گیا۔ 1918ء سے 1920ء تک سوویت حکومت کے خلاف زار کے حامیوں اور ان مسلمانوں کی جدوجہد جاری رہی جو لینن کا اصل چہرہ پہچان چکے تھے۔ لینن کا قریبی دوست اور مشہور امریکی مصنف لوئی فشر اپنی تصنیف ''لائف آف لینن'' میں انکشاف کرتا ہے کہ لینن یہودی تھا۔ یہودی اسے اس حیثیت سے خوب جانتے ہیں۔ اس کی بیوی بھی یہودن تھی۔ یہ بھی طشت ازبام ہو چکا ہے کہ سوشلسٹ تحریک کو نہ صرف یہودیوں نے اُبھارا تھا بلکہ اس کے لیے وہ مالی وسائل بھی مہیا کرتے رہے تھے۔

وسط ایشیا میں انور پاشا کی مہم: کمیونسٹوں سے مزاحمت میں انور پاشا کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔ انور پاشا ترک عثمانی سلطنت کے اہم جرنیل تھے۔ پہلی جنگِ عظیم میں ترکی کی شکست کے بعد وہ ''جمعیت اتحاد و ترقی'' کے کئی دوسرے لیڈروں کی طرح ترکی چھوڑ کر یورپ چلے گئے تھے۔ کمیونسٹ انقلاب کو وسط ایشیا پر چھاتا دیکھ کر وہ خاموش نہ رہ سکے اور 1920ء میں وسط ایشیا چلے آئے، یہاں ترکستان کو کمیونسٹوں کے چنگل سے نکال کر ایک آزاد ترک اسلامی مملکت کے قیام کے لیے جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے سمرقند کو اپنی تحریک کا مرکز بنایا اور رُوس سے جنگ شروع کر دی۔ ان دنوں وسط ایشیا میں بخارا مسلمانوں کی آخری اُمید تھا جو صدیوں کے اسلامی ورثے کا امین اور مسلمانانِ ماوراء النہر کا تاریخی حصار تھا۔

انور پاشا مرحوم کی کوشش تھی کہ سمرقند و بخارا کو کسی نہ کسی طرح بچا لیا جائے مگر بخارا کے نیم خود مختار مسلمان حاکم عثمان خواجہ اور ان میں باہمی اعتماد پیدا نہ ہو سکا۔ آخرکار انور پاشا 5 اگست 1922ء کو روسیوں کے ایک حملے میں شہید ہو گئے۔ اس کے بعد وسط ایشیا کے مزاحمتی عناصر دم توڑتے چلے گئے۔ انور پاشا کی شہادت کے بعد رُوس نے جلد ہی سمرقند اور بخارا پر قبضہ کر لیا۔ امیر بخارا نے فرار ہو کر افغانستان میں پناہ لی۔ رُوسیوں نے مزاحمتی تحریکوں کے خاتمے کے بعد اسلامی تہذیب و تمدن کے ان مراکز کو اسی طرح پامال کیا جیسا کہ سات صدیاں قبل چنگیز خان نے کیا تھا۔

الحاد کا سیلاب: لینن کی جانب سے دینی معاملات میں عوام کو آزادی دینے کے دعوے سراب ثابت ہوئے اور مذہب کے ہر تصور کو بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکنے کا کام تیزی سے جاری رہا۔ اس دور کے مشہور نومسلم یورپی مفکر محمد اسد جنہوں نے قبولِ اسلام سے پہلے وسط ایشیا کا دورہ کیا تھا، اپنی سوانح حیات ''روڈ ٹو مکہ'' میں لکھتے ہیں:

''سوویت رُوس کے بارے میں میرا سب سے پہلا اور دیرپا تاثر وہ ہے جو مرو کے ریلوے اسٹیشن پر میرے ذہن میں رقم ہوا۔ یہ ایک بہت بڑا پوسٹر تھا جس میں مزدوروں کی یونیفارم میں

ملبوس ایک نوجوان کی تصویر تھی جو ایک سفید ریش اور عبا قبا میں ملبوس شخص کو، جسے ابر آلود آسمان سے نکلتے ہوئے دکھایا گیا تھا،ٹھوکریں مار رہا تھا۔اس کے نیچے لکھا ہوا تھا: ''سوویت یونین کے مزدوروں نے اس طرح خدا کو اس کی بلندی سے اُتار پھینکا ہے۔'' (نعوذ باللہ) یہ اشتہار سوویت یونین کی اشتراکی جمہوریتوں کی لادینی انجمنوں کی طرف سے لگایا گیا تھا۔ اس طرح کے اشتہارات (جو حکومت کی اجازت کے بعد چھپ سکتے تھے) ہر جگہ نظر آتے تھے۔ پبلک مقامات پر، سڑکوں پر حتیٰ کہ بسا اوقات عبادت گاہوں سے متصل چسپاں رہتے تھے۔ترکستان میں مسجدیں زیادہ تھیں اور انہی کے ساتھ یہ بے حرمتی ہوتی تھی۔نماز اگرچہ باقاعدہ ممنوع نہ تھی لیکن لوگوں کو نماز سے باز رکھنے کی ہر ممکن تدبیر عمل میں لائی جارہی تھی۔ بخارا اور تاشقند میں لوگوں نے مجھے بتایا کہ پولیس کے سی آئی ڈی مسجد میں ایسے ویسے ہر شخص کا نام بلیک لسٹ میں لکھتے ہیں۔''

(طوفان سے ساحل تک، اردو ترجمہ روڈ ٹومکہ)

مسجدیں نوحہ خواں: مولانا عبیداللہ سندھی جو اس زمانے میں سیاسی پناہ کے لیے روس گئے ہوئے تھے، بیان کرتے ہیں:

''بخارا میں بڑی بڑی مسجدیں ہیں، وہ پارک کا کام دیتی رہی تھیں۔ انفرادی طور پر کوئی آیا، اذان دی، نماز پڑھی اور چلا گیا۔اسی طرح گرجوں کی حالت تھی۔ اجتماعی حالت قوم کی فنا ہو گئی تھی۔ انفرادیت کا مظاہرہ عام تھا۔مسجدیں یا تعلیم گاہیں جو طالب علموں سے بھری پڑی تھیں وہ ساری کی ساری بچوں کے کھیل کی جگہیں بن چکی تھیں۔اس وقت چاروں طرف سوائے تخریب کے اور کوئی مظاہرہ نہ تھا۔عورتوں اور لونڈیوں کو بعض نوجوان شرارتی مردعام پھراتے تھے اور شریف لوگ گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔شہر قبرستانوں کی طرح سنسان ویران تھے۔سونا چاندی اور سونے چاندی کے زیورات سے لدی ہوئی ایک مال گاڑی ہر ہفتے ماسکو روانہ ہوتی تھی جس میں ریاستِ بخارا کے تمام قیمتی جواہرات بھرے ہوتے تھے۔لوگوں سے معلوم ہوا کہ جب سے بخارا فتح ہوا ہے اسی طرح سنہری لوازمات ماسکو جارہے ہیں۔ ایک روسی افسر نے دورانِ گفتگو مجھے بتایا کہ اگر ہم بخارا فتح نہ کرتے تو ماسکو والے بھوکوں مر جاتے۔ یہی سونا چاندی ہے کہ اس کو دکھا کر ہم فرانس اور برطانیہ سے اناج اور ضروریات زندگی حاصل کر رہے ہیں۔''

(مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشت کابل)

مولانا سندھی ان حالات پر افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"باوجود اتنی دولت اور خزانے کے بخارا نے اپنی قوم کو (عصری) تعلیم نہیں دی۔ اگر بخارا والے اپنی رعیت کو تعلیم دیتے تو یہ تمام ترکستان پر مسلط ہو جاتے۔ یہ لوگ ترک ہیں۔ جس وقت روس میں انقلاب ہوا، روسی اپنی مشکلات میں تھے اور ترکستان کے علاقے سمرقند و بخارا وغیرہ خالی پڑے تھے۔ اگر بخارا کے نوجوان تعلیم یافتہ ہوتے تو اپنی آزاد اور بڑی اِسلامی سلطنت جو روس سے دو چند ہوتی، بنا لیتے اور اس غلامی سے بچ جاتے۔ یہ سرمایہ دار خود بھی ڈوبے اور قوم کو بھی ڈبو دیا اور قوم کو ذلیل و خوار کیا۔ اگر ان نوجوان ترکوں کو لیڈر اور سرمایہ مل جاتا تو روسی کبھی غالب نہیں ہو سکتے تھے اور اگر وہ انور پاشا کو جب کہ اس نے سمرقند میں جنگ کی، سرمایہ سے امداد دیتے تو بھی کچھ بن جاتا لیکن ان عقل کے اندھوں نے سرمایہ کی محبت کی وجہ سے خاموشی اختیار کی. جس کے نتیجے میں یہ غلام بن گئے۔ میں اس پر تین دن روتا رہا۔ آخر میں نے جل کر یہ کہا کہ ایسے سرمایہ داروں پر یہ دورِ غلامی آنا لازم ہے۔"

سوویت روس...... نئی حکومت نیا نظام: 1917ء کے انقلاب کے بعد روس میں واحد سیاسی جماعت کمیونسٹ پارٹی تھی۔ لینن عوام کا لیڈر اور یہودی سیاست دان ٹرائسکی ملک کا پہلا وزیر اعظم تھا۔ ان دونوں کی خواہش تھی کہ جلد از جلد دنیا کے تمام ممالک کو اشتراکیت کے دھارے میں شامل کرلیا جائے۔ انقلاب کے بعد سوویت یونین نے ہمسایہ ممالک سے زارشاہی کی حکومت کے معاہدے منسوخ کردیے اور وہاں یہ پیغام عام کیا کہ لوگ ایک نئے سماجی نظام کا حصہ بن کر اپنی زندگی کے تمام امور کا انتظام اپنی مرضی کے مطابق کریں، ماضی کو بھول کر ایک نئے دور کا آغاز کریں۔ روس نے سوویت یونین کا روپ دھار کر ماضی سے اپنے تمام رشتے ختم کرلیے تھے اور اب وہ یہی طرزِ حیات ساری دنیا کو سکھانا چاہتا تھا جو حقیقت میں مذہبی و اخلاقی اقدار سے بغاوت کی انتہا تھی۔

اَفغانستان اور سوویت روس: اَفغانستان سوویت روس کا سب سے قریبی اور اہم ہمسایہ ہونے کی وجہ سے اس کا اولین ہدف تھا۔ تاہم روس نے اَفغانستان کو زیرِ دام لانے کا کام بہت آہستہ آہستہ کیا۔ انقلاب کے بعد 3 مارچ 1918ء کو سوویت روس نے یہ اعلان کیا تھا: "ایران و اَفغانستان کی علاقائی سالمیت اور سیاسی و معاشی آزادی کا احترام کیا جائے گا۔"

یہ حبیب اللہ خان کا دور تھا اور اس کے لیے روس کے یہ خیالات قابلِ اطمینان تھے۔ اس کے بعد 1919ء میں امان اللہ خان نے برسرِ اقتدار آتے ہی لینن کو خط لکھ کر دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی جس کا حوصلہ افزا جواب آیا اور روس نے اَفغانستان کو خود مختار تسلیم کرنے میں سب سے پہل کی۔

امان اللہ خان کے دور میں 13 ستمبر 1920ء کو سوویت روس اور افغانستان کے مابین پہلا معاہدہ ہوا جسے امان اللہ خان نے پُرخلوص رشتوں کی بنیاد قرار دیا۔ یہ بات شک وشبے سے بالاتر ہے کہ امیر عبدالرحمن خان اور حبیب اللہ خان کا جھکاؤ برطانیہ کی طرف رہا جبکہ امان اللہ خان ان کے برعکس برطانیہ مخالف اور روس کی طرف مائل تھا۔ اسی میلان کے سبب جلد ہی افغانستان اور روس میں دوسرا معاہدہ ہوا جس کا مسودہ لینن نے بدستِ خود تیار کیا تھا۔ اس معاہدے پر 28 فروری 1921ء کو دستخط کیے گئے۔ ان معاہدوں میں بنیادی نکتہ ''باہمی عدم جارحیت اور غیر جانبداری'' تھا۔

امان اللہ خان اور لینن: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ امان اللہ خان کا روس سے تعلقات بہتر بنانا صرف اس مجبوری کے تحت تھا کہ وہ برطانیہ سے اپنا دامن چھڑانا چاہتا تھا اور نہ بذاتِ خود اسے لینن کے افکار یا سرخ انقلاب سے اتفاق نہ تھا۔ یہ خیال اس لحاظ سے درست معلوم ہوتا ہے کہ امان اللہ خان نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد وسط ایشیا کی ان مسلم ریاستوں سے بھی تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کی تھی جو روس کے چنگل میں آنے والی تھیں۔ پھر جب سرخ فوج ان ریاستوں پر حملہ آور ہوئی اور غازی انور پاشا نے سمرقند میں جہاد کا آغاز کیا تو امان اللہ خان نے سمرقند و بخارا کے مسلمانوں کی مدد کے لیے خفیہ طور پر کچھ فوج بھی روانہ کی اور مالی امداد سے بھی دریغ نہ کیا۔ تاہم یہ سب کچھ اتنا خفیہ رکھا گیا کہ افغان روس تعلقات پر کوئی منفی اثر نہ پڑا۔ بعد میں جب وسط ایشیائی مسلم ریاستیں سرنگوں ہو گئیں تو امان اللہ نے مفرور مسلم امراء کو پناہ بھی دی تاہم اب اسے انجام کار روس سے دوستانہ تعلقات کو برقرار رکھنے ہی میں عافیت نظر آئی۔

سوویت روس افغانستان کے بارے میں کبھی نیک ارادے نہیں رکھتا تھا مگر لینن کی زندگی میں روس نے افغانستان کے خلاف اپنے استعماری عزائم کو کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔

پہلا افغان سوویت تنازعہ: 1924ء میں لینن مر گیا۔ اس کے اگلے برس روس نے وسط ایشیا میں اپنی باج گزار شوروی حکومت کے ذریعے دوستی کے معاہدوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے یکدم افغانستان پر حملہ کر دیا۔ کمونسٹوں نے افغان سپاہیوں کا بھیس بدلا اور دریائے آمو عبور کر کے دریائی جزیرے ''ارتا تغائی'' پر قبضہ کر لیا۔ دریائے آمو 1872ء کے معاہدے کے تحت افغانستان اور روس (یا اس کے ماتحت وسط ایشیائی ریاستوں) کے درمیان متفقہ سرحد کی حیثیت رکھتا ہے مگر روس نے دریا کی دو شاخوں کے درمیان واقع 160 مربع میل کے اس جزیرے کو سوویت یونین کا ذیلی علاقہ قرار دے کر اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس واقعے کے بعد سوویت روس کے استعماری عزائم افغانوں پر واضح ہو گئے۔ روس نے نام نہاد ریفرنڈم کرا کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ جزیرے کے لوگ افغان حکمرانوں سے

نالاں اور سوویت نظریات سے متفق ہیں لہٰذا امان اللہ خان اس وقت یہ جزیرہ واپس نہ لے سکا۔ تاہم اس کے بعد شمالی سرحد پر افواج کی تعداد بڑھا دی گئی اور اَفغان حکومت روس کے حوالے سے سخت خدشات محسوس کرنے لگی۔

معاہدۂ پغمان: ماسکو کو جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ جزیرہ اس کے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا جبکہ اَفغانوں کا چوکنا ہوجانا اس کے عزائم کو ناکام بنا سکتا تھا چنانچہ روس نے یہ جزیرہ خالی کردیا اور 27 نومبر 1926ء کو کٹھ پتلی شوروی حکومت کو بیچ میں لاکر اَفغانستان کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جسے ''معاہدۂ پغمان'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس میں یہ طے ہوا کہ دونوں ریاستیں عالمی سیاست میں غیر جانبدار پالیسی اور عدمِ تعرض وبقائے باہمی کا اصول اپنائیں گی۔

ایشیا و یورپ کا دورہ: امان اللہ خان نے دسمبر 1927ء میں مختلف اِسلامی و یورپی ممالک کا دورہ کیا۔ وہ ہندوستان، ایران، مصر، ترکی، اٹلی، فرانس، بلجیم، سوئزرلینڈ، جرمنی، برطانیہ اور پولینڈ گیا۔ وہ اِسلامی ملکوں میں ایک مردِ غازی کی حیثیت سے مشہور تھا اس لیے اس کا زبردست استقبال ہوا۔ یورپی ممالک میں بھی اسے غیر معمولی عزت و احترام ملا۔ جرمنی نے اسے برطانیہ دشمن حکمران کی حیثیت سے خوب پذیرائی دی اور وہاں کے اخبار وجرائد اس کی مدح وستائش سے بھر گئے۔ مگر افسوس کہ جس قدر اہلِ یورپ اس کے ''مجاہدانہ ماضی'' سے مرعوب تھے، اس سے کہیں زیادہ وہ یورپ کے ''مادّہ پرست حال'' پر فریفتہ ہوگیا۔ وہ اپنے معاصر جدید ترکی کے بانی مصطفی کمال پاشا سے بھی خاصا متاثر معلوم ہوتا تھا، یورپ کے اس دورے نے اس کی جدت پسند طبیعت کو مزید برانگیختہ کیا۔ لگتا ہے وہ احساس کمتری کا شکار بھی ہوا۔ اَفغانستان واپس آکر اس نے تیزی سے ایسے اقدامات شروع کردیے جو اس کے خیال میں ایشیائی مسلمانوں کو ترقی کی دوڑ میں یورپ کے برابر لا سکتے تھے۔

امان اللہ خان کی جدت پسندی، فوائد اور مضرات: امان اللہ خان کی ترقی پسندانہ پالیسیوں اور جدتِ فکر کے باعث چند مفید کام بھی ہوئے۔ مثلاً

1. اَفغانستان کے لیے یورپی ممالک سے جدید اسلحہ کی فراہمی کا راستہ کھلا اور امیر نے اپنے سفر یورپ میں 54 ہزار جدید رائفلیں، 106 توپیں، 8 طیارے، 6 ٹینک اور دیگر آلات حرب خریدے۔
2. اَفغانستان میں دار المساکین، دار المجانین اور دار العجزہ کے ناموں سے مسکینوں، نفسیاتی مریضوں اور لاوارث بوڑھوں کے لیے رفاہی ادارے قائم ہوئے، خواتین کے ہسپتال بنائے گئے، دو بڑے قومی کتاب خانے بنانے کا اعلان کیا۔

❸ سرکاری ملازمین کے لیے تنخواہوں اور سفری اخراجات میں اضافہ منظور ہوا۔
❹ ملک میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کے اداروں پر خاصی توجہ دی گئی، ٹیکنیکل اسکول وکالج قائم ہوئے۔
❺ امیر افغانستان میں ریلوے لائن بچھانا چاہتا تھا، اس کے لیے جرمن وفرانسیسی کمپنیوں سے معاہدہ کیا گیا۔

تاہم اس کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب وتمدن سے متاثر ہوکر اس نے کچھ ایسے اقدامات کیے جو کسی طرح بھی شریعت، اِسلامی تہذیب وتمدن اور اُفغانستان کے رسم ورواج سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ ان کی ایک جھلک یہ ہے:

❶ خواتین سے پردے کی پابندی ختم کردی گئی اور بے پردگی کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ چنانچہ اُفغانستان سے پہلی بار طالبات کا ایک گروہ حصول تعلیم کے لیے ترکی روانہ ہوا۔ یہ سب طالبات بے پردہ تھیں۔ یاد رہے کہ یہ بے پردگی اس حد تک نہیں تھی جیسا کہ آج کل یورپ اور ماڈرن مسلمانوں ملکوں میں رائج ہے۔ بلکہ سر اور پورے جسم کو ڈھانپنے کا اہتمام تھا، صرف چہرہ کھلا ہوتا تھا۔ تاہم غیور اُفغان عوام کو اپنی تہذیب واقدار کے خلاف اتنی بات بھی گوارا نہ تھی۔ امان اللہ خان کے سفر ایشیا ویورپ میں اس کی ملکہ ثریا اس کے ساتھ تھی۔ وہ بھی چہرہ کھلا رکھتی تھی اور اسی حالت میں فرانسیسی وبرطانوی دفتر خارجہ کے اہلکاروں نے اس کی تصاویر اتاریں۔ یہ تصاویر اُفغانستان بھی پہنچیں جن سے عوام کو سخت دھچکا لگا۔
❷ لڑکی کے نکاح کے لیے کم از کم عمر 18 اور لڑکے کے لِیے 22 سال مقرر کی گئی۔
❸ سرکاری ملازمین کے لیے ایک سے زائد نکاح ممنوع قرار دیے گئے۔
❹ علمائے کرام اور قبائل سرداروں کے اختیارات کم کردیے گئے۔

عوامی نفرت: امیر کے ان اقدامات کے باعث اُفغان عوام میں اس کے خلاف نفرت پھیلتی گئی جس کے نتیجے میں امیر کی ملک پر گرفت کمزور پڑنے لگی۔ اس کے لیے ''غازی'' کا مقدس تصور دھندلا گیا اور اس کے سیاسی مخالفین کو اپنے ارمان نکالنے کا موقع مل گیا۔ اس کے خلاف سازشوں اور شورشوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔

جمہوریت کی پٹڑی: امان اللہ خان 20 جون 1928ء کو غیر ملکی دورے سے واپس آیا تھا اور آتے ہی اپنی مزعومہ اصلاحات پر کام شروع کردیا تھا۔ 25 جولائی 1928ء کو ملکہ ثریا کی طرف سے سرکاری اخبار ''امان'' میں ایک مضمون شایع ہوا جس میں عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دیے جانے پر زور دیا گیا۔

28 اگست کو امان اللہ خان نے ایک بڑا جرگہ طلب کیا جس میں عورتوں کی بڑی تعداد سمیت ایک

ہزار افراد شریک تھے۔اس میں امان اللہ خان نے جدید اُفغانستان کا تصور اور اس کا ڈھانچا پیش کیا۔ اس نے 150 افراد پر قومی اسمبلی قائم کر کے اُفغانستان کو یورپی ممالک کی طرح جمہوریت کی پٹڑی پر چڑھانے کی خواہش بھی ظاہر کی۔

حزب مخالف اور علماء کا کردار: جلد ہی امیر کی جدت پسندی کے خلاف اُفغان عوام کا ردِعمل سامنے آنا شروع ہو گیا۔کوہستان کے مُلّا عبدالاحد اور کابل کے قاضی عبدالرحمن جیسے مذہبی رہنماؤں نے امیر کے خلاف آواز اٹھا کر ایک تہلکہ مچادیا۔اس ماحول سے امیر کے چند سیاسی حریفوں شیر آغا، گل آغا اور معصوم نے خوب فائدہ اٹھایا۔انہوں نے امیر کے خلاف ایک منشور ترتیب دیا جس پر 400 علمائے کرام کے دستخط تھے۔تاہم سرکاری مشینری فوراً حرکت میں آ گئی۔گل آغا گرفتار ہو گیا۔کابل، خوست اور کوہستان کے تقریباً 40 علماء کو بھی حراست میں لے لیا گیا۔قاضی عبدالرحمن سمیت چند علماء کو سزائے موت دے دی گئی۔

برطانیہ آگ کو ہوا دینے لگا: برطانیہ اُفغانستان میں جاری اس ہنگامے کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اُفغانستان جس نے بے سروسامانی کے عالم میں اس کی ناقابل تسخیر سمجھی جانے والی طاقت کو شکست دی تھی، اب منتشر ہو رہا تھا۔امان اللہ خان جس نے مجاہدانہ جنگ لڑ کر گورے سپاہیوں کے چھکے چھڑا دیے تھے، یورپی تہذیب کا بے دام اسیر بن کر اپنے ہی عوام کی نفرت کا نشانہ بن رہا تھا۔برطانیہ اپنی شکست کو نہیں بھولا تھا۔وہ اس بات پر بھی امان اللہ خان سے سخت برہم تھا کہ اس نے روس سے کیوں تعلقات بڑھانے شروع کر دیے ہیں؟ روس اور برطانیہ ایک دوسرے کے حریف چلے آ رہے تھے۔اس لیے روس سے اُفغانستان کا گٹھ جوڑ برطانیہ کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ان وجوہ کی بناء پر برطانیہ، امان اللہ خان کو مزید بدنام کرنا اور ملک میں افراتفری کو مزید فروغ دینا چاہتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ملکہ ثریا کی برطانیہ میں لی گئیں بے حجاب تصاویر کو برطانوی کارندوں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اُفغانستان میں مشتہر کیا تھا تاکہ عوام کو زیادہ سے زیادہ مشتعل کیا جاسکے۔پھر امان اللہ خان کے اپنے اقدامات بھی عوامی تنفر کے لیے کافی تھے۔چنانچہ ہر طرف حکومت کے خلاف فضا بنتی چلی گئی۔یہ سب کچھ تین چار ماہ کے اندر اندر ہو گیا۔اس زمانے میں راسخ الفکر ادیبوں، صحافیوں اور شعراء نے امان اللہ خان کے ان جدت پسندانہ اقدامات کے خلاف خوب کھل کر لکھا۔ایک شاعر نجف علی خان کی یہ نظم بہت مقبول ہوئی:

دختراں بودند در عہدِ امانی شوخ وشنگ ہر طرف خیزک زناں چوں آہوئے دشتِ تتار

شاہ امان اللہ کے دور میں ہر طرف شوخ وطرار لڑکیاں صحرائے گوبی کے ہرنوں کی مانند گھومتی پھر رہی ہیں۔

ساقہائے شاں نمایاں بود مابین جراب پیرس ولندن بوضع فیشن ایشاں نثار

جرابوں کے اوپر ان کی پنڈلیاں نمایاں ہو رہی ہیں، ان کے فیشن پر پیرس اور لندن والے بھی قربان جائیں۔

دست شستہ از حیا و ننگ و ناموس و شرف ملتِ افغاں ز شوخیہائے ایشاں شرمسار

انہوں نے شرم وحیا اور عزت وناموس کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور ملتِ افغان ان کی شوخیوں سے شرمندہ ہو رہی ہے۔

از جراثیم تفرنج اکثرے گشتہ مریض در نواحِ شہر کابل بد ہوا بس ناگوار

کابل کے گردونواح تک کے اکثر لوگ اس خراب اور ناگوار آب وہوا کی وجہ سے جو فرنگیوں کی نقالی کے جراثیم سے پھیلی ہے، بیمار پڑ چکے ہیں۔

ہر مسلمانے کہ دید ایں منظرِ عبرت فروز شد بدیں بے دانشی شاہِ افغاں اشکبار

اس عبرت ناک منظر کو دیکھ کر ہر مسلمان افغان بادشاہ کی بے عقلی پر اشک بار ہے۔

زیرِ دنداں کردہ انگشتِ ماسف آہ کرد بوالعجب از غیرت اِسلام شاہِ کوہ سار

وہ افسوس کے مارے انگلیاں دانتوں میں دبائے کہہ رہا ہے کہ کہساروں کے بادشاہ کی اِسلامی غیرت پر تعجب ہے۔

نوجواناں را بود وردِ زباں لفظِ وطن زآنکہ بااِسلام ودین چنداں نمیدارند کار

نوجوانوں نے وطن کے لفظ کو اس طرح رٹ لیا ہے گویا اِسلام اور دین سے ان کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

شاہ امان اللہ غازی خواب غفلت رفتہ بود بے خبر از گردشِ ایام در لیل و نہار

شاہ امان اللہ غازی غفلت کی نیند سو رہا ہے اور دن رات کی گردش سے بے خبر ہے۔

ملحدان و دہریون چوں مجلس آرائی کنند سوویت برپا کنند این منکرانِ کردگار

ملحد اور دہریے محفلیں آراستہ کر کے بیٹھے ہیں، ان منکرینِ خدا کو کمیونسٹوں نے تیار کیا ہے

اسی طرح فیشن زدہ اور جدت پسند فوجی افسران کی ہجو میں لکھے گئے یہ اشعار بھی بہت مشہور ہوئے:

گر مخنث را بپوشانی سلاحِ کارزار روزِ میداں کے تواند با عدو آویختن

اگر مخنث کو ہتھیار پہنا بھی دیے جائیں تو میدانِ جنگ میں بھلا وہ دشمنوں سے کیا لڑے گا

با لباسِ فیشن افواجِ امان اللہ چہ کرد کس نشد زیشاں جلوگیر از بغاتِ راہزن

فیشنی لباس میں امان اللہ کی فوجیں کیا کر پائیں گی۔ ان میں سے کوئی راستہ لوٹنے والے باغیوں تک سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔

بچہ سقہ کا ظہور: امان اللہ خان کیے خلاف عوامی ردِ عمل کے انہی دنوں میں افغانستان کی سیاست میں ایک نیا نام ظاہر ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا۔ یہ حبیب اللہ نامی ایک جنگجو

سردار تھا جو ''بچہ سقہ'' کے لقب سے مشہور ہوا۔ اس نے دیکھا کہ حکومت کے خلاف نفرت کی آگ پھیل چکی ہے،، حزب مخالف اور علماء کی تحریک عروج کی جانب بڑھ رہی ہے۔ چنانچہ اس نے تبدیلی اقتدار کے تمام متوقع مفادات سمیٹنے کی کوشش کی۔ اس کا گروہ بہت طاقتور تھا۔ کابل جانے والے قافلوں پر اس کی دارو گیر جاری رہتی تھی۔ سرکاری سپاہی بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکتے تھے۔ وہ لوٹ مار کی رقم کا ایک حصہ غریب دیہاتیوں میں تقسیم کر دیتا تھا اس لیے اسے کچھ عوامی حمایت بھی حاصل ہو گئی تھی۔ عموماً وہ ڈیورنڈ لائن کے پار انگریزی حدود میں پارہ چنار کے علاقے میں کارروائیاں کرتا تھا۔ وہاں مقامی انتظامیہ کے ہاتھوں گرفتار ہو کر تقریباً ایک سال جیل میں بھی رہا تھا۔

جن دنوں امان اللہ خان کے خلاف شرقی اَفغانستان میں شورش برپا ہوئی انہی دنوں وہ رہا ہو کر حدودِ اَفغانستان میں پہنچا اور کابل کے شمال میں کاپیسا اور پروان کی شاہراہوں پر حملے کر کے حکومت کے لیے امن وامان کے مسائل پیدا کرتا رہا۔ حکومتِ برطانیہ کی قید سے اس کی اچانک رہائی اور امان اللہ خان جیسے برطانیہ کے معتوب کے خلاف اس کی سرگرمیوں کے پیش نظر شاہ امان اللہ کے حامی اسے برطانوی ایجنٹ کہتے تھے مگر دوسری طرف شاہ کے مخالفین کی نگاہ میں وہ ایک مجاہد تھا۔

<u>برطانیہ کی ایک اور چال</u>: ادھر برطانوی ایجنٹوں نے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو مزید ہوا دینے کے لیے ملکہ ثریا کی ایک اور تصویر شائع کرادی جس میں ملکہ کا چہرہ ایک نیم عریاں رقاصہ کے جسم سے جوڑ دیا گیا تھا۔ عام آدمی یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ تصویر میں جعل سازی کی گئی ہے۔ ملکہ ثریا کی یہ تصویر ہزاروں کی تعداد میں اَفغانستان کے طول وعرض میں تقسیم کی گئی۔ اس سے لوگوں کی قوتِ برداشت بالکل جواب دے گئی اور وہ ہر صورت میں حکومت گرادینے پر تل گئے۔ کچھ دنوں بعد سازشیوں نے یہ افواہ پھیلادی کہ ملکہ ثریا کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اس سے حالات اور خراب ہو گئے۔ ادھر کابل کے شمال میں بچہ سقہ ایک بھاری نفری کے ساتھ موجود تھا اور امان اللہ خان کا تختہ الٹنے کی فکر میں تھا۔ اس نے سرکاری فوج کے ایک دستے کو جو کہ وادی پنج شیر کے ایک حکومت مخالف عالم دین کو گرفتار کرنے آرہا تھا، مار بھگادیا۔

<u>ڈاکو یا مجاہد</u>: اگرچہ بچہ سقہ کے بارے میں حکومت نے مشہور کر دیا تھا کہ وہ ایک ڈاکو ہے مگر اسے علماء کی ایک جماعت کی حمایت حاصل تھی، بہت سے لوگ اسے مجاہد مانتے تھے۔ اس نے خود ایک نجی مجلس میں اپنا قصہ یوں سنایا:

''میں امان اللہ خان کے خوف سے اپنے ماموں زاد بھائیوں سکندر اور سمندر کے ساتھ فرار ہو کر پشاور چلا گیا تھا۔ وہاں چائے فروخت کرتا رہا۔ موقع ملنے پر اَفغانستان واپس روانہ ہوا تو راستے

میں نماز جمعہ کے لیے ایک مسجد میں داخل ہوا جہاں ایک مُلاّ جہاد پر تقریر کررہا تھا۔ نماز کے بعد میں اس سے ملا اور دعا کی درخواست کی۔ مُلاّ نے دعا دی اور کہا: راستے میں فلاں درخت سے جو کچھ ملے گا لے لینا۔ مجھے اس درخت سے اسلحہ اور ایک ہزار روپیہ ملا۔ میں لے کر چل دیا۔ اَفغانستان میں کوہ دامن کے علاقے میں مجھے علماء نے امان اللہ خان کو قتل کرنے پر اُبھارا۔ اخوندزادہ مُلاّ حمید اللہ خان جیسے اکابر اور غلام محمد خان جیسے اعیان سلطنت نے مجھے اس کام کے لیے تیار کیا۔ پروان کے خانوں نے مجھے کمک دی اور یوں میں نے کابل پر حملہ کیا۔''

علمائے دین سے فاصلے: امان اللہ خان کے بُرے دن آ گئے تھے۔ اس لئے اس سے حماقتوں پر حماقتیں ہو رہی تھیں۔ اس نے خود کو علماء سے دور کر لیا تھا اور یوں ایک مخلص و مؤثر طبقے کے مشوروں سے محروم ہو گیا تھا۔ مولانا عبید اللہ سندھی جیسے مخلص ہندوستانی مشیر بھی اَفغانستان کی حکومت سے ہندوستان کی تحریک آزادی کو کوئی مفاد حاصل نہ ہوتا دیکھ کر روس چلے گئے تھے۔

امان اللہ خان اب ذاتی صوابدید پر سب کچھ کر رہا تھا۔ علماء سے ٹکر لے کر اس نے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی۔ اس نے نور المشائخ حضرت فضل عمر مجددی رحمہ اللہ جیسے بزرگ کو بھی سیاسی عناد کی بنا پر اَفغانستان سے جلاوطن کر دیا تھا۔ مجددی خاندان کے یہ بزرگ دربدر پھرتے ہوئے کوئٹہ اور پھر ڈیرہ اسماعیل خان پہنچے مگر امان اللہ خان انہیں اَفغانستان کی سرحدوں کے پاس بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے برطانوی گورنمنٹ سے رابطہ کر کے انہیں وہاں سے بھی نکلوا دیا۔ آخر کار یہ بزرگ بمبئی میں مقیم ہو گئے۔ علماو مشائخ سے یہ سلوک عوام میں مزید اشتعال کا سبب بنتا رہا۔

شنواریوں کی تحریک اور مطالبات: انہی دنوں جلال آباد اور اس کے نواح میں آباد شنواری قبائل نے حکومتی پالیسیوں سے تنگ آ کر علم بغاوت بلند کر دیا۔ حکومت کے غیر شرعی اقدامات کے علاوہ انہیں یہ بھی شکایت تھی کہ ان کے کچھ لوگ بے گناہ مارے گئے تھے۔ قاتلوں کو سرکاری انتظامیہ نے کھلی چھوٹ دے دی تھی۔ یوں شنواری انصاف کی فراہمی سے مایوس تھے۔ شنواریوں کی قیادت جلال آباد میں محمد علم خان کر رہا تھا۔ ان لوگوں نے ''ڈکہ'' پر حملہ کر کے سرکاری فوج کو مار بھگایا تھا۔ اس کے بعد خوگانی اور چپرہاری قبائل بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔

امان اللہ خان اس صورت حال سے نہایت پریشان تھا۔ خطرہ تھا کہ اگر مہمند قبائل بھی شنواریوں کے ساتھ مل گئے تو حکومت ہل کر رہ جائے گی۔ ان حالات میں امان اللہ خان کو شنواریوں سے گفت و شنید کے ذریعے معاملات طے کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ چنانچہ اس کے نمائندے شنواری رہنماؤں سے مل کر

بات چیت کرنے لگے۔

شنواریوں کے مطالبات زیادہ تر اسلامی نظام اور افغان تہذیب وتمدن کے احیا کی عکاسی کرتے تھے۔ان میں سے چند اہم مطالبات درج ذیل ہیں:

1. امان اللہ خان ملکہ ثریا کو طلاق دے دے۔
2. لڑکیوں کی درس گاہیں بند کر دے۔
3. جولڑکیاں تعلیم کیلئے بیرون ممالک بھیجی گئی ہیں انہیں واپس بلائے۔
4. ٹیکسوں میں کمی کی جائے۔
5. یورپی لباس پہننے کے قانون کوختم کر دیا جائے۔
6. پردے کورواج دیا جائے۔
7. علماء کوحکومت میں شامل کرلیا جائے۔
8. اسلامی قوانین نافذ کیے جائیں۔

سرکاری افواج کی شکست: امان اللہ خان کواس موقع پر کم ازکم سیاسی مصلحتوں کے تحت لچک دار رویہ اپنانا چاہیے تھا مگراس سے بھاری غلطی یہ ہوئی کہ اس نے حالات کے سدھرنے کی اس آخری اُمید کوبھی ختم کر دیا اور مطالبات پر سنجیدگی سے غور نہ کیا۔اس نے ایک بار پھر بزورِ قوت حالات پر قابو پانے کی کوشش کی اور پے درپے افواج کو جلال آباد روانہ کیا۔یہ ایک اور حماقت تھی۔اس طرح کابل سرکاری افواج سے تقریباً خالی ہوگیا۔

شنواریوں کے خلاف جلال آباد بھیجی جانے والی سرکاری فوج 29 نومبر 1928ء کوشکست فاش سے دو چار ہوئی اور اس کے اعلیٰ افسران گرفتار ہو گئے۔ فتح مند شنواری پوری آزادی سے سرکاری دفاتر لوٹتے رہے۔انہیں بھاری مقدار میں اسلحہ ہاتھ لگ گیا جس سے ان کی قوت مزید بڑھ گئی۔

بچہ سقہ سے صلح: حالات پر امان اللہ خان کی گرفت اب بہت کمزور ہوگئی تھی۔اس صورتِ حال سے بچہ سقہ جیسے موقع شناس نے پورا پورا فائدہ اُٹھایا اور کابل کی شمالی شاہراہ کومسدود کرنے کے بعد اپنے گروہ کے ساتھ دارالحکومت کے قریب آن پہنچا۔طوفانی موسم اور یخ بستہ سردی میں کابل کو دور دراز کے شہروں سے فوری کمک ملنا ویسے بھی آسان نہ تھا۔اس لیے بچہ سقہ بڑی بے خوفی سے کابل کے سامنے براجمان رہا۔امان اللہ خان اس کے گروہ سے اتنا خوفزدہ ہوا کہ مذاکرات پر آمادہ ہوگیا مگر بچہ سقہ یکدم مذاکرات کی سطح پر نہیں آیا۔اس نے مار دھاڑ جاری رکھی اور سرکاری محافظوں کوحملوں کا نشانہ بناتا رہا۔جلال آباد

میں شنواریوں کے ہاتھوں سرکاری فوج کی شکست سے مایوس ہو کر امان اللہ خان نے سوچا کہ دو دشمنوں سے بیک وقت لڑنے سے بہتر ہے ایک سے صلح کر کے دوسرے کو کچل دوں۔ چنانچہ اس ''حکمت عملی'' کے تحت اس نے اپنے سب سے خطرناک دشمن بچہ سقہ سے صلح کر لی تا کہ اس سے بے فکر ہو کر شنواری قبیلے کا زور توڑ سکے۔ مگر یہ صلح بڑی عاجزانہ اور حکومت کی بے بسی کی تصویر تھی۔ امان اللہ خان نے بچہ سقہ کو خوش کرنے کے لیے اسے اعزازی طور پر فوجی جرنیل کا عہدہ دے دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے چار لاکھ روپے کی خطیر رقم، بہت سی رائفلیں اور بھاری مقدار میں کارتوس فراہم کیے۔ گروہ کے ہر فرد کے لیے معقول سالانہ مالی امداد کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد اسے کابل کے شمالی علاقوں کا بیسا اور پروان کا عامل مقرر کر دیا گیا اور وہاں سے سرکاری افواج واپس بلالی گئیں۔ طے یہ ہوا کہ ان علاقوں کا نظم و نسق بچہ سقہ کے کارندے ہی سنبھالیں گے۔

بچہ سقہ کابل میں: مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ امان اللہ خان کی توقع کے بالکل برخلاف تھا۔ بچہ سقہ نے قلعہ ملا ویس الدین میں حکومت مخالف افراد کی ایک مشترکہ مجلس آراستہ کی جس میں اسے ''بادشاہ اَفغانستان'' کہہ کر پکارا گیا۔ یہ کھلم کھلا حکومت کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ پھر اس نے حکومت کی بخشی ہوئی طاقت اور اسلحے کو اسی کے خلاف استعمال کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ 14 دسمبر 1928ء کو اس نے اپنے گروہ کے ساتھ کابل پر حملہ کر دیا۔ سرکاری محافظ کئی دن تک لڑتے رہے مگر اس کا زور نہ توڑ سکے۔ امان اللہ خان نے بازی ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر گل آغا اور معصوم جیسے اہم سیاسی مخالفین کو رہا کر دیا اور اپنی کئی متنازع اصلاحات منسوخ کر دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ علماء سے گفت و شنید کی کوشش بھی کی مگر اب وقت نکل چکا تھا۔ امان اللہ خان نے اپنا انجام سامنے دیکھ کر اپنے اہل و عیال کو طیارے کے ذریعے قندھار روانہ کر دیا۔

امان اللہ خان کی آخری کوشش: نیا شمسی سال 1929ء اس حال میں شروع ہوا کہ کابل کے گرد و نواح مکمل طور پر بچہ سقہ کی گرفت میں تھے۔ انہی دنوں امان اللہ خان نے عوامی حمایت ازسرنو حاصل کرنے کے لیے ایک پمفلٹ شائع کرا کے تقسیم کرایا جس کے مطابق سرکاری سطح پر ''ترقی پسندانہ اصلاحات'' میں کچھ تبدیلیاں کی گئی تھیں اور عوام سے خوش کن وعدے کیے گئے تھے۔ اس میں اعلان کیا گیا تھا کہ ''شراب نوشی قابل سزا ہوگی، سرکاری تعطیل حسبِ سابق بروز جمعہ ہوا کرے گی، عورتیں ہاتھ اور چہرے کا پردہ کریں گی اور یورپی لباس کی جگہ برقع پہننے کی پابند ہوں گی، لوگ مشائخ سے بیعت ہو سکتے ہیں، علماء کو درس و تدریس کے لیے شہادت نامے (سرکاری اجازت نامے) کی ضرورت نہیں ہوگی، علماء کو شعبہ احتساب میں شامل کیا جائے گا، رشوت کی روک تھام کی جائے گی، 'انجمن حمایت نسواں'

معطل قرار دے دی گئی ہے۔'' مگر اس بہلاوے سے کھویا ہوا عوامی اعتماد بحال نہ ہو سکا۔ حالات ایک انقلاب کی طرف جا رہے تھے۔

ایک دن امان اللہ خان نے اچانک بچہ سقہ کے مقابلے میں یک طرفہ طور پر جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔ بچہ سقہ قلعہ مراد بیگ میں مورچہ زن تھا۔ سرکاری فوج کی طرف سے گولہ باری اور فائرنگ کا سلسلہ بالکل رُک جانے سے اس کی ہمت مزید بڑھ گئی۔

14 جنوری: برف باری کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ کابل کے باشندے گھروں میں آگ تاپ رہے تھے۔ 13 اور 14 جنوری 1929ء کی درمیانی شب شدید برف باری کے سبب شہر کے تمام پہاڑ، عمارتیں اور سڑکیں برف سے اَٹے ہوئے تھے اور ہر طرف ہُو کا کا عالم طاری تھا۔ تب رات کے آخری پہر بچہ سقہ اپنے گروہ کے ساتھ قلعہ مراد بیگ سے نکل کر ''کوتل خیر خانہ'' تک آن پہنچا۔ صبح کاذب سے کچھ پہلے شہر کے مختلف حصوں سے فائرنگ کی ایسی زوردار آوازیں گونجیں کہ سرکاری کارندے، سپاہی اور عام شہری ہکا بکا رہ گئے۔ اس کے فوراً بعد ہر طرف یہ خبر پھیل گئی کہ شنواریوں نے ننگرہاریوں کے ساتھ مل کر کابل پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہ خبر سن کر سرکاری محافظین کے چھکے چھوٹ گئے اور وہ ''کوتل خیر خانہ'' کو چھوڑ کر ''دہ کپک کابل'' تک پسپا ہو گئے۔ اب بچہ سقہ کے راستے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی تھی۔ اس خوفناک شب کے اختتام پر ایک اُداس صبح طلوع ہوئی۔ شاہ امان اللہ خان برف کی چادر میں لپٹے ہوئے کابل کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ ایک دن بھی مزید یہاں ٹھہرا رہا تو یہی شہر اس کا مقبرہ بن جائے گا۔ 9 بجے اس نے شاہی محل کے درودیوار کو پر ایک اشک آلود نظر ڈالی اور اپنی موٹر میں بیٹھ گیا۔ کسی حفاظتی دستے اور جلوس کے بغیر اس کی موٹر چپ چاپ قندھار جانے والی شاہراہ پر روانہ ہو گئی۔ 10 بجے ایک مجاز عہدے دار نے ارکانِ سلطنت کو جمع کر کے سابق بادشاہ کی جانب سے یہ اعلان پڑھ کر سنایا: ''ملک کی خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ میں مستعفی ہو جاؤں کیونکہ تمام تر خوں ریزی اور انقلابی کوششیں میرے خلاف ہو رہی ہیں۔''

اس رقعے میں امان اللہ خان نے اپنے بھائی عنایت اللہ خان کو جانشین مقرر کر دیا تھا۔

عنایت اللہ خان تین دن کا بادشاہ: اسی دن (14 جنوری 1929ء کو) عنایت اللہ خان تخت نشین ہو گیا۔ مگر وہ ایک کمزور طبع انسان تھا۔ اس نے تخت پر بیٹھتے ہی بچہ سقہ سے صلح کرنے کی کوشش کی مگر جب اس کا وفد مفاہمت کی بات چیت کے لیے گیا تو بچہ سقہ نے دوٹوک لہجے میں کہا کہ کابل کا بادشاہ وہ خود بنے گا۔

صلح کی اس بات چیت کے آغاز سے پہلے سرکاری فوج نے بے فکر ہو کر راستوں کی ناکہ بندی ختم

کر دی تھی اور شام تک وہ اضافی فوج جو چوکیوں پر تھی اندرونِ شہر ڈٹ گئی تھی۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر اسی شام بچہ سقہ کے حامی شہر کے اندر داخل ہو گئے اور شاہی محل کا محاصرہ کر لیا۔ وہ پورے شہر میں نعرے لگاتے پھر رہے تھے: ''امیر غازی حبیب اللہ...... خادم دین رسول اللہ'' اپنے دفاع سے مایوس ہو کر 16 جنوری 1929ء کو عنایت اللہ خان بچہ سقہ کے حق میں جان کی امان کی شرط پر تخت سے دست بردار ہو گیا اور اگلے روز ایک برطانوی طیارے پر سوار ہو کر اہل و عیال سمیت پشاور سدھارا۔ اس طرح تقریباً ایک صدی پر مشتمل بارک زئی خاندان کا دورِ حکومت ختم ہو گیا۔

مآخذ و مراجع

- ...... تاریخ تجزیہ شاہنشاہی افغانستان۔ علامہ عبدالحی حبیبی
- ...... افغانستان در مسیر تاریخ، میر غلام محمد غبار
- ...... Encyclopedia of Islam.V.1
- ...... مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشت کابل، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان
- ...... آپ بیتی، ظفر حسن ایبک
- ...... سیر افغانستان، علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ

افغانستان کا نقشہ

افغانستان کا قومی پرچم

سومنات کا مندر جسے سلطان محمود غزنوی نے فتح کیا۔ آزادی کے بعد بھارتیوں نے اسے دوبارہ عالی شان انداز میں تعمیر کرا دیا ہے۔

جنوبی افغانستان کے ضلعے بست کا ایک قدیم قلعہ اور محراب

کابل کا قلعہ بالا حصار جو افغان تاریخ کی اہم سرگرمیوں کا مرکز رہا

درّہ خیبر اور علی مسجد کا قلعہ۔ اس مقام کو صدیوں سے افغانستان کا "مین گیٹ" شمار کیا جاتا ہے۔

کابل میں مغل بادشاہ شاہ جہاں کی تعمیر کردہ مسجد

کابل کے باغِ بابری میں ظہیر الدین بابر کا مقبرہ

ہندوکش کے پہاڑی سلسلے میں افغانوں کے قافلے رواں دواں
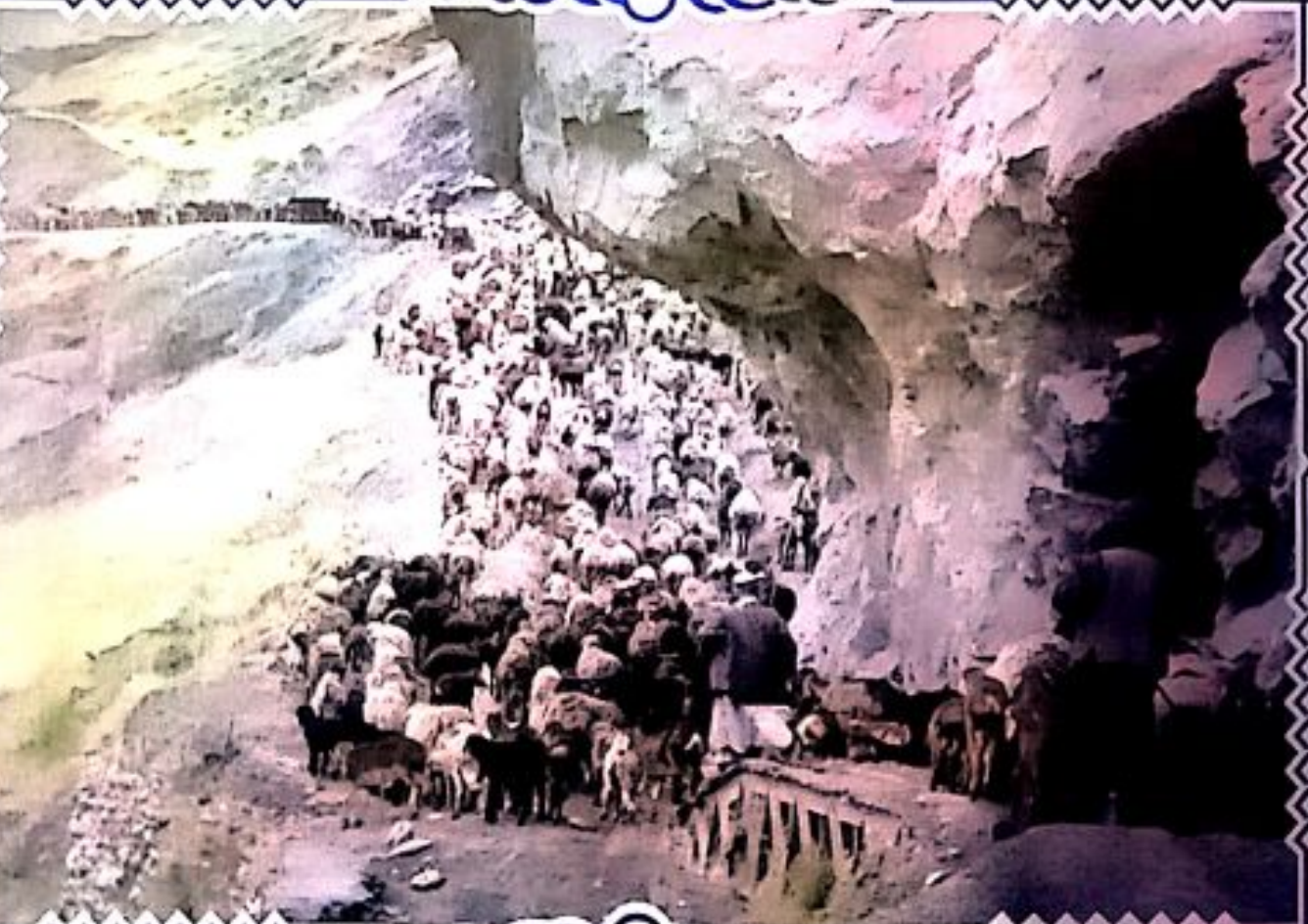
افغانوں کا روایتی پیشہ گلہ بانی

مجاہدین کا برطانوی فوج پر حملہ۔ ایک مصور کی نظر میں

ڈاکٹر بریڈن زخمی حالت میں تنہا جلال آباد پہنچ رہا ہے، ایک مغربی مصور کی عکاسی

غزنی کے جنوب مغرب میں تقریباً پچاس میل دور واقع ایک پرانا قلعہ

سلطان محمود غزنوی کے زمانے کا غزنی، ایک مصور کی نگاہ میں

کابل میں برف باری کا ایک خوبصورت منظر

افغانوں کا روایتی کھیل، بزکشی

کچھ اس کتاب کے بارے میں

تاریخ کی کتب قوم کی امانت ہوتی ہیں اور انہی پر قوموں کے تشخص کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ دورِ حاضر میں مستشرقین کی ایک پوری کھیپ ہماری تاریخ مسخ کرنے میں مصروف ہے۔ اس بات کا خطرہ ہے کہ اگر ہم نے اپنے ماضی بعید کے ساتھ ساتھ قریبی ادوار کی تاریخ کو پوری احتیاط، دیانت داری اور صداقت کے ساتھ محفوظ نہ کیا تو اگلی نسلوں کے ہاتھوں میں تاریخ کے نام پر صرف وہی زہر آلود مواد ہوگا جو مستشرقین پیش کر رہے ہیں۔ افغانستان کی تاریخ خصوصاً ایسے فکری حملوں کا ہدف ہے۔ اہل مغرب آج میڈیا کے ذریعے وہاں کے غیور مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں، کل کو اسی مواد سے وہ افغانستان کی ایسی تاریخ مرتب کریں گے جس میں ہمارے لیے جا بجا گمراہ پھندے بچھے ہوں گے۔

ان خطرات کے دفاع کے لیے ساڑھے پانچ سال قبل ہفت روزہ ضربِ مومن میں "تاریخ افغانستان" پر مضامین کا آغاز کیا گیا۔ ابتدا میں میرا ہدف صرف قریبی دو عشروں کی تاریخ مرتب کرنا تھا۔ اس میں بھی سوویت یونین کے خلاف جہاد اور طالبان کے اسلامی دور کو خصوصی اہمیت دینا میرا محور تھا۔ مگر جب کام شروع کیا تو معلوم ہوا کہ افغانستان کا ہر دور اپنے سابقہ دور سے اس طرح بندھا ہوا ہے کہ اس سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔ ویسے تو ہر قوم اپنے ماضی کی اسیر ہوتی ہے مگر اپنی اسلامی تاریخ اور روایات سے جس قدر مضبوط رشتہ افغانوں میں دیکھا جاتا ہے، دنیا کی کوئی اور قوم اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ اس لیے میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ کیوں نہ افغانستان کے پورے اسلامی عہد کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے اور قارئین کو اس سیر میں اپنا ہم سفر بنا لیا جائے۔

بایں ہمہ جب یہ سلسلہ شروع ہوا تھا تو یہ توقع نہ تھی کہ اسے عوام و خواص میں اس قدر مقبولیت حاصل ہوگی۔ راقم کو قارئین کی جانب سے ملنے والے بکثرت خطوط سے یہ اندازہ ہوا کہ الحمد للہ ہماری قوم خاص کر نوجوان طبقے میں اپنی تاریخ جاننے اور اس سے سبق حاصل کرنے کا زبردست ولولہ موجود ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک بات اکثر خطوط اور پیغامات میں مشترک ہوتی تھی اور وہ یہ کہ اس سلسلے کو کتابی شکل میں ضرور لایا جائے۔ قارئین کی دلچسپی کے پیشِ نظر اب اسے کتابی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بلاک A-1، گلستانِ جوہر، یونیورسٹی روڈ، کراچی

0321-3135009 | 0321-2000870

almanhalpublisher@gmail.com

almanhalpublisher@hotmail.com

www.almanhalpublisher.com